وَزِنُوا بِالْقِسْطَاسِ الْمُسْتَقِيمِ

(اور ترازو کی ڈنڈی سیدھی رکھکر تولا کرو)

المیزان

یعنی مولوی شبلی نعمانی کی کتاب موازنۂ انیس و دبیر پر محققانہ اور منصفانہ ریویو

اور مرزا دبیر کی شاعری پر تفصیلی بحث، اور اُن کی ہر قسم کی سلیس اور صاف نظم کا نمونہ

اور اُن کے محاسنِ سخن اور فصاحت و بلاغتِ کلام کا مشرح تذکرہ

عالیجناب مولوی چودھری سید نظیر الحسن صاحب فوق رضوی سے

رئیس مہابن ضلع متھرا

محمد عبد اللطیف منیجر کے اہتمام سے

مطبع مفید عام علیگڈھ کالج میں چھپی

اور جناب مؤلف کتاب نے مہابن سے شائع کی

(محبوب بخش پیپن) ... از شاگردان سر آوردۂ خوشنویسان ہندوستان عالیجناب منشی علی محمد خان صاحب فرخ آبادی مدظلہ العالی

فہرست مضامین المیزان

وزنوا بالقسطاس المستقیم

المیزان

یعنی مولوی شبلی نعمانی کی کتاب موازنہ انیس و دبیر پر محققانہ و منصفانہ ریویو

اور مرزا دبیر کے ہر قسم کے فصیح و بلیغ اور صاف و سلیس کلام کا نمونہ

اور میر انیس و مرزا دبیر پر اعتراضات کے مدلل و مفصل جوابات

مؤلفہ

عالیجناب مولوی چودھری سید نظیر الحسن صاحب فوق رضوی

رئیس مہابن ضلع متھرا

حافظ عبد اللطیف پرنٹر کے اہتمام سے

مطبع فیض عام علی گڈھ میں چھپی

اور جناب مؤلف کتاب نے مہابن سے شائع کی

قیمت فی جلد قسم اول [illegible] قسم دوم [illegible]

گنجینۂ گوہر زِ مدیحِ تو دہنہا	اے خار و خسِ بحرِ ثنائے تو سخنہا

الحمدُ للہ المُفضِلِ المُنعام ۔ والصّلوٰۃ والسّلام علیٰ نبیّنا سیّد الانام وآلہ الطیّبین الکرام

تمہید

اس کتاب کے پڑھنے سے قبل امور ذیل کو پیشِ نظر رکھنا چاہیے ۔

(۱) یہ کتاب مولوی شبلی صاحب کی کتاب موازنہ انیس و دبیر کا لفظ بہ لفظ جواب ہے ۔ اگرچہ ہم نے جواب دیتے وقت مولوی صاحب کی پوری عبارت نقل کر دی ہی، لیکن اگر موازنہ کو سامنے رکھ کر پہلے اُنکے مضمون کو پڑھ لیا جائے اور پھر ہماری تحریر دیکھی جائے تو غالباً زیادہ لطف حاصل ہوگا اور انصاف کا موقع ہاتھ آئیگا ۔

(۲) مرزا صاحب کے مرثیوں کا جو انتخاب اس کتاب میں کیا گیا ہی اُنکے بعض بعض مصرعوں میں مطبوعہ مرثیوں کے لحاظ سے کچھ تغیر و تبدل نظر آئیگا: اس کی وجہ یہ ہی کہ جلدوں میں اکثر الفاظ غلط اور مہمل طبع ہوگئے ہیں کہیں کے بند کہیں اور کہیں کے مصرعے کہیں لگا دیئے ہیں لہذا ایسے مقامات پر ہم نے قلمی مرثیوں اور اپنی یاد سے کام لیا ہی یعنی جس طرح مجالس میں اُن مرثیوں کو سنا ہی اور وہی صحیح معلوم ہوا ہی تو اُسی طرح درج کیا گیا ہی۔

(۳) مرزا صاحب کے بعض بعض مرثیوں میں کچھ بند مکرر چھپے ہوئے ہیں، اس کتاب میں مختلف عنوانات میں جو جو مرثیے درج کیے ہیں اُن میں ہمنے مکررات کو حذف کر دیا ہے؛ لیکن جہاں یہ معلوم ہوا ہی کہ مکررات کو حذف کرنے سے سلسلۂ کلام ناقص ہو جائیگا اُن مقامات پر مجبوراً ہم نے بھی اُن بندوں کو مکرر درج کر دیا ہی۔ ناظرین اس مجبوری کو معاف فرمائیں۔

(۴) صرف ایک یا دو مقام پر بعض بند شروع سے آخر تک مکرر درج ہیں۔ اُسکا یہ مطلب ہے کہ اُن کو ایک جگہ بلحاظ فصاحت و روانیِ الفاظ اور دوسرے مقام پر بلحاظ بلاغت معانی دکھایا گیا ہے۔

(۵) جن مقامات پر جلدوں اور اُنکے صفحات کا حوالہ دیا گیا ہی وہاں بنظر اختصار صرف ہندسوں کو کافی سمجھا ہی۔ مثلاً ۴/۱۲ کا یہ مطلب سمجھنا چاہیے کہ جلد چہارم صفحہ ۱۲۔

(۶) ہماری کتاب پڑھتے وقت ناظرین یہ امر بھی ملحوظ خاطر رکھیں کہ گو ہم یہ کتاب مرزا صاحب کے دفع الزام کے واسطے لکھ رہے ہیں، لیکن میر صاحب اعلی اللہ مقامہ کی نسبت جنکا اعتقاد ہم کو مولوی شبلی صاحب سے بہت زیادہ ہی، کوئی خلافِ ادب لفظ نہیں لکھا۔ جن مقامات پر مولوی شبلی صاحب نے مرزا صاحب پر اعتراضات کیے ہیں

اُنھوں نے فلاں مضمون یا فلاں لفظ خلافِ بلاغت و فصاحت لکھا ہے، اُسکے جواب میں ہم نے اُسی قسم کے اشعار میر صاحب مرحوم کے درج کیے ہیں۔ اس سے خدانخواستہ یہ مطلب نہیں ہی کہ میر صاحب پر کوئی اعتراض کیا جاتا ہی۔ بلکہ مرزا صاحب پر جو اعتراض کیا گیا ہی اُسکے رفع کرنے کی غرض سے میر صاحب کے کلام سے استناد کیا ہی، یعنی ازبسکہ میر صاحب نے بھی ایسا لکھا ہی اسلیے صحیح ہی اور یہ لفظ مولوی شبلی صاحب کے نزدیک قابل اعتراض نہ ہونا چاہیے تھا؛ غالباً مولوی صاحب کے ساکت کرنے کے واسطے اس سے بہتر کوئی تدبیر نہ تھی کہ میر صاحب کا کلام بطور سند پیش کیا جائے۔

(۷) ہم کو اُن سوقیانہ الفاظ پر بھی اعتراض اور افسوس ہی جو شبلی صاحب نے مرزا صاحب جیسے عالم و عابد۔ دیندار و خداپرست۔ زاہد و متقی۔ پاک باطن پاک نفس۔ مقدس و واجب التعظیم بزرگ کی نسبت اکثر مواقع پر لکھے ہیں۔ ایک مسلمان اور ذی علم شخص سے یہ امر کسقدر تعجب خیز معلوم ہوتا ہی کہ وہ بزرگانِ قوم اور مداحانِ **اہلِ بیت** علیہم السّلام کا احترام بالکل فراموش کردے۔ ممکن ہی کہ مولوی صاحب مرزا صاحب کے کلام کی عظمت نہ کریں، لیکن کم سے کم اُن کی ذات بابرکات کا تو ادب و وقار ملحوظ رکھنا چاہیے تھا۔ یہ عنایت اُنھوں نے صرف مرزا صاحب ہی پر نہیں کی بلکہ شعر العجم میں فارس کے دیندار و متقی شاعروں میں بھی کسی کو امرد پرست کہتے ہیں۔ کسی کو شراب خوار۔ کسی کو رند و اوباش؛ اور اس کی بنیاد صرف یہ قرار دیتے ہیں کہ اُن کے اشعار سے ایسا پایا جاتا ہے۔

(۸) چونکہ یہ امر مسلّم الثبوت ہی کہ کسی شاعر کا کلام بلحاظ فصاحت و بلاغت۔ شستگی و روانی۔ یکساں نہیں ہوتا، اسلیے اس کلیہ کے مطابق میر صاحب اور مرزا صاحب

کے کلام میں بھی تین مدارج ہیں۔ اوّل جہاں کسی مشترک مضمون کے ادا کرنے میں میر صاحب بڑھ گئے ہیں۔ دوسرے جہاں مرزا صاحب کو فضیلت حاصل ہے۔ تیسرے جہاں دونوں صاحبوں کا کلام بلحاظِ فصاحت و بلاغت و طرزِ بیان یکساں واقع ہوا ہے۔

امر اوّل کو مولوی شبلی صاحب نے اپنی کتاب میں بیان کرنے کی کوشش کی ہے؛ یعنی آخر کتاب موازنہ میں اُنھوں نے وہ متحد المضمون اشعار لکھے ہیں جہاں میر صاحب بڑھ گئے ہیں۔ مگر افسوس ہے کہ اُن کا انتخاب غلط اور ناقص ثابت ہوا، اسوجہ سے ہمکو مجبوراً اُنکے خیال کی تردید کرنی پڑی ہے۔ کاش مذاقِ صحیح اور وجدانِ سلیم اُن کی رہنمائی کرتا، اور اُن کی پُر زور طبیعت لطافتِ اشعار اور حُسنِ کلام کو بخوبی جانچ سکتی تو میر صاحب کا ایسا نفیس کلام بہت مل سکتا تھا جہاں وہ فی الواقع مرزا صاحب سے بڑھ گئے ہیں۔

امر دوم کو یعنی جہاں مرزا صاحب کے کلام کو ترجیح ہے، ہم نے اپنی کتاب میں درج کیا ہے

امر سوم یعنی جہاں دونوں صاحبوں کا کلام یکساں واقع ہوا ہے۔ یہ مقامات نہایت دلچسپ و دلاویز۔ پُر لطف اور قابلِ دید ہیں؛ جہاں ہر ایک باکمال شاعر کی قابلیت۔ قادر الکلامی۔ زورِ طبیعت۔ اور خصوصیاتِ کلام کا خوب اندازہ ہوتا ہے، اور نکتہ سنج ناظرین معلوم کر سکتے ہیں کہ دونوں بزرگوں نے اپنی دلکش نظموں میں ایک ہی قسم کے واقعہ کو الگ الگ انداز سے ادا کر کے کلام میں کسقدر جوش اور اثر پیدا کر دیا ہے۔ ہم نے اس مقام کو مختصراً کچھ لکھا بھی تھا لیکن چونکہ کتاب کا حجم بڑھ گیا تھا اور یہ بحث بہت وسیع اور ایک علٰحدہ تالیف کی متقاضی تھی۔ لہٰذا اس مقام کو بالکل چھوڑ دیا۔

(۹) ایک کتاب حیات دبیر میرے دوست میر افضل حسین صاحب ثابت

لکھنوی بھی لکھ رہے ہیں۔ اُنکا موضوع تو فقط مرزا صاحب کی سوانح عمری تحریر کرنا ہی، مگر سُنا گیا ہو کہ ضمناً دو چار مقامات پر اختصار کے ساتھ اُنھوں نے موازنۂ مولوی شبلی صاحب کا بھی جواب دیا ہی۔ مگر اس امر کا افسوس ہے کہ اُن کی کتاب اور میری کتاب ایک ہی زمانہ میں پریس میں بھیجی گئیں، اسلیے نہ تو میں اُنکی کتاب سے مستفیض ہو سکا نہ اُن کو میری کتاب کے دیکھنے کا موقع ملا۔ شاید کسی مقام پر توارد ہو گیا ہو تو معلوم نہیں۔

(۱۰) چونکہ مجکو کتاب کی صحّت کا بیحد خیال رہتا ہے، اسلیے اس کتاب کی تصحیح میں معمول سے زیادہ جانکاہی۔ محنت اور توجہ سے کام لیا گیا ہے۔ چنانچہ اہالیانِ مطبع فیض عام نے اس بات کا اقرار کیا کہ جسقدر توجہ صحت کتاب کے متعلق آپ کرتے ہیں شاید ہی کوئی مصنّف کرتا ہو۔ سب سے پہلے میں نے منشی محمد اسمٰعیل صاحب علیگڈھی خوشنویس، کاتبِ کتاب ہذا پر سخت تاکید رکھی کہ نہایت غور و توجّہ سے کتابت کریں۔ چنانچہ اُنھوں نے مہربانی فرما کر خاص توجّہ اور غور سے کتابت کی ہے اور ہر چھوٹی چھوٹی غلطی کو میری ہدایت کے مطابق صحیح اور درست کیا ہے۔ پھر میں نے خود بڑے غور سے چار چار بار کاپیوں کو دیکھا ہے اور اسکے بعد کئی کئی بار پروفوں پر نظر ڈالی ہے۔ میرے دیکھنے کے بعد میرے عنایت فرما ماسٹر گھاسی رام صاحب ملک نے جو علمی قابلیت کے علاوہ مذاقِ شعر و سخن بھی رکھتے ہیں، کئی کئی بار ان کاپیوں اور پروفوں کو نہایت توجّہ اور محنت سے دیکھا ہی۔ پھر کارپردازانِ مطبع فیض عام خصوصاً منشی عبد الکبیر صاحب مالک مطبع نے نہایت جانکاہی سے پتھر پر غلطیوں کی صحّت کی ہے اور جا بجا بیلوں وغیرہ سے اسکے خوشنما بنانے میں معمول سے زیادہ توجّہ

کی ہے، جسکا میں بیحد ممنون ہوں - کام کے دیکھنے کی غرض سے میں خود بار بار مطبع میں گیا ہوں - اتنی کوششوں اور محنتوں کے بعد انشاء اللہ کتاب میں بہت کم غلطیاں رہی ہونگی - لیکن ازبسکہ سہو بشریت لازمی ہے بعض مقامات پر دو چار غلطیاں نظر آتی ہیں لیکن وہ معمولی محض نقطوں وغیرہ کی غلطیاں ہیں جو بادی النظر میں معلوم بھی نہیں ہوتیں اور جن کو قابل ناظرین کتاب خود ہی درست کر لیں گے - اسی وجہ سے میں نے غلطنامہ نہیں لگایا کیونکہ ایسی چھوٹی اور خفیف غلطیونکے واسطے غلط نامہ محض بیکار اور فضول ہی -

اصل یہ ہی کہ کتاب کا صحیح چھپوانا اور صحّت میں کوشش کرنا بھی مصنفوں کے واسطے ایک جانکاہ مصیبت ہے اور میرے خیال میں کوئی شخص پورے طور پر اس کام سے عہدہ برآ نہیں ہوسکتا - مولوی شبلی صاحب نے شعرالعجم میں بہت صحیح لکھا ہے کہ "دنیا میں ناممکنات کی ابتک جو فہرست تیار ہوچکی ہی، اس میں ایک نمبر "کتاب کا صحیح چھپنا" بھی اضافہ کرنا چاہیے، یہ مصیبت مدّت سے مجکو پیش آتی ہے لیکن علاج کی کوئی صورت نہیں نکلتی - کاپیوں اور پروف کی تصحیح چنداں کام نہیں دیتی، چھپنے میں حرف کچھ کے کچھ ہو جاتے ہیں"

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حامدًا و مصلیًا

دیباچہ

یک سخن در ہر مذاقے می کند کارِ دگر | از نسیمے گُل پریشاں غنچہ خنداں می شود

جب اُردو شاعری نے پہلے پہل دنیاے سخن میں قدم رکھا، شعرا کی طبع آزمائیاں صرف غزل و قصائد کے دائرے تک محدود تھیں، اور حُسن و عشق کے فسانے اور گُل و بلبل کی داستانیں گرمیِ صحبت کا باعث ہوتی تھیں۔ یہانتک کہ ایک زمانہ آیا کہ بعض خوش اعتقاد شعرائے غزل گوئی کے کوچے سے باہر نکل کر مداحِ اہلبیتؑ کے حلقے میں قدم رکھا۔ ابتدا میں مرثیے اور سلام پُرانے طریقے پر لکھے جاتے تھے جیسا کہ آغازِ ایجاد میں ہوا کرتا ہے، اُن بزرگوں کو ان نظموں سے فقط گریہ و بکا اور حصولِ ثواب مقصود تھا شاعری اور صنائعِ انشا پردازی سے کچھ غرض نہ تھی؛ مگر جوں جوں زمانہ گذرتا گیا اُن میں بھی جدت۔ صفائی اور فصاحت و بلاغت کی روح پھونکی جانے لگی؛ حتیٰ کہ لکھنؤ کے نازک خیال شعرائے اس فن کو ترقی کے اُس پایہ پر پہونچا دیا کہ اُس سے زیادہ عروج اب خیال میں بھی نہیں آسکتا۔ پہلے نامی و گرامی شعرا جنکا نام ابتک اقلیمِ سخن میں گونج رہا ہے خاص خاص اصنافِ

سخن پر قادر رہے ہیں، کوئی غزل گو تھا کوئی قصیدہ گو، کوئی رزم کا دھنی تھا کوئی بزم کا، کوئی بہاریہ اشعار اچھے لکھتا تھا کسی کو درد انگیز مضامین تحریر کرنے میں یدِطولیٰ حاصل تھا؛ مگر مرثیہ گویوں نے ہر ایک صنف سخن پر اپنی قادر الکلامی کے ایسے بیّن ثبوت دیئے ہیں کہ اُردو شاعری جسقدر اُن کی ذات پر ناز کرے کم ہے۔ مرثیوں کے دیکھنے والے اچھی طرح جانتے ہیں کہ اصنافِ سخن میں سے کوئی صنف باقی نہیں رہی جسمیں مداحانِ اہلبیتؑ نے اپنی جادو بیانی کے جوہر نہیں دکھائے۔

مرزا دبیر اور میر انیس کی سخن گوئی

مرثیہ گویوں میں مرزا دبیر اور میر انیس نے اس فن کو اُس درجے تک پہونچا دیا جس سے آگے ترقی کا رستہ بند ہوگیا۔ اور سچ تو یہ ہے کہ نہ صرف مرثیہ گویوں بلکہ نکتہ سنج شعرا میں یہی دو بزرگوار ہیں جو آسمانِ بلاغت کے مہر و ماہ کہے جا سکتے ہیں۔ اُن کا ایک ایک مرثیہ بلاغت کا تاجِ سر، اور ایک ایک شعر بلکہ ایک ایک لفظ پیکرِ فصاحت کی جان ہے۔

مرثیوں میں اخلاقی مضامین

ان بزرگوں نے اپنے پُرزور کلام سے نہ صرف مذہبی ضرورت کو پورا کیا ہے، بلکہ پند و موعظت۔ عقائد و دینداری۔ عظمت و جلالِ الٰہی۔ نیرنگیِ دہر۔ بے ثباتیِ عالم۔ زہد و اتقا۔ صبر و قناعت وغیرہم کے بیشمار مضامین، اور وہ اعلیٰ اخلاقی اصول، جو دنیا و عقبیٰ دونوں کے لیے مفید، اور تکمیلِ اخلاق کیواسطے ضروری ہیں، ایسے دلکش انداز اور موثر الفاظ میں بیان کیے ہیں کہ بے اختیار دلوں میں سرایت کر جاتے ہیں۔ خود عظیم الشان معرکۂ کربلا جو مرثیہ گوئی کا موضوع ہے، اُسکے تمام واقعات پر باریک بیں نگاہ سے جسقدر غور و خوض کیا جاتا ہے اور اُن کو جس پہلو اور جس انداز سے دیکھا جاتا ہے، حُسنِ اخلاق کے بے شمار نمونے ملتے ہیں، چنانچہ اس بحث کو کسی قدر

تفصیل کے ساتھ ہم نے اپنی کتاب حسناتِ محرّم میں بیان کیا ہے۔ یورپ کے منصف
مزاج اور جلیل القدر مورّخ آجتک واقعۂ کربلا میں نئے نئے نکات نکال کر امام علیہ السلام
کی اعلیٰ درجہ کی مدبّری۔ دانائی۔ عاقبت اندیشی اور مستقل مزاجی کو دنیا کی نگاہوں
میں جلوہ گر کرتے ہیں، اور مرثیوں میں ان سب باتوں کو بہت خوبی کے ساتھ ظاہر
کیا گیا ہے۔ مولوی حالی فرماتے ہیں کہ "مرثیہ کو اگر اخلاق کے لحاظ سے دیکھا جائے
تو بھی ہمارے نزدیک اُردو شاعری میں اخلاقی نظم کہلانے کا مستحق صرف انہیں لوگوں کا
کلام ٹھہر سکتا ہے، بلکہ جس اعلیٰ درجہ کے اخلاق ان لوگوں نے مرثیے میں بیان کیے ہیں
اُن کی نظیر فارسی بلکہ عربی شاعری میں بھی ذرا مشکل سے ملیگی"[1] فضائل کے اشعار سے
دلوں میں بزرگانِ دین کی عقیدت و محبت کا جوش اور ولولہ پیدا ہوتا ہے، اور
خاندانِ نبوّت کے ساتھ رشتۂ محبت و اخلاص جو کہ اسلام کی جڑ ہے مضبوط، اور
اُس کی سچّی اور حقیقی عظمت و شان کا اعتقاد مستحکم ہو جاتا ہے۔ اگرچہ اہلبیت علیہم السلام
کے اصلی مراتب ظاہر کرنے سے شاعری مطلقاً مجبور ہے، کیونکہ اُن کے فضائل و مناقب
شاعرانہ مبالغوں کے وسیع دائروں میں بھی نہیں سما سکتے اور وہم و خیال بھی اُن کے
ادراک سے عاجز ہے۔ لیکن جہانتک ایک شاعر کے امکان میں ہے مدّاحانِ اہلبیتؑ
نے اُن کے بیان کرنے کی کوشش کی ہے؛ چنانچہ بیشمار تاریخی روایات نظم کی ہیں،
جن میں ائمہ علیہم السّلام اور اُن کی ذریتِ اطہار کی پاکیزہ اور قابلِ تقلید زندگی کے
نمونے دکھا کر، ہزاروں مثالیں صبر و استقلال۔ انسانی ہمدردی۔ ایثار علی النفس۔
پاسِ حق۔ ثابت قدمی۔ عفو و ترحم کی پیشِ نظر کر دی ہیں؛ تاکہ سُننے والے اُنکے

---

[1] مقدمۂ شاعری صفحہ ۱۸۳

شاعری کا مقصد وجذبات پر اثر

طرزِ عمل سے عمدہ سبق حاصل کریں، اور عقائد میں پختگی ۔ دماغوں میں روشنی ۔ دلوں میں صفائی ۔ خیالات میں پاکیزگی اور ارادوں میں بلندی پیدا ہو ۔ اخلاقی یا مذہبی مضامین کا نظم میں موجود ہونا ہر قوم کیواسطے ایک بے بہا نعمت سمجھا جاتا ہی، کیونکہ کسی مضمون یا مطلب کو بخوبی ذہن نشین کر دینے اور طبیعت کو متاثر بنا دینے میں، نظم سے زیادہ کسی چیز کو دخل نہیں ۔ شاعری ہمیشہ خاص خاص اشیا اور خاص خاص جذبات کا ایک دلچسپ نقشہ کھینچ دیتی ہی، اور اُس کے ذریعہ سے ہماری قوتِ متخیلہ حرکت اور جوش میں آجاتی ہے ۔

معرکۂ کارزار میں رجز کے ایک شعر سے بہادروں کے دریاے شجاعت میں بلا کا تلاطم، اور رگِ حمیت میں غضب کا جوش پیدا ہو جاتا ہی ۔ اخلاقی و مذہبی مطالب کے بیان کرنے میں برجستہ نظمیں طبعی جذبات کو ایسا اُبھار دیتی ہیں کہ شعر کے سوز و گداز کے ساتھ ہی مضمون کا اثر بھی بجلی کی طرح دل میں اُتر جاتا ہی اور لطیف نظم کا جادو برسوں تک اُس کے مفہوم کو دل و دماغ سے محو نہیں ہونے دیتا ۔ یورپ کا ایک محقق کہتا ہی کہ "مشاغلِ دنیوی میں انہماک کے سبب جو قوتیں سو جاتی ہیں شعر اُن کو جگاتا ہی ۔ شعر کا اثر محض عقل کے ذریعہ سے نہیں، بلکہ زیادہ تر ذہن اور ادراک کے ذریعہ سے اخلاق پر ہوتا ہی ۔ پس ہر قوم اپنے ذہن کی جودت، اور ادراک کی بلندی کے موافق شعر سے اخلاقِ فاضلہ اکتساب کر سکتی ہے" ۔ چونکہ اردو شاعری میں کوئی نظم ایسی نہیں ملتی جس میں مرثیوں کی برابر اخلاقی مضامین کا گراں بہا ذخیرہ موجود ہو، اس لیے ضرورت ہی کہ لوگ اس کلام کو دیکھیں ۔ پڑھیں ۔ سمجھیں ۔ تاکہ علاوہ حصولِ ثواب کے، ان نظموں کے طفیل دینداری اور حسنِ اخلاق

مرثیوں کو دیکھنے کی ضرورت

کے مضامین کا ذخیرہ دلوں میں جمع کرنے کا موقع ملے، اور وہ اعلیٰ مطالب نظر
سے گذر جائیں جو قوم و ملت کے عقائد و دینداری۔ رسوم و معاشرت۔ تہذیب و
تمدن۔ ادب و اخلاق سے گہرا تعلق رکھتے ہیں۔

مرثیہ گویوں میں میر انیس اور مرزا دبیر کا طرزِ سخن جُدا جُدا، اور اظہارِ کمال میں اُنکی
رفتار الگ الگ ہی؛ اور چونکہ ہر شخص کو کوئی خاص رنگ مرغوب ہوا کرتا ہی اسلیے
اُن کے قدردانوں کے بھی دو گروہ ہوگئے ہیں؛ ایک گروہ حُسنِ بیان اور سلاست و
روانی پر گرویدہ ہی، تو دوسرا مضمون آفرینی و نازک خیالی اور صنائع و بدائع پر مفتون
نظر آتا ہی؛ دونوں طرز کمال سے خالی نہیں، البتہ طبیعتیں مختلف ہوتی ہیں اسلیے
پسند میں اختلاف ہی۔ لیکن زبان کی سادگی اور صفائی پر ایسا محو ہو جانا کہ مضمون
آفریں شعرا کے کلام کی قدر نہ کرنا، یا فصیح و بلیغ شعرا کی نازک خیالیوں پر گرویدہ ہو کر
سلاست پسند سخن آفرینوں پر زبانِ طعن دراز کرنا انصاف کی آنکھوں میں خاک
ڈالنا ہے۔

اصل یہ ہی کہ شاعری کی ہر قسم اور ہر طرز اپنے اپنے مقام پر قدر و منزلت کی نگاہوں
سے دیکھی گئی ہی۔ یہ وہ جوہرِ اعلیٰ ہی جس کے نور کی شعاعیں ہر وقت اور ہر زمانے
میں مطبوعِ خلق اور محبوبِ عالم رہی ہیں، اور اُس کی ہر شان میں شانِ دلربائی
پائی گئی ہی۔ کسی قوم کسی مُلک کسی زمانے میں اُس کی مقبولیتِ عام میں کمی نہیں ہوئی؛
مگر اس کا مزاج ہمیشہ رنگ بدلتا آیا ہی۔ یا یوں کہیے کہ جسقدر زمانے کا رنگ بدلتا
گیا اُس کی دلفریبیاں بھی اپنی جلوہ آرائیوں میں تراش خراش نکالتی رہیں۔ شاعر
کی معراجِ کمال یہی ہی کہ اپنے کلام کو عام پسند بنائے، اور پسندِ عام کا خلعت

زبان کی تبدیلیاں

اُسی وقت مِل سکتا ہی جب عام پسندی کا لحاظ رہے اور شعر و سخن کی عمارت زبانِ رائج الوقت کی بُنیاد پر قائم کی جائے۔ زبان کی نسبت ہر شخص کو معلوم ہی کہ لٹریچر کی دنیا میں وقتاً فوقتاً انقلاباتِ عظیم پیدا ہوتے رہتے ہیں؛ ایک صدی بلکہ اس سے بھی کم میں ایک مُلک کی زبان کو اُس کی قدرتی ترقی کہاں سے کہاں پہونچا دیتی ہی؛ اور اُسکے اصطلاحات و محاورات میں کیسا قابلِ لحاظ اور قابلِ احساس فرق آجاتا ہی۔ پس جبکہ خود زبان ہی محلِ تغیّرات ہی، اور دن بدن ترقی کے قدم آگے بڑھاتی رہتی ہی، تو شاعری جو اُسکی پروردۂ آغوش ہی اُس میں بھی نمایاں تغیّرات پیدا ہونا لازمی بات ہی؛ کیونکہ زمانے کی رفتار اور زمانے کی تقلید شعراکو اپنا پابند بنالیتی ہی، اور اُنھیں زمانے کے مقتضیات کے مطابق زبان میں تبدیلی کرنی پڑتی ہی۔ جس نسبت سے زبان کو تغیر ہوتا رہتا ہی اُسی نسبت سے شاعری کا پلّہ بھی اونچا ہوتا جاتا ہی؛ یہی وجہ ہی کہ ایک سن رسیدہ شاعر کے ابتدائی اور آخری حصۂ عمر کے کلام میں زمین و آسمان کا تفاوت ہو جاتا ہی۔

ہر زمانے کی زبان قابلِ قدر ہی

چونکہ زمانے کی حالت کا بدلنا، اور زبان کا درجہ بدرجہ عروج قوتِ بشری کے احاطۂ اختیار سے باہر ہی، اور پسندِ عام اُسی کا ایک ضمیمہ ہی، لہذا کسی نکتہ سنج اور سخن شناس کا یہ کام نہیں ہی کہ ایک زمانے کی زبان کو دوسرے زمانے کی زبان کے مقابل میں کم وقعت خیال کرے۔ کبھی سعدی۔ و حافظ و خسرو کا دور دورہ تھا، تو کبھی نظیری و ظہوری و عرفی و طالب و اسیر کی عملداری تھی؛ کون کہہ سکتا ہے کہ ان میں سے ہر شخص فارسی شاعری کا رکنِ رکین نہ تھا، باوجودیکہ زبان و طرزِ ادا۔ اور خیالات و جذبات میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔

اختلافِ مذاقِ شاعری

رائج الوقت زبان کے علاوہ شعرا کو مختلف مذاق کی متابعت بھی لازمی ہوتی ہی،

کیونکہ اُن کا فرض ہی کہ اپنے قدردانانِ سخن کے مذاق کا لحاظ رکھیں۔ اگر زمانے کی طبیعت کے خلاف چلتے تو نہ خواجہ حافظ بلبلِ شیراز ہوتے، نہ فردوسی طوسی پیغمبرِ سخن، اور نہ ظہوری و عرفی و غالب کے سر پر نازک خیالی کا تاج رکھا جاتا۔ اب کہ انقلابِ دہر نے اُس زمانے کا ورق اُلٹ دیا، اور زمانے کے ساتھ ہی ہمارے مذاق نے پلٹا کھایا، نگاہیں جدید تراش خراش کی جستجو کرنے لگیں۔ لیکن جوہر شناسانِ سخن کے جوشِ قدردانی نے ہر رنگ کا کلام ابتک محفوظ رکھا ہی، جسپر نگاہ ڈالنے سے بعض بعض کلام ہمارے موجودہ مذاق سے ملتے ہوئے، اور اکثر ہمارے حدِ مذاق سے دُور جا پڑے ہیں۔ ہمارا یہ کہنا کس قدر بیجا ہے کہ یہ کچھ بھی نہیں اور وہ بہت کچھ ہیں؛ حقیقت میں ایسا خیال کرنا غلط فہمی اور سمجھ کی کوتاہی ہی؛ اپنے زمانے میں وہ بھی سب کچھ تھے اور یہ بھی سب کچھ تھے۔ آج جن لوگوں کے کلام سے ہماری طبیعت کو لگاؤ نہیں یہ نہ کہنا چاہیے کہ وہ ہماری طبیعت کے موافق نہیں کہہ سکے، بلکہ یہ خیال کرنا چاہیے کہ اُس زمانے کا مذاق اور تھا اور ہمارا مذاق اور ہی۔ ہر اُستادِ فن اپنے زمانے کے مذاق کو پہچانتا تھا اور اُس میں کامل تھا، اسلیے وہ آج بھی اُسی قدر و منزلت کا مستحق ہی جس عزت و وقار کا مستحق اپنے زمانے میں تھا۔" ایران میں زمانۂ حال کے شعرا ظہوری و عرفی و طالب و اسیر وغیرہ کے طرز کو ناپسند کرتے ہیں اور ہندوستان میں بھی روز بروز طبیعتیں نیچرل شاعری کی طرف مائل ہوتی جاتی ہیں، جسکا نتیجہ یہ ہونا چاہیے کہ رفتہ رفتہ اس قسم کے تکلفات اور نزاکتیں نظروں سے گر جائیں۔ لیکن یہ سب زمانے کے مقتضیات ہیں جو ہمیشہ بدلتے رہتے ہیں، ایسی باتوں سے اُن لوگوں کی اُستادی اور گرانمائگی میں کچھ فرق نہیں آتا جنکو نئی طرز کے موجد ہونے کا فخر حاصل تھا۔"

زبان کی تبدیلی تو برسوں بعد اپنا اثر دکھاتی ہی اور وہ اثر تقریباً تمام ملک میں یکساں ہوتا ہے، لیکن کسی ملک کے ہر خطے بلکہ ہر خطے میں طبقے طبقے کا مذاق ایک ہی وقت میں جُداگانہ ہوسکتا ہی، حتّٰی کہ ایک ہی شہر میں شاعری کے متعلق مختلف مذاق کے آدمی ہوتے ہیں؛ اس ضرورت سے ہر طبقے کے شاعر کو بلحاظ اپنے قدر دانوں کے ایک جداگانہ طرزِ کلام اپنے حصولِ شہرت کے لیے اختیار کرنا پڑتا ہی "سب سے بڑا اور زبردست حاکم جو شاعر کو ایک خاص رنگ پر ڈال دیتا ہی وہ سوسائٹی کا دباؤ اور اُس کا مذاق ہی"+ اگر یہ بات نہ ہوتی تو زمانے میں صرف ایک طرزِ کلام کا سکّہ بیٹھ جاتا، اور اُس کے خلاف جو روش اختیار کی جاتی نظروں سے گر جاتی؛ حالانکہ آج دیکھا جاتا ہی کہ ہر شاعر کے کلام میں ایک جُدا شان اور نیا طرز جلوہ گر ہے اور ہر طرز اپنے اپنے زمانے میں مقبول رہا ہے۔

اسی اختلافِ طبائع نے انیس کو انیس اور دبیر کو دبیر بنا دیا، سخن فہموں کے دو گروہ ہوگئے اور اُنھوں نے زباندانی کے میدان میں دو شہسوار کھڑے کر دیے۔ اگر زمانے کا ایک ہی مذاق ہوتا تو میر صاحب کے مقابل میں مرزا صاحب، اور مرزا صاحب کے مقابل میں میر صاحب کہاں سے آتے۔ شیخ ناسخ اور خواجہ آتش آخر اسی لکھنؤ کے رہنے والے تھے، اُستاد ذوق اور مرزا غالب، میر تقی اور مرزا سودا، اسی گلشنِ ہند کے نونہال ہیں، ان سب کی طرزوں میں جو تفاوت تھا اور زمانہ نے ہر طرز کی جیسی کچھ قدر دانی کی ان سب باتوں سے کون واقف نہیں؛ یہ سب ہمارے ملک کے اختلافِ طبائع کی روشن نظیریں ہیں۔ اس لحاظ سے

+ یادگارِ غالب

ہماری رائے میں انیسیوں اور دبیریوں کے دو حریف گروہ ایک نازیبا بلکہ شرمناک جنگ و جدل میں مبتلا ہو کر ... فاش غلطی کر رہے ہیں۔ انیسیے مرزا دبیر کو اس وجہ سے نہیں مانتے کہ اُن کے خیال میں مرزا صاحب صفائیِ کلام۔ حُسن بیان۔ روزمرہ لطفِ محاورہ۔ اور روانیِ زبان کے کوچوں سے نابلد تھے، اور دبیریوں کے دلوں میں میر انیس کی اس سبب سے عظمت نہیں کہ اُن کے گمان میں میر صاحب شوکتِ الفاظ۔ بلند پروازی۔ تازگیِ مضامین۔ جدّت طرازی۔ اور بندیہ مضامین سے قطعاً محروم نظر آتے ہیں۔ مگر بامعانِ نظر دیکھا جائے تو ایسے قادر الکلام اور یکتائے عصر بزرگوں کی شان میں، جنھوں نے مرثیہ گوئی بلکہ فصاحت و بلاغت کے پیکرِ بے جان میں ایک نئی روح پھونک دی ہو، یہ خیال نہ صرف سوءِ ادب ہے، بلکہ خود جواہرِ سخن کی ناقدردانی، اور اپنی سخن فہمی اور جوہر شناسی کا خون کرنا ہے۔ گویا انیسیوں کے نزدیک ایجادِ مضامین اور نازک خیالی، جس نے ظہوری و عرفی کو اقلیمِ بلاغت کا تاجدار بنا دیا، اور جو مرزا صاحب کے خصوصیاتِ کلام میں سے ہے کوئی قابلِ قدر چیز نہیں؛ اور دبیریوں کے خیال میں صفائیِ کلام۔ اور لطفِ زبان جن میں میر صاحب یکتا اور لاجواب تھے، معمولی بات ہے۔ حقیقت میں متعصّب طبیعتیں جو طرفداری کا جامہ پہن لیتی ہیں اُنکی نگاہوں میں اپنے مخالف کے محاسن بھی عیب بنکر جلوہ گر ہوتے ہیں ؎

ہنر بچشمِ عداوت بزرگتر عیبے است ۔ گل است سعدی و در چشمِ دشمنان خار است

یہ صحیح ہے کہ دونوں کے اکثر کلام کا طرز جُدا جُدا تھا، لیکن ہر انداز اپنی اپنی جگہ پر دلپذیر اور قابلِ قدر و تحسین ہے؛ اسی لیے منصف مزاج لوگ جو کمال کے قدردان اور حُسنِ کلام کے جوہر شناس ہیں، ہر رنگ کو عزت کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں۔

دونوں صاحبوں کے یکساں باکمال ہونے کی زندہ دلیل

اگر اپنے اپنے مقام پر ان دونوں کے کلام میں کوئی خاص دلربائی اور دلکشی نہ ہوتی تو یقیناً ایک کا فروغ دوسرے کی ناموری کو دبا دیتا، اور آج شہرت کے آسمان پر صرف میر انیس یا فقط مرزا دبیر کا نیرِ کمال درخشاں نظر آتا۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ ایک کا دوسرے کی شہرت کو بالکل نیست و نابود کر دینا تو الگ رہا، آجتک ملک یہ ہی فیصلہ نہ کرسکا کہ ان دونوں میں فضلیت کا سہرہ کس کے سر باندھا جائے۔ اگر ان دونوں میں کسی کی شہرت عارضی اور بلا سبب ہوتی تو بہت جلد فنا ہو جاتی۔ اکثر لوگ اپنے اپنے زمانوں میں چند روزہ عارضی ناموری حاصل کر لیتے ہیں، مگر چونکہ اُن کے کلام میں کوئی خاص دلاویزی نہیں ہوتی، اسلیے بہت جلد اُن کے کلام بلکہ ناموں پر بھی گمنامی کے پردے پڑ جاتے ہیں؛ مثلاً "سعدی کے زمانے میں اُسکے اکثر ہمعصر امامی ہروی کو اُس پر ترجیح دیتے تھے مگر بہت عرصہ نہ گذرا کہ سعدی کا نام اور اُس کا کلام اطرافِ عالم میں منتشر ہو گیا اور امامی کا کلام صرف تذکروں میں باقی رہ گیا[۶]،، اسی طرح میر انیس کے زمانے میں علاوہ مرزا دبیر کے اور بھی اکثر جلیل القدر مداحانِ اہلبیتؑ میر صاحب کے معاصر تھے منجملہ اُن کے ایک صاحب میر مداری تھے، جن کی شہرت اور ناموری کا اس سے بڑھکر اور کیا ثبوت ہوگا کہ اُن کی نسبت خود میر صاحب فرماتے تھے "جب ہم نے لکھنؤ میں مرثیہ پڑھنا شروع کیا تو اُسوقت دو صاحب اس فن کے لکھنؤ میں نامی و گرامی تھے ایک تو میر مداری جو باڑہ میں رہتے تھے، دوسرے مرزا سلامت علی دبیر مرحوم[+]" لیکن آج باہر کے لوگ تو درکنار لکھنؤ میں بھی کوئی میر مداری سے واقف نہیں، اور نہ کہیں اُن کا کلام نظر آتا ہے۔ اسی طرح اور بھی چند حضرات کا نام لیا جاتا ہے جو اُسوقت

[۶] یادگار غالب، [+] واقعات انیس صفحہ ۲۷،

نامی وگرامی اور مقبولِ خاص و عام ہوگئے، مگر آج اُن کو کوئی بھی نہیں جانتا اور میر انیس کے ساتھ ساتھ فقط مرزا دبیر ہی کا نام زبانوں پر جاری ہے۔

مرزا صاحب نے مضمون آفرینی اور موشگافیوں کا جو رنگ اختیار کیا تھا، یہ طرز بجائے خود ایسا دقیق اور سنگلاخ تھا کہ اُسکو ایسی خوبی کے ساتھ طے کرجانا اُنہیں کے زورِ قلم کا کام تھا؛ یہی وجہ ہے کہ وہی اس طرز کے موجد ہوئے، اُنہیں کے دم سے اُس نے نشو و نما پایا، اور نہیں کے ساتھ اُسکا خاتمہ ہوگیا۔ع۔ خلعتے بود کہ برقامتِ او دوختہ شد

میر صاحب نے جس رنگ کو پسند فرمایا وہ مذاقِ عام کے مطابق تھا، اس لیے مذاقِ عام نے جیسی چاہیے اُس کی سرپرستی کی؛ اس کے خلاف مرزا صاحب کا اکثر طرزِ سخن خاص پسند تھا؛ بظاہر سمجھ میں آتا ہے کہ اُن کے قدر دانوں کا گروہ مختصر ہونا چاہیے کیونکہ خواص کی جماعت ہمیشہ محدود و مختصر ہوتی ہے، لیکن یہ اُنکے کلام کا حیرت انگیز اعجاز تھا کہ اُس نے مذاقِ عام کے خلاف ہوکر بھی تمام دلوں پر اپنا سکّہ بٹھالیا، اور اپنے بیشمار قدر دان پیدا کرکے رفتہ رفتہ اتنا عروج حاصل کرلیا کہ آج مرزا صاحب کا نام بھی شہرت کے آسمان پر میر صاحب کے پہلو بہ پہلو چمک رہا ہے، اور اُنکے معاندین بھی اُن سے اکتسابِ فیوض پر مجبور ہوئے۔ اگر بغور دیکھا جائے تو اُنکے معتقدین کی جماعت میر صاحب کے ہواخواہوں سے شمار میں افزوں ہے، اور اس جماعت میں کثرت سے وہ اربابِ فضل وکمال ہیں جو بجائے خود اُستادِ زمانہ اور مختلف کتبِ منقولات و معقولات کے مصنّف و مؤلّف ہیں۔ پس ہر اُستاد کا یکساں طور پر ہر دلعزیز ہونا ظاہر کرتا ہے کہ ملک میں دونوں طرز مقبول ہوئے، اور یہ اُسوقت تک نہیں ہوسکتا جب تک کہ کلام میں کوئی خاص دلفریبی نہو۔

مرزا صاحب کا طرزِ خاص

دونوں صاحبوں کے ہاں ہر قسم کا کلام موجود ہے

لیکن اگر اس سے بھی قطعِ نظر کرلی جائے تو ہر ایک طرز اور ہر ایک قسم کا کلام دونوں صاحبوں کے مرثیوں میں بافراط موجود ہے۔ جس سادگیِ زبان اور لطفِ روزمرّہ کے انیسیے شائق ہیں، اگر تلاش کی نگاہوں سے دیکھیں تو یہ جواہرِ بے بہا مرزا دبیر کے کلام میں بھی بکثرت موجود ہیں؛ چنانچہ مختلف موقعوں پر ہم اس کی بہت سی مثالیں درج کرینگے۔ دبیریئے اگر غور سے جستجو کریں تو مضامین کے انبار میر انیس کے خرمنِ سخن میں بھی پا سکتے ہیں۔ "میر تقی، کی قدر لوگ اس لیے نہیں کرتے کہ اُس نے متعدد ضخیم دیوان چھوڑے ہیں؛ بلکہ صرف اس کے منتخب اشعار نے جو تعداد میں نہایت قلیل ہیں اسکو تمام ریختہ گو شاعروں کا سرتاج بنا دیا ہے۔+" تو کیا انیسیوں اور دبیریوں کو مرزا دبیر اور میر انیس کے مرثیوں میں اپنی اپنی پسند کا اتنا منتخب کلام بھی نہ مل سکیگا کہ اُسکو دیکھ کر دونوں کی اُستادی اور فضل و کمال کا تھوڑا بہت اعتقاد اُنکے دلوں میں پیدا ہو جائے، اور یہ حالت باقی نہ رہے کہ ایک کی مجلس میں دوسرے فریق کے لوگ شرکت کرنا جرمِ عظیم خیال کرتے ہیں، اور اگر کبھی اتفاقاً شریک بھی ہو جاتے ہیں تو خاموش بُت بنے بیٹھے رہتے ہیں۔ یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ باکمال شاعروں کا دلکش اور جادو اثر کلام اُن کے دلوں میں گھر نہیں کرلیتا، کیونکہ کسی شئے کی خوبی اور نفاست موافق و مخالف سب کو اپنا شیدا بنا لیتی ہے؛ موسیقی کے فرحت بخش نغموں سے توجہ نہ کرنے والے بھی حظ اُٹھاتے ہیں، اور پھولوں کی جانفزا نکہت صحنِ چمن سے مُنہ پھیر کر گذرنے والوں کے دماغ کو بھی معطر کر دیتی ہے؛ لیکن جوشِ عصبیّت دلوں پر مُہرِ انکار اور زبانوں پر قفلِ

انیسیوں اور دبیریوں کا شرمناک تعصب

+ یادگارِ غالب مولوی حالی صفحہ ۱۰۶

خموشی لگا دیتا ہی۔ فلاسفہ کا قول ہی کہ ہر شے اپنی مختلف کیفیتوں میں خوبصورتی اور بدصورتی کا ایک عالم رکھتی ہی، پس انسان وہی ہی کہ جس پیرائے میں خوبصورتی جلوہ دکھائے اُس سے کیفیت اُٹھائے۔

موازنۂ انیس و دبیر اور اسکے مولف کا تعصب

ان دنوں مولوی شبلی صاحب نے ایک کتاب موازنۂ انیس و دبیر کے نام سے لکھی ہے۔ مولوی صاحب کے باکمال اور دقیق النظر مورخ ہونے کا ایک حدتک ہم کو بھی اقرار ہی، لیکن افسوس ہی کہ اُنھوں نے مرزا دبیر کی مخالفت کے جوش میں اُن کے عدیم النظیر کمالات کو گھٹانے میں کوشش کا کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا؛ بلکہ بعض مقامات پر حق پسندی اور انصاف سے جو محاکمہ کرنے والوں کا فرض ہے، چشم پوشی کرکے اُن کی خوبیوں کو غلط بیانی کے تاریک پردے میں چھپانے کی بھی کوشش کی گئی ہی۔ بعض مقامات پر فرضی اور بے بنیاد اور غلط الزامات لگائے ہیں، بعض جگہ غلط شعر لکھ کر اور بعض جگہ چند اشعار یا بند حذف کرکے اعتراض قائم کردیا ہی، بعض موقعوں پر دوسروں کے اشعار اُن کی جانب منسوب کرکے اعتراض کیا ہے، چنانچہ ہم نے ان سب باتوں کو مختلف موقعوں پر اچھی طرح ظاہر کردیا ہے۔ مرزا دبیر کے ہواخواہ تو کیا کوئی انصاف پسند انسان اُن کی دلشکن تحریر کو ٹھنڈے دل سے دیکھ نہیں سکتا، اور ناممکن ہی کہ کوئی بے لاگ شخص جو کسی صاحب کی طرفداری میں ہمہ تن محو نہ ہو اُسکو بغیر دل پر چوٹ کھائے پڑھ سکے۔ میر صاحب کے باکمال ہونے کا اعتقاد شاید میری برابر لائق مؤلف کو نہ ہوگا، مگر میں اسقدر بیدرد نہیں ہوں کہ مرزا صاحب جیسے یگانۂ عصر بزرگ کی اُن لاجواب مضمون آفرینیوں کی طرف سے آنکھ بند کرلوں جنھوں نے آج دنیائے سخن میں اپنی شہرت کا ڈنکہ بجا رکھا ہی۔

موازنہ میں دبیر کو کس طرز پر پیش کرنا چاہیے تھا

میر انیس نے اپنے عام پسند انداز میں پورا کمال حاصل کر لیا تھا، اس لیے وہ اپنے طرز میں یکتا سمجھے جاتے ہیں۔ پس بہتر تھا کہ لائق مؤلف اُن کے محاسنِ سخن پر قلم فرسائی کرنے ہی پر اقتصار کرتے، اور اُن کے کلام کے وہ جواہر سِلک کے سامنے پیش کرتے جو ایک فصیح و بلیغ شاعر کے واسطے مایۂ ناز، اور سخن فہموں کے لیے باعثِ انبساط ہو سکتے ہیں؛ ایسی حالت میں اُن کی تالیف کو ہر شخص دلچسپی اور عزت کی نگاہوں سے دیکھتا، اور نہ صرف انیسیوں بلکہ منصف مزاج دبیریوں کے لیے بھی باعثِ مسرت ہوتی؛ لیکن اسکے ساتھ ہی بلاضرورت مرزا صاحب کے فرضی اور اتہامی معائب کا بیان کر کے اُنھوں نے اپنی بیش بہا کتاب کو نہ صرف دبیریوں بلکہ مہذب اور شائستہ انیسیوں میں بھی ہر دل عزیز ہونے سے محروم رکھا جس کا سب سے زیادہ ہم کو افسوس ہے۔

موازنہ کی غیر ہر دلعزیزی

یہ امر کہ لائق مؤلف کو میر صاحب کے کلام سے خاص اُنس ہو کسی طرح ناموزوں نہیں سمجھا جا سکتا، لیکن ساتھ ہی یہ خیال کہ وہ مرزا صاحب کے کلام کو قابلِ قدر خیال نہ کریں، ضرور قابلِ گرفت ہے، جس کے معنی یہ ہو سکتے ہیں کہ وہ دبیریوں کو جن میں بڑے بڑے فاضل اور یگانۂ عصر بزرگ شامل ہیں، نافہم اور غیر سخن سنج سمجھے ہوئے ہیں۔

میر صاحب پر مؤلف کے اعتراضات

سب سے زیادہ تعجب خیز یہ امر ہے کہ قابل مؤلف نے جہاں میر صاحب کی بیجا مدح سرائی حد سے زیادہ کی ہے، وہیں باایں‌ہمہ حُسنِ اعتقاد اُن پر سرقے کے الزام بھی بکثرت لگائے ہیں، اور بہت سی چھوٹی چھوٹی غلطیاں اُنکے نفیس کلام میں نکالی ہیں؛ اگرچہ ہم اپنے اعتقاد میں جو مؤلف سے بہت زیادہ ہے، میر صاحب کو ان الزامات سے پاک سمجھتے ہیں، لیکن اُنکے خیال کے مطابق اگر خدانخواستہ وہ غلطیاں اُنکے کلام

ہیں مان لی جائیں تو اُن کا عظیم الشان رتبہ ایک مبتدی شاعر سے بھی گھٹ جاتا ہے؛ حالانکہ ایسا نہیں۔ چنانچہ میں نے اس کتاب میں مختصراً اُن اعتراضات کا بھی جواب دیا ہے جو مؤلف نے نہایت بیدردی سے میر صاحب جیسے باکمال پر لگائے ہیں؛ اور میرے معزز دوست سید افضل حسین صاحب ثابت لکھنوی نے اپنی کتاب حیاتِ دبیر میں اُن کی شرح و بسط کے ساتھ تردید کی ہے۔ میر صاحب نکاتِ شاعری کو ایسا بہ سمجھتے تھے کہ کم شاعر سمجھ سکتے ہیں، خصوصاً اُن کے روزمرے اور محاورے پر اعتراض کرنا تو نہایت ہی مضحکہ انگیز خیال ہے؛ اُن کی بلکہ اُن کے گھرانے کی زبان اردوے معلّٰی کے لحاظ سے تمام لکھنؤ میں سند تھی، اور اُنکے ہر لفظ اور ہر محاورہ کے آگے سب کو سر جھکانا پڑتا ہے۔ لیکن قابل مولف معترض ہیں کہ میر صاحب نے اس مصرع میں ع۔ کمتی نہیں پانی کی سلامت رہیں عباسؑ۔ لفظ کمتی جو استعمال کیا ہے وہ انفار اَور اراذل کی زبان ہے، حالانکہ معتبر ذرائع سے معلوم ہوا کہ یہ لفظ محلاتِ شاہی میں بولا جاتا تھا؛ گو اراذل بھی استعمال کرتے ہوں مگر میر صاحب نے ایک خاتونِ معظم کی زبان سے محلاتِ شاہی کا لفظ استعمال کیا ہے۔ مبتذل و رسوقیانہ الفاظ وہی ہیں جو فقط اراذل میں بولے جاتے ہوں اور خواص میں مستعمل نہوں، لیکن جو الفاظ خواص کے محاورے میں مروّج ہوں اور اُن کی تقلید سے اراذل بھی بولتے ہوں، وہ ہرگز اراذل کے الفاظ نہیں سمجھے جائیں گے، اس لیے اُن کا استعمال یقیناً جائز اَور روا ہے؛ بلکہ مولانا حالی نے تو اس دائرہ کو اور زیادہ وسیع کر دیا ہے۔ اُن کی رائے ہے کہ "جو محاورے یا الفاظ صرف عوام النّاس کی زبان پر جاری ہیں اور خواص اُنکو کبھی نہیں بولتے اُن کو بھی استعمال کرنا چاہیے ورنہ زبان کا دائرہ نہایت تنگ

مبتذل الفاظ کا معیار

ہوجائیگا۔ اور لٹریچر کو وسعت دینا جو شاعری کا اصل مقصد ہے وہ فوت ہو جائے گا[1]
مگر مؤلف اس بارہ میں معذور سمجھے جانے کے لائق ہیں، کیونکہ اہلِ زبان کے سوا
دوسرے لوگوں کا محاورہ شناسی کے کوچوں سے نابلد ہونا جائے تعجب
نہیں۔

میر صاحب اور مرزا صاحب کی ترجیح کا مسئلہ

دیباچہ میں سب سے پہلے قابل مؤلف نے اس امر پر بہت پیچ و تاب کھایا ہے کہ
بدمذاق زمانے نے ابتک میر انیس و مرزا دبیر کی ترجیح کا مسئلہ کیوں نہ حل کر دیا، اور
ابتک کیوں یہ معاملہ غیر منفصل رہا۔ ہم اُن کو بتانا چاہتے ہیں کہ تمام ارباب کمال اور
اصحاب ذوق کا یہی سچّا عقیدہ ہے کہ یہ دونوں بزرگ اُردو شاعری میں بے مثل و لاجواب
تھے، اور ایک کو دوسرے پر ترجیح دینا محض ایک قسم کا تعصب ہے نہ واقعیت و حقیقت۔

مفتی صاحب قبلہ و کعبہ کا فیصلہ

اس بارے میں جناب مفتی میر محمد عباس صاحب قبلہ و کعبہ کا قابل قبول فیصلہ یہ ہے کہ
مرزا صاحب کا کلام دقیق و ملیح، اور میر صاحب کا کلام فصیح و شیریں ہے۔ دونوں کا
ذائقہ علیحدہ علیحدہ ہونے کی وجہ سے ایک کو دوسرے پر ترجیح نہیں دی جاسکتی، کیونکہ
بعض طبیعتیں نمک کو پسند کرتی ہیں اور بعض طبائع شیرینی پر مائل ہیں۔ ممکن ہے کہ قابل
مؤلف بھی اُس خاص طبیعت کے انسان ہوں جو محض شیرینی پر جان دیتے ہیں، لیکن یہ تو
بڑا ظلم ہے کہ وہ تمام دنیا کو بھی نمکِ سخن سے محروم رکھ کر حلاوت پسندی کا پابند
کرنا چاہتے ہیں؛ اور چاہتے ہیں کہ جو چیز اُن کو پسند ہے وہی تمام طبیعتوں کو بھی
مرغوب ہو جائے۔

دونوں صاحبوں کا قابل قدر کمال

ایک طرف تو مرزا صاحب کی یہ حیرت انگیز قابلیت ہے کہ وہ بذاتِ خود

---

[1] یادگار غالب صفحہ ۱۱۵۔

شرفِ مرثیہ گوئی حاصل کرکے میر انیس جیسے بزرگ کے مقابلے میں جنکا خاندان پشتہا پشت سے شاعر تھا، نامور ہوئے؛ اور نہ صرف نامور ہوئے بلکہ لکھنؤ بلکہ تمام ہندوستان میں اُن کی حیات میں اکثر اہلِ علم اور شعرائے باکمال مرزا صاحب کو تمام معاصرین پر فضیلت دیتے تھے، اور اُن کے نزدیک گویا مرزا صاحب سے بہتر کوئی شاعر دنیا میں نہ تھا۔ جیسا کہ خود واقعاتِ انیس سے ظاہر ہے؛[1] دوسری طرف میر صاحب کے فضل و کمال کا اعتراف کرنا چاہیے کہ مرزا صاحب جیسے نازک خیال۔ نکتہ سنج۔ ذی علم۔ اور باکمال شاعر کے مدِمقابل مانے گئے، حتیٰ کہ منصف مزاج اور سخن فہم لوگ باوجود اسقدر غور و خوض کے آجتک فیصلہ نہ کرسکے کہ دونوں میں سے ترجیح کا سہرہ کس کے سر باندھا جائے، اور نہ آئندہ کرسکیں گے۔ خود لائق مؤلف ایک حد تک ہمارے دعوے کے مؤید ہیں، چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ "مدت ہائے دراز کے غور و فکر۔ کد و کاوش۔ بحث و تکرار کے بعد بھی فیصلہ نہو سکا کہ ترجیح کا مسند نشیں کس کو کیا جائے" اس کا سبب بالکل ظاہر ہے، اور وہ یہ کہ دونوں کا اکثر طرزِ سخن جُدا تھا، اور ہر ایک بجائے خود اُستادِ کامل الفن تھا؛ لیکن وہ اس کی وجہ قوم کی بدمذاقی قرار دیتے ہیں جس سے ہم متفق نہیں، کیونکہ جب سے میر انیس اور مرزا دبیر نے مرثیہ گوئی کے کوچے میں قدم رکھا اُس زمانے سے ابتک کچھ کم سو برس کا زمانہ گذر گیا ہوگا، پس سمجھ میں نہیں آتا کہ اس طویل زمانے تک ذی علم مؤلف کے سوا تمام اربابِ کمال بدمذاق اور نافہم تھے، حالانکہ یہ وہ دور تھا کہ جس میں ایسے ایسے علما۔ فضلا۔ نکتہ سنج اور دقیقہ رس بزرگ گذر گئے ہیں جن کی ذات پر دنیا آجتک ناز کرتی ہے اور اب زمانہ باوجود گردشِ لیل و نہار اُن کا مثل پیدا

---

[1] دیکھو نوٹ واقعاتِ انیس صفحہ ۲۱

فضلائے عصر کے اقوال

نہیں کرسکتا۔ مثلاً افضل الفضلا مولوی حامد حسین صاحب مرحوم نے جب اُن کا یہ شعر سُنا، ؎

طے ہر قدم پہ ایک مہینہ کی راہ ہی ۔۔۔ رویت ہلال نعل کی اسپر گواہ ہی

تو فرمایا یہ مضمون تو فارسی میں بھی نہیں دیکھا گیا۔ سُنا گیا ہی کہ منشی امیر مینائی مرحوم۔ مولوی عبد الحی مرحوم۔ مولوی فیض الحسن مرحوم۔ مولوی غلام حسنین صاحب کنتوری۔ مولوی علی حسن صاحب جائسی وغیرہم سب یہی کہتے تھے کہ دونوں آفتاب ہیں ایک کو دوسرے پر ترجیح نہیں دی جاسکتی۔ منشی مظفر علیخاں اسیر نے ایک سوال کے جواب میں فرمایا کہ دونوں اُستاد ہیں۔ شاعر عدیم المثال منشی سمٰعیل حسین منیر شکوہ آبادی، جن کے فضل و کمال کا شہرہ تمام ہند میں پھیلا ہوا ہے، اور جو مرثیہ گوئی میں مرزا صاحب مرحوم کے شاگرد تھے، اُن کی نسبت فرماتے ہیں ؎

عطا کی مرثیہ میں اُس کی اصلاح	کہ جس کی بزم ہی خورشید مصباح
مسیحائے سخن اعجاز گستر	دبیر پاک دیں۔ مقبول داور

مرزا غالب کی رائے

منجملہ اُن بدقسمت بدمذاقوں کے جو ترجیح کا فیصلہ نہ کرسکے مرزا غالب بھی تھے جنکی رائے مولوی حالی یادگار غالب میں اس طرح لکھتے ہیں "اُن کا (مرزا غالب) قول تھا کہ ہندوستان میں انیس اور دبیر جیسا مرثیہ گو نہ ہوا ہی نہ آیندہ ہوگا" مولانا آزاد

مولوی آزاد صاحب کی رائے

تذکرہ آب حیات میں لکھتے ہیں "اسی اعتبار سے کہہ سکتے ہیں کہ میر انیس اور مرزا دبیر خاتمہ شعرائے اُردو کا ہیں" ان اقوال سے معلوم ہوا کہ مرزا غالب جو شعرا متاخرین میں نہایت ممتاز شاعر، اور بے مثال سخن فہم اور نکتہ سنج سمجھے جاتے ہیں، اور

† معراج المضامین صفحہ ۔ ‡ آب حیات صفحہ ۵ ۔

مولوی آزاد جو حُسنِ کلام کے بہت بڑے جوہر شناس تھے، اور دیگر یگانۂ دہر اور یکتائے عصر بزرگوار جن کا ذکر اوپر کیا گیا، یہ سب بھی ترجیح کا فیصلہ نہ کر سکے، بلکہ مرزا دبیر کو میر انیس کا ہم پایہ اور حریفِ مقابل تسلیم کرتے تھے۔ اسکے مقابل میں مولوی شبلی صاحب کا ایک دوسرا فقرہ ملاحظہ ہو "بد مذاقی کی نوبت یہانتک پہونچی کہ وہ (میر انیس) اور مرزا دبیر حریفِ مقابل قرار دیئے گئے"۔ چونکہ مرزا غالب کا مقتدر شعرا میں شمار ہوتا ہے اس لیے اُن کی عظمت کے لحاظ سے مؤلف کو اُن کا نام بد مذاقوں کی فہرست میں سرے پر درج کرنا چاہیے۔ مگر ہم کو اُن لوگوں کے فیصلے پر اتفاقِ کلّی ہے اور ہمارا اعتقاد ہے کہ ان منصف مزاج لوگوں کی شان سے بعید تھا کہ بلا وجہ کسی شخص کو بزمِ ترجیح کا مسند نشین بنا دیتے۔ مولوی آزاد صاحب تذکرۂ آبحیات میں انیسیوں اور دبیریوں کا ایک مناظرہ لکھتے ہیں جس میں دونوں فریق اپنے اپنے اُستادوں کی فضیلت میں دلائل پیش کرتے ہیں۔ مناظرے کے خاتمے پر مولانا آزاد نے رائے دی ہے، وہ لکھتے ہیں "غرض جھگڑالو دعویداروں کو کوئی تقریر خاموش نہ کر سکتی تھی البتہ مجبوری دونوں کے گلے تھکا کر آوازیں بند کر دیتی تھی، اور منصفی بیچ میں آ کر کہتی تھی دونوں اچھے دونوں اچھے، کبھی کہتی وہ آفتاب ہیں یہ ماہ، اور کبھی کہتی یہ آفتاب ہیں وہ ماہ"[1]

خیال بندی اور مضمون آفرینی کے علاوہ جہاں جہاں مرزا صاحب نے زبان کی سلاست۔ صفائی اور روزمرہ پر توجہ فرمائی ہے، وہاں بھی ثابت کر دیا ہے کہ ہم اس رنگ میں بھی کسی سے کم نہیں، چنانچہ ہم اس قسم کا کلام اپنے موقعے پر درج کرینگے۔

[1] آب حیات صفحہ ۵۰۰

انیسیوں اور دبیریوں کا مناظرہ اور مولانا آزاد کی رائے

مرزا صاحب کا صاف و سلیس کلام

مرزا صاحب کو میر صاحب کے رنگ پر چلنے سے جو لوگ عاجز سمجھتے ہیں یہ اُن کی ناواقفی ہے۔ اُن کے خوانِ سخن پر ہر رنگ کا کھانا موجود ہے؛ مضمون آفرینی پسند کرنیوالے مضامین کی بلند پروازی۔ اور الفاظ کی شان و شکوہ دیکھ کر وجد کرتے ہیں، اور سلاست زبان، صفائیِ بیان۔ اور لطفِ محاورہ کے شیدا صاف اور سلیس اشعار سے لطف اُٹھاتے ہیں۔ خصوصاً درد انگیز اور پُرتاثیر مضامین لکھنے میں تو اُن کا جواب نہیں، اس بارے میں ہم مولانا آزاد کی شہادت پیش کرتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ "مرزا صاحب نے طبیعت بھی ایسی گداز پائی تھی جو اس فن کے لئے نہایت موزوں اور مناسب تھی۔ مرزا صاحب شوکتِ الفاظ۔ مضامین کی آمد۔ اُس میں جا بجا غم انگیز اشارے۔ درد خیز کنائے۔ الم ناک اور دلگداز انداز۔ جو مرثیے کی اصلی غرض ہے ان وصفوں میں بادشاہ تھے"[لہ] سچ یہ ہے کہ وہ کون چیز ہے جو اس ہمہ داں اور قادر الکلام شاعر کے کلام میں نہیں مل سکتی، صرف چشمِ بینا اور نظرِ انصاف کی ضرورت ہے۔

ہم کو قابل مؤلف سے کوئی مناظرہ منظور نہیں ہے، مگر اس ناچیز تالیف سے ہمارا یہ منشا ہے کہ ناظرین پر عموماً اور مؤلف پر خصوصاً اس بات کو اچھی طرح ثابت کر دیں کہ مرزا صاحب کی شان اُس سے بہت زیادہ بلند ہے جسقدر وہ خیال کرتے ہیں یا اُن کی تالیف سے عیاں ہے۔ اسلیے ہم تہذیب کے ساتھ اُن اعتراضات کو بھی رفع کرینگے جو لائق مؤلف کے زعم میں مرزا صاحب کے کلام پر وارد ہوتے ہیں، لیکن اس بات کی کوشش کرینگے کہ ہماری منصفانہ تحریر میں مناظرے کی جھلک نظر نہ آجائے۔

ہر قسم مضامین مرزا صاحب کا حصہ ہے

اس کتاب کے تالیف کرنے کی علت غائی

لہ آبحیات صفحہ ۵۰۲

اس کے علاوہ ہر عنوان کے متعلق مرزا صاحب کے کلام سے اُسی قسم کے دلاویز نمونے دکھائیں گے جیسے مؤلف نے میر انیس کے فصیح کلام سے انتخاب کر کے پیش کیے ہیں؛ اور جن پر اُنکے تعصب نے قصداً گمنامی کا پردہ ڈال دیا تھا؛ مگر اس امر میں ہم اُنکو کچھ الزام نہیں دیتے، کیونکہ جوشِ مخالفت میں اپنے مخالف کے محاسن سے چشم پوشی کر لینا عوام کی طبیعت کا ایک لازمی خاصہ ہے اور ذی علم مؤلف کا بھی باہمہ دعوے ثقاہت اس کلیہ سے مستثنیٰ ہونا قانونِ قدرت کے خلاف ہے؛ گو یہ ضرور کہا جائے گا کہ اُن کا باین علم و فضل عاداتِ عوام کی اس شد و مد کے ساتھ پیروی کرنا کسی قدر تعجب خیز امر ہے۔ مگر از بسکہ ہماری طبیعت میں کسی طرح کا تعصّب یا بیجا طرفداری کا لگاؤ نہیں، اس لیے ہماری نگاہ میر صاحب اور مرزا صاحب کے محاسنِ کلام پر یکساں پڑتی ہے

ع۔ متاعِ نیک ہر دکاں کہ باشد۔

اب ہم ذی علم مؤلف کی بیش بہا تالیف پر سلسلہ وار مفصّل و مشرّح ریویو لکھتے ہیں، اور امید کرتے ہیں کہ منصف مزاج ناظرین چشم توجہ سے ملاحظہ فرمائینگے۔
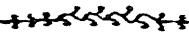
تمہید کے بعد لائق مؤلف نے اُردو مرثیہ گوئی کا مختصر تذکرہ کیا ہے، جسپر ہم کو کچھ ریمارک کرنا نہیں ہے بلکہ بجائے اسکے ہم اُن کی محنت اور کاوش کی داد دینا ضروری سمجھتے ہیں۔ اسکے بعد اُنھوں نے صفحہ ۱۶ میں میر انیس کے متعلق جو باتیں لکھنے کی ہیں وہ درج کی ہیں جسپر ہم کچھ خامہ فرسائی کرتے ہیں۔

نمبر (۲) میں وہ لکھتے ہیں کہ میر صاحب نے شاعری میراث میں پائی تھی۔ ہمکو اس سے بالکل اتفاق ہے۔ حقیقت میں وہ خاندانی شاعر تھے اور اُن کا یہ دعوے کہ ع

میر صاحب [illegible]

مرزا صاحب نے خود شاعری شروع کی

پانچویں پشت ہی شیکسپیئر کی مداحی ہیں۔ رستی پر مبنی ہے۔ وہ جس گھر میں پیدا ہوئے شعرا
قدیم کا خاندان تھا[1]، جس میں ہر وقت اُٹھتے بیٹھتے شعر و سخن کے چرچے اور سخن سنجیوں
کے مشغلے رہا کرتے تھے، خود اُن کے والد اور دونوں بھائی ممتاز شعرا میں شمار کیے جاتے
ہیں۔ اس کے برخلاف مرزا صاحب کے والد نہ شاعر تھے نہ ذاکر، اگرچہ اُن کے خاندان
میں بھی شاعری قدیم الایام سے ہے، چنانچہ اُنکے اجداد میں مرزا اہلی[2] شیرازی صاحب
مثنوی سحر حلال۔ اور ملا محمد رفیع شیرازی متخلص بہ رفیع اور مرزا ہاشم[3] شیرازی۔ شعرا
مسلم الثبوت میں سے گزرے ہیں، لیکن اُنکے زمانہ مشق سخن میں خاندان میں کوئی شاعر
نہ تھا کہ باہمی بحث و تکرار سے طبیعت کو جولانی ہو یا کسی قسم کی مدد مل سکے؛ شفیق اُستاد
سے بھی یار لوگوں نے بگڑوا دی تھی؛ پس اُنھوں نے خود اپنی استعدادِ علمی۔ قوتِ دماغی
ذاتی زورِ طبیعت اور غواصیِ فکر سے شاعری کے کوچہ میں قدم رکھا؛ تمام دنیا کو اپنی
فصیح البیانی کا گرویدہ بنا لیا، اور میر صاحب جیسے خاندانی شاعر کے مقابل میں مضمون
آفریں شعرا کی بزم میں صدر نشینی کی عزت حاصل کر لی۔ یہ وہ حیرت انگیز کامیابی ہے
جس کی ہر منصف مزاج شخص کو قدر کرنی چاہیے اور جو حقیقت میں مرزا صاحب کی

---

[1] میر صاحب کے بزرگ ہرات سے آکر پرانی دلی میں آباد ہوئے۔ امامی موسوی کی اولاد میں تھے جو ایک پرانے شاعر باکمال اور فاضل تبحر تھے۔ اس سے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ اُنکے خاندان میں شاعری کسقدر پُرانے زمانے سے میراث چلی آتی ہے ۱۲

[2] مرزا اہلی شیرازی فصحا ر نامدار اور بلغا ر روزگار سے تھے۔ اور شعر گوئی میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔ مثنوی سحر حلال کہ ذو بحرین در ذو قافیتین مع التجنیس ہے ان کی طبع زاد ہے مشہور و معروف ہے۔ فقیہ ربانی شہید ثالث قاضی سید نور اللہ صاحب شوستری نور اللہ مرقدہ نے کتاب مجالس المومنین کی بارہویں مجلس میں جہاں اکابر شعرا ر عجم کا ذکر کیا ہے ان کا ذکر خیر نہایت صفت و ثنا کے ساتھ لکھا ہے۔ دیوان غزلیات بھی انسے یادگار ہے ۱۲

[3] مرزا ہاشم شیرازی فن انشا پردازی اور حسن تحریر مراسلات و مکاتبات منشیانہ میں وحید عصر۔ منشی کامل۔ اور نثار ماہر تھے ۱۲

شاعری کی خصوصیات میں داخل ہونے کے قابل ہی۔

نمبر (۴)، میں قابل مولف ایک نہایت مہتم بالشان مسئلے کی جانب توجہ فرماتے ہیں اور حقیقت میں یہ مسئلہ ہی بھی قابل غور؛ اس مسئلے میں اس امر کی تحقیق کی گئی ہی کہ اوّل اوّل سب سے پہلے کس نے میدانِ شاعری میں قدم رکھا اور یہ کہ خاص خاص مرثیے جو دونوں کے ہاں قریب المعنیٰ پائے جاتے ہیں، اوّل کس نے کہے اور کس نے اُن کا جواب لکھا۔

دونوں مسئلوں کے متعلق وہ لکھتے ہیں کہ باوجود بہت سی جد و جہد کے مجکو کچھ کامیابی نہیں ہوئی. لیکن امرِ اوّل کا حل کرنا جسقدر دشوار ہی اُسی قدر غیر ضروری بھی ہی؛ دونوں صاحبوں کے محاسنِ کلام سے بحث کرنا آپ کا اصل مقصود ہی خواہ کسی نے شاعری پہلے شروع کی ہو۔ اس مسئلے کے حل کرنے میں ہم کو بھی کچھ کامیابی نہیں ہوئی اور کوئی قابل اطمینان دفعہ نظر سے نہیں گذرا۔ البتہ فسانۂ عجائب کے دیکھنے سے اسقدر معلوم ہوتا ہی کہ اس میں جہاں لکھنؤ کے دیگر کاملینِ فن کا ذکر ہی، وہیں شعرا نامی کی فہرست میں علاوہ میاں دلگیر میر ضمیر۔ میر خلیق۔ مرزا فصیح وغیرہم کے مرزا دبیر کا نام بھی ملتا ہی[1] لیکن میر انیس کا ذکر نہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ فسانہ عجائب کی تصنیف کیوقت، یعنی نصیر الدین حیدر بادشاہ کے زمانے میں مرزا صاحب اپنی شاعری کو اُس پایہ پر پہونچا چکے تھے کہ میاں دلگیر میر ضمیر۔ میر خلیق وغیرہم نامور مرثیہ گویوں کے ساتھ اُن کا نام بھی لیا گیا، غالباً اُس زمانے میں میر انیس کی شاعری ابتدائی حالت میں ہوگی جسکو قابلِ ذکر نہ سمجھا گیا۔

[1] فسانہ عجائب کی اصل عبارت یہ ہی۔ مرثیہ گو بے نظیر میاں دلگیر۔ صاف باطن نیک ضمیر۔ خلیق۔ فصیح۔ مرد مسکین۔ مکروہات زمانہ سے کبھی افسردہ نہ دیکھا۔ اللہ کے کرم سے ناظم خوب دبیر مرغوب سکندر طالع بصورت گدا۔ بارِ احسان اہلِ دول کا نہ اُٹھایا۔ عرصۂ قلیل میں مرثیہ سلام کا دیوان کثیر فرمایا۔

اور اُس کی یہی وجہ ہوسکتی ہے کہ اُنھوں نے شاید مرزا دبیر کے بعد اسکو شروع کیا ہوگا۔ اگر اس میں یہ شبہ کیا جائے کہ میر صاحب فسانۂ عجائب کی تصنیف کیوقت فیض آباد میں رہا کرتے تھے اس وجہ سے شعرائے لکھنؤ کے ضمن میں اُن کا تذکرہ نہ کیا گیا ہوگا تو یہ امر بھی خلافِ واقعہ ہے۔ کیونکہ جب نواب آصف[1] الدولہ نے لکھنؤ کو مستقل دار السلطنت قرار دیا تو میر ضاحک اور میر حسن کی آمد و رفت لکھنؤ میں جاری ہوچکی تھی[2] اور میر خلیق اور میر انیس تو اکثر وہاں رہتے تھے اور مجلسوں میں مرثیے پڑھا کرتے تھے۔ علاوہ بریں اگر یہ سبب ہوتا تو میر خلیق کا کیوں ذکر کیا جاتا۔ اس واقعہ سے خیال کیا جاسکتا ہے کہ شاید مرزا صاحب نے پہلے میدانِ شاعری میں قدم رکھا ہو۔ اسکے سوا اور کوئی واقعہ ہم کو نہیں ملا، اسی سے جو چاہو قیاس کرلو۔ اگر ہم کو کوئی ایسا ہی چھوٹا سا واقعہ میر صاحب کے متعلق بھی مل جاتا تو اُسکو بھی یہاں درج کر دیتے۔ واللہ اعلم بحقیقۃ الحال۔

ہم مضمون مرثیے اول کس نے لکھے اور کس نے جواب لکھا

اب دوسرا مسئلہ یہ باقی رہ گیا کہ خاص خاص مرثیے جو دونوں کے ہاں قریب المعنیٰ ہیں اوّل کس نے کہے۔ اس مسئلے نے حقیقت میں مؤلف کو بڑی مشکل میں ڈال دیا، کیونکہ واقعات سے تو اس کا حل ہونا ممکن نہ تھا اس لئے قیاسی باتوں کی بنا پر مجبوراً جودتِ طبع کے کرشمے دکھانے پڑے ہیں۔ اس مسئلے کے متعلق سب سے پہلے جو خیال اُنکے دماغ میں آیا وہی اصلی اور سچا خیال تھا "یعنی یہ کہ زمانے کی تقدیم و تاخیر کے نہ معلوم ہونے سے یہ نہیں متعیّن ہوتا کہ ایجاد کا فخر کس کو ہے"

---

[1] سال تخت نشینی نواب آصف الدولہ ۱۱۸۹ھ ہجری۔ سال تخت نشینی نصیر الدین حیدر جنکے زمانے میں فسانۂ عجائب ختم ہوا ۱۲۴۳ھ ہجری۔ [2] واقعات انیس صفحہ ۲۲۔

اگر وہ اسی فقرہ پر اپنی گہری تحقیقات کو ختم کر دیتے تو بہتر تھا، مگر اُنھوں نے عجب طرح کا مغالطہ دیکر اس مسئلے کے تصفیے کے واسطے نئی ترکیب سے استدلال کیا ہی جس کو دیکھ کر بے اختیار ہنسی آتی ہی۔ اُن کے استدلال کی بنیاد دو دلیلوں پر ہی۔

معترض کی پہلی دلیل
میر صاحب تعریض
کرتے ہیں

(۱) یہ کہ میر صاحب جابجا اس بات کا اشارہ کرتے ہیں کہ اُنکے حریف اُنکے کلام سے فائدہ اُٹھاتے ہیں مثلاً ؎

لگا رہا ہوں مضامینِ نو کے پھر انبار ✤ خبر کرو مرے خرمن کے خوشہ چینوں کو ـــ وغیرہ وغیرہ

پس اُن کا قیاس ہی کہ مرزا صاحب ہی اُنکے خرمنِ کلام سے خوشہ چینی کرتے ہونگے ورنہ میر صاحب ہرگز ایسی خلافِ واقعہ بات نہ لکھتے۔

معترض کی دوسری دلیل
مرزا صاحب جواب
نہیں دیتے

(۲) یہ کہ ان چوٹوں کو سُنکر مرزا صاحب برابر کا جواب نہیں دیتے، یعنی یہ نہیں کہتے کہ میں نہیں، میرا حریف سرقہ کرتا ہی، بلکہ صرف تبرّی کرتے ہیں کہ میں اس جُرم کا مرتکب نہیں۔ مثلاً ؎

شکرِ خدا کہ سرقے کی حد سے بعید ہوں ✤ ہر مرثیے میں موجدِ طرزِ جدید ہوں

اس سے وہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ میر انیس، مرزا صاحب کے مقابلے کا قصد نہیں کرتے تھے ورنہ مرزا صاحب ضرور اسکا اشارہ کرتے۔ لیکن بنظرِ تعمق دیکھا جاے تو دونوں قیاس نہایت ضعیف ہیں اور کسی طرح اس قابل نہیں کہ ان کی بنا پر مرزا صاحب جیسے یکتاے عصر پر ایسا غلط الزام لگایا جائے۔

پہلی دلیل کا جواب۔
میر صاحب کسی کی
طرف اشارہ نہیں

(۱) امر اوّل کا جواب یہ ہی کہ اگر میر صاحب نے جابجا اس بات کا اشارہ کیا ہی کہ حریف اُنکے کلام سے فائدہ اُٹھاتے ہیں، تو ممکن ہی کہ یہ ایک شاعرانہ تعلّی ہو؛ ہر شاعر اکثر اوقات ایسے اشعار لکھا کرتا ہی کہ میرے مضامین دوسرے شعرا کو نفع پہونچاتے ہیں؛ اور یہ شعرا کا

ایک طرزِ کلام ہی جسکو اکثر اوقات واقعیت سے کچھ تعلق نہیں ہوا کرتا۔ مثلاً محمد فضل سرخوش لکھتے ہیں ؎

پست فطرت گر برد مضمونِ ما رسوا شود　　دزد را خصمے بتراز گوہر شہوار نیست

غنی کشمیری

ز مضموں دزدیِ یاراں نمی باشد غمے ما را　　چناں بستیم مضموں را کہ نتواند کسے بُردن

شوکت

تصرّف چوں کند دشمن بآبِ رنگِ اشعارم　　نگاریں گردد انگشتے کہ بگذارد بگفتارم

غرض اردو فارسی کے کسی شاعر کا کلام ایسی تعلّیوں سے خالی نظر نہیں آتا۔ ہر شاعر کے ہاں ایسے دس بیس اشعار ملتے ہیں۔ ممکن ہی کہ میر صاحب نے بھی اسی قسم کی شاعرانہ تعلّی سے کام لیا ہو، اور حقیقت میں اُن کا کسی خاص شخص کی طرف اشارہ نہو۔ ہمارے قول کی تائید مصنّف واقعاتِ انیس بھی کرتے ہیں، چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ "مرثیہ یا سلاموں میں کہیں کہیں شاعرانہ شوخی یا سخن گسترانہ اشارات پائے جاتے ہیں اور یہ معمولی طریقِ شعرا ہی درصل کسی جانب روئے سخن نہیں" [۱]

دوسری دلیل کا جواب۔ مرزا صاحب چوٹوں کا جواب دیتے ہیں۔

(۲) رہی آپ کی دوسری دلیل، یعنی ان چوٹوں کو سنکر مرزا صاحب برابر کا جواب نہیں دیتے، یعنی یہ نہیں کہتے کہ میں نہیں میرا حریف سرقہ کرتا ہے۔ اسکا جواب یہ ہی کہ آپ کا یہ قول صحیح نہیں کہ مرزا صاحب برابر کا جواب نہیں دیتے، بلکہ وہ بھی میر صاحب کی طرح جابجا فخریہ شعروں میں اس بات کا اشارہ کرتے ہیں کہ حریف اُنکے کلام سے فائدہ اُٹھاتے ہیں۔ مثلاً

[۱] واقعات انیس صفحہ ۸۰

رباعی

ہی سُست کہ چُست پر کلام اپنا ہے　　لاریب خطا پوش امام اپنا ہے

جو بند کے بند قطع کر لیتے ہیں　　اُن مرثیہ گویوں کو سلام اپنا ہے[1]

دیگر

سرقہ مضموں کا زبوں ہوتا ہے　　یعنی عِلم نظم نگوں ہوتا ہے

پر اُن میں جو مندرج ہی حالِ شہدا　　اس سے مرے مرثیوں کا خوں ہوتا ہے[2]

ایک موقع پر اس مرثیہ میں ع - اے دبدبۂ نظم دو عالم کو ہلادے - فرماتے ہیں ؎

ہیں وقف ہمیشہ مرے الفاظ و معانی　　ہاں قلزمِ شیریں کا سبھی پیتے ہیں پانی[3]

یہ شعر اُس مرثیہ - اے دبدبۂ نظم الخ - میں ہی جسکو ذی علم مؤلف نے اوّل سے آخر تک بغور دیکھ کر آخرِ کتاب میں اعتراضات کے تیروں کا آماجگاہ بنایا ہی، بلکہ خود اس شعر کو بھی اعتراضات کے عنوان میں صفحہ ۲۴۴ پر نقل کیا ہی. اسلیئے وہ یہ تو عذر نہیں کر سکتے کہ اُن کی نگاہ سے نہیں گذرا، پھر افسوس کے ساتھ سوا اسکے اور کیا کہہ سکتے ہیں کہ اس قسم کے شعر کو قصداً اچھپا ڈالا جو اس مرثیہ میں صاف موجود ہی - اور جسکو خود انھوں نے اپنی کتاب میں بھی درج کیا ہے۔

پھر مرزا صاحب ایک رباعی میں فرماتے ہیں -

شیرانِ مضامیں کو کہاں بند کروں　　گونجیں گے ڈکاریں گے جہاں بند کروں

خلاقِ مضموں کا ہی دعویٰ سب کو　　کھُل جائے حقیقت جو زباں بند کروں

لاریب توارد سے بری کوئی کہاں ہے　　افراطِ توارد ہو تو سرقے کا گماں ہے

---

[1] جلد بستم رباعیات　　[3] جلد اوّل - صفحہ ۲۱۰

جو مصرعِ موزوں مرا مشہورِ جہاں ہے　　　البتہ توارد ہو تو حیرت کا مکاں ہے

سرقہ ہی کہ تالیف ہی مضمونِ کہن کی
یہ سب ہے زکوٰۃ اپنے زرِ نقدِ سخن کی

گو دزدِ سخن سرقہ کرے میرے بیاں سے　　　ملکِ سخنِ تازہ میں لوں تیغِ زباں سے

شاکر ہو دبیر آلِ نبیؐ کی ہے یہ تائید　　　تازہ ہی تمامی سخن اور تازہ ہے تمہید
دزدانِ مضامیں پہ نہ کر منع کی تاکید　　　تو مجتہدِ نظم ہے فرض اُن پہ ہے تقلید

ہر باغ ہے گلچیں مرے مضموں کے چمن کا　　　ہر بحر ہے قطرہ مرے دریائے سخن کا[۴]

یہ سب اشعار مرزا صاحب کی نہیں مطبوعہ جلدوں میں موجود ہیں۔ نہیں معلوم لائق مولف کی نظر سے کس طرح رہ گئے باوجودیکہ تمام جلدیں اُن کی نظر سے گذری ہیں۔ مؤلف کی اس قسم کی بہت سی یک طرفہ کارروائیوں کی یہ سب سے پہلی مثال ہی اس کے علاوہ اور نظیریں وقتاً فوقتاً آگے نظر سے گذریں گی۔

مؤلف کی بے جا کارروائیوں کی پہلی مثال

مولف نے جو شعر مرزا صاحب کا بڑی کے بیان میں لکھا ہے اُس سے بھی ضمناً اسی قسم کا اشارہ پایا جاتا ہے جو ان شعروں میں ہی۔ یعنی خدا کا شکر ہی کہ میں تو سرقہ کی حد سے بعید ہوں لیکن میرے معاصر اُس سے قریب ہیں، اور جہاں حریف دوسروں کے مضامین سے تمتع حاصل کرتے ہیں، میں ہر مرثیے میں جدّت سے

[۴] جلد ۱۳۔ صفحہ ۱۸۸

کام لیا کرتا ہوں ۔ اب تو آپ کو معلوم ہو گیا کہ مرزا صاحب بھی برابر کا جواب دیتے ہیں ۔

میر صاحب اور مرزا صاحب دونوں میں کسی جانب سے سخن نہو گا

لیکن ہماری اب بھی وہی راے ہے کہ جس طرح میر صاحب کا روے سخن کسی طرف نہو گا اسی طرح مرزا صاحب کے اشعار میں بھی محض سخن گسترانہ اشارات معلوم ہوتے ہیں اور دراصل اُن کا بھی روے سخن کسی جانب نہو گا ۔ اور فی الحقیقت دونوں صاحبوں کی ثقاہت ۔ متانت اور تہذیب کا یہی مقتضیٰ بھی ہے کہ وہ ایسی عامیانہ چوٹوں سے بری رہیں ۔ جو لوگ اُن کے اس قسم کے اشعار میں کوئی اور معنی پہنانے کی کوشش کرتے ہیں وہ گویا ان اخلاقِ مجسّم بزرگوں کی شان و وقار سے اجنبی ہیں ۔

ایک دوسرے کا جواب لکھنا ضروری نہیں

رہا ایک دوسرے کا جواب لکھنا، یہ تو شعرا کیا ہی کرتے ہیں، لیکن یہ خیال کہ ہمیشہ مرزا صاحب ہی جواب لکھا کرتے تھے دعوے بے دلیل اور صریح ہٹ دھرمی ہے ۔ ہماری راے میں جس زمانے میں ان نامور شاعروں کی معرکہ آرائیوں کا بازار گرم تھا، پُرزور طبیعتیں جولانیوں پر آئی ہوئی تھیں، اُسوقت جب ان میں سے کسی کا جدید مرثیہ نکلتا ہو گا، خاص شہرت ہو جاتی ہو گی؛ پس لامحالہ دوسرے صاحب کسی دوسری مجلس میں اُس کا جواب پڑھکر حریف کے رنگ کو پھیکا کر کے اپنے لئے داد و تحسین کا خلعت حاصل کرتے ہونگے ۔ یہ امر نہ مرزا صاحب کیواسطے خاص ہو گا نہ میر صاحب کے لئے، بلکہ دونوں صاحب ایک دوسرے کا جواب لکھ کر اپنی جادو بیانی کا ثبوت دیتے ہونگے ۔ یہ بات نہ قابل اعتراض ہے نہ کسی شاعر کی سُبکی کا باعث ۔ ہمارا خیال تو یہ ہے کہ کسی شاعر کے طرزِ ادا سے بچ کر،

ایک ہی مضمون کو، کوئی لطیف اضافہ یا تبدیلی کر کے، دوسرے انداز اور نئے پیرایہ میں فصاحت و بلاغت کے ساتھ اس طرح ادا کرنا کہ مضمون کی خوبی یا متانت یا وضاحت زیادہ ہو جائے، نہایت مشکل اور شعرا کے زورِ طبیعت اور قادرالکلامی کا ثبوت ہے، اور ایسا شاعر درحقیقت اُس مضمون کو پہلے شاعر سے چھین لیتا ہے پس اگر دونوں صاحب ایسا کرتے ہوں تو کوئی ہرج، یا قابلِ گرفت بات نہیں ہے۔ اُردو فارسی کے تمام اگلے شاعروں نے ایسا کیا ہے، جس کی مثالیں بخوفِ طوالت قلم انداز کی جاتی ہیں۔

میر انیس کی شاعری کی خصوصیات

اس میں شک نہیں کہ میر انیس مرحوم اعلی اللہ مقامہ بھی سرتاجِ شعراے ہند تھے، لیکن قابل مؤلف نے اس عنوان میں جو خصوصیات اُن کیواسطے ثابت کی ہیں انہیں ہم اُنکے جلیل القدر معاصر مرزا دبیر مرحوم کو بھی شریک سمجھتے ہیں، کیونکہ ان دونوں یکتاے عصر شاعروں کے کلام میں فصاحت و بلاغت کے ایسے بے بہا نمونے پائے جاتے ہیں جو دوسرے شعرا کے کلام میں ڈھونڈے بھی نہیں ملتے

آگے چل کر مؤلف لکھتے ہیں کہ " علماے ادب نے فصاحت کی یہ تعریف کی ہی کہ (۱) لفظ میں جو حروف آئیں اُن میں تنافر نہ ہو۔ الفاظ نامانوس (غیر مانوس) نہوں۔ قواعدِ صرفی کے خلاف نہو،[۱] (۲) الفاظ سادگی، آسانی، کثیر الاستعمالی کے ساتھ ہی

---

[۱] اس مقام پر قابل مؤلف سے اس قدر عرض کرنا ضروری ہی کہ آپ فصاحت کی جو تعریف لکھتے ہیں یہ خود فصاحت کی نہیں، بلکہ کلمۂ فصیح کی تعریف ہی۔ فصاحت کا اطلاق تو کلمہ۔ کلام متکلم تینوں پر ہوتا ہے پس آپ کو اس طرح لکھنا چاہیے تھا کہ علماے علم ادب نے کلمۂ فصیح کی یہ تعریف کی ہی کہ اس میں جو حروف آئیں ان میں تنافر نہو الخ۔ چنانچہ آپ کی تسلّی کے واسطے کتب علم معانی سے چند اقوال بطور سند لکھتے ہیں جن سے کلمۂ فصیح اور فصاحت کی تعریف علیحدہ علیحدہ معلوم ہوجائے گی۔ کلمۂ فصیح کی تعریف۔ مطول میں ہی۔ فالفصاحۃ فی المفرد خلوصہ من تنافر الحروف۔ والغرابۃ۔ ومخالفۃ القیاس اللغوی۔ فصاحت کی تعریف یہ ہی۔ راغب مفردات میں لکھتے ہیں۔ الفصح خلوص الشی مما یشوبہ۔ یعنی کسی چیز کا اُس کی آمیزش سے خالی ہونا یقال فصح الرجل اذا جادت لغتہٗ دروس البلاغت میں ہی۔ الفصاحۃ فی اللغۃ تنبئی عن البیان والظہور۔ یقال افصح الصبی فی منطقہ اذا بان وظہر کلامہ۔ ان تصریحات کے بعد آپ خود غور کرلیں کہ جو تعریف آپ نے لکھی ہی وہ خود فصاحت کی ہی یا کلمۂ فصیح کی۔

مبتذل اور سوقی بھی نہوں۔ ابتذال کا معیار مذاقِ صحیح کے سوا اور کوئی چیز نہیں۔ مذاقِ صحیح خود بتا دیتا ہی کہ یہ لفظ بتذل۔ پست۔ اور سوقیانہ ہی" پھر وہ فصاحتِ کلام کی تعریف لکھتے ہیں کہ "جب ایسے الفاظ مل جائیں جو سادہ۔ آسان۔ کثیر الاستعمال اور غیر مبتذل ہوں تو یہ بھی ضرور ہی کہ جن الفاظ کے ساتھ وہ ترکیب میں آئیں اُنکی ساخت ہیئت۔ نشست۔ سبکی اور گرانی کے ساتھ اُن کو خاص تناسبُ توازن ہو، ورنہ فصاحت قائم نہ رہیگی۔ جب کسی مصرعہ (مصرع) یا شعر کے تمام الفاظ میں ایک خاص قسم کا تناسبُ توازن، اور توافق پایا جاتا ہی، اس کے ساتھ وہ تمام الفاظ بجائے خود بھی فصیح ہوتے ہیں تو وہ پورا مصرعہ یا شعر فصیح کہا جاتا ہی اور یہی چیز ہی جسکو بندش کی صفائی، نشست کی خوبی، ترکیب کی دلاویزی، برجستگی، سلاست اور روانی سے تعبیر کرتے ہیں"

فصاحتِ کلام

اسی بحث میں اُنھوں نے لکھا ہی کہ "مرزا صاحب کا یہ مشہور مصرع ہی۔ ع۔ زیرِ قدمِ والدہ فردوسِ بریں ہی۔ اس کے تمام الفاظ بجائے خود فصیح ہیں لیکن انکے باہم ترکیب دینے سے جو مصرعہ پیدا ہوا ہی وہ بھدّا اور گراں ہی" نہیں معلوم یہ مصرع مرزا صاحب کی کس جلد میں مؤلف کی نظر سے گذرا ہی ان بیسوں جلدوں میں تو اسکا پتہ نہیں ملتا، اکثر قلمی مرثیے نظر سے گذرے اُن میں بھی نہیں دیکھا گیا، پھر مؤلف نے کس یقین پر اسکو مرزا صاحب کا مصرع خیال کر لیا، یہ مصرع ہرگز مرزا صاحب کا نہیں بلکہ حکیم قدیر شاگرد مرزا صاحب کا ہی۔

اس کے بعد لائق مؤلف نے میر صاحب اور مرزا صاحب کے کلام سے مشترک مضامین کے چند اشعار انتخاب کیے ہیں اور دونوں کے تقابل کے بعد ظاہر کیا ہی کہ میر صاحب ہر موقع پر فصیح سے فصیح الفاظ ڈھونڈ کر لائے ہیں اور مرزا صاحب کے ہاں غریب اور ثقیل الفاظ استعمال کیے گئے ہیں۔ اس موقع پر بجائے اسکے کہ ہم اسکا کچھ

جواب لکھیں، موازنہ کے متعلق ایک مفصل مضمون لکھتے ہیں جو ناظرین کے واسطے غالباً دلچسپ اور مفید ہوگا اور اس سے مؤلف کے موازنہ کی حقیقت بھی بخوبی واضح اور عیاں ہو جائے گی۔

شاعر کا تمام کلام یکساں نہیں ہوتا

یہ ایک مسلم الثبوت بات ہے کہ کسی شاعر کا تمام کلام بالکل ایک ہی سانچہ میں ڈھلا ہوا نہیں ہوتا۔ گو یہ ضرور ہے کہ اُس کا مذاق اور طرزِ سخن اُسکے ہر صنفِ کلام میں جلوہ دکھاتا رہتا ہے۔ مگر اس میں شک نہیں کہ وہ جلوہ کہیں کم اور کہیں زیادہ ہوتا ہے۔

کلام میں مختلف مدارج ہونے کی وجوہ

پہلی وجہ

شعرا کے کلام میں مختلف مدارج ہونے کے چند وجوہ ہیں۔ **اوّل** یہ کہ بعض کلام ابتداے مشق کا ہوتا ہے، بعض شباب کے زمانے کا، اور بعض آخرِ عمر کا منجھا ہوا؛ جسقدر مشقِ سخن عمر اور تجربہ کے لحاظ سے رفتہ رفتہ بڑہتی جاتی ہے، اُسیقدر کلام کا رتبہ بھی درجہ بدرجہ رفیع اور بلند ہوتا جاتا ہے؛ اور بتدریج طرزِ ادا میں خوش اسلوبی اور زبان کی صفائی میں ترقی پیدا ہوتی جاتی ہے۔ مگر یہ کلام باہم ایسا خلط ملط ہو جاتا ہے کہ ہر زمانے کا کلام علیحدہ علیحدہ چھانٹنا ناممکن ہے۔ اسی وجہ سے اساتذہ کے دواوین میں غایت درجہ کا استوار، اور حد سے زیادہ کمزور کلام نظر آتا ہے۔

دوسری وجہ

دوسرے یہ کہ موقع اور محل کے لحاظ سے بھی کلام میں مختلف مدارج پیدا ہو جاتے ہیں۔ مثلاً کوئی کلام اپنی طبیعت کی اُپج اور اُمنگ سے جوش اور ولولہ کی حالت میں بیساختہ زبان سے نکل جاتا ہے، کوئی کسی کی فرمائش، اصرار اور دباؤ سے لکھنا پڑتا ہے، ظاہر ہے کہ جو کلام بغیر اقتضاے طبعی اور ولولۂ باطنی کے لکھا جائیگا پُر زور اور پُراثر نہوگا؛ کسی مضمون سے مصنّف کو خاص طور پر لگاؤ اور تعلق ہوتا ہے، اور کوئی مضمون محض اپنی شاعری کی تکمیل کی غرض سے طبیعت کو مجبور کر کے لکھتا ہے، دونوں کلاموں میں آمد اور

آورد کا فرق بیّن طور پر نظر آجاتا ہے۔ بعض[1] اشعار کسی خاص ضرورت یا فرمائش سے عجلت میں کہنے پڑتے ہیں جن پر معمولی غور و فکر سے کام نہیں لیا جا سکتا۔ بعض[2] فرمائشی کلام ایسا ہوتا ہے کہ کسی دوست نے جن خاص رعایتوں کی فرمایش کر دی ہے وہ مجبوراً برتنا پڑتی ہیں۔ یہ وجوہ ہیں جو ہر شاعر کے کلام میں مختلف مدارج پیدا کر دیتے ہیں۔

بڑے شعرا کے کلام میں چند غیر فصیح الفاظ ہونا کوئی تعجب نہیں

رہا کسی کلام میں چند غیر فصیح اور معمولی الفاظ کا موجود ہونا، اس کی نسبت ہمارا خیال ہے اور مؤلف بھی ہمارے ہمخیال ہیں کہ جس قدر قادر الکلام اور پُرگو شعرا گذرے ہیں اُن سب کے کلام میں اکثر غیر فصیح اور معمولی الفاظ بھی پائے جاتے ہیں۔ چنانچہ ایک موقع پر مؤلف نے لکھا ہے کہ ”فردوسی سے بڑھکر کون قادر الکلام ہوگا، متاخرین میں قاآنی کا جواب نہیں، ان دونوں کے کلام میں اس قسم کی بے اعتدالیاں نہایت کثرت سے موجود ہیں“[3]۔ میر انیس کو بھی اسی قادر الکلامی اور پُرگوئی کے عذر پر مؤلف اس جرم سے بری رکھنا چاہتے ہیں۔ پس اسی کلیہ کے مطابق ہم کہہ سکتے ہیں کہ

مرزا صاحب کی پُرگوئی

مرزا دبیر تمام شعرا سے زیادہ پُرگو اور تمام اہلِ کمال کے مرجع تھے۔ ہزاروں دوست ہزاروں شاگرد طرح طرح کی فرمائشیں کرتے رہتے تھے۔ عام مرثیہ گو صرف چند حالات کے مرثیے لکھتے ہیں، انھوں نے حمد۔ نعت۔ منقبت۔ مدحِ مجتہدین، مدحِ شاہِ اودھ، حالاتِ حضرت حبیبؓ ابن مظاہر۔ جنابِ زہیر قین۔ چہاردہ معصومین علیہم السلام۔ مختار، ولادتِ حضرت امام حسینؑ، حضرت عباسؑ حضرت علی اکبرؑ وغیرہ میں بکثرت مرثیے لکھے؛ کربلا میں قبلِ غدر مجتہدین شہید

[3] موازنہ صفحہ ۲۳۰۔

ہوئے اس حال میں ایک مرثیہ تصنیف کر دیا، ایک شخص نے تعزیہ داری پر اعتراض کیا اس کے جواب میں ایک مرثیہ لکھ ڈالا۔ سیکڑوں روایتیں اور حدیثیں مرثیوں میں نظم کیں، سیکڑوں مرثیے دوسرے لوگوں کا تخلص ڈال کر اُن کو دیدیئے۔ یہ بیس مطبوعہ جلدیں کلام کا دسواں حصہ بھی نہیں، انکے علاوہ اور بھی بہت سے ایسے مرثیے اُستادی معظمی مرزا اوج صاحب قبلہ مدظلہ اور بعض تلامذہ کے پاس موجود ہیں جنکا ایک مصرع بھی نہیں چھپا۔ پس جس شخص نے اُردو شعرا میں سب سے زیادہ الفاظ استعمال کیے ہوں اور جسکو مختلف واقعات اور گوناگوں حالات بیان کرنے کی ضرورت سے ہر قسم اور ہر طرز اور ہر درجے کے الفاظ کہنے پڑے ہوں اُسکے کلام کے لاکھوں اشعار میں اگر چند غیر فصیح الفاظ بھی پائے جاتے ہوں تو جائے تعجب نہیں۔ ایسی معمولی فروگذاشتوں سے دنیا میں کسی عربی۔ فارسی اُردو کے شاعر کا کلام پاک نہیں ہوسکتا، اور نہ ایسی جزوی فروگذاشتوں سے کسی کی اُستادی میں فرق آسکتا ہے۔ ؎

گر سخن اعجاز باشد بے بلند و پست نیست		در ید بیضا ہمہ انگشتہا یکدست نیست

مرزا صاحب کے عیب

البتہ ہم کو اسپر فخر ہے کہ وہ الفاظ جنسے کسی شاعر کی کم علمی عیاں ہوتی ہے۔ مرزا صاحب کے یہاں کسی معمولی عیب ہیں کو تو کیا قابل مؤلف کو بھی نظر نہیں آئے ورنہ وہ اُنکو ضرور پیش کرتے۔ مرزا صاحب علوم و فنون متداولہ کے ایک عالم متبحر، اور نہایت وسیع الخیال شاعر تھے؛ چنانچہ خود اُن کے کلام سے عالمانہ اوصاف اور شاعرانہ قابلیتوں کا اظہار ہوتا ہے۔

اب ہم دو کلاموں میں موازنہ کرنے کی مشکلات کا بیان، اور اس امر میں جو جو غلطیاں

پہلی مشکل

اور نا انصافیاں ہونا ممکن ہیں اُن کی تشریح کرتے ہیں - یہ امر ظاہر ہے کہ مرثیہ گویوں کی تصنیف مثل مثنوی کے کوئی ایک نسخہ نہیں ہے، وہی معمولی مضامین ہیں جنکو مختلف مقامات پر دوسرے الفاظ اور دوسرے رنگ میں بیان کیا گیا ہے۔ ایک ہی مضمون کی بندش بعض مقامات پر اعلیٰ پایہ کی ہوتی ہے، اور بعض مقامات پر معمولی درجے کی۔ پس دو شاعروں میں سے جسکا چاہیں ہم مضمون کلام اعلیٰ اور ادنیٰ پایہ کا بہت تھوڑی توجہ سے ملسکتا ہے بلکہ ایک ہی شاعر کے ہمضمون کلام کو جو مختلف اوقات میں لکھا گیا ہے مقابلہ کیا جائے تو ضرور فضیلت کا تاج اُن میں سے ایک ہی کے سر پر رکھا جائیگا چہ جائیکہ دوسرے شاعر کے کلام سے موازنہ کیا جائے۔ مثلاً یہ دونوں مصرعے میر صاحب ہی کے ہیں، ع۔ تھا بلبلِ حق گو کہ چہکتا تھا چمن میں۔ اور۔ ع۔ بلبل چہک رہا تھا ریاضِ رسولؐ میں حالانکہ دونوں مصرعوں کی بندش اور برجستگی میں زمین آسمان کا فرق ہے۔

دوسری مشکل

اس کے علاوہ ایک شاعر کا کوئی مضمون ایجاد کرنا اور دوسرے کا اُسکو ترقی دیدینا بھی منصفانہ موازنہ کرنے میں ہارج ہوتا ہے۔ یہ امر خصوصیاتِ شاعری میں سے ہے کہ شاعر مضمون سے مضمون اور بات سے بات نکالتا ہے؛ پس جب کوئی شاعر کسی پہلے مضمون کو دیکھکر کوئی بات نکالتا، اور اُسکو دوسرے پیرایہ میں ظاہر کرتا ہے، اُس کی یہی کوشش ہوتی ہے کہ اِس مضمون کو ایسے بلیغ اسلوب سے ادا کروں کہ اگلی بندش سے سبقت لیجائے اور نقشِ ثانی نقشِ اوّل سے اعلیٰ اور ارفع ہو۔ اگر اس کوشش میں کامیابی ہوئی تو بہتر، ورنہ اُس خیال ہی کو چھوڑ دیتا ہے اور خود موازنہ کر لیتا ہے کہ پہلا کلام کس پایہ کا تھا اور جو میں کہہ رہا ہوں وہ کس حیثیت کا ہے، پھر مدِ مقابل سے دیدہ و دانستہ کیوں کمزور رہوں۔ یہ تو دوسرے مقابلے کا ذکر ہے، خود ہی طبیعت چاہتی ہے کہ جس بات کو میں ایکبار لکھ چکا ہوں اُسکو دوسرے

وقت لکھوں تو پہلے سے کچھ برتری ضرور ہو۔ پس جب کوئی دو مضمون کلام نظر سے گذریں، اور اُن کا زمانۂ تصنیف نہ معلوم ہو تو ممکن ہی کہ اُن دونوں میں جو ادنیٰ قسم کا ہی اُسکا مصنف مضمون کا موجد ہو، اور جو اعلیٰ درجہ کا ہی اُسکے مصنف نے پہلے شاعر کے کلام کو دیکھ کر ترقی دیدی ہو، پھر ایسے کلام کے موازنہ میں وجہِ ترجیح کمزور ہو جاتی ہی؛ اسلیے کہ اگر دوسرا مصنف مضمون کے ترقی دینے کا شرف رکھتا ہی تو پہلے کو ایجاد کا فخر حاصل ہی کیونکہ الفضلُ للمتقدّم۔ کہیں ایسا بھی ہوتا ہی کہ توارد ہو جاتا ہی اس میں ایک کو دوسرے ترجیح دینا البتہ ایک معقول بات ہی مگر ایسا شاذ و نادر ہوتا ہی۔ مرزا دبیر۔ اور میر انیس کے کلام میں محاکمہ کرنے کے متعلق مولانا آزاد صاحب تذکرۂ آبحیات میں بالکل بجا لکھتے ہیں کہ "ان کے کلام میں محاکمہ کرنے کا لطف جب ہے کہ ہر اُستاد کے چار چار پانچ پانچ سو مرثیے بجائے خود پڑھو اور پھر مجلسوں میں سُنکر دیکھو کہ ہر ایک کا کلام اہلِ مجلس پر کسقدر کامیاب یا ناکام رہا بے اسکے مزا نہیں"۔

پس جبکہ یہ امر ثابت ہو چکا کہ کسی شاعر کا تمام کلام ایک درجہ کا نہیں ہوتا اور نہ ہو سکتا ہے تو موازنہ کرنے والے کے ہاتھ میں اس بات کا بڑا موقع ہی کہ جسکو چاہے بڑھا دے اور جسکو چاہے گھٹا دے، خصوصاً جبکہ وہ انصاف اور حق پسندی سے کام نہ لے کیونکہ ایک شاعر کا اعلیٰ درجہ کا، اور دوسرے شاعر کا ادنیٰ درجہ کا کلام مقابل میں لے آنا کوئی بڑی لیاقت یا غور کی بات نہیں ہی؛ جیسا کہ قابل مؤلف نے اس عنوان کے آخر میں میر صاحب کے بہترین کلام، اور مرزا صاحب کے چند معمولی اشعار کا انتخاب کرکے دونوں میں مقابلہ کیا ہی۔

ایک امرِ عجیب اور بھی قابلِ غور ہی۔ مؤلف کو اس مقام (بحث فصاحت) پر اس امر کا

بیان کرنا مقصود تھا کہ ایک ہی مضمون یا مطلب کے واسطے مختلف اقسام کے الفاظ بیان کیے جائیں تو اُن میں بلحاظِ فصاحت بہت تفاوت و اختلاف ہوجاتا ہے۔ بعض الفاظ فصیح ہونگے۔ بعض فصیح تر۔ بعض فصیح ترین۔ پس ان مدارجِ فصاحت کے اظہار کے واسطے اُن کو مختلف مدارج کے، ہمضمون اشعار لکھنے کی ضرورت تھی خواہ وہ فقط میر انیس کے ہوں، یا مرزا دبیر کے، یا دونوں کے۔ چنانچہ اسکے عمدہ اور بہتر طریقے دو تھے (۱) یہ کہ میر صاحب ہی کے کلام سے دونوں قسم (ادنیٰ اور اعلیٰ) کے ہمضمون اشعار انتخاب کر لیے جاتے، جن میں اُنھوں نے کہیں فصیح الفاظ استعمال کیے ہیں، کہیں فصیح تر، کہیں فصیح ترین (۲) یا یہ کہ ایک مقام پر میر صاحب کا اعلیٰ اور مرزا صاحب کا ادنیٰ، اور دوسرے مقام پر مرزا صاحب کا اعلیٰ اور میر صاحب کا ادنیٰ قسم کا کلام لکھ کر مدارجِ فصاحت کا اظہار کر دیا جاتا، تاکہ اُن کا مطلب بھی بخوبی پورا ہوجاتا اور کسی کو شکایت بھی باقی نہ رہتی، اور ہم کو بھی کہیں نہ کہیں اُن کی منصف مزاجی اور حق پسندی کا قائل ہوجانا پڑتا۔ مگر اُنھوں نے اسکا سب سے بُرا پہلو اختیار کیا، یعنی اس موقع پر بھی اپنی رائے میں مرزا صاحب کے ادنیٰ قسم کے اشعار تلاش کر کے اُس کے مقابلہ میں میر صاحب کے بہتر اشعار نہایت توجہ اور غور سے انتخاب کیے ہیں تاکہ مدارجِ فصاحت کا بھی اظہار ہوجائے اور مرزا صاحب کے کلام کی تنقیص سے اُن کا دل بھی تسکین پائے، اور وہ اصول کہیں ہاتھ سے نہ جانے پائے جسکو اُنھوں نے شروع سے آخر تک ہر مقام پر نصب العین رکھا ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ اُن کو تینوں قسموں کے اشعار نہیں مل سکے تو یہ بات بھی نہیں، چنانچہ ہم اُن بہتر طریقوں کی مثالیں لکھتے ہیں جن پر مؤلف نے قصداً توجہ نہیں کی۔

(۱) میرانیس کے کلام سے ادنیٰ اور اعلیٰ قسم کی مثالیں جن سے فصاحت اور فصاحت کے اختلافِ مراتب کا اندازہ ہو جاتا ہے۔

میرانیس۔ تھا بلبلِ حق گو کہ چہکتا تھا چمن میں
ایضاً بلبل چہک رہا تھا ریاضِ رسولؐ میں۔

میرانیس۔ آنکھوں میں پھرے یوں کہ نہ پُتلی کو خبر ہو
ایضاً۔ آنکھوں میں یوں پھرے کہ مژہ کو خبر نہ ہو

میرانیس۔ روباہ ہیں سب میں اسدِ حق کا ولد ہوںؑ

ایضاً

روباہ ہیں یہ میں پسرِ شیرِ خدا ہوںؑ (یا) ہشیار کہ میں شیرِ الٰہی کا پسر ہوں*

میرانیس

پے کر کے اسپ کو ہوا حضرت پہ حملہ ور حیدرؑ نے بہرِ دفعِ ضرر سر پہ لی سپر

ایضاً

مرحب ہوا علیؑ ولی پر جو حملہ ور حضرت نے اپنے فرقِ مبارک پہ لی سپر

میرانیس۔ بس اک یہی تو ہیگا وسیلہ نجات کا
ایضاً۔ رونا ہی وسیلہ ہے شفاعت کا ہماری

میرانیس۔ دیکھیں یہ ہما فرق پہ لہراتا ہے کس کے
ایضاً۔ دیکھیں یہ ہما سایہ فگن ہوتا ہے کس پر

میرانیس

سونپا ہے تمہیں میں نے دل و جانِ نبیؐ کو لیوگی بہن تم سے حسینؑ ابنِ علیؑ کو

* حا، جہارم صفحہ ۱۰۸ [illegible]

ایضاً

تم سے بڑی امید ہے زہراؑ کی جائی کو بھیا! تمھیں سے لگی بہن اپنے بھائی کو

(میر انیس)

بھیجا ہمارے واسطے خالق نے ہل اتیٰ کافی سند کیواسطے ہے لفظ قل کفا
زیبا ہمارے تن پہ ہی تشریف انمّا ہم کو کیا خدا نے سرافراز لافتا

(ایضاً)

حق نے کیا عطا یہ عطا ہل اتیٰ کسے کہتی ہی خلق بادشہ قل کفا کسے
کونین میں ملا شرف انمّا کسے حاصل ہوا ہی مرتبہ لافتا کسے

ان کے علاوہ اور بھی بہت سے ایسے ہم مضمون اشعار مل سکتے ہیں اسوقت یہی چند اشعار جو ذہن میں آئے درج کر دیئے گئے۔

(۲) میر صاحب اور میرزا صاحب کے وہ ہم مضمون اشعار جہاں میر انیس کو فوقیت ہے، یہ اشعار مؤلف نے اپنے موازنہ صفحہ ۲۲ میں درج کیے ہیں اور ہم کو تلاش کی زحمت سے بچا دیا۔ اگرچہ اس انتخاب میں ہم کو بعض اشعار کی نسبت اختلاف ہی، لیکن ہماری طبیعت میں مؤلف کی طرح نکتہ چینی کا مادّہ نہیں، اس لیے ہم ان تمام اشعار ہی میں میر صاحب کی افضلیت مانے لیتے ہیں۔

(۳) مرزا صاحب اور میر صاحب کے وہ ہم مضمون اشعار جن میں مرزا دبیر کو ترجیح حاصل ہے۔

میر انیس۔ پہونچے نہ صبا اُس کے کبھی گرد کے دنبال
مرزا دبیر۔ جولاں جو ہوا پیک صبا رہ گیا پیچھے

میرانیس۔ حق نے کیا عطا یہ عطا ہل اتی کسے
مرزا دبیر۔ حیدرؑ کو اس عطا نے شہ ہل اتی کیا

میرانیس

جس سے خدا خوشی ہو علیؑ کی وہ حرب ہے ۔ افضل عبادتِ دو جہاں سے یہ ضرب ہے

مرزا دبیر

حق نے کہا ہو حربِ علیؑ میری حرب ہے ۔ افضل عبادتِ دو جہاں سے یہ ضرب ہے

میرانیس۔ قائم ہیں دونوں پاؤں پر جبرئیل پر
مرزا دبیر۔ ہیں شیرِ حق کے پاؤں پر جبرئیل پر

میرانیس۔ آنکھوں میں پھرے یوں کہ نہ پتلی کو خبر ہو
مرزا دبیر۔ آنکھوں میں پھرے یوں کہ نہ مردم کو خبر ہو

میرانیس

زیبا ہمارے تن پہ ہو تشریفِ اَنّما ۔ ہم کو کیا خدا نے سرافرازِ لافتا

مرزا دبیر

خورشیدِ انورِ فلکِ اَنّما ہیں یہ ۔ اغیار لاف زن ہیں، شہِ لافتا ہیں یہ

میرانیس

سینے پہ مرے زانوے قاتل نہ گراں ہو ۔ خنجر کے تلے نام ترا وردِ زباں ہو

مرزا دبیر

حلق پہ تیغ رہے، سینے پہ جلاد رہے ۔ لب پہ ہو نام ترا، دل میں تری یاد رہے

اس کے بعد مؤلف نے میر صاحب کے کلامِ بلاغت نظام سے چند منتخب بند اور مختلف اشعار پیش کیے ہیں۔ اُن کی خوبی اور لطافت میں کچھ شک نہیں، لیکن اگر وہ تلاش کرتے تو مرزا صاحب کے وسیع ذخیرۂ کلام میں بھی ایسے بیشمار بند مل جاتے جنکو الفاظ کی فصاحت۔ بندش کی صفائی۔ نشست کی خوبی کا بہترین نمونہ ماننا پڑتا؛ مگر یا تو اُنھوں نے اُن کے دلکش و دلاویز کلام کی طرف سے آنکھ بند کرلی یا دیدہ و دانستہ تلاش کی زحمت گوارا نہیں کی؛ کیونکہ مرزا صاحب کا ایسا ہی دلچسپ اور فصیح کلام درج کتاب کرنا اُنکے مقصود کے خلاف تھا۔ مگر یہ جواہرِ بے بہا اُن کو نظر کیوں آتے، اُنھوں نے تو مرزا صاحب کا کلام سرسری طور پر محض اعتراضات تلاش کرنے کی نیت سے کہیں کہیں دیکھ لیا ہے۔ اگر خوش نیتی اور حسنِ اعتقاد سے دیکھتے تو اُس میں سب کچھ مل جاتا۔ بہرحال اس موقع پر ہم مرزا صاحب کے نفیس کلام سے چند بند اور مختلف اشعار بطور نمونہ درج کرتے ہیں۔

ہیبت و جلال

خیبر شکن کے لال کی آمد ہے صف شکن
سیفِ خدا کی تیغ کا سایہ ہے تیغ زن
گرتی ہے فوج فوج پہ، پڑتا ہے رن پہ رن
غلطاں کہیں قدم ہیں، کہیں سر، کہیں بدن

نے حوصلہ نہ بُغضِ امامِ مبیں رہا
اب دل میں بھاگنے کے سوا کچھ نہیں رہا

کر کیسٹ پیتروں کو بدلکر بڑھے، کہ ہاں
مرتے ہیں مرد نام پہ، نامرد بہرِ ناں
شیر و دلیرو! غازی و تازی کی لو عناں
سنبھلے ہوئے، کہ سامنے ہے ہاشمی جواں

لینا نہ موںھ پہ ڈھال کہ ہستی حباب ہے
دینا نہ آبرو کہ یہ موتی کی آب ہے

رجز امام حسینؑ

حضرت نے غافلوں سے کہا ہوشیار رہو
ہاں قاتلانِ آلِ عبا! ہوشیار رہو
کانوں میں کہہ رہی ہے قضا ہوشیار رہو
نزدیک ہے عذابِ خدا ہوشیار رہو
سیرِ جناں ہے بادۂ حبِّ حسینؑ میں
اک نشۂ حلال ہے یہ نشأتین میں

میں جان ہوں رسولؐ کی ہیں انس و جاں گواہ
مالک ہوں سب زمینوں کا ہے آسماں گواہ
مظلومیت میں ایک ہوں دونوں جہاں گواہ
ہفتم سے پانی بند ہے، آبِ رواں گواہ
جاری ہے کیا زبانوں پہ؟ یہ کس کی نہر ہے؟
مالِ یزید ہے، کہ مری ماں کا مہر ہے؟

مانا، یزید صاحبِ دولت ہے، ہم نہیں
پر وہ وہی ہے، اور شرافت میں ہم ہمیں
ہوتی ہے آسماں کے مقابل کہیں زمیں
وہ تخت کا مکیں ہے، تو ہم عرش کے مکیں
ممکن ہے زور و زر سے یہ رتبہ کسی کا ہو
چاہے جسے خدا وہ نواسا نبیؐ کا ہو

فوج اُسکے پاس بھی ہے، پہ فوجِ خدا کہاں
صاحب علم ہزار، پہ عباسؑ سا کہاں
بیٹے بہت، پہ اکبرِ گلگوں قبا کہاں
لاکھوں میں ایک ثانیِ خیر الوریٰ کہاں
بھائی یزید کا کوئی مثلِ حسنؑ بھی ہے
زینبؑ سی عابدہ کوئی اُسکی بہن بھی ہے

فرش اُسکا جبرئیل کا پر ہو، نہوئے گا
عرشِ بریں پہ اُسکا گذر ہو، نہوئے گا
سلطانِ دیں وہ بانیِ شر ہو، نہوئے گا
دنیا اگر ادھر کی اُدھر ہو، نہوئے گا

پرچے غلط سُناتے ہیں مخبر پلید کے
وحیِ خدا بھی آئی ہے گھر میں یزید کے

یہ جد و کد، یہ سعی یہ کوشش، یہ اہتمام
اس پر مٹے ہو بس، کہ مٹے پنجتنؑ کا نام
یہ صف کشی، یہ مورچہ بندی، یہ قتلِ عام
ناحق، عبث، نشان مرا قائم ہے تا قیام

حاشا کبھی جو آلِ رسولِ اممؐ مٹیں
قرآں مٹے کسی کے مٹائے تو ہم مٹیں

تلوار

جس مورچے میں لیلیِ تیغِ دو سر گئی
ہر صف میں خاک اُڑا کے ادھر سے اُدھر گئی
چنگے بھلوں کو سائے سے دیوانہ کر گئی
پر یہ نہا نہا کے لہو میں، نکھر گئی

عالم نہ پوچھو قطرہ فشانی کے حُسن کا
جوبن ٹپک رہا تھا جوانی کے حُسن کا

آگے کبھی بڑھی، کبھی پیچھے کو پھر پڑی
تجویز جو لعینوں نے کی، وہ مضر پڑی
سر پر جو لڑکھڑائی تو شانوں پہ گر پڑی
اُفتاد اُن سے پوچھیے یہ جنکے سر پڑی

اُٹھی، گری، بلند ہوئی، پست ہو گئی
پی پی کے میکشوں کا لہو مست ہو گئی

اِک دم میں برابر، اِدھر آئی اُدھر آئی
ہر سو ہوا محشر، اِدھر آئی اُدھر آئی
یاں دم لیا، واں سر، اِدھر آئی اُدھر آئی
ڈر کر صفِ لشکر، اِدھر آئی اُدھر آئی

جانے میں شبِ وصل کی ساعت نظر آئی

آئنے میں یہ عاشق کی طبیعت نظر آئی

جب باگ ہلی، آمدِ محشر نظر آئی
لشکر میں قیامت ادھر آئی اُدھر آئی
چمکا جو علم، چار طرف یہ خبر آئی
لو کاہکشاں آج زمیں پر اُتر آئی
جب ہاتھ میں تلوار کا پرتو نظر آیا
خورشید کے پنجے میں مہِ نو نظر آیا

امام حسینؑ کی فوج کا حال

سب نو عروسِ شوقِ شہادت سے ہمکنار
دنیا سے بے خبر رہِ عقبیٰ سے ہوشیار
حوروں کا اشتیاق شہادت کا انتظار
گہ مدحِ پنجتنؑ تو کبھی ذکرِ کردگار
تسبیح کا یہ ورد تھا اُن کی صفات میں
سر رشتۂ عبادتِ خالق ہی ہات میں

کہتا تھا تیغ تول کے اک صاحبِ یقیں
یہ فوج شام کی نہیں، یا آج ہم نہیں
کہتے تھے دل بڑھانے کو انصارِ شاہِ دیں
مردوں کی بس یہ بات ہے، واللہ آفریں
نیّت تو ہے بخیر، اب انجام نیک ہو
پھر موت زندگی ہے اگر نام نیک ہو

عمّامہ رکھ کے ہاتھوں پہ کرتا تھا اک دعا
یا رب بتصدّقِ آلِ پیمبرؐ کی پیاس کا
یہ صبر دے، کہ لب نہ کریں پیاس کا گلا
ہمّت وہ بخش، سر شہِ دیں پر کریں فدا
ہم ہوں، رکابِ شاہ ہو، جنّت کی سیر ہو
دنیا بخیر ہو چکی، عقبیٰ بخیر ہو

سب ماہرو تھے شاہ پہ ہالہ کیے ہوئے
مرنے پہ دل دیے ہوئے، باگیں لیے ہوئے

اور جامِ عشقِ ساقیِ کوثر پیے ہوئے ۔ لبہائے شکوہ روزِ ازل سے سیے ہوئے

آ آ کے معرکے میں برابر کھڑے ہوئے
نو لاکھ کے حضور بہتّر کھڑے ہوئے

وہ تن پہ زیبِ اسلحہ، وہ صف کشی کی شاں ۔ وہ حیدری جوان، وہ پیغمبری نشاں
وہ سامنے فرات، وہ سوکھی ہوئی زباں ۔ وہ حق کے میہمان، قضا اُن کی میہماں

شہ کے محب، حبیب رسولِ زمن کے تھے
بلبل تھے اس چمن کے تو پھول اُس چمن کے تھے

سراپا حضرت عباسؑ

واہ کیا چہرۂ پُر نور ہے، اللہ اللہ! ۔ چشمِ خورشیدِ فلک کو نہیں یارائے نگاہ
چشمِ بد دور عجب شکل ہے ماشاء اللہ ۔ واہ کیا حسن ہے، کیا نور ہے، کیا رتبہ وجاہ

سیرِ آئینۂ رخ، لطف یہ دکھلاتی ہے
اسد اللہؑ کی تصویر نظر آتی ہے

حسن وہ حسن، کہ ہیں سبطِ نبیؐ جس پہ فدا ۔ نور وہ نور، کہ غش طور پہ موسیٰؑ بھی ہوا
چہرہ وہ چہرہ، کہ ہے جس کی ثنا صلِّ علیٰ ۔ شان وہ شان، کہ یوسفؑ کو جہاں آئے حیا

قد ہے وہ قد، کہ فقط نورِ خدا ہے جس میں
قلب وہ قلب، کہ حق جلوہ نما ہے جس میں

طائرِ رنگِ رخِ فوج اُڑا جاتا ہے ۔ خونِ تن ہیبتِ آمد سے گھٹا جاتا ہے
قبضۂ تیغ بھی ہاتوں سے چھُٹا جاتا ہے ۔ خود بخود سرطرفِ خاک جُھکا جاتا ہے

عقل معدوم ہر اک صاحبِ شمشیر کی ہے

آمد آمد سوے روباہ عجب شیر کی ہے

نام نامی ہے حسینؑ ابنِ علیؑ صلِّ علےٰ | اور لقب بیوطن، و بیکس و شاہِ شہدا
مخزنِ صبر و رضا، معدنِ الطاف و عطا | مرجعِ رحمتِ حق، مبدءِ افضالِ خدا

سورۂ نور سے بھی نور دوچنداُن کا ہے
رتبہ تکبیر کے نعرے سے بلند اُن کا ہے

شرفِ کلکِ قضا، گلشنِ قدرت کی بہار | زینتِ لوح و قلم، عرشِ الٰہی کا وقار
راکبِ دوشِ نبیؐ، مہرِ نبوت کا سوار | مصحفِ ناطق، و تفسیرِ کلامِ غفّار

فخر وہ شکل، نہ کیوں چاند یہ دہ چند کرے
جس پہ یہ پیرِ فلک تاروں کو اسپند کرے

حضرت عباسؑ گھوڑے سے گرتے ہیں

گھوڑے سے گرے جب تو برادر کو پکارا | کام آیا یہ خادم یہ نمک خوار تمھارا
سنتے ہی نہ حضرت کو رہا ضبط کا یارا | بس ہاے اخی کہہ کے گریباں کیا پارا

کانپا جو بدن، حیدرؑ صفدر نے سنبھالا
غش کھا کے گرے تھے کہ جو اکبرؑ نے سنبھالا

سر پیٹتے روتے ہوئے میداں کو چلے شاہؑ | بابا کی کمر تھام کے اکبرؑ ہوئے ہمراہ
عباسؑ کا لاشہ جو نظر آگیا ناگاہ | بھائی سے بغلگیر ہوئے سرورِ ذیجاہ

کچھ کہنے نہ پائے کہ مسافر ہوئے عباسؑ
منہ دیکھتے ہی دیکھتے آخر ہوئے عباسؑ

بولے شہِ مظلوم یہ شانے کو ہلا کر
ہمراہ تھے ہم بھی، نہ توقف کیا دم بھر
اُٹھتے نہیں، کیا سو گئے عباسؑ دلاور
اللہ، یہ جلدی ہوئی اے جانِ برادر
پایا جو مکاں سرد تو نیند آگئی تم کو
ہاں شیر تھے، دریا کی ہوا بھا گئی تم کو

ڈیوڑھی پہ عَلَم غرق بخوں آیا کہ محشر
پھر تو کوئی غش تھا کوئی حیراں کوئی ششدر
ماتم کا اشارہ کیا پنجے نے لچک کر
ڈیوڑھی پہ حرم پیٹتے تھے، لونڈیاں باہر
سردار بھی بیہوش تھا، اور اہلِ حرم بھی
منہ ڈھانپ کے روتا تھا پھریرے سے عَلَم بھی

مناجات امام حسینؑ

جب ہوئی ظہر تلک قتل سپاہِ شبیرؑ
تھی فقط روحِ علیؑ پشت و پناہِ شبیرؑ
غیرِ اصغرؑ نہ رہا نورِ نگاہِ شبیرؑ
حق سے کہتے تھے کہ تو رہیو گواہِ شبیرؑ
سر فدا کر کے شریکِ شہدا ہوتا ہوں
آج میں تیری امانت سے ادا ہوتا ہوں

مطلع ثانی

ظہر تک سب رفقا شاہ کے مقتول ہوئے
یک قلم صرفِ خزاں فاطمہؑ کے پھول ہوئے
تھے وہ مقبولِ خدا اور بھی مقبول ہوئے
رو بہ قبلہ شہِ دیں شکر میں مشغول ہوئے
رو کے کہتے تھے کہ اکبرؑ نہیں عباسؑ نہیں
اب امانت کوئی خالق کی مرے پاس نہیں

اب نہ قاسمؑ مرا باقی ہے نہ اکبرؑ باقی
بھانجے ہیں نہ بھتیجے، نہ برادر باقی
نہ علمدار سلامت ہے، نہ لشکر باقی
اب فقط سر مرا باقی ہے اور اصغرؑ باقی

قتل اصغرؑ ہو، مرا سر بھی جُدا ہو جائے
اس امانت سے بھی شبّیرؑ ادا ہو جائے

تو شہنشاہ شہنشاہوں کا ہے بارِ خدا
خاطرِ عاشقِ جانباز ہے اہستہ جُدا
ہیں برابر تری درگاہ میں سب شاہ و گدا
اے خوشا حال، کہ مجھ سے ہو ترا عشق ادا

حلق پر تیغ رہے، سینے پہ جلّاد رہے
لب پہ ہو نام ترا، دل میں تری یاد رہے

قاصدِ حضرت صغراؑ کا کربلا میں پہونچنا

روانہ نہرِ لبن کو جو شیر خوار ہوا
تڑپ کے ہاتوں پہ حضرت سے ہمکنار ہوا
زباں دکھانے پہ گردن سے تیر پار ہوا
خزاں ہوا جو وہ گُل تو گلے کا ہار ہوا

اِدھر تو شاہ کو یہ صدمہ جگر پہونچا
اُدھر مدینے سے صُغراؑ کا نامہ بر پہونچا

لہو میں غرق کھڑے تھے کمر جُھکائے ہوئے
لہو بھرا ہوا دامن اُسے اُڑھائے ہوئے
پسر کی ننّی سی میّت گلے لگائے ہوئے
کفن کی فکر میں خیمے کو مُنہ پھرائے ہوئے

یہ حال دیکھ کے قاصد کی آس ٹوٹ گئی
ہوا یہ رعشہ کہ فوراً مہار چھوٹ گئی

اُتر کے ناقے سے آداب وہ بجا لایا
وہ نوحہ کرتا ہوا اور متّصل آیا
مگر حسینؑ تھے خاموش کچھ نہ فرمایا
نگاہِ یاس سے مُنہ دیکھ کر یہ چلّایا

قرار دو مجھے میں بے قرار ہوتا ہوں
حسینؑ جانِ نکلے تم پہ نثار ہوتا ہوں

کہو بقیۂ اولادِ مرتضٰیؑ ہو تم
غریبِ کوفہ و مظلومِ کربلا ہو تم ؟

امیرِ لشکرِ اللہ و مصطفٰیؐ ہو تم
بتاؤ قاسمِؑ ناشاد کے چچا ہو تم ؟

جواب دو پدرِ نامرادِ اکبرؑ ہو
ہیں صدقے، حضرتِ عباسؑ کے برادر ہو

بہن ہے آپ کی زینبؑ سکینہؑ دختر ہے
حضور کا کوئی ننّا سا لال اصغرؑ ہے

وطن میں بھی کوئی بیٹی علیل و ششدر ہے
ہراول آپ کے لشکر کا حرِّؑ صفدر ہے

زہیرؑ اور حبیبؑ آپ کے مصاحب ہیں
جنابِ عونؑ و محمدؑ کے ماموں صاحب ہیں

حسینؑ بھر کے دمِ سرد بولے اے غمخوار
کہاں ہیں قاسمؑ و اکبرؑ کہاں علم بردار

امیر کون ہے، میں تو ہوں بیکس و ناچار
خدا کے بندے تھے وہ سب ہوئے خدا پہ نثار

سپاہِ ظلم نے، تنہا سمجھ کے گھیرا ہے
ہزار تیغیں ہیں، اور ایک حلق میرا ہے

سُنا تھا تو نے کہاں شہرہ میرے اکبرؑ کا
سُنا تھا دبدبہ کس جا خدا کے لشکر کا

ابھی ابھی وہ مرقع مٹا پیمبرؐ کا
ابھی ابھی ہوا یاں خاتمہ بہتّرؑ کا

جو شیر خوار کی تجھکو تلاش ہے بھائی
یہ دیکھ لے مرے ہاتوں پہ لاش ہے بھائی

گویا ہوئی یہ دخترِ پیغمبرؐ زمن
تو نے کیا ہے رات کو بندوں کا پیرہن

اے عیب پوش خلق خداوندِ ذوالمنن
لیکن ترے حسینؑ و حسنؑ ہیں برہنہ تن

کیسی یہ عید آئی کہ رنج و الم ہوا
فاقے کے دکھ میں پیاروں کو کُرتوں کا غم ہوا

کُرتے کہاں ہیں، اُن کو جو دوں گی دمِ سحر
زینت سے سب کے بچے پھریں گے ادھر اُدھر
ننگے رہے برس کے برس دن مرے پسر
رہ جائیں گے مسوس کے دل کو مرے جگر

اطفالِ خاص و عام بغلگیر ہوئیں گے
یہ نا امید ماں کے گلے مِل کے روئیں گے

تو جانتا ہی یاں ہے نہ خیاط نے لباس
بہلا دیا ہے میں نے کہ بچے نہ ہوں اُداس
بالکل تری کنیز کو ہے ہر طرف سے یاس
اب ہوں خیالِ وعدہ خلافی سے بدحواس

صدیقہ نام رکھا ہے تو نے بتولؑ کا
جھوٹا نہ کیجیو مجھے صدقہ رسولؐ کا

عزیزوں کی فرقت میں حضرت صغراؑ کے مدینے میں بین

پیدا ہوئے اصغرؑ تو پیامِ سفر آیا
بھیّا کو چھٹی بھر تو گلے خوب لگایا
افسوس کہ جھولے میں بہن نے نہ جھلایا
بچھڑے تو کبھی خواب میں بھی مُنہ نہ دکھایا

داخل شہِ دیں اب بھی نہ گھر میں ہوئے نانی!
اصغرؑ چھ مہینے کے سفر میں ہوئے نانی!

اب میں نہیں غم کھاتی ہوں، کھاتا ہی مجھے غم
مُنہ زرد ہی، لب خشک ہیں، جی سُست، کمر خم
یہ تپ مری رگ رگ کا لہو پیتی ہے ہر دم
یہ حال ہی، اور شوقِ لقائے شہِ عالم!

پروا نہ بدن کی ہی، نہ دل کی، نہ جگر کی،
آنکھیں رہیں باقی، کہ زیارت ہو پدر کی

جو اپنے تھے وہ ہو گئے چھٹتے ہی پرائے
ماں باپ نے تو خیر، مرے پیار بھلائے
ڈیوڑھی پہ کھڑی رہتی ہوں میں آس لگائے
یہ دیکھیے، بھیا علی اکبرؑ بھی نہ آئے!
تن شمع صفت جلتا ہے، اور بدمزگی ہے
لو بھائی کے ملنے کی مگر دل سے لگی ہے

نانی نے دلاسا دیا لے لے کے بلائیں
پرزہ کوئی لکھ بھیجیں، تمھیں بھی نہ بلائیں
واری گئی جیتے رہیں وہ چاہیں جب آئیں
لو چلتی ہے، ان روزوں میں تشریف نہ لائیں
اغلب ہے کہ اس دھوپ میں آرام لیا ہو
اللہ کرے، خیمہ ترائی میں کیا ہو

ناگاہ مدینے میں قیامت کی شب آئی
صغراؑ کے لیے سخت ہلاکت کی شب آئی
گذرا جو نواں روز، شہادت کی شب آئی
نانی کو پکاری، یہ کس آفت کی شب آئی!
بے نور ستارے بھی ہیں، اور چرخِ بریں بھی
اے لو، در و دیوار بھی ہلتے ہیں، زمیں بھی!

للہ، نواسی کے کلیجے کو سنبھالو
اس رات میں ڈرتی ہوں، چھاتی سے لگا لو
عباسؑ چچا جان کی ماں کو بھی بلا لو
قرآن مرے پڑھنے کا طاقوں پہ اٹھا لو
مر جاؤں گی اس شب کی اندھیری سے دہل کر
روضہ پہ نبیؐ کے رہو، اس رات کو چل کر

کیا جانے، مسافر مرے اس وقت کہاں ہیں
پانی بھی ملا ہے انھیں، یا تشنہ دہاں ہیں
اترے ہیں کہیں، یا اس اندھیری میں رواں ہیں
اللہ غریبوں کا نگہباں، وہ جہاں ہیں
روشن رہیں دنیا میں چراغ آلِ عبا کے

دل میرا اُلجھا جاتا ہی جھونکوں سے ہَوا کے

کیوں آج پرندے نہیں لیتے ہیں بسیرا؟ | ان طائروں کے اُڑنے سے ہوش اُڑتا ہی میرا
کیا اُنکے سلیمانؑ کو دشمن نے ہے گھیرا؟ | دیکھیں ہمیں دکھلاتا ہے کیا کل یہ اندھیرا

بالکل غضبِ قہرِ الٰہی کی ہے آمد
کیا جانیے کس گھر پہ تباہی کی ہے آمد

جو لوگ کہتے ہیں کہ مرزا دبیر کسی چیز یا کسی کیفیت یا حالت کی تصویر کھینچنے سے بالکل عاجز ہیں[۲] وہ ان اشعار کو بغور دیکھیں کہ علاوہ صفائی، سادگی۔ اور روانی کے کیسے مناسب اور موزوں الفاظ میں پریشانی اور گھبراہٹ کا سماں باندھ دیا ہی کہ ہر لفظ اور ہر مضمون اضطرابِ غم کی مجسّم تصویر ہے۔

اب لکھتا ہی یوں راقمِ حالِ شہِ والا | تشویش میں سب چاند محرم کا بھی گذرا
پردیسیوں کا نامہ و پیغام نہ پہونچا | اک لڑکی نے آکر کہا اک روز، کہ صغرا

کیا روتی ہے دل شاد ہو، بابا ترا آیا
بیمار! مبارک ہو، مسیحا ترا آیا

یہ مژدہ سُنا جب، کہ سفر سے پدر آئے | خالی ہوا دل غم سے، مگر اشک بھر آئے
سجدہ کیا، بولی مرے ارمان بر آئے | پھر پوچھا، کہاں تک شہِ جن و بشر آئے؟

ہی خیر رفیقانِ شہِ عرش نشیں کی؟
کچھ دُھوم سے آتی ہی سواری شہِ دیں کی؟

[۲] دیکھو موازنہ صفحہ ۲۳۷،

کب ہوئیگا داخل یہاں فرزندِ ید اللہ؟ ہیں اکبرؑ و عباسؑ بھی ہمراہ شہنشاہ؟
وہ لڑکی یہ کہنے لگی، بنتِ شہِ ذیجاہ! جو ساتھ سدھارے ہیں وہ سب ہوئینگے ہمراہ؟
عرصہ نہیں، اب گھر میں حسینؑ آتے ہیں صغراؑ
لینے کے لیے اہلِ وطن جاتے ہیں صغراؑ

امِ سلمہؓ ہنستی ہوئی آئیں پھر اُس جا بولیں کہ حسینؑ آئے مبارک تمہیں صغراؑ
میں کہتی نہ تھی؟ آنے کو ہیں سیّدِ والا آیا کہ نہ آیا؟ وہ شہِ یثرب و بطحا
تم گھٹتی تھیں ناحق یہاں دوری کے الم میں
اب تم میں نہیں اُٹھنے کی طاقت ہے کہ ہم میں؟

کہنے لگی صغراؑ کہ بجا سب ہے یہ تقریر آتے ہیں تمہاری ہی دعا سے شہِ دلگیر
یہ کیا ہے کہ سُنکر خبرِ آمدِ شبیرؑ کچھ حال مرے دل کا ہوا جاتا ہے تغیر!
بے وجہ یہ حالت نہیں اس دم مرے جی کی
اللہ کرے خیر حسینؑ ابنِ علیؑ کی

نانی نے دلاسا دیا، بے جا ہے یہ زاری کچھ خو ہی تمہیں پڑ گئی ہے رونے کی واری
ہے قاعدہ بے حد جو خوشی ہوتی ہے طاری اُسوقت بھی اشک آنکھوں سے ہو جاتے ہیں جاری
کیوں اشک نہ شادی کے بہیں دیدۂ تر سے
تھوڑی یہ خوشی ہے کہ حسینؑ آئے سفر سے

صغراؑ نے یہ نانی سے کہا بھر کے دمِ سرد رونا یہ خوشی کا ہے، تو پھر دل میں ہے کیوں درد؟
چہرہ مرا اسوقت ہوا جاتا ہے کیوں زرد؟ میں روتی ہوں اور آج ہیں خوش سارے زن و مرد
تم لاکھ کہو، میں نہ یقیں مانوں گی نانی!

جب گھر میں پدر آئینگے تب جانونگی نانی!

کل صبح یہ نمازیِ خیر النسا کہاں
یہ کربلا کہاں ، یہ صفِ اتقیا کہاں
شورِ اذانِ اکبرِ گلگوں قبا کہاں
کل صبح یہ موذّنِ فوجِ خدا کہاں

مغرب کیوقت لوٹ ہی اور یہ خیام ہیں
مابینِ ظہر و عصر بہتّر تمام ہیں

پژمردگی سے پھولوں کی رنگت بدل گئی	ولہ	نکہت صبا کے ساتھ چمن سے نکل گئی
کہتا تھا فرس ڈھونڈ تولے کوئی کہاں ہوں	ولہ	آنکھوں میں تو پھرتا ہوں نگاہوں سے نہاں ہوں
رُک رُک کے قدم رکھتی تھی ہر سر بہ ادب سے	ولہ	جُھک جھک کے مثالِ شرفا ملتی تھی سب سے
کِھل کِھل کے پھول، نافونکی صورت مہکتے تھے	ولہ	ذکرِ خدا میں مرغِ خوش الحاں چہکتے تھے
باگیں اُٹھاؤ گھوڑوں کی تیغیں نکال لو	ولہ	جبتک امامؑ آئیں انہیں دیکھ بھال لو
آرام کرینگے وہیں، افضالِ خدا سے	ولہ	نیند آتی ہے شیروں کو ترائی کی ہوا سے
ہرگز صفتِ اسپ ہنرمند نہ ہوگی	ولہ	اس شیشۂ دل میں یہ پری بند نہ ہوگی
سب کے گلے سے ملتی تھی، لیکن رُکی ہوئی	ولہ	جوہر یہ تھے کہ بوجہ سے تھی خود جھکی ہوئی
ظاہر تھی کبھی اور کبھی آنکھوں سے نہاں تھی	ولہ	قدرت تھی خدا کی، کبھی یاں تھی کبھی واں تھی
غیرت کوئی سیکھے پسرِ شاہِ نجف سے	ولہ	مُنہ پھیرے ہوئے سوتے ہیں دریا کی طرف سے
بعد از حسینؑ اہلِ حرم ننگے سر پھرے	ولہ	لوٹے گئے، اسیر ہوئے، دربدر پھرے
منزل کڑی ہے اس سفرِ ناگزیر کی	ولہ	مالک کے ہاتھ شرم ہی وقتِ اخیر کی
حلق پہ تیغ رہے، سینے پہ جلاد رہے	ولہ	لب پہ ہو نام ترا، دل میں تری یاد رہے

تن تن کے صاف سینوں کی ڈھالیں سنبھال لیں	ولہ	آدھی سروہیاں کمروں سے نکال لیں
اللہ رے وفا! آنکھ نے دیکھی نہ چمک بھی	ولہ	پتلی تو سناں لگی پہ جھپکی نہ پلک بھی
قدرت کے آفتاب چمکتے نظر پڑے	ولہ	باغِ نبیؐ کے پھول مہکتے نظر پڑے

کلام کی اصلی ترتیب کا قائم رہنا

کلام کی اصلی ترتیب کا قائم رہنا۔ جملوں کی اصلی ترتیب کا بحالِ خود قائم رہنا نظم میں دشوار بلکہ ناممکن ہے۔ ہر فصیح سے فصیح شاعر کو اجزائے کلام کی تقدیم و تاخیر کرنی پڑتی ہے، کیونکہ جب اصلی ترتیب بحر کے محدود دائرے میں قائم نہیں رہ سکتی تو الفاظ کو مقدم و موخر کرکے وزن درست کرلیا جاتا ہے۔ فصیح و بلیغ اور قادر الکلام شاعر حتی الامکان ترتیب کی پابندی کا خیال رکھا کرتے ہیں، اور ایسے اشعار نہایت موثر، دلاویز، اور برجستہ ہوتے ہیں۔ ترتیب الفاظ میں کوئی خفیف سی تبدیلی ناگوار بھی نہیں ہوتی، لیکن جو ترتیب ناموزوں حد تک بگڑ جاتی ہے فوراً طبیعت میں ایک انقباض پیدا کردیتی ہے اور شعر بھی اپنی برجستگی اور صفائی سے گر جاتا ہے۔ مؤلف نے میر صاحب کے فصیح کلام سے چند مثالیں نقل کی ہیں جن میں اُنھوں نے حتی الامکان ترتیب کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ اب ہم مرزا صاحب کے کلام سے چند اشعار درج کرتے ہیں۔ ان میں بھی یہ صفت خوبی اور صفائی کے ساتھ پائی جاتی ہے ؎

جبکہ مسلمؑ کے پسر گھر میں قضا کے آئے دامِ آفت میں ہما خیرِ نساؑ کے آئے	برجِ عقرب میں قمر شیرِ خدا کے آئے ہائے بجھنے کو چراغ آلِ عبا کے آئے

پھر نہ یثرب میں وہ یثرب کے ستارے پہونچے
قید خانے سے چھٹے گور کنارے پہونچے

بعدِ مدت جو ہوئیں بیڑیاں پاؤں سے جُدا
ہاتھ چھوڑا جو رسن نے، تو اجل نے پکڑا
پائے نازک کا ورم بن گیا زنجیرِ قضا
راستہ بھولے مدینے کا ملی راہِ قضا

آگے تقدیر کے رستے ہیں نہ تدبیر چلی
طوق سے ننھے گلے نکلے تو شمشیر چلی

مطلع ثانی

نہر پر حضرتِ مسلمؑ کے خلف آتے ہیں
لال ہونے کے لیے، درِّ نجف آتے ہیں
خلد کو جاتے ہیں مقتل کی طرف آتے ہیں
ڈوبنے کو قمرِ برجِ شرف آتے ہیں

فاطمہؑ قبر سے کھولے ہوئے سر آتی ہے
جس طرف دیکھتے ہیں موت نظر آتی ہے

قتل کرنے کو عجب ظلم سے لاتا ہے عدو
ہر قدم خشک ہوا جاتا ہے پیاسوں کا لہو
ہاتھ میں چھوٹے کا گیسو ہے بڑے کا بازو
نرگسی آنکھوں کو حسرت سے ہے گردش ہر سو

کھینچتا ہے جو عدو نامِ علیؑ لیتے ہیں
جب گھرکتا ہے تو چُپ ہو کے یہ رو دیتے ہیں

نہ ٹھہر سکتے ہیں، نہ جلد چلا جاتا ہے
دھیان مرنے کا لبِ نہر جو آجاتا ہے
چُپ رہا جاتا ہے، نہ عذر کیا جاتا ہے
ایک دریا ہے کہ آنکھوں سے بہا جاتا ہے

ماں نہیں، باپ نہیں، اکبرؑ و عباسؑ نہیں
پاس وہ ہے جسے ایمان کا کچھ پاس نہیں

تنہا شبِ فرقت میں بکا کرتی تھی صغراؑ
جینے کی، نہ صحت کی دعا کرتی تھی صغراؑ
دن آمدِ اکبرؑ کے گِنا کرتی تھی صغراؑ
زہراؑ کی لحد سے یہ کہا کرتی تھی صغراؑ

بیمار کو، بے کس کو، مسیحا سے ملادو
صدقے گئی دادی مجھے بابا سے ملادو

طولِ شبِ فرقت سے میں گھبراتی ہوں دادی!
ہمسائیوں کو ڈر کے میں چِلّاتی ہوں دادی!
گھر دیکھ کے سنسان، ڈری جاتی ہوں دادی!
غمخوار کوئی اپنا نہیں پاتی ہوں دادی!

ہمجولیوں کے گھر سے صدا بھی نہیں آتی
بابا بھی نہیں آتے، قضا بھی نہیں آتی

وہ دن گئے جو راہ کے کرتی تھی نظارے
پھر وں کوئی جب نام مرا لے کے پکارے
اب آنکھ بھی کھل سکتی نہیں ضعف کے مارے
تب کھول کے آنکھیں کروں وا ایک اشارے

سر بالشِ بستر سے مرا اُٹھ نہیں سکتا
اب ہاتھ سے صغراؔ کے عصا اُٹھ نہیں سکتا

حضرت امام حسینؑ کی مناجات

حق سے کہتے تھے، ترا شکر کروں کیا میں ادا
ماں تو دی فاطمہؑ سی، باپ دیا حیدرؑ سا
واہ کس گھر میں مجھے تو نے کیا ہے پیدا
نانا ایسا دیا، سب پڑھتے ہیں کلمہ جسکا

آج یہ رتبہ والا بھی عطا کرتا ہے
آج اس بندے کو شاہِ شہدا کرتا ہے

مجکو یہ صبر تھا، عباسؑ کو دیکھوں بیدم!
لاش قاسمؑ کی ہو پامال نہو مجکو الم!
قتل اکبرؑ سا پسر ہو نہ کروں چشم کو نم!
مجھ میں یہ حوصلہ کب تھا، یہ ترا فضل و کرم

بندہ پرورا! عجب اس بندے پہ اکرام کیا
صبر تو آپ دیا اور مرا نام کیا

بیٹوں کی لاش پر حضرت زینبؑ کے بین

پیارو! وہاں چلے ہو جہاں کا نشاں نہیں
رہبر نہیں، رفیق نہیں، کارواں نہیں،
بچّے ہو، ساتھ باپ نہیں اور ماں نہیں
زخموں سے چور چور ہو تاب و تواں نہیں

منزل تلک غضب کی ہے تنہائی راہ میں
بھائی سے ہوشیار رہے بھائی راہ میں

پوچھے درِ بہشت پہ گر خازنِ جناں
تم کون ہو؟ کہاں سے ہوا ہے گذر یہاں؟
ہاں افصح العرب کے نواسو! نثار ماں
اُس دم کہیں نہ پیاس سے لکنت کرے زباں

کہنا، کہ ہم شبیہِ پیمبرؐ کے بھائی ہیں
شبیرؑ کے غلام ہیں، اور کربلائی ہیں

حضرت علی اکبرؑ کی شجاعت پر اعدا کی حیرت

سب کہنے لگے، دیکھیے جرات کا تماشا
اللہ رے پیاسے کی شجاعت کا تماشا!
اس زور کو ہم دیکھیں، کہ صورت کا تماشا
بالکل ہے یہ اللہ کی قدرت کا تماشا

ہوں اُلٹے مقابل، یہ ہمیں حوصلہ کب تھا
دو روز کے پیاسے جو نہ ہوتے تو غضب تھا

حضرت صغرا امام حسینؑ سے عرض کرتی ہیں

سر قدموں پہ ہنوز رادیا، ٹوپی بھی اُتاری
پھر باندھے لرزتے ہوئے ہاتھ، اور یہ پکاری
بابا! مجھے چھوڑو نہ یہاں، تم پہ میں واری
بیٹی نہیں، میں آج سے لونڈی ہوں تمہاری

مُنہ ہاتھ دُھلاؤں گی میں صغرؑ کا تمہارے
گہوارہ جُھلاؤں گی میں اصغرؑ کا تمہارے

کیوں نے نہیں چلتے ہو، خطا لونڈی کی کیا ہے
پھر جائے مقدر ہی تو بات اس کی جُدا ہے
کچھ بڑھ کے سکینہؑ کو نہیں میں نے کہا ہے
امّاں کا اس آزار میں بھی کام کیا ہے

گو تپ نے کسی وقت کا آنا نہیں چھوڑا
پر جھولے میں اصغرؑ کا جھلانا نہیں چھوڑا

صغراؑ نے اِدہر اور اُدہر پاس سے دیکھا
کہنے لگی، تم میری سفارش کرو بھیّا!
پھر جھولے سے اصغرؑ کو اُٹھا لائی وہ دُکھیا
سب کنبہ ہے بابا کی طرف، اور میں تنہا

صغراؑ کو تو سمجھاتے ہیں بابا کی طرف سے
کچھ باپ سے کہتے نہیں صغراؑ کی طرف سے

حضرت امام حسینؑ حضرت عباسؑ کی شان و شوکت دیکھ کر فرماتے ہیں ؎

تھے آگے آگے فوج کے عباسؑ نامور
بے ساختہ یہ کہتے تھے سلطانِ بحر و بر
لہرا رہا تھا سر پہ پھریرا اِدہر اُدہر
شوکت پہ میرے بھائی کی کوئی کرے نظر

نانا جہاد کو جو وطن سے نکلتے تھے
لیکر علم یونہیں مرے بابا بھی چلتے تھے

ایک ایسے ہی موقع پر حضرت زینبؑ فرماتی ہیں ؎

زینبؑ پکاری شاہِ نجف یاد آتے ہیں
کس شان سے علم لیے عباسؑ جاتے ہیں

عمر سعد اپنی فوج کو اعدائے امام علیہ السلام کے اسلاف کے کارنامے سُنا کر جانبازی کی ترغیب دیتا ہے ؎

مشہور ہے ہر شہر میں شمشیرِ دو پیکر
طفلی میں یہ تھی طاقتِ دامادِ پیمبرؐ
یہ تحفۂ باری ہے سوئے حیدرِ صفدر
دو اُنگلیوں سے چاک کیا کلّۂ اژدر

سُنتے ہیں، کہ غُل نعرۂ تکبیر کے اُٹھے
جھولے سے جو اُٹھے تو اُسے حیدرِ کرار اُٹھے

جنگِ جمل و بدر و اُحد کر گئے یہ سر
خندق میں جو لی میان سے شمشیرِ دو پیکر
صفین و سلاسل کی صفیں ہو گئیں ابتر
جبریل نے روکا تو قلم کر دیئے شہپر

پردے حسد و کبر کے بھی پھاڑ کے نکلے
خیبر سے جو نکلے تو علم گاڑ کے نکلے

شاہِ شہدا بھی ہیں، اُسی شاہ کے دلدار
ابنِ حسنؑ و اکبرؑ و عباسؑ علمدار
طاقت وہی بازو میں، وہی ہاتھ میں تلوار
اُس فوج میں یہ تین بہادر ہیں نمودار

کچھ رشتہ میں ہیں، اور کچھ اصحاب نبیؐ کے
بیٹے ہیں، بھتیجے ہیں، نواسے ہیں علیؑ کے

اس قسم کے اور بھی ہزاروں اشعار ہیں جنکو بخوفِ طوالت ترک کیا گیا؛ آگے مختلف عنوانات میں جو اشعار نقل کیے جائیں گے اُن میں دیگر محاسن کے علاوہ یہ خصوصیت بھی نمایاں ہوگی۔

روزمرّہ اور محاورہ جو الفاظ اور ترکیبیں اہلِ زبان کی بول چال میں زیادہ مستعمل اور متداول ہوں اُن کو روزمرّہ کہتے ہیں، اور اہلِ زبان کی بول چال اور اسلوبِ بیان ہی کا نام محاورہ ہے۔ روزمرّہ کی پابندی تمام اقسامِ کلام مثل تحریر و تقریر نظم و نثر میں نہایت ضروری ہے۔ جسقدر کسی کلام میں روزمرہ کا لحاظ کیا جائیگا اُسیقدر فصاحت کے معیار پر پورا اُتریگا اور مقبولِ طبائع خاص و عام ہوگا۔ بغیر محاورہ کے کوئی کلام فصاحت و بلاغت کے اعلیٰ پایہ پر پہونچ سکتا ہے، لیکن اگر روزمرّہ کی پابندی نہوگی تو درجۂ فصاحت سے گرجائیگا

لکھنؤ کو حسن شناسانِ سخن نے زبان کا مرکز تسلیم کر لیا ہی، اور میر صاحب و مرزا صاحب زباندانی میں اہلِ لکھنؤ کے سرتاج سمجھے جاتے ہیں، اس لیے ان دونوں صاحبوں سے بڑھ کر اور کون شخص روزمرّہ اور محاورہ لکھنے کا دعویٰ کر سکتا ہی۔ دونوں بزرگوار آپس یکتاے عصر مانے گئے ہیں۔ ہاں فرق یہ ہی کہ پہلے زمانے کے فاضل اربابِ کمال کے کان شعراے عجم کی نازک خیالیوں اور رنگیں بیانیوں سے بھرے ہوئے تھے، زبانیں فصحاے فارس کے پُر تکلّف اور پُر مضمون اشعار کے مزے اُٹھائے ہوئے تھیں، اسلیے اُن لوگوں کو وہی کلام محظوظ کر سکتا تھا جسکو علاوہ نازک خیالی، مضمون آفرینی، اور تشبیہوں کی لطافت اور استعاروں کی نزاکت کے شوکتِ الفاظ نے بلند اور شاندار بنا دیا ہو، اسوجہ سے زمانے کا رنگ اور شائقین کی طبیعتوں کا مذاق پہچان کر مرزا صاحب مرحوم نے تشبیہات، استعارات، اور مضامین آفرینی پر زیادہ توجہ فرما کر وہ وہ نادر اشعار نظم کیے کہ اربابِ مذاق کے دلوں پر اُن کی بلاغت کا سکّہ بیٹھ گیا۔ میر صاحب مرحوم کا خاندانی طرز چونکہ اس کے خلاف تھا، اور اُن کے آبا و اجداد لطفِ زبان، محاورہ کی صفائی، اور کلام کی سادگی میں شہرت حاصل کر چکے تھے، اسلیے اُنھوں نے اپنے خاندانی طرز ہی میں سخن سنجیاں شروع کیں؛ اور باوجودیکہ یہ رنگ اُس زمانے کے خلاف تھا مگر اُنھوں نے اپنی سحر بیانی کی قوت سے اس طرز میں بھی وہ عالیشان مرتبہ حاصل کر لیا کہ مرزا صاحب کی طرح آج اُن کا نامِ نامی بھی نہایت عظمت کے ساتھ زبانوں پر جاری ہی، اور بقولِ مؤلف باوجودِ امتدادِ ایّام آجتک یہ فیصلہ نہو سکا کہ دونوں بزرگوں میں سے ترجیح کا مسند نشیں کس کو کیا جائے اور نہ آئندہ کبھی فیصلہ ہو سکے گا۔ جو لوگ مضمون آفرینی میں مرزا صاحب کو یکتا، اور زباندانی میں میر صاحب کو کامل

پہلے زمانے کے اربابِ کمال کا مذاق

میر صاحب کا خاندانی طرز

دونوں صاحبوں کا کلام مرزا کا موجود ہے

سمجھتے ہیں، اُن کا یہ مطلب نہیں کہ دونوں باکمال شاعر دوسرے رنگ میں کچھ کہنے سے عاجز تھے، یا اُن کے کلام میں دوسرا انداز پایا ہی نہیں جاتا۔ مثلاً مرزا صاحب نے نازک خیالی میں جو کچھ حیرت انگیز کمالات دکھائے ہیں اُن کا ذکر تو اپنے موقع پر آئیگا، مگر اس مقام پر ہم اُن کے دلاویز کلام سے بطور نمونہ وہ اشعار انتخاب کرتے ہیں جن میں ایسی صفائی اور روانی کے ساتھ روزمرہ اور محاورہ کا استعمال کیا ہے کہ اس سے بہتر ہو نہیں سکتا۔ ؎

روزمرہ و محاورہ کی مثالیں

ہاتھ پکڑے ہوئے اکبرؑ کا ہیں بابا تیار یہ نہ جانا ہے مرے دم سے لگی اک بیمار		بھیّا اصغرؑ کو لیے ہوگئیں اماں بھی سوار روکے مجرا تو لیا اور نہ کہا برخوردار

ٹھہرو اے صاحبو، ٹھہرو، مجھے آ لینے دو
بھیّا اصغرؑ کو کلیجے سے لگا لینے دو

حضرت زینب علی اکبر سے فرماتی ہیں

خدمت میں واری آپ کی کس روز کمی تھی	ولہ	اکثر رات لوری دینے میں دم بھر زباں تھمی

اِن محنتوں کا دھیان ذرا تم کو کچھ نہیں
سمجھو تو سارے حق ہیں نہ سمجھو تو کچھ نہیں

زینبؑ کو بھی ہوش آگیا کی شہ سے یہ گفتار بھائی نے کیا آج خیال اس کا نہ زنہار	ولہ	سب جانتے ہیں میں نے ہی پالا ہی دیا لاڈ اک دودھ پلا کر ہوئیں اکبرؑ کی یہ مختار

مجھ سے بھی نہیں مشورہ کچھ اس میں لیا ہی
فرمانِ شہادت علی اکبرؑ کو دیا ہے

۳ مطلع۔ اے باغِ طبع رنگِ بہارِ سخن دکھا۔ مرثیہ غیر مطبوعہ۔

میں نے اسے ابتک نظرِ بد سے بچایا
الحمد کو دم کر لیا پانی جو پلایا
کھانا بھی اُسے اوٹ میں دامن کے کھلایا
ثمرہ مگر اس پالنے کا آج یہ پایا
اپنا جسے سمجھا تھا وہ بیگانہ ہوا ہے
قسمت کا نہیں پھیر تو صدقے گئی کیا ہے

اکبرؑ کے سُنانے کو یہ کہتی تھی زباں سے
جو کام کیا پوچھ کے مجھ سوختہ جاں سے
ولہ
اے عونؑ و محمدؑ تمھیں لاؤں میں کہاں سے
اب قدر ہوئی پیارو نکی جب چھٹ گئے ماں سے
کیا جان کے دم بھرتی تھی ہمشکلِ نبیؐ کا
سب کہنے کی باتیں ہیں نہیں کوئی کسی کا

پھر بولیں یہ بانوؑ کے قریب آکے بر قت
بچپن کے بھی کرتے ہیں، جوانی کی بھی خلعت
لو بھابی یہ ملبوس یہ اکبرؑ کی امانت
اللہ مبارک کرے اب تم کو یہ خدمت
تم والدہ اُن کی ہو، پدر، سرورِ دیں ہیں
یہ آج کھلا ہم کوئی اکبرؑ کے نہیں ہیں

پھر رونے لگی بیٹھ کے واں زینبِؑ ناچار
میری پھوپی اماں، مری مالک، مری مختار
ہمشکلِ نبیؐ لپٹے یہ کہتے ہوئے اِک بار
میں تو ہوں غلام آپ کا کیوں آپ ہیں بیزار
ہم چاہتے ہیں تم ہمیں چاہو کہ نہ چاہو
اللہ، اب اک بات پہ بندے سے خفا ہو

ہٹ ہٹ کے وہ بولیں کہ نہ یہ ذکر نکالو
دم رُکتا ہی باہیں نہ گلے میں مرے ڈالو

ماں بیٹھی ہی وہ، جاؤ گلے اُس کو لگالو
بانوؔ کی خوشامد کرو مرنے کی رضا لو

میں پیار نہیں کرتی، میں قرباں نہیں ہوتی
جاؤ، میں تمہاری پھوپی اماں نہیں ہوتی

ولہ

دوڑی وفورِ طیش سے خود زینبؑ حزیں
فرمایا میں تو آنے کو تھی ننگے سر وہیں
کیا مشورہ تھا شمر سے؟ وہ بولے کچھ نہیں
فرمایا خوب! لوگوں میں چرچا ہی پھر تو نہیں

شمرِ لعیں سے صلح جو ٹھرائی ہوئے گی
مرضی تمہاری تھوڑی بہت پائی ہوئے گی

ہی ہی مجھے تو اور ہی وسواس اب ہوا
شاید علم نہ ملنے کا تم کو تعب ہوا
عباسؑ کو علم جو ملا کیا غضب ہوا؟
گذرا جو ناگوار خلافِ ادب ہوا

آئے کوئی بلا نہ پدر کی کمائی پر
صدقے ہوئے تھے تم مرے عباسؑ بھائی پر

ولہ

زینبؑ تو بیاں کرتی تھی یہ ہند سے روکر
تھی پاس سکینہؑ کے کھڑی ہند کی دختر
کہتی تھی، بہن! آتا ہے رونا مجھے تجھ پر
کُرتا ہی پھٹا، سی نہیں دیتیں تجھے مادر

ہم غیروں کے دل پر ترے نالوں کا اثر ہی
اللہ، تری ماں کا بھی کیا سخت جگر ہے

ولہ

یاد آتا ہے بیمار بہن کا مجھے کہنا
دشوار ہے پردیس کی ایذاؤں کا سہنا
تم سے بھی کہا تھا کہ جُدا اس سے نہ رہنا!
یاں آکے بُرا ہو گیا ہے ہے مرا لہنا

بابا نے نہ پوچھا تو چچا نے بھی نہ پوچھا

یہ اور غضب ہے کہ قضا نے بھی نہ پوچھا

حضرت شہر بانو جناب صغرا سے فرماتی ہیں

بانوئے حزیں پردہ الٹ کر یہ پکاری
تھراتے ہوئے پاؤں سے آنے کے میں واری

ولہ

تکلیف نہ کر اے مری بی بی مری پیاری
جا گھر کو، تجھے صبر دے اب ایزدِ باری

اب ننھا سا سجادہ بقیعہ میں بچھا کر
زہراؑ کے مسافر کے لیے حق سے دعا کر

تب پڑے کے عقب سے بڑھائے چچا نے ہات
بس بس نہ بے نصیبوں پہ فرماؤ التفات

ولہ

واں سے بڑھی یہ کہہ کے وہ سرمایۂ حیات
اللہ آج شب کو نہ پوچھی ہماری بات

کیا دونوں وقت ملتے غضب کی عطش ہوئی
اماں سے پوچھیے تو میں کے بار غش ہوئی

اُمِ سلمہؓ ہنستی ہوئی آئیں پھر اُس جا
میں کہتی نہ تھی آنے کو ہیں سیّدِ والا

ولہ

بولیں کہ حسینؑ آئے، مبارک تمہیں صغراؑ
آیا کہ نہ آیا وہ شہِ یثرب و بطحا

تم گھلتی تھیں ناحق یہاں دوری کے الم میں
اب تم میں نہیں اُٹھنے کی طاقت ہی کہ ہم میں

جنے پہ چلنے کو کہا سب نے کہا بسم اللہ | ولہ | مجھسے جھوٹوں بھی نہ پوچھا میں گنہگار تھی آہ

کیوں سبک سمجھے نہ ہر ایک مجھ آزاری کو | ولہ | طول سا طول کھچا ہے مری بیماری کو

حضرت سکینہ کی زبان سے

فوج یہ پانی خوشی سے جو نہیں دیتی ہے | ولہ | پانی اس طرح کا پیاسوں کی بلا لیتی ہے

سب کی نظروں میں سبک میں جگر افگار ہوئی | ولہ | اک فقط مشک تمہیں دے کے گنہگار ہوئی

بیگانے بھی اس دکھ میں کنارا نہیں کرتے | ولہ | تم ہو کے جگر، پاس ہمارا نہیں کرتے

لو جاؤ گھر پدر ہے شہادت کے دھیان میں	ولہ	مرتے سے کے ساتھ مر نہیں جاتے جہان میں
باگیں اُٹھاؤ گھوڑوں کی تیغیں سنبھال لو	ولہ	جبتک امام آئیں انہیں دیکھ بھال لو
کہا بانوؑ نے میں صدقے گئی کچھ ماں کی خطا	ولہ	مجھ پہ غصے ہوئیں اور باپ سے کچھ بس نہ چلا
وہ بولی میں صدقے گئی سچ کہتے ہو یہ بات	ولہ	لو بھائی، بھلا سر پہ تو زینب کے رکھو ہات
دکھلائے ہنر شعلہ فشانی کے ہزاروں	ولہ	دوزخ پہ گھڑے پڑ گئے پانی کے ہزاروں
اونچی جو ہوئی کفر بھی پھر ہو گیا نیچا	ولہ	اعدا کے بڑے بول کا سر ہو گیا نیچا
یاں نام سُنکے خوف سے سب تھرتھراتے ہیں	ولہ	اُن کا جگر سراہیے جو لڑکے آتے ہیں
جیتے تھے جسکو دیکھ کے وہ قتل اب ہوا	ولہ	اللہ سب کی خیر کرے کیا غضب ہوا
یوں بھر شیر دیں جو سراسیمہ رواں ہو	ولہ	تم ہو نہ ہو عباسؑ علمدار کی ماں ہو
دھڑکوں میں یہاں ننھا سا دل انکا پھٹے گا	ولہ	شب خیر سے گذریگی تو کل دن نہ کٹے گا
آپ کی جان سے دور آئے اگر میری قضا	ولہ	ہرج کیجے نہ کہیں میرے لیے منزل کا
تو غم سے گُھلی جاتی ہو کیونکر نہ حزیں ہوں	ولہ	آخر کو میں نانی ہوں کوئی غیر نہیں ہوں

بچوں کی زبان سے

جناب ام سلمہ حضرت صغرا سے

مضامین کی نوعیت سے الفاظ کا استعمال انسان کا قلب جو جذبات اور تاثیرات کا قبول کرنے والا ہی، اگر کسی اثر سے متاثر ہو کر شاعر کی زبان کا شریک ہو جائے، تو مناسب اور موزوں الفاظ کا ذخیرہ فراہم ہو جاتا ہی۔ ایک درد رسیدہ کو کسی دردناک واقعہ کے بیان کرتے وقت الفاظ میں سوز و گداز کی حالت پیدا کرنا کچھ مشکل نہیں، اور ایک

شجاع کو میدانِ جنگ میں شاندار الفاظ تلاش کرنے میں دیر نہیں لگتی۔ ایک واعظ کو، جسکا دل عظمت و جلالِ الٰہی سے متاثر ہو، دوسروں کا دل ہلا دینا آسان ہے۔ اب شاعر کو، جسکا کام ہر واقعہ اور حالت کی بجنسہٖ تصویر کھینچنا ہے، ان سب لوگوں کی شبیہ بننا پڑتا ہے۔ وہ کبھی بہادروں کے دلیرانہ خیالات کو ظاہر کرنے میں شجاعانہ جذبات سے سرشار ہو جاتا ہے، اور کبھی درد و غم کا نقشہ اُتارتے وقت اپنے دل میں غم و الم کی خراش پیدا کرکے الفاظ میں سوز و قلق کا رنگ بھر دیتا ہے۔ اسی طرح ہر قسم کے جذبات و تاثیرات کا حال ہے۔ جب کسی نظم کے الفاظ سامعین کے دلوں میں مطلوبہ جذبات پیدا کرنے سے قاصر رہتے ہیں، وہ خود شاعر کے دل کی بے اثری کے سبب سے ہے۔

ہر شخص کا خیال ہے کہ مرزا صاحب کے کلام میں اس صفت کا لحاظ نہایت خوبی کے ساتھ پایا جاتا ہے۔ یہ اُن کی قادر الکلامی کا بیّن ثبوت ہے کہ اُن کے عالمانہ دماغ میں ہر قسم کے الفاظ کا ایک بڑا ذخیرہ جمع رہتا تھا، اور جہاں جہاں جیسا موقع ہوتا مناسب طور پر اُن کا استعمال کرتے تھے اور یہی اُن کے کلام کی تاثیر کا بڑا راز ہے۔ جہاں درد و الم کی دلسوز داستانیں نظم کی ہیں وہاں ایسے دردانگیز الفاظ ڈھونڈ کر لائے ہیں کہ قلب پاش پاش ہو جاتا ہے۔ جس موقع پر اہلبیتؑ کے مصائب اور زندانِ شام کی ایذا کا بیان ہے اُس کے جملے ایسے مؤثر اور جگر خراش ہیں کہ تیر و نشتر کی مانند دلوں پر اثر کر جاتے ہیں۔ جس جگہ رجز کے فخریہ اشعار لکھتے ہیں اُنکے ایک ایک لفظ سے جلالت شان، اور عظمت ٹپکتی ہے؛ جہاں رزمیہ اشعار میں شمشیرِ شرربار کی روانی کا بیان ہے وہاں شاندار اور پُرشوکت الفاظ نے ایک خاص رفعت پیدا کر دی ہے۔ چنانچہ

الفاظ کا مناسب استعمال

ہم نمونہ کے طور پر ہر موقع کے چند اشعار لکھتے ہیں جن سے ناظرین کو اس باکمال شاعر کے زورِ طبیعت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ رزمیہ فخر کے اشعار لکھتے ہیں تو فرماتے ہیں ؎

یہ جانُو جس وقت کھچے گی مری تلوار
اک حملے میں کر دونگا پرے فوج کے بیکار
تیغوں میں نہ دم ہونگے نہ سر ہونگے نہ سردار
جز گرد نہ پیدل نظر آئیں گے نہ اسوار
سرکوبیِ افواجِ بداعمال کروں گا
چیونٹی کی طرح مور ہے پامال کروں گا

انسان تو کیا جن بھی نہیں ہم سے لڑے ہیں
نام اپنی دلیری کے دلیروں میں بڑے ہیں
سر کے نہیں جس جا پہ قدم رنمیں گڑے ہیں
اس ضرب کے سکّے عربستاں میں پڑے ہیں
کس کس پہ چلی تیغِ ظفرناک ہماری
ہر شہر میں ہر ملک میں ہے دھاک ہماری

کمزور ہیں رستم سے پہلوان مرے آگے
نابود ہے فرعون کا ساماں مرے آگے
مجبور ہیں سہراب و نریماں مرے آگے
رکھتے نہیں کچھ جان بنی جاں مرے آگے
بیہوش ہو جس صاحبِ شمشیر کو ٹوکوں
روباہ بنے ڈر کے، اگر شیر کو ٹوکوں

ولہ

ہم دل میں جب در آئینگے فوجِ شریر کے
ٹکڑے کرینگے خنجر و شمشیر و تیر کے
جوہر کھلیں گے طاقتِ برنا و پیر کے
وارث ہیں ذوالفقارِ جنابِ امیرؑ کے
اک اک کی موت آج حسام دو سر سے ہے
قبضہ قضا کی تیغ پہ حکمِ قدر سے ہے

جلال و غیظ کو ان الفاظ میں ادا کرتے ہیں ؎

آئے غرورِ جنگ ہو اب جس دلیر کو	روکے تو کوئی شیرِ الٰہی کے شیر کو
تو سیل کو، اور برقِ شرر بار کو روکو	رہوار کو روکو مری تلوار کو روکو
دیکھیں تو بھلا آئیں تو نولاکھ سمٹ کر	ہاں کھدیں جو ماموں تو صفیں کھدیں اُلٹ کے
غصّے سے سرخ ہو گیا یاقوتِ رُخ کا لون	شیرِ خدا کے شیر جو بپھریں سنبھالے کون
کیا تختِ سلطنت ہے امیرِ پلید کا	دل پر رکھیں تو ملک اُلٹ دیں یزید کا

دیگر رزمیہ اشعار کی شان و شوکت ملاحظہ ہو ۔

لاکھوں کا ایک حملے میں مُنہ پھیر دیتے ہیں	کس طرح اُن سے طبل و علم چھین لیتے ہیں
باگیں اُٹھاؤ گھوڑوں کی تیغیں سنبھال لو	جب تک امام آئیں انھیں دیکھ بھال لو
ناگاہ بجے بُوق و دف و بربط و قرنا	باجوں کی صداؤں سے ہلا گنبدِ خضرا
تن تن کے صاف سینوں کی ڈھالیں سنبھال لیں	آدھی سروہیاں کمروں سے نکال لیں
مردوں کو تیغ چاہیے میدان چاہیے	شیروں کو برچھیوں کا نیستان چاہیے
وہ بولے کہ ہم پانی کا قطرہ بھی نہ دینگے	یہ بولے کہ ہم زور سے تلوار کے لینگے
لو آؤ بڑھو نیزہ سنبھالو تو میں جانوں	کاندھے سے بھلا مشک اُٹھالو تو میں جانوں
کس طرح خللِ رتبۂ سادات میں آتا	سر جاتا ہی پر فرق نہیں بات میں آتا

دیکھو جس طرح ایک بہادر اور پُر ہیبت شخص بحالتِ غیظ و غضب کسی شخص کو مرعوب بنا دیتا ہے اسی طرح ان پُرزور الفاظ کے صوت و لہجہ سے شوکت و جلال کی تصویر آنکھوں کے سامنے پھر جاتی ہے ۔

امام حسینؑ روضۂ جناب رسالت مآبؐ سے رخصت ہوتے ہیں

جب کوچ کی شب قبرِ نبیؐ پر گئے شبّیرؑ
رخصت کو مع آلِ پیمبرؐ گئے شبّیرؑ
قندیلیں جو روشن کیں تو غش کر گئے شبّیرؑ
زینبؑ نے یہ جانا کہ ہیں مر گئے شبّیرؑ

تھی عرش میں ندا، ہم اسی حسرت میں مرینگے
اب روشنی اس قبر پہ کاہے کو کرینگے

اے نانا کے روضے، مرا گھر ہوتا ہی ویراں
اے قبرِ حسینؑ آج کی شب ہی ترا مہماں
کل صبح مری منزلِ آخر کا ہے ساماں
کل روح مرے نانا کی ہوئیگی پریشاں

اے قبر، میں دکھ پاؤں گا پردیس میں جاکر
تو شوق ہو تو نانا سے لپٹ جاؤں میں آکر

اے قبر، میں کیسا ترے صاحب کا ہوں پیارا
سجدے میں مجھے پشت سے اپنی نہ اُتارا
اب خنجرِ جلّاد ہے اور سینہ ہمارا
سُنیو کہ مجاور ترا پیاسا گیا مارا

تیری تو ملاقات کی یہ رات ہی باقی
پھر خنجر و گردن کی ملاقات ہے باقی

پانی ہی وہ شے، پیتے ہیں سب مومن و کافر
پر قحط اسی پانی کا ہوگا مری خاطر
دنیا سے کفن لیتے ہیں عقبیٰ کے مسافر
لیکن نہ کفن پائے گا تیرا یہ مجاور

کس شخص کو مدفن پسِ مُردن نہ ملیگا
اے قبرِ پیمبرؐ ہمیں مدفن نہ ملے گا

* ان بیتوں کے دونوں مصرعوں میں صنعتِ ردالعجز علی الصدر مع التکرار ہے۔ یعنی جو لفظ کہ بیت کے عجز (آخر مصرعِ ثانی) یا حشو میں واقع ہو وہی صدر (شروعِ مصرعِ اول) یا حشو میں بھی واقع ہو۔ جیسے یہ شعر

شمارِ غم اوندانم از انکہ
بروں شد غم اوز حدِ شمار

الفاظ کی تکرار سے درد اور اثر [illegible]

کیسے پُر درد و الم الفاظ ہیں۔ کیا کوئی فصیح سے فصیح شاعر اس سے زیادہ جگر خراش لفظوں میں حسرت و غم اور جذباتِ صادقہ کی تصویر کھینچ سکتا ہے۔ ان اشعار میں وہ درد بھرا ہے کہ ایک ایک لفظ پر آنکھیں خون کے آنسو بہانا چاہتی ہیں۔

بحروں کا انتخاب اور حسنِ قافیہ و ردیف

شعر کی دلاویزی، اور اُس کی تاثیر دوبالا کرنے کیواسطے شگفتہ بحروں کو بہت دخل ہے۔ اگر بحر موزوں اور دلفریب نہو تو اچھے سے اچھے مضامین اور فصیح سے فصیح الفاظ بھی دلوں پر اثر پیدا نہیں کرسکتے۔ مگر اس بحث میں قابل مؤلف ایک عجیب و غریب خیال ظاہر فرماتے ہیں کہ "شعر کی دلاویزی کا ایک بڑا نکتہ یہ ہے کہ ہر مضمون کے مناسب بحریں اختیار کی جائیں۔ شاہنامہ کی بحر رزم کے لیے مخصوص تھی۔ فردوسی نے عشقیہ واقعات کو بھی اسی بحر میں ادا کرنا چاہا اس وجہ سے اُس کی یوسف زلیخا مقبول عام نہوئی"

مؤلف کی ایک عجیب رائے

اقسامِ کلام یعنی رباعی مثنوی وغیرہا کے واسطے تو عروضیوں نے چند اوزان خاص کر لیے ہیں، چنانچہ رباعی کا وزن مختص بحر ہزج ہے اور پھر اس میں نو قسم کے زحاف جاری کر کے ۲۴ اوزان استخراج کیے گئے ہیں، اسی طرح مثنوی کے واسطے ۷ وزن مخصوص سمجھے جاتے ہیں، لیکن یہ آج معلوم ہوا کہ مضامین کے لحاظ سے بھی بحریں مخصوص ہوگئی ہیں۔ مثلاً رزم لکھو تو فلاں بحر میں۔ بزم لکھو تو فلاں بحر میں۔ عشقیہ واقعات لکھو تو فلاں بحر میں۔ پند و موعظت لکھو تو فلاں بحر میں۔ ورنہ کلام کو مقبولیت حاصل نہو گی۔ یہ مؤلف کا خود ایجاد خیال ہے۔ واضعانِ بحور نے کہیں اس کی تصریح نہیں کی۔ شاہنامہ کی بحر کو رزم کے واسطے مخصوص سمجھنا ایک قسم کا دھوکہ کھانا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ فردوسی کی جادو بیانی اور روانیِ طبع نے شاہنامے کی رزم کو اس قدر شاندار اور پُرشوکت

بنادیا ہی، اس میں بحر وغیرہ کا کچھ اثر نہیں، لیکن لوگوں کو یہ مغالطہ ہوگیا کہ اس میں بحر بھی کچھ مدد دے رہی ہی، یا شاید بحر متقارب مثمن رزم کے ساتھ خاص ہی جس نے فردوسی کے کلام کو ایسا بلند رتبہ بنا دیا۔

پس لائق مؤلف کے کلیّہ کے مطابق اگر شاہنامہ کی بحر میں، علاوہ رزم کے، دوسرے مضامین مثل مضامینِ عشقیہ۔ یا مضامینِ پند و موعظت وغیرہ لکھے جائیں تو کتاب عام پسند نہ ہوگی، جیسا کہ بقول اُنکے یوسف زلیخاے فردوسی اس وجہ سے مقبول نہ ہوئی کہ اُس میں رزم کی بحر میں عشقیہ مضامین لکھے گئے ہیں۔ لیکن اُردو میں میر حسن کی مثنوی جس میں یوسف زلیخا، فردوسی کی طرح عشقیہ واقعات نظم کیے گئے ہیں اسی شاہنامے کی رزمیہ بحر میں ہی، باایں ہمہ ہندوستان میں جو شہرت اور مقبولیت اُس نے حاصل کی ہے وہ اس سے پہلے یا اس کے بعد کسی مثنوی کو نصیب نہیں ہوئی۔ اسی طرح سعدی نے بوستاں میں اسی شاہنامہ کی بحر میں پند و موعظت کے مضامین لکھے لیکن اُن کی کتاب بیحد مقبول ہوئی، حالانکہ مؤلف کے کلیّہ کے مطابق اُس کو بھی مقبول نہ ہونا چاہیے تھا کیونکہ وہ بھی رزم کی مخصوص بحر میں لکھی گئی ہی، پس جو وجہ یوسف زلیخاے فردوسی کے غیر مقبول ہونے کی ہی وہی بوستاں میں بھی موجود ہی۔ اگر رزم کی مخصوص بحر میں عشقیہ مضامین لکھنے سے کتاب غیر مقبول ہوجاتی ہی، تو اس مخصوص بحر میں پند و موعظت کے مضامین بھی غیر مقبول ہونے چاہییں، حالانکہ ایسا نہیں ہوا۔ اصل یہ ہی کہ جو قادر الکلام اور مشاق شاعر ہیں وہ ہر مضمون کو ہر بحر میں ادا کر کے طبیعت کے زور، زبان کی پاکیزگی اور الفاظ کی شستگی سے اپنے کلام کو پُر زور اور پُر اثر بنا دیتے ہیں۔

پس یہ قیاسی بات ہی کہ یوسف زلیخاے فردوسی، شاہنامہ کی بحر میں ہونے کی

وجہ سے مقبول نہ ہوئی۔ بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہر مضمون سے ہر شاعر کو ایک خاص لگاؤ ہوا کرتا ہے؛ مثلاً پند و موعظت میں سعدی شیرازی بے مثل و یکتا تھے، تصوف اور معرفت کے مضامین سے مولوی روم کو مناسبت تھی، اسی طرح بعض لوگوں کی رائے میں فردوسی کو فقط جنگ و جدل اور طعن و ضرب کے بیان سے خاص لگاؤ تھا عشقیہ مضامین سے اُس کی طبیعت کو مناسبت نہ تھی، اسلیے اُسکا جادو نگار قلم ان مضامین کے بیان میں کوئی نُدرت یا دلفریبی پیدا کرنے سے عاجز رہا۔ ایک محقق کی بھی یہی رائے ہے کہ ”شاہنامے میں جہاں کہیں فردوسی کو بہادری اور رزم کے سوا کوئی اور بیان کرنا پڑا ہے وہاں اُس کے کلام میں وہ خوبی اور لطافت نہیں پائی جاتی، یہی سبب ہے کہ اُس کی عشقیہ مثنوی یوسف زلیخا اسقدر مقبول نہیں ہوئی جسقدر شاہنامہ مقبول ہوا ہے[۱]“ ہماری رائے میں بھی اُس کے مقبول نہونے کی یہی وجہ ہے نہ کہ شاہنامے کی بحر میں ہونا۔ چنانچہ قابل مؤلف اس مقام پر تو یوسف زلیخائے فردوسی کے مقبول نہ ہونے کی یہ وجہ لکھتے ہیں کہ شاہنامے کی بحر میں لکھی گئی ہے، لیکن اس سے قبل اسی صفحہ کی ابتدائی سطور میں وہ بھی اپنے اس بیان کے خلاف اور ہمارے قول کے مطابق، اس کے مقبول نہ ہونے کی دوسری وجہ لکھتے ہیں کہ ”رزم بزم۔ وعظ و پند۔ ہر ایک کے لیے جُدا جُدا الفاظ ہیں۔ جو شعرا اس فرقِ مراتب سے واقف نہیں، یا ہیں لیکن ایک خاص رنگ اُن پر اس قدر چڑھ گیا ہے کہ ہر قسم کے مضامین میں ایک ہی قسم کے الفاظ اُن کی زبان سے ادا ہوتے ہیں، اُن کا کلام بجز ایک خاص رنگ کے بالکل بے اثر ہوتا ہے۔ یہی نکتہ ہے کہ سعدی سے رزم اور فردوسی سے بزم نہیں نبھ سکتی“ اس کے سوا یوسف زلیخائے فردوسی کے مقبول

یوسف زلیخا کے مقبول نہ ہونے کے دوسرے اسباب

[۱] حیات سعدی مولوی حالی صفحہ ۱۰۸

نہ ہونے کے اور بھی کئی اسباب ہیں۔

پہلا سبب

اوّل۔ یہ کہ اُس نے یوسف وزلیخا آخر عمر میں لکھی ہے۔ جبکہ اس سے پہلے اُس کے شاہنامے کی پُرزور اور دلفریب نظم نے تمام دلوں پر اپنا سکّہ جما لیا تھا، اور دنیائے سخن کی ہوا کو اس قابل نہیں رکھا تھا کہ اُس میں کوئی دوسری آواز گونج سکے۔

دوسرا سبب

دوسرا یہ کہ یوسف زلیخا نے ایسا مناسب وقت نہ پایا جو اُس کی شہرت کیواسطے موافق اور سازگار ہوتا۔ شاہنامہ جس زمانہ میں لکھا گیا ہے بادشاہِ وقت کی قدردانی کا ہاتھ اُس کے سر پر رکھا ہوا تھا۔ چنانچہ ختم ہونے سے پہلے ہی اُس کی صدہا داستانیں لوگوں کی زبانوں پر جاری ہوگئیں، لیکن یوسف وزلیخا کی تصنیف سے پہلے فردوسی بادشاہ کے معتوبین میں سے تھا، محمود نے اُس کو ہاتھی کے پاؤں کے نیچے پامال کردینے کا حکم دیدیا تھا؛ فردوسی سراسیمگی اور پریشانی کی حالت میں کبھی ہرات۔ کبھی طوس۔ کبھی طبرستان۔ کبھی قہستان میں پڑا پھرتا تھا۔ یہ حالتیں کب اجازت دیتی تھیں کہ کوئی اُس کے کلام کو شہرت دینے اور سخن فہموں کے کانوں تک پہونچانے کی کوشش کرتا۔

تیسرا سبب

تیسرا یہ کہ فردوسی نے جس حالت میں یوسف و زلیخا کو نظم کیا وہ شاعرانہ جوش اور ولولہ کا زمانہ نہ تھا، کیونکہ محمود کی ناقدردانی نے اُسکو پژمردہ دل اور پریشان خاطر بنا دیا تھا؛ اور قلم کا زور۔ دماغ کی قوت۔ اور دل کی اُمنگ رخصت ہوچکی تھی۔ یوسف و زلیخا لکھنے سے اُسکا مقصود اپنی شاعری کے کمال۔ سیف زبانی کے نمونے۔ اور جادو بیانی کے جوہر دکھانا نہ تھا، بلکہ ہجوم مصائب میں اپنا غم غلط کرنا۔ اور اپنے دردِ دل کا اظہار اور تضییعِ عمر کی شکایت کرنا تھا۔ چنانچہ یوسف وزلیخا کے شروع میں وہ اپنے وقت کے

رائگاں جانے، اور رستم کی قوت و شوکت، اور ایرانیوں کی جنگ و جدل کے کارنامے دکھانے پر متاسف ہی۔ وہ لکھتا ہے۔ ؎

نگویم کنوں نامہاے دروغ
سخن را زگفتار ندہم فروغ

نکارم کنوں تخمِ رنج و گناہ
کہ آمد سفیدی بجاے سیاہ

دلم سیر گشت از فریدونِ گُرد
مرا زاں چہ، کو تختِ ضحاک بُرد

گرفتم دل از مُلکتِ کیقباد
ہماں تختِ کاؤس کے بردباد

ندانم چہ خواہد بُداین جز عذاب
زکیخسرو و جنگِ افراسیاب

بریں می سزد گر بخندد خرد
زمن خود کجا کے پسندد خرد

کہ یک نیمہ از عمرِ خود کم کنم
جہانے پُر از نامِ رستم کنم

کنوں گر مرا روزِ چندیں بقاست
دگر نسپرم جز ہمہ راہِ راست

نگویم دگر داستانِ ملوک
دلم سیر شد زآستانِ ملوک

کہ آں داستانہا دروغ ہست پاک
دو صد زاں نیرزد بجز مشتِ خاک

شاید اسی وجہ سے لوگوں کو فردوسی جیسے عدیم المثال شاعر کی نسبت خیال پیدا ہوگیا ہو کہ اُس سے بزم نہیں نبھ سکی۔

اس کے علاوہ کسی کتاب کا مقبول اور ہر دلعزیز ہونا وقت اور اتفاق پر بھی منحصر ہی اس میں بحر کو کیا دخل۔ حسنِ قبول اور فیضِ تاثیر عطیۂ الٰہی ہے۔

اگر آپ کوئی قاعدہ مقرر فرما دیتے کہ کس کس مضمون کیواسطے کون کونسی بحر خاص ہے تو شعرا ہمیشہ آپ کے زیر بارِ احسان رہتے اور اُن کو اپنی تصانیف کے مقبول عام بنانے کا بہت اچھا راز معلوم ہوجاتا۔ جن تین چار بحروں کا قابل مؤلف نے ذکر کیا ہی

بحروں کا خاص کرلینا

ان بحروں کو میر صاحب اور مرزا صاحب نے یکساں طور پر خاص کر لیا تھا۔ بیشک میر صاحب سے پہلے مرثیے اکثر بڑی بڑی بحروں میں لکھے جاتے تھے یا نہایت چھوٹی بحروں میں، لیکن اُن کی شاعری سے بہت قبل یہ بحریں متروک ہو چکی تھیں۔ چنانچہ میر ضمیر جنھوں نے مرثیہ کو موجودہ طرز کا خلعت پہنایا اُن کے سیکڑوں مرثیے انہیں بحروں میں موجود ہیں جو بقول مؤلف میر صاحب نے خاص کر لی تھیں۔ اُن کی جلد اوّل میں ایک بھی مرثیہ اُن پُرانی بحروں کا نظر نہیں آتا جو مؤلف نے لکھی ہیں۔ ہاں البتہ یہ پُرانی بحریں مرزا سودا سے قبل اور اُن کے زمانے تک مروّج تھیں، کیونکہ اُس زمانے میں مرثیوں کو سوز میں پڑھنے کا رواج تھا، اور سوز میں راگ راگنیوں کے اختلاف اور اُتار چڑھاؤ کے سبب سے مرثیے مختلف بحروں میں پُر لطف معلوم ہوتے تھے۔ چنانچہ میاں افسردہ۔ گدا۔ احسان کے بہت سے مرثیے ان بحروں میں موجود ہیں مگر ان کے بعد تو مدت سے پُرانے مرثیہ گویوں کے کلام میں بھی اُن کا نام و نشان نہیں پایا جاتا۔

ردیف کا التزام

یہی حال ردیف کے التزام کا بھی سمجھ لینا چاہیے۔ میر صاحب کی طرح مرزا صاحب نے بھی بیشتر ردیف کا التزام رکھا ہے۔ اور ان دونوں صاحبوں پر کیا منحصر ہے ردیف کا التزام تو میر ضمیر۔ میر خلیق۔ منشی دلگیر اور دوسرے پُرانے مرثیہ گویوں نے بھی نہایت خوبی کے ساتھ رکھا ہے شاذ و نادر نہو تو یہ اور بات ہے۔ البتہ یہ بات ضرور ہے کہ میر صاحب اور مرزا صاحب نے جہاں خود فنِ مرثیہ گوئی کو بامِ ترقی پر پہونچا دیا ہے ساتھ ہی اسکے متعلق ہر بات کو عجیب و غریب خوبی کے ساتھ استعمال کیا ہے۔ چنانچہ ردیف کو بھی ایسی صفائی سے لکھتے ہیں کہ مطلق آورد کا شائبہ نہیں پایا جاتا۔

دونوں صاحبوں کے ہاں حسنِ قافیہ و ردیف کی مثالیں بکثرت ملتی ہیں۔

مؤلف نے میر صاحب مرحوم کے کلام سے چند لطیف نظیریں نقل کر دی ہیں۔ لیکن مرزا صاحب کے کلام میں اُن کی مثالوں کو دیکھنے کے لیے غالباً ناظرین کی مشتاق نگاہیں بیتاب ہونگی اسلیے اُن کے کلام سے حُسنِ قافیہ و ردیف کی چند مثالیں اس موقع پر درج کرتے ہیں۔ ان اشعار میں اکثر قافیے معمولہ[۱] واقع ہوئے ہیں جو متاخرین کے نزدیک داخلِ صنعت ہے ؎

حسنِ قافیہ و ردیف کی مثالیں

کیا ہاتھ ہے، کیا سینہ ہے کیا چہرہ ہے کیا سر		اے صلِّ علےٰ نور کا مجمع ہے سراسر
کی شرم نہ محبوبِ خدا سے نہ خدا سے	ولہ	لے دیکھ تو روتے ہیں پیمبرؐ کے نواسے
ہو کیوں نہ وہ بی بی شرفِ مادرِ عیسیٰؑ	ولہ	فرزند ہے عباسؑ سا وارث ہے علیؑ سا
دوزخ جدا وشعلۂ قہرِ خدا جدا	ولہ	رہوار کے جلو سے نہ تھی ایک جا جُدا
خود و سر و دل و جگر و دست و پا جدا		سب تیغ کے قدم پہ پڑے تھے جُدا جُدا
گردن سے سر لیا، کبھی قالب سے دم لیا	ولہ	بس دم لیا تو تیغ دو دم نے یہ دم لیا
ہر نقدِ عمل اب زرِ بیعانہ بنے گا	ولہ	بے اسکے کبھی خلد کا سودا نہ بنے گا
اکبرؑ کی نہ شادی کا لیا کام بہن سے	ولہ	اسوقت یہی کام لونا کام بہن سے
ہاتھوں کی لکیروں میں لکھا ہے یہ خدا نے	ولہ	رسّی میں بندھیں زینبؑ و کلثومؑ کے شانے
کیا غم ہے جو نولاکھ جواں تم ہو قلم بند	ولہ	ہم پیچھے کھینچیں تو ابھی سب کا ہو دم بند

[۱] اگر ایک لفظ کے دو ٹکڑے کرکے ایک جز کو قافیہ، اور دوسرے کو ردیف میں داخل کریں یعنی ایک ہی کلمہ میں قافیہ اور ردیف پیدا کریں تو اسکو قافیہ معمول کہتے ہیں جیسے کمال کا یہ شعر ہے ؎ زہے زسنبلِ تر کردہ لالہ را پردہ ٭ برآسماں زدہ عکسِ رخت سرا پردہ۔ اس غزل میں سرا رجفا۔ قفا۔ قافیہ اور پردہ ردیف ہے۔ مگر سراپردہ جو ایک لفظ ہے اسکے دو ٹکڑے کیے ہیں۔ سرا۔ اور پردہ۔ پہلے جز کو قافیہ۔ اور دوسرے کو ردیف قرار دیا۔

زہرا کے مہر میں نہیں دریا، نہیں سہی	وله	قابل نہیں میں پانی کے، اچھا نہیں سہی
عصیاں سے میں نہیں ہوں مبرا نہیں سہی		پر مجرموں نے بھی تو یہ ایذا نہیں سہی
بدمست ہو کس نیند میں، ہشیار ہو جاگو	وله	کوثر کے طلبگار رہو، نار سے بھاگو
نزدیک تمھارے ہوں سزاوار جفا، گو		پر امت محبوب خدا کا ہوں دعا گو
سمجھو ہمیں احباب دو عالم کا نتیجہ	وله	چاہیں تو ہمیں کوثر و تسنیم اسی جا
نانا ہیں محمدؐ مرے نانی ہیں خدیجہؑ		شبیر جسے حق نے دیئے اُسکا ہوں بھتیجا
ارباب سخن میرے دعاگو ہیں سراپا	وله	لو مرثیہ تو ایک ہے اور دو ہیں سراپا
ہر بند کو کھولا بھی لیا نقد بقا بھی	وله	جنبش نہ ہوئی تن کو یہ آیا بھی گیا بھی
آزار رسیدہ یہ نکوئی نہ کرے گا	وله	جو میں نے کیا تم سے وہ کوئی نکرے گا
اِک دن اسی طرح سے یہ دنیا تمام ہے	وله	پرسا شاہ کربلا کی عزا ناتمام ہے
اس نہر کا ہم آبرو اصلا نہ ہو زمزم	وله	اک قطرۂ ناچیز کا پیمانہ ہو زمزم
پیش نظر عزیزوں کا تو خوں بہا کرے	وله	وہ جز رضائے حق نہ طلب خوں بہا کرے
گرمیٔ شوق جنگ سے دم بھر نہ کل پڑی	وله	گویا زباں نیام کے مُنہ سے نکل پڑی
تھا شہر شہرۂ حیدرؑ جہان میں	وله	حیدرؑ، نبیؐ کے علم کا ہے در جہان میں
وہ کون ہے جس نے کہ کیا فاقے پہ فاقا	وله	پر فاقے کے غم سے دیا سائل کو افاقا
یوں ضرب تیغ سے سر دشمن روانہ تھا	وله	گویا بدن سے اپنے کبھی آشنا نہ تھا
یہ فوج ہے کیا چیز یہ سردار ہیں کیا مال	وله	لوں باگ جو گھوڑے کی تو کردوں ابھی پامال

تنسیق الصفات

اس صنعت کی تعریف جو تمام کتابوں میں مذکور ہے یہ ہے کہ "کسی موصوف کا صفاتِ متوالیہ کے ساتھ ذکر کریں"۔ جیسے حضرت امام رضا علیہ السلام کی

حدائق البلاغت صفحہ ۱۰۲

منقبت میں قاآنی کے یہ اشعار ؎

نہالِ باغِ علّیّین - بہارِ مرغزارِ دین	نسیمِ روضۂ یاسین - شمیمِ دوحۂ طاہا
نظامِ عالمِ اکبر - قوامِ شرعِ پیغمبر	فروغِ دیدۂ حیدرؑ - سرورِ سینۂ زہراؑ

یا امیر خسرو کا یہ شعر ؎

کجا خیزد چو تو سروِ جواں - و نازک - و نوبر	شکر گفتار - و شیریں کار - و گلرخسار - و مہ پیکر

یا کسی شاعر کا یہ شعر ؎

تیری شمشیر سرِ خصم پہ ہے میداں میں	صاعقہ - برقِ بلا - قہرِ خداوند تعال

مگر مؤلف علّامہ اس صنعت کی تعریف فقط یہ لکھتے ہیں "جب کسی موقع پر چند الفاظ ایک وزن یا ایک قسم کے پے در پے آتے ہیں تو ایک خاص لطف پیدا ہوتا ہے" یہ عجیب و غریب تعریف قابل مولف کی ایجاد ہے - حالانکہ ایک وزن کے الفاظ جمع ہو جانے کو صنعتِ موازنہ[1] (از اقسامِ سجع)، اور ایک قسم کے الفاظ جمع ہونے کو صنعتِ مراعات النظیر کہتے ہیں - اسکے بعد اُنھوں نے تنسیق الصفات کی پانچ مثالیں درج کی ہیں، لیکن لطف یہ ہے کہ تنسیق الصفات کی جو جدید تعریف اُنھوں نے ایجاد کر کے لکھی ہے اُسکے لحاظ سے سوا ایک مثال کے اور کوئی مثال اس عنوان کے تحت میں داخل نہیں ہو سکتی - چنانچہ ہم اُن کی پانچوں مثالوں پر علٰحدہ علٰحدہ ریمارک کرتے ہیں ؎

[1] اس میں نظم کے دو مصرعوں کے تمام الفاظ بر سبیل تقابل وزن میں متحد اور روی میں مختلف ہوتے ہیں - جیسے عبد الواسع جبلی کا یہ شعر ؎ آرائشِ آفاق شد رخسارِ بزم آرائے تو + آسائشِ عشاق شد دیدارِ روح افزائے تو - یہاں وزن سے مراد عروضیوں کا وزن ہے، جس میں حرکات کا یکساں ہونا ضرور نہیں - پس انکے نزدیک مستنیم اور فاعلن کا ایک وزن ہے، نہ صرفیوں کا وزن جنکے نزدیک توافقِ حرکات واجب ہے - جیسے نصر بروزن فعل -

کوفہ میں ہی معرکہ دن بھر نظر آیا	شمر آیا۔ سناں آیا۔ حُر آیا۔ عمر آیا

سمٹا جما اُڑا ادہر آیا اُدہر گیا	چمکا۔ پھرا۔ جمال دکھایا۔ ٹھر گیا

شمر آیا۔ سناں آیا۔ حُر آیا۔ عمر آیا، یا سمٹا۔ جما۔ چمکا۔ پھرا وغیرہ ان الفاظ کو کسی موصوف کی صفت ہونے کی قابلیت نہیں، اسلیے ان دونوں شعروں پر صنعتِ تنسیق الصفات جس کی تعریف تمام کتابوں میں تحریر ہے، صادق نہیں آتی۔ اور نہ یہ مؤلف کی ایجاد کردہ تعریف کے مطابق تنسیق الصفات کی مثالیں ہو سکتے ہیں، کیونکہ نہ تمام الفاظ ایک وزن کے ہیں نہ ایک قسم کے، پھر نہ معلوم یہ دو مثالیں کِس غرض سے لکھی ہیں ؎

موجود بھی ہر غول میں، اور سب سے جُدا بھی اِک گھاٹ پہ تھی آگ بھی پانی بھی ہوا بھی	دم خم بھی، لگاوٹ بھی صفائی بھی ادا بھی امرت بھی۔ ہلاہل بھی مسیحا بھی قضا بھی

چلتی تھی عجب رنگ سے شمشیرِ قضا رنگ چم خم کا جدا رنگ تھا، کس بل کا جُدا رنگ	ہر ہاتھ میں دکھلاتی تھی اعدا کو نیا رنگ لب سرخ۔ دہن صاف۔ بدن گوں ل ہرا رنگ

ان میں سے بعض مصرعے متقدمین کی تعریف کے مطابق تنسیق الصفات کی مثال ہو سکتے ہیں۔ لیکن مؤلف کی ایجاد کردہ تعریف کے لحاظ سے کوئی مصرع بھی تنسیق الصفات کے تحت میں داخل نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ کسی مصرع کے الفاظ بھی ہموزن یا ایک قسم کے نہیں ہیں ؎

مؤلف کی تعریف کے مطابق تنسیق الصفات کی تعریف میں نہ وہ الفاظ آتے ہیں جو علم بیان

متقدمین کی تعریف تنسیق الصفات مؤلف کی تعریف نہیں

دونوں لحاظ سے تنسیق الصفات

دوزخ کے زبانوں سے بھی آنچ اُسکی بُری تھی　　　برچھی تھی۔ کٹاری تھی۔ سروہی تھی۔ چھُری تھی

یہ شعر متقدمین کی تعریف کے مطابق بھی تنسیق الصفات کی مثال ہو سکتا ہے، کیونکہ دوسرے مصرع کے الفاظ میں تلوار کی صفت ہونے کی قابلیت موجود ہے۔ اور مؤلف کی ایجاد کردہ تعریف کے لحاظ سے بھی اسکو تنسیق الصفات کہہ سکتے ہیں، کیونکہ یہ الفاظ گو ہم وزن نہیں لیکن ایک قسم کے ضرور ہیں۔ تمام مثالیں ختم ہو چکیں لیکن یہ تعجب کی بات ہے کہ ایک وزن کی کوئی بھی مثال نظر نہ آئی جس کا ذکر مؤلف نے عنوان میں کیا ہے۔

ہم کو نہایت افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ ذی علم مؤلف نے جو عنوان (تنسیق الصفات) لکھا اُس کی تو تعریف غلط لکھی۔ اور جو تعریف لکھی اُس کی صحیح صحیح مثالیں نہ دیں۔

دیکھیے میر صاحب مرحوم کے یہ لاجواب اشعار صنعتِ تنسیق الصفات میں ہیں کاش آپ اسی قسم کے دلچسپ اشعار انتخاب کر کے ناظرین کو محظوظ فرماتے۔

منقبتِ جناب امیر علیہ السلام ؎

بازوے نبیؐ۔ دستِ خدا۔ نفسِ پیمبرؐ	طیب۔ وزکی۔ وطاہر۔ وپاکیزہ۔ واطہر
لشکر شکن۔ وبت شکن وفاتحِ خیبر	سرتاجِ عجم۔ میرِ عرب۔ حیدرِ صفدر

منقبت امام حسینؑ

اُس مہر کو تو دیکھو یہ ذرّے ہیں جسکے سب	سرتاجِ آسمان و زمیں۔ نورِ عرشِ رب
ابرِ کرم۔ خدیوِ عجم۔ خسروِ عرب	عالی ہمم۔ امامِ امم۔ شاہِ تشنہ لب

آنکھ ؎

احسان بھی حیا بھی۔ مروّت بھی۔ قہر بھی
بینا بھی۔ نکتہ سنج بھی۔ دانائے دہر بھی

خود موت بھی۔ حیات بھی۔ امرت بھی۔ زہر بھی
تسنیم بھی بہشت بھی۔ کوثر بھی نہر بھی

آہو شکار و تیر۔ کماندار و شیر گیر
خوں ریز۔ و جاں فریب و دلاویز۔ و بے نظیر

ہشیار و خوش نگاہ و سخن سنج و دلپذیر
قبضے[۱] میں ابروؤں کی کمانیں مژہ کے تیر
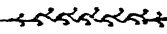
ذرہ نواز۔ ورند نما۔ صاحب امتیاز
حق بین و پاکباز و خدا بین و بے نیاز

طنّاز و شرمگین و گراں خواب و سرفراز
بیدار و داغ دیدہ و خونبار۔ و غم طراز
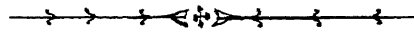
گھوڑا ؎

خوش خو و خوش خرام و خوش اندام و خوش لگام
جاندار و شوخ چشم و سعید و خجستہ کام

خوشرو و خوش جمال و وادافہم و تیز گام
گلپوش و تیز ہوش و سمن گوش و سرخ فام
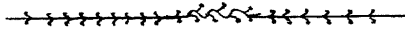
اس صنعت کی بیشمار نادر و نفیس نظیریں مرزا صاحب کے کلام میں بھی ملتی ہیں اُنمیں سے چند مثالیں نقل کرنے پر اکتفا کی جاتی ہے۔ ؎

تنسیق الصفات کی مثالیں

نامِ نامی ہے حسینؑ ابنِ علیؑ صلِّ علےٰ
مخزنِ صبر و رضا۔ معدنِ الطاف و عطا

اور لقب بیوطن۔ و بیکس و شاہِ شہدا
مرجعِ رحمتِ حق۔ مبدءِ افضالِ خدا

---

[۱] یہ مصرعہ صنعتِ تنسیق الصفات سے باہر ہے۔

سورۂ نور سے بھی نور دوچند اُسکا ہے
رتبہ تکبیر کے نعرے سے بلند اُسکا ہے

شرفِ کلکِ قضا۔ گلشنِ قدرت کی بہار — زینتِ لوح وقلم۔ عرشِ الٰہی کا وقار
راکبِ دوشِ نبیؐ۔ مہرِ نبوّت کا سوار — مصحفِ ناطق۔ وتفسیرِ کلامِ غفّار

فخر وہ شکل نہ کیوں چاند پہ دہ چند کرے
جسپہ یہ پیرِ فلک تاروں کو اسپند کرے

وہ کون رسولؐ جز وکلُ۔ خطبۂ ایماں — ولہ — سرتاجِ فصیحانِ عرب۔ آیۂ عرفاں
محبوبِ خدائے دوجہاں۔ قالبِ فرقاں — استادِ دبستانِ ازل۔ نائبِ یزداں

میزانِ خدا۔ مفتیِ دیں۔ قاضیِ فردا — ولہ — سلطانِ ازل۔ شاہِ ابد۔ عروۂ وثقا
خورشیدِ نجف۔ بدرِ حرم۔ رونقِ بطحا — اقبالِ عرب۔ اوجِ حرم۔ خسروِ دنیا

بیعت کو سند ہاتھ سے، قرآں کو قلم سے
خطبے کو شرف نام سے، منبر کو قدم سے

گُل پیرہن وگلبدن وگُل رخ وگلفام — ولہ — شمشاد قد۔ وغنچہ دہان وسمن اندام
خوش قامت وخوشرو وخوش آغاز وخوش انجام — حُسنِ چمنِ شرع۔ بہارِ گلِ اسلام

منظور جو اُس تیغ کو ابــتر کی رضا تھی — ولہ — گہ ابر تھی۔ گہ برق تھی۔ گہ سیلِ فنا تھی

بجلی کی جست۔ شیر کی آمد۔ ہوا کا شور — ولہ — قدرت کا کھیل۔ قہر کی طاقت۔ بلا کا زور

وہ تیغ تھی کہ قدرتِ پروردگار تھی — ولہ — گلچیں تھی، باغباں تھی۔ خزاں تھی۔ بہا تھی

در نعت جناب

۴ ان تینوں ٹیپوں میں صنعتِ تنسیق الصفات نہیں ہے۔ ان کو صرف سلسلۂ مضمون قائم رکھنے اور لطفِ کلام معلوم ہونے کی غرض سے تحریر کر دیا گیا۔ اصل عنوان سے ان کو تعلق نہیں ہے۔

باقی تنسیق الصفات کی دلچسپ مثالیں صنائع بدائع کی بحث میں دیکھو۔

بلاغت

قابل مؤلف نے اس موقع پر اُس خیال کو ظاہر کیا ہی جو ایک عرصہ سے میر صاحب اور مرزا صاحب کے کلام کے موازنہ میں زبانوں پر بطورِ ضرب المثل جاری ہی، یعنی میر صاحب میں فصاحت زیادہ ہی اور مرزا صاحب میں بلاغت۔ مگر وہ اس جملہ کو مہمل اور بےمعنی قرار دیتے ہیں۔ اگر یہ ضرب المثل واقعیت اور حقیقت کے لحاظ سے غلط سمجھی جائے تو کچھ مضائقہ نہیں؛ کیونکہ میر صاحب میں فقط فصاحت، اور مرزا صاحب میں فقط بلاغت سمجھنا بےمعنی اور خلافِ واقعہ بات ہی؛ لیکن مؤلف نے اسکو بلحاظِ معنی جو غلط اور مہمل لکھا ہی وہ ہرگز صحیح نہیں۔ اُن کی رائے کا خلاصہ یہ ہی کہ یہ فقرہ اِس وجہ سے بےمعنی ہی کہ جب بلاغت کی پہلی شرط یہ ہی کہ کلام فصیح ہو، پھر فصاحت و بلاغت کو باہم حریف قرار دینا اجتماعِ نقیضین ہی۔ افسوس ہی کہ لائق مؤلف نے اس موقع پر تعمقِ نظر سے کام نہیں لیا۔ چونکہ یہ ایک دقیق اور علمی بحث ہی، اسلیے اس کے حل کرنے میں کسی قدر تفصیل کی ضرورت ہی، تاکہ بخوبی ناظرین کے ذہن نشین ہو جائے۔

سب سے پہلے یہ دیکھنا چاہیے کہ فصاحت و بلاغت کی تعریف کیا ہی، اور ان دونوں کا اپنے اپنے افراد سے کیا تعلق ہی۔

فصاحتِ کلام

فصاحتِ کلام کے یہ معنی ہیں کہ کلام الفاظِ ثقیلہ و غریبہ سے پاک ہو۔ یعنی جس میں تمام الفاظ فصیح و شیریں و معتاد ہوں۔ اور یہ الفاظ ایسی خوبی کے ساتھ ترتیب و تالیف

کیے گئے ہوں کہ کلام حد سے زیادہ دلاویز و دلفریب معلوم ہو اور حُسنِ تالیف سے مزین، اور تعقیدِ لفظی و معنوی تخییل و اصطلاح و ادّعاے ناپسندیدہ سے مبرّا ہو۔

بلاغتِ کلام

بلاغتِ کلام یہ ہے کہ کلام مقتضاے حال کے مطابق، اور استعاراتِ[1] باقرائن، کنایاتِ بلیغ، مجازہاے پسندیدہ۔ تشبیہاتِ نادرہ غیر مبتذلہ سے آراستہ ہو۔ بشروطِ فصاحت، کیونکہ فصاحت بلاغت کا ایک جُزو ہے۔ پس فصاحت کا تعلق الفاظ با معنی سے ہے اور اُس میں الفاظ اور بندشِ الفاظ کے حُسن و قبح سے بحث ہوتی ہے، اور بلاغت کا اصلی تعلق معانیِ الفاظ سے ہے، یعنی اسمیں معنی کی خوبی و نفاست کی نوعیت کا لحاظ رکھا جاتا ہے۔

بلاغت و فصاحت میں کیا نسبت ہے

بلاغت و فصاحت میں عموم و خصوص مطلق کی نسبت ہے۔ بلاغت اخصِ مطلق ہے اور فصاحت اعمِ مطلق۔ یعنی ہر بلیغ فصیح ہے (گو یہ ضرور نہیں کہ ایک کلام میں جس پایہ کی بلاغت ہو اُسی پایہ کی فصاحت بھی ہو کیونکہ ممکن ہے کہ کلامِ بلیغ کا ہر کلمہ فصیح تر نہو) لیکن ہر فصیح کا بلیغ ہونا لازم نہیں ہے، بلکہ بعض فصیح بلیغ ہے اور بعض نہیں۔

اب یہ دیکھنا چاہیے کہ ان دونوں کا اپنے اپنے افراد کے ساتھ کیا تعلق ہے۔ یعنی ان میں تشکیک[2] ہے یا تواطؤ ظاہر ہے کہ دونوں میں تشکیک ہے۔ یعنی فصاحت و بلاغت

---

[1] بلاغتِ کلام کی تعریف میں صرف مطابقت اور فصاحت داخل ہے، اور استعارات و کنایات وغیرہ کلام کیواسطے عارضی، اور حدِ بلاغت سے خارج ہیں، البتہ کلام میں بعد رعایتِ مطابقت و فصاحت، ایک حُسن پیدا کر دیتے ہیں ۱۲

[2] منطقیوں کی اصطلاح میں اگر کلی اپنے تمام افراد پر یکساں طور پر صادق آئے تو اُسکو متواطی کہتے ہیں۔ جیسے لفظ انسان کہ اسکا اطلاق ہر انسان پر یکساں ہوتا ہے، کیونکہ تمام انسان انسانیت میں برابر ہیں۔ اور اگر ایسا نہو یعنی اُس کلی کا اطلاق بعض افراد پر زیادہ اور بعض پر کم ہو تو اُسے مشکک کہتے ہیں۔ جیسے لفظ وجود۔ یا ہستی۔ کہ اسکا اطلاق ذاتِ الٰہی پر اتم و اقوی ہے بہ نسبت دیگر موجوداتِ عالم کے۔ ۱۲ مؤلف

جن دونوں کا مفہوم کلی ہے اُنکے تمام افراد مساوی نہونگے۔ مثلاً فصیح کے افراد میں قسم کے کلام ہوں تو لفظ فصیح اُن سب پر یکساں طور پر صادق نہ آئیگا۔ کیونکہ کوئی کلام فصیح ہوگا۔ کوئی فصیح تر چنانچہ اطلاقِ افصح جو مقابلِ فصیح ہے مثبتِ تشکیک ہے۔ یہی بلاغت کا بھی حال ہے، کوئی بلیغ ہوگا کوئی بلیغ تر۔ چنانچہ کسی کو بلیغ کسی کو ابلغ کہنا زبان زدِ خلق ہے۔ اس سے ثابت ہوا کہ دونوں کے افراد میں وصفِ فصاحت و بلاغت کی کمی بیشی ممکن ہے۔ علماے علمِ معانی و بیان نے بھی اس امر کو بصراحت ظاہر کر دیا ہے[۱]

ان دونوں کی تعریف، اور اُن کا اپنے اپنے افراد کے ساتھ جو کچھ تعلق ہے، اُسکے معلوم ہو جانے کے بعد ضرب المثل کے معنی پر غور کیجیے۔ مرزا صاحب کی نسبت لوگوں کا یہ خیال ہے کہ اُن میں بلاغت زیادہ ہے، اسکے یہ معنی ہوئے کہ اُن میں ہیں تو بلاغت اور فصاحت دونوں، مگر بلاغت زیادہ ہے (فصاحت کم) نہ یہ کہ فصاحت بالکل نہیں، جیسا کہ آپ نے خیال کیا ہے اور اسی بنا پر کہدیا کہ لوگ فصاحت و بلاغت کو باہم حریف قرار دیتے ہیں یعنی یہ کہتے ہیں کہ بلاغت ہے فصاحت نہیں۔ بلاغت زیادہ ہونے کا یہ مطلب ہے کہ اُن کا کلام مقتضاے حال کے مطابق ہوتا ہے، لیکن ضرب المثل والوں کی راے میں، جس پایہ کی بلاغت ہوتی ہے اُسکے مناسب و مطابق فصیح الفاظ نظر نہیں آتے، یا الفاظِ فصیح کو حُسنِ ترتیب کے ساتھ ترکیب نہیں دیا جاتا۔ اس لیے اُن میں بلاغت جسکا تعلق معانی سے ہے زیادہ ہے، لیکن فصاحت جسکا تعلق الفاظ سے ہے اُس سے کم درجہ کی ہے۔ اس تمہید کو ذہن نشین کر لینے کے بعد آپکے تمام فقرات کی بآسانی رد ہو جاتی ہے۔ مثلاً آپ لکھتے ہیں کہ (بلاغت کی

[۱] مختصر المعانی میں بلاغت کے موقع پر لکھا ہے۔ وبینہما اے بین الطرفین مراتب کثیرۃ متفاوتۃ بعضہا اعلی من بعض بحسب تفاوت المقامات ورعایۃ الاعتبارات والبعد من اسباب الاخلال بالفصاحۃ انتہی۔ یہ تصریحاً تشکیکِ بلاغت پر دال ہے اور تلویحاً مثبتِ تشکیکِ فصاحت ہے۔

پہلی شرط یہ ہی کہ کلام فصیح ہو اسلیے فصاحت و بلاغت کو باہم حریف قرار دینا اجتماعِ نقیضین ہی) یہ آپ نے کس طرح جانا کہ ضرب المثل والے فصاحت و بلاغت کو باہم حریف قرار دیتے ہیں وہ بھی مانتے ہیں کہ جہاں بلاغت ہوگی فصاحت بھی ہوگی کیونکہ فصاحتِ الفاظ کلامِ بلیغ کے واسطے لازمی ہی، لہذا بلاغت کے ساتھ اِسکا اِجتماع ضروری ہی مگر یہ لازم نہیں کہ دونوں ایک ہی حیثیت اور شان کی ہوں ۔ فصاحت و بلاغت کو باہم حریف سمجھنا تو اُسوقت خیال کیا جاتا جب ضرب المثل والے یہ کہتے کہ مرزا صاحب میں فقط بلاغت ہی فصاحت نہیں ۔ ضرب المثل کے لفظ زیادہ سے خود معلوم ہوتا ہی کہ وہ لوگ فصاحت کے معدوم ہونے کے قائل نہیں، بلکہ صرف یہ کہتے ہیں کہ بلاغت زیادہ ہی اور فصاحت بھی ہی مگر کم ۔ پس جب ضرب المثل کے الفاظ سے فصاحت و بلاغت کا اجتماع ثابت ہوتا ہے تو معلوم ہوا کہ وہ لوگ ان دونوں کو حریف نہیں قرار دیتے، اور جب حریف نہ رہے تو ایک کلمے میں اُنکے جمع ہونے سے اجتماعِ نقیضین لازم نہ آیا ۔

پھر آپ فرماتے ہیں (مرزا صاحب میں بلاغت زیادہ ہی تو اِس کے یہ معنی ہیں کہ فصاحت بھی زیادہ ہی کیونکہ کلام اُسوقت تک بلیغ نہیں ہو سکتا جب تک اُس کے تمام الفاظ مفردات و مرکبات فصیح نہوں، اگر فصاحت میں کسی قسم کی کمی ہوگی تو بلاغت میں بھی کمی ہوگی)

بلاغت زیادہ اور فصاحت کم ہونا ممکن ہی

یہ بالکل صحیح نہیں کہ اگر بلاغت زیادہ ہی تو فصاحت بھی زیادہ ہی ۔ ممکن ہی کہ بلاغت جسکا تعلق مطالب و مضامین سے ہے زیادہ ہو، لیکن فصاحت جسکا تعلق الفاظ سے ہی اُس سے کچھ کم ہو ۔ بلاغت کی شرط مطلق فصاحت ہی نہ زیادتیِ فصاحت، اور نہ بلاغت کی زیادتی فصاحت کی زیادتی پر موقوف و منحصر ہی جو یہ شبہہ پیش آئے کہ جو کلام زیادہ بلیغ ہوگا وہ لزوماً فصیح بھی زیادہ ہوگا، کیونکہ ممکن ہی کہ ایک کلامِ فصیح میں جو دوسرے

کلامِ افصح سے کم رتبہ ہو رعایت مقتضائے حال کے زیادہ ہو لہذا وہ بلیغ زیادہ ہوگا اور فصاحت میں افصح سے کم ہوگا۔ مثلاً شاعر ایسا مضمون نظم کرے جو مقتضائے حال کے مطابق ہو، لیکن الفاظ شیریں تر اور فصیح تر نہوں، تو کہا جائیگا کہ کلام بلیغ تو ہی مگر جس درجہ کا بلیغ ہی اُس درجہ کا فصیح نہیں، جیسے کہا کرتے ہیں کہ فلاں شخص نے بات تو اچھی سوچی ہی مگر طرزِ ادا بہت ناقص ہے، یعنی اچھی طرح ادا نہ کرسکا۔ اربابِ معانی و بیان نے صرف اسقدر بیان کیا ہی کہ کلامِ بلیغ کو فصیح ہونا بھی لازمی ہی۔ لیکن اس سے یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ جب تک فصیح تر کلمات کا استعمال نہو کلام بلیغ ہو ہی نہیں سکتا۔ ممکن ہے کہ کلام میں وہ فصاحت موجود ہو جو بلیغ ہونے کے لیے کافی ہی مگر اُس سے فصیح تر بھی ممکن ہو۔ کلمات کی فصاحت محدود نہیں ہی بلکہ وہ درجہ بدرجہ فصیح اور افصح ہوتے چلے جاتے ہیں؛ یہانتک کہ اُن کا پہلا زینہ حیوانات کی زبان سے اونچا اور آخری زینہ حدِ اعجاز پر جاکر ٹھہرتا ہے۔ ان دونوں کے وسط میں بہت سے تدریجی مراتبِ فصاحت پیدا ہوتے ہیں جو اربابِ نظر پر مخفی نہیں۔ پس یہ کہنا کہ اگر فصاحت میں کسی قسم کی کمی ہوگی تو بلاغت میں بھی کمی ہوگی ہرگز قابلِ قبول نہیں۔ لیکن اگر الفاظ بالکل ہی فصیح نہ ہوں تو بلاغت صرف کم ہی نہ ہوجائے گی بلکہ جاتی رہے گی۔ اس سے نتیجہ نکلا کہ کسی کلام میں بلاغت کا زیادہ اور فصاحت کا کم ہونا ممکن ہی اور اس میں کچھ نقص پیدا نہیں ہوتا۔

ابن خلدون کی رائے

ابن خلدون لکھتے ہیں کہ معانی کو ایسا سمجھو جیسے پانی اور الفاظ کو ایسا سمجھو جیسے پیالہ۔ پانی کو چاہے سونے کے پیالہ میں بھرلو اور چاہو چاندی کے پیالہ میں اور چاہو مٹی کے پیالہ میں۔ پانی کی ذات میں کچھ فرق نہیں آتا۔ مگر سونے یا چاندی وغیرہ کے پیالے میں اُس کی قدر بڑھ جاتی ہی اور مٹی کے پیالے میں کم ہوجاتی ہی۔ اسی طرح معانی کی قدر

ایک فصیح و ماہر کے بیان میں زیادہ ہو جاتی ہی اور غیر فصیح کے بیان میں گھٹ جاتی ہی" اس سے معلوم ہوا کہ معنی کا نفیس اور اعلیٰ ہونا اور اُسکے واسطے مناسب الفاظ فراہم نہونا ممکن ہے پس ایسی حالت میں بلاغت یعنی معنی کی نفاست و خوبی زیادہ پائی جائیگی لیکن فصاحت یعنی الفاظ کی پاکیزگی اُس سے کچھ کم ہوسکیگی۔ اسلیے کہا جائیگا کہ اس کلام میں بلاغت زیادہ ہے لیکن فصاحت اُس درجہ سے کچھ کم ہی۔ اسلیے ضرب المثل والوں کا یہ قول کہ بلاغت زیادہ ہی فصاحت کم، صحیح ہے۔

ضرب المثل کا دوسرا حصہ اور اسکے معنی کی تشریح و توضیح

رہا ضرب المثل کا دوسرا حصہ یعنی میر صاحب میں فصاحت زیادہ ہی (بلاغت کم) یہ تو بالکل صاف ہی۔ یعنی میر صاحب کے کلام میں الفاظ نہایت فصیح و شیریں اور مرغوب طبع ہوتے ہیں، بندشِ الفاظ بھی نہایت صفائی اور خوبی کے ساتھ کرتے ہیں، اسلیے اُن میں (بہ نسبت بلاغت کے) فصاحت زیادہ ہی اور یہ بالکل جائز ہی۔ مثلاً ایک شاعر اپنے کلام میں موزوں اور فصیح الفاظ کا استعمال کرے، اُن کی مناسب طور پر بندش بھی کردے لیکن جوانب و مراعاتِ مقام کا لحاظ نہ رکھا ہو تو کہیں گے کہ کلام فصیح تو ہی مگر بلیغ نہیں۔ جیسے کہا کرتے ہیں کہ فلاں شخص نے جو مطلب بیان کیا وہ تو معمولی تھا مگر طرزِ بیان اور طریقۂ ادا بہت خوب تھا۔

فصاحت زیادہ ہونا اور بلاغت کم ہونا ممکن ہی

صاحب مختصر المعانی لکھتے ہیں لیس کلّ فصیح بلیغاً لجواز ان یکون کلام فصیح غیر مطابق لمقتضی الحال (ہر فصیح کلام کا بلیغ ہونا لازم نہیں کیونکہ جائز ہے کہ کوئی کلام فصیح تو ہو مگر مقتضائے حال کے مطابق نہو)، پس جب فصاحت کے واسطے بلاغت کا بالکل نہونا بھی جائز ہی تو اُس کی کمی تو بدرجۂ اولیٰ جائز ہوگی۔ اسلیے یہ کہنا کہ میر صاحب میں فصاحت زیادہ ہی (بلاغت کم) درست ہی لہٰذا یہ ضرب المثل جو میر صاحب اور مرزا صاحب کے موازنہ میں زبان زدِ خلق ہی اور جسکو قابل مولف مہمل اور غلط بتاتے ہیں بحیثیتِ معنی بہت صحیح اور درست ہی۔ لیکن ہماری رائے

ضرب المثل بحیثیت معنی صحیح ہی

میں بلحاظِ واقعیت وحقیقت علی العموم صحیح نہیں، کیونکہ میر انیس اور مرزا دبیر میں نہ فصاحت کی کمی ہے نہ بلاغت کی؛ جس طرح ملکِ فصاحت میں دونوں کی شہرت کا پرچم جلوہ فگن ہے اسی طرح اقلیمِ بلاغت میں اُنکے آوازۂ کمال کے ڈنکے بجے ہوئے ہیں۔

جمہور انام کی رائے مولف کی مخالف ہیں

ہم کو اس امر کا خاص طور پر افسوس ہے کہ جمہورِ انام کا فیصلہ ہمیشہ لائق مولف کی رائے کے خلاف رہتا ہے، یا اُنہیں کی جدّت پسند طبیعت کا خاصّہ ہے کہ ہر مسئلہ میں سب سے الگ تھلگ رہنا چاہتے ہیں۔ اس سے پہلے اُنھوں نے دیباچہ میں طے کر دیا تھا کہ شاعری میں میر انیس کا پایہ مرزا دبیر سے بہت بڑھا ہوا ہے۔ حالانکہ بقول اُنکے "جمہورِ انام نے مدتہائے دراز کی غور وفکر، کد وکاوش، بحث وتکرار کے بعد بھی فیصلہ نہ کیا کہ ترجیح کا مسند نشین کسکو کیا جائے"۔

پہلی نظیر

بلاغت کے موقعوں پر بھی وہ اکثر اپنی کتاب میں لکھ چکے ہیں کہ "مرزا صاحب بلاغت کے کوچوں سے نابلد ہیں" اور "بلاغت اُن سے چھو بھی نہیں گئی" حالانکہ تمام قوم کا متفقہ فیصلہ ہے کہ "مرزا صاحب میں بلاغت زیادہ ہے" اور یہ فیصلہ اسقدر شہرت رکھتا ہے کہ بقولِ مُولف بطورِ ضرب المثل مشہور ہو گیا ہے۔ چونکہ مولوی شبلی صاحب لکھ چکے ہیں کہ "مرزا صاحب سے بلاغت چھو بھی نہیں گئی" اور "اُن کے کسی قسم کے کلام میں یہ وصف (بلاغت) پایا نہیں جاتا[۵]"، اس لیے کسی قسم کے الفاظ پڑھ کر ذہن میں آتا تھا کہ شاید اُن کو مرزا صاحب کے کلام میں ایک مثال بھی بلاغت کی نظر نہ آئیگی، لیکن اسکو توفیقِ جبری کہا جائے یا مرزا صاحب کے کلام کی کرامت، کہ آخرِ کتابِ موازنہ میں، اُس مرثیہ پر رائے دیتے وقت جس میں حضرت امام حسینؑ جناب علی اصغرؑ کے لیے پانی مانگتے ہیں، قائل مُولف مرزا صاحب کے کلام کی بلاغت کے کُھلّم کُھلا قائل ہو گئے ہیں۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں۔

دوسری نظیر

---

[۵] موازنہ انیس و دبیر صفحہ ۲۶۰۔

"مرزا صاحب نے اس واقعہ کے بیان میں جو بلاغت صرف کی ہے اور جو درد انگیز سماں دکھایا ہے آجتک کسی سے نہو سکا" دو مقاموں پر اسقدر مختلف المعنی کلام دیکھ کر یقین نہیں آسکتا کہ ان متضاد خیالوں کا ظاہر کرنے والا ایک ہی شخص ہے۔ یہ حالت قابلِ افسوس ہے کہ انصاف کی طرح حافظہ نے بھی اُن کا ساتھ نہیں دیا۔[۲]

یہ امر بھی غور طلب ہے کہ سوا ان چند درد انگیز بند اور ایک سین دکھلانے کے مرزا صاحب کا سارا ذخیرۂ کلام یعنی ڈیڑھ لاکھ اشعار بلاغت سے اسقدر معرّا ہیں کہ اُن میں یہ وصف نام کو بھی نہیں۔ تعجب ہے کہ ایک شخص ایک موقع پر تو ایسا سماں دکھادے جسکا مثل آجتک کسی سے نہو سکے لیکن اسکے علاوہ اپنی تمام عمر کی شاعری میں اور موقعوں پر (بقول مولف) کسی واقعہ کی تصویر دکھانے سے قطعی عاجز ہو۔

بلاغت کو لفظ سے کچھ تعلق نہیں

اسی بحث میں مولف ایک موقع پر لکھتے ہیں "بلاغتِ الفاظ درحقیقت بلاغت کا ابتدائی درجہ ہے" اس فقرہ میں اُنھوں نے بلاغت کا تعلق الفاظ سے ابتدائی درجہ میں تسلیم کرلیا ہے۔ پھر آگے موازنہ کے صفحہ ۶۰ پر جہاں وہ میر صاحب کے اس مصرع کی بلاغت کا اظہار کرتے ہیں ع اک ذرا غور سے دیکھو تو یہ سر کِسکا ہے' لکھا ہے کہ ذرا کا لفظ اور زیادہ بلیغ ہے۔ اس فقرہ میں اُنھوں نے لفظ کو بلیغ تحریر فرمایا ہے حالانکہ یہ صحیح نہیں۔

مولف لفظ کو بلیغ کہتے ہیں

علمائے علم معانی نے تصریح کردی ہے کہ بلاغت کلمہ کی صفت نہیں ہوتی بلکہ صرف کلام و متکلم کی صفت ہوتی ہے۔ کلمہ کی صفت نہونا اس امر کی دلیل ہے کہ اسکو لفظ سے تعلق نہیں، کیونکہ ایک لفظ میں مقتضائے حال کی مطابقت نہیں ہوتی۔ البتہ بلاغت، کلام کی (جو الفاظ سے مرکب ہوتا ہے) صفت ہوتی ہے کیونکہ وہ اپنے معنی کی جہت سے

۲ مرزا صاحب کے کلام سے بلاغت کی مثالیں جزئیاتِ بلاغت کی بحث میں دیکھو۔

مقتضائے حال کے مطابق ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے فصاحت کا تعلق الفاظ سے ہے اور بلاغت کا معانی سے۔ صاحب شجرۃ الامانی لکھتے ہیں "لفظِ فصیح اطلاق کنند بر کلمہ و کلام۔ و متکلم۔ ہر سہ۔ و اطلاقِ بلیغ بر کلام۔ و متکلم۔ صحیح بود و بر کلمہ غیر صحیح" اسی طرح کتبِ عربیہ میں بھی اس کی صراحت موجود ہے[1] ان تمام اقوال سے معلوم ہوتا ہے کہ کلمہ یعنی لفظ کو بلیغ کہنا غلط ہے۔

بلاغتِ الفاظ

اسی بحث میں وہ لکھتے ہیں "میر انیس کے کلام میں بلاغتِ الفاظ بھی اگرچہ انتہا درجہ کی ہے لیکن یہ اُن کے کلام کا اصلی معیار نہیں۔ اُن کے کمال کا اصلی جوہر معانی کی بلاغت میں کھلتا ہے" اس سے معلوم ہوا کہ اُن کی رائے میں الفاظ کی بلاغت بحیثیتِ لفظ و صوت، اور معانی کی بلاغت بحیثیتِ مضمون، دو علٰحدہ علٰحدہ چیزیں ہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ بلاغتِ الفاظ بدون لحاظِ بلاغتِ معانی کیونکر پیدا ہوگی[2] اور نہ یہ عقل میں آتا ہے کہ معانی کی بلاغت کا جوہر بغیر الفاظ کی مدد کے کیونکر کھل سکتا ہے۔ فلسفیانِ عرب۔ حکمائے قدیم اور محققینِ یورپ و امریکہ کا ایک بڑا طبقہ کہتا ہے کہ بلا الفاظ انسان کا فکر کرنا ہی محال ہے منطق جو فکرِ انسانی کو بذریعہ دلائل صداقت تک پہونچانے کا آلہ ہے وہ بھی الفاظ سے معرّا نہو سکا چہ جائیکہ فنِ بلاغت و فصاحت جو کلام یا الفاظ کے اوصاف سے ہے

---

[1] مطول میں ہے۔ الفصاحۃ یوصف بہا المفردُ یقال کلمۃ فصیحۃ۔ والکلامُ یقال کلام فصیح۔ والمتکلم یقال کاتب و شاعر فصیح۔ والبلاغۃ یوصف بہا الاخیران اے الکلام والمتکلم فقط دون المفرد۔ یقال کلام بلیغ و رجل بلیغ۔ ولم یسمع کلمۃ بلیغۃ۔ ۱۲ مطول صفحہ ۱۱۔

[2] مختصر المعانی میں ہے۔ البلاغۃ عبارۃ عن مطابقۃ الکلام الفصیح لمقتضی الحال۔ وظاہر ان اعتبار المطابقۃ وعدمہا انما یکون باعتبار المعانی والاغراض التی یصاغ لہا الکلام، لا باعتبار الالفاظ المفردۃ والکلم المجردۃ۔ ۱۲

اس سے خالی ہو۔ اگر بفرضِ محال صرف معانی کا وجود بغیر الفاظ کے ہو دماغ انسانی میں پایا جائے تو بھی اُس کا مفہوم بغیر الفاظ کے دوسروں کے دلوں میں ڈالنا ناممکن ہے۔

قابل مولف کو جب بلاغت کے معنوں اور اُس کی تعریف ہی سے یہ اجنبیت ہے تو اُن کے اس قول سے کہ "مرزا صاحب کے کلام میں بلاغت نہیں ہے" ہم کو ناخوش ہونیکی کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی۔

بلاغت کے ایک نئے اور خودساختہ معنی

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ شاید جمہور کا یہ مقولہ کہ مرزا صاحب کا کلام بلیغ ہے، اس لحاظ سے ہوگا کہ اُن کے کلام میں مضمون آفرینی اور بلند پروازی ہوتی ہے، اور وہ استعارات و تشبیہات و کنایات سے مزین ہوتا ہے۔ اور میر صاحب کے کلام کو اس لحاظ سے فصیح کہتے ہونگے کہ اُس میں سادگی اور صفائی نظر آتی ہے۔ غالباً مرزا صاحب کے کلام کو بلیغ کہنا بلحاظ معنیِ مصطلح علمِ معانی نہ ہوگا یعنی رعایتِ مقتضاے حال و مقام کیونکہ اکثر لوگ اگر اُن سے دریافت کیا جائے تو بلاغتِ اصطلاحی کے معنی اور اس کی تعریف بھی نہ جانتے ہونگے۔

ہماری راے میں بھی یہ خیال قرینِ قیاس معلوم ہوتا ہے کیونکہ بلاغتِ اصطلاحی کے معنی جاننے کے بعد کوئی شخص بھی یہ نہیں کہہ سکتا کہ میر صاحب میں بلاغت کم ہے پس یہاں اگر بلاغت سے شوکتِ الفاظ وغیرہ مراد سمجھی جائے تو شاید اس معنی کے لحاظ سے مولف کو بھی مرزا صاحب کے کلام میں بلاغت زیادہ ہونے سے انکار نہوگا۔ کاش اگر وہ لفظِ بلاغت کے یہ معنی سمجھ کر اس ضرب المثل کو صحیح خیال کر لیتے تو ہم کو بھی اُن سے جھگڑا کرنے کی چنداں ضرورت نہ تھی، اور یہ امر اُن کے اُصول اور اعتقاد کے خلاف بھی نہ ہوتا؛ کیونکہ یہ بات اُن کو بھی تسلیم ہے کہ مرزا صاحب کے کلام

میں الفاظ کی شوکت۔ مضامین کی بلند پروازی۔ اور خیالات کی جدت انتہا درجہ کی پائی جاتی ہے۔ لیکن وہ اس ضرب المثل کے لفظِ بلاغت کو اصطلاحی معنوں میں لیجاکر پریشانی میں پڑ گئے اور پیچھا چھڑانا مشکل ہوگیا۔

واقعات کربلا مطابق مقتضائے حال ہیں

اس کے بعد قابل مؤلف نے لکھا ہے کہ "بلاغت کا کمال یہ ہے کہ واقعاتِ کربلا کو جو مرثیہ گویوں کا موضوعِ شاعری ہے اس طرح بیان کیا جائے کہ بالکل مقتضائے حال کے موافق ہو اور واقعہ کی صورت آنکھوں میں پھر جائے"۔ پھر انھوں نے مرزا صاحب مرحوم کے کلام سے دخترِ شاہِ حلب کی روایت پیش کرکے لکھا ہے کہ "یہ روایت بالکل بلاغت اور مقتضائے حال کے خلاف ہے"۔

جواب روایت دختر شاہ حلب

اگرچہ رسومِ عرب اور رسومِ ہند میں بہت کچھ تفاوت ہے اور وہاں کے اکثر دستور اس ملک سے علیحدہ ہیں، مثلاً عورت اور شوہر کے تعلقات میں جن باتوں کو یہاں ناجائز اور خلافِ شرم و حیا سمجھا جاتا ہے وہاں اُن کو جائز اور روا رکھا گیا ہے؛ لیکن چونکہ مرثیہ گویوں نے تمام واقعات کو رسومِ عرب کے موافق نہیں، بلکہ رسم و رواجِ ہند کے مطابق نظم کیا ہے، اس لیے بلحاظِ رسومِ ہند اس روایت میں بین کے چند الفاظ کسی قدر نگاہوں میں کھٹکتے ہیں۔ اصل روایت کے متعلق تو کچھ بحث کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ کیونکہ یہ تاریخی بات ہے جس کی تنقیح سے قابل مؤلف کو کچھ غرض نہیں، رہا دخترِ شاہِ حلب کا اظہارِ غم، وہ بھی مقتضائے فطرت ہے، کیونکہ ایک مقتدر خاندان میں منسوب ہوجانے کے بعد منسوب شوہر کا اس بیکسی اور ظلم سے قتل ہوجانا ایسا دلخراش واقعہ ہے کہ اگر منسوبہ لڑکی نے زیادہ اظہارِ حزن و ملال کیا ہو تو جائے تعجب نہیں۔ البتہ چند الفاظ جنکا بین کے موقع پر استعمال کیا گیا ہے وہ بلحاظِ رسومِ ہند مستبعد معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن اس امر کو پیشِ نظر رکھنا چاہیے کہ ہر زمانہ کی شاعری

سوسائٹی اور مذاقِ عام کی تابع ہوا کرتی ہے۔ مرثیہ گویوں کو اپنا کلام ہر خیال اور ہر مذاق کے لوگوں کے کانوں میں پہونچانا، اور ہر طبیعت کو محظوظ کرنا پڑتا ہے، اور علتِ غائی اور مقصودِ اصلی اُن کا رونا رُلانا ہے۔ اس مقصود کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے اور اس کی پابندی کرتے ہوئے کبھی کبھی اپنے خلافِ مزاج اور خلافِ عادت بعض واقعات مجبوراً ایسے بھی نظم کرنے پڑتے ہیں جنکو ایک سنجیدہ اور گہری نگاہ ڈالنے والا شخص حدِ اعتدال اور جادۂ معقولیت سے متجاوز سمجھے گا؛ اور یہ وہ مجبوریاں ہیں جن سے کوئی مرثیہ گو حتیٰ کہ میر صاحب مرحوم بھی باوجود اسقدر احتیاط اور فطرت وجذباتِ انسانی کی نکتہ شناسی کے محفوظ نہیں رہ سکے چنانچہ میر انیس اور دوسرے مرثیہ گویوں کے ایسے اشعار جن میں ایک رات کی بیاہی جناب کبرٰا کی اپنے شوہر حضرت قاسمؑ سے رخصت، اور پھر اُن کی لاش پر اُن کا نام لیکر بین اور ماتم کرنے کے حالات درج ہیں، اہلِ ہند کے قانونِ شرم وحیا سے کسی قدر متجاوز ہیں، اور بلحاظِ رسومِ ہند عجیب و غریب معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن مرثیہ گو جسکا مقصودِ اصلی گریہ وزاری کرانا۔ اور مضامینِ مصائب سے دلوں کو متاثر کرنا۔ اور ہر قسم اور ہر مذاق کے لوگوں کی طبیعت اور پسند کے موافق اپنے کلام کا اندازہ رکھنا ہے، ان معمولی مسامحات سے بچ نہیں سکتا۔

روایتوں کے بارے میں مولانا آزاد کی رائے

اس قسم کے اعتراضوں کے جواب میں جو کچھ مولانا آزاد صاحب نے لکھا ہے، وہ اس اعتراض کے فیصلے کے لیے ہی کافی ہوگا، اس لیے ہم اُن کی عبارت کو بجنسہ نقل کر دینے کے بعد اس بحث کو ختم کرتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ "یہ اعتراض حریفوں کا درست ہے کہ بعض ضعیف روایتیں اور دلخراش مضامین ایسے نظم ہوگئے ہیں جو مناسب نہ تھے، لیکن انسان کی طبیعت ایسی واقع ہوئی ہے کہ جب ایک مقصود کو مدِ نظر رکھ کر اُسپر متوجہ ہوتا ہے،

تو اور پہلوؤں کا خیال بہت کم رہتا ہے۔ انہیں ایسی مجلسوں میں پڑھنا ہوتا تھا جہاں ہزار ہا
آدمی دوست اور دشمن جمع ہوتا تھا، تعریف کی بنیاد گریہ و بکا اور لطفِ سخن اور ایجادِ
مضامین پر ہوتی تھی۔ کمال یہ تھا کہ سب کو رولانا اور سب کے منہ سے تحسین کا نکلنا،
اس شوق کے جذبہ اور فکرِ ایجاد کی محویت میں جو کچھ قلم سے نکل جائے تعجب نہیں۔
نکتہ چینی ایک چھوٹی سی بات ہے، جہاں چاہا دو حرف لکھ دیئے۔ جب انسان تمام عمر
اسی میں کھپا دے تب معلوم ہوتا ہے کہ کتنا کہا اور کیسا کہا؟[1]

اس کے بعد لائق مؤلف لکھتے ہیں کہ مرثیوں میں جو مضامین قدرِ مشترک کے طور پر
ہیں وہ یہ ہیں۔ آمادگیِ سفر۔ راہ کی تکالیف۔ اور صعوبتیں الخ۔ چنانچہ سفر کی طیاری
کے متعلق بلاغت کا یہ اقتضا ہے کہ سفر کے وقت جو جو واقعات اور حالات پیش آتے ہیں
اُن کی تصویر کھنچی جائے۔ سفر کی آمادگی۔ سواریوں کی تقسیم۔ زادِ سفر کا انتظام، دوست
احباب کے وداعی جذبات۔ بھائی بہنوں اور عزیزوں کی گریہ وزاری وغیرہ وغیرہ۔

(۲) دو حریفوں کی لڑائی میں یہ واقعات بیان کیے جائیں۔ دونوں کے سراپا۔
ڈیل ڈول۔ اسلحۂ جنگ کے سجنے کا نقشہ۔ دونوں نے فنِ جنگ میں کیا کیا ہنر
دکھائے وغیرہ وغیرہ۔

مگر مولف نے اس موقع پر مثالیں اس وجہ سے قلم انداز کر دی ہیں کہ آگے چلکر واقعہ
نگاری اور اظہارِ جذبات وغیرہ کے عنوانوں میں جو مثالیں آئیں گی وہی بلاغت کے لیے
بھی کافی ہونگی۔ لہذا ہم بھی مرزا دبیر صاحب کے کلام سے ان واقعات کی مثالیں یہاں
قلم انداز کرتے ہیں۔ ناظرین ہماری کتاب میں بھی ان مثالوں کو اُسی موقع پر ملاحظہ فرمائیں

[1] آب حیات صفحہ ۵۰۲

جہاں مؤلف نے میر صاحب کے کلام سے اس قسم کی مثالیں تحریر کی ہیں۔

(۳) پھر لائق مؤلف لکھتے ہیں کہ "واقعات کے بیان میں جس رتبہ اور درجہ، اور جس سن و سال کے لوگوں کا ذکر آئے اُسی قسم کے طرزِ خیال اور طریقِ ادا کو ملحوظ رکھا جائے بوڑھے۔ بچے۔ جوان۔ مرد عورت۔ کنواری۔ بیوہ۔ آقا غلام۔ نوکر چاکر۔ غرض جس کی زبان سے جو خیال ظاہر کیا جائے اُس کی زبان اور طرزِ خیال کی تمام خصوصیتوں کو قائم رکھا جائے۔" اس کے بعد میر انیس اعلی اللہ مقامہ کے کلام سے ان موقعوں کی بہت سی نادر مثالیں درج کی ہیں جو میر صاحب مرحوم نے نہایت خوبی سے نظم فرمائی ہیں۔ لہٰذا اس موقع پر ہم بھی مرزا صاحب کے فصیح و بلیغ کلام سے چند نفیس نظیریں پیش کیے دیتے ہیں۔

مثلاً حضرت امام حسینؑ کے سفر کے وقت حضرت عباسؑ کی والدہ امام علیہ السلام کو سفر سے روکتی ہیں۔ ؎

حضرت سے کہا مادرِ عباسؑ نے اُس دم	واری گئی گر قصد ہے کوفے کا مصمّم
جیسے گئے اب، جیسے گئے بعدِ محرّم	دیکھو تو میں واری، کہ ہے کیا گرمی کا عالم

رخصت کرو قاسمؑ کو نہ ہم شکلِ نبیؐ کو
صدقے گئی تم بھیج دو عباسؑ علیؑ کو

امِّ سلمہؓ بھی یہی رو رو کے پکاری	کوفے میں تو جانا ہی مناسب نہیں واری
ضربت سرِ حیدرؑ پہ لگی تھی وہیں کاری	آخر وہی کوفہ ہے، وہی خلق ہے ساری

بن جائیگا سب کام یہیں حق کی مدد سے
صدقے گئی تم جاؤ نہ نانا کی لحد سے

یا مثلاً جب امام حسینؑ اپنی صاحبزادی حضرت صغرٰاؑ کو سفر میں لیجانے سے انکار کرتے ہیں تو وہ حضرت علی اکبرؑ سے سفارش کی خواستگار ہیں۔ ؎

آئے علی اکبرؑ تو پکاری وہ دل افگار
دعوے ہی ہمیں تم پہ گواہ اس کا ہے غفار
پیاری ہے سکینہؑ چلی ہمراہِ علمدار
بیچلتے ہو بھیّا ہمیں یا کرتے ہو انکار؟

گر بالی سکینہؑ علی اصغرؑ کی بہن ہے
صغراؑ کو یہ ہے فخر کہ اکبرؑ کی بہن ہے

یا مثلاً جب حضرت صغراؑ کو سفر میں ساتھ جانے سے مایوسی ہوئی تو وہ حالتِ اضطراب میں اپنے بزرگوں کی شکایت کرتی ہیں کہ سب کو دوسرے بہن بھائیوں سے الفت ہے مگر ان کی محبت کسی کے دل میں نہیں۔ ؎

ہاتھ پکڑے ہوئے اکبرؑ کا ہیں بابا طیّار
یہ نہ جانا ہے مرے دم سے لگی اک بیمار
بھیّا اصغرؑ کو لیے ہوگئیں امّاں بھی سوار
رو کے مجرا تو لیا اور نہ کہا برخوردار

ٹھہرو اے صاحبو ٹھہرو، مجھے آ لینے دو
بھیّا اصغرؑ کو کلیجے سے لگا لینے دو

مجکو الفت ہی تمھاری نہیں الفت ہی نہیں
امّاں لیں گود میں، ایسی مری قسمت ہی نہیں
ساتھ دوڑوں جو سواری کے سو طاقت ہی نہیں
پیار آجائے پدر کو سو یہ صورت ہی نہیں

لونڈیاں ساتھ چلیں آج عزیزوں کی طرح
میں جو بیٹی تھی رہی گھر میں کنیزوں کی طرح

پھر اپنے مرض کی شدت یاد دلا کر کہتی ہیں کہ اس نازک حالت میں مجکو تنہا چھوڑ جانا کسقدر نامناسب ہے ایسی حالت میں تو غیر بھی پاس سے علیحدہ ہونا پسند نہیں کرتے۔ ؎

یک بیک میرے مقدّر کا بگڑنا دیکھو
بات کرنے میں ذرا سانس اُکھڑنا دیکھو
پاؤں پڑتی ہوں مرا پاؤں رگڑنا دیکھو
حال یہ، اُس پہ عزیزوں کا بچھڑنا دیکھو

غیر بھی ایسے مریضوں کو نہ تنہا چھوڑیں
حیف ہے بیٹی کو اسوقت میں بابا چھوڑیں

ہائے اب میں ہوں یہ تنہائی ہے اور سونا گھر
دل کے بہلانے کو تم سب گئے ہیں بھیّا صغرٰا
نہ خبر مجکو تمھاری، نہ تمھیں میری خبر
خالی جھولے سے میں ٹکراؤں گی یاں پٹک کر سر

اُفتیں دیکھ کے ایک ایک کی میں سیر ہوئی
ہائے اللہ مری موت کو کیوں دیر ہوئی

دردِ سر۔ سوزشِ دل۔ رنجِ بخار ایک طرف
سو علاج ایک طرف، آپ کا پیار ایک طرف
اور یہ ہجرِ شہِ عرش وقار ایک طرف
لاکھ چین ایک طرف، شہ کا کنار ایک طرف

نازکی کے بعد بحث ہم کلام

گر قضا ہے تو فراقِ شہِ ابرار سے ہے
گر شفا ہے تو اسی شربتِ دیدار سے ہے

دوسرے مرثیہ میں ایک موقع پر لکھا ہے کہ جب امام حسینؑ حضرت صغرٰاؑ سے رخصت ہو کر چلے ہیں تو کچھ دیر کے بعد وہ پھر بیقرار ہو کر محملوں کے پیچھے دوڑی آئیں اُسوقت حضرت شہر بانوؑ کس مادرانہ محبت کے انداز سے اُن کو رخصت کرتی ہیں

بانوئے حزیں پردہ اُلٹ کر یہ پکاری
تھرّاتے ہوئے پاؤں سے آنیکے میں واری
تکلیف نہ کر اے مری بی بی مری پیاری
جا گھر کو، تجھے صبر دے اب ایزدِ باری

اب ننھا سا سجّادہ بقیعہ میں بچھا کر
زہرٰا کے مسافر کے لیے حق سے دعا کر

یا مثلاً حضرت علی اصغرؑ کے پیاس سے جاں بلب ہونیکے وقت، اُن کی ماں کی مضطربا
حالت کا اس طرح نقشہ کھینچا ہے ؎

بانوؑ کے شیر خوار کو ہفتم سے پیاس ہے
نے دودھ ہے، نہ پانی کے ملنے کی آس ہے
بچّے کی نبض دیکھ کے، ماں بے حواس ہے
پھرتی ہے آس پاس، یہ جینے سے یاس ہے
کہتی ہے کیا کروں میں دُہائی حسینؑ کی
پُتلی پھری ہے آج مرے نورِ عین کی

اب کس کی بامراد بڑھاؤں گی ہنسلیاں
تیور بدل بدل کے پھراتے ہیں پُتلیاں
ہے ہے، کرخت ہو گئیں یہ نرم اُنگلیاں
لے لیکے اُلٹی سانس گراتے ہیں ہچکیاں
باقی حواس پیاس سے معصوم کے نہیں
مُنہ میں انگوٹھے لیتے ہیں اور چوستے نہیں

مگر جب امام حسینؑ کے آنے سے اُن کو افاقہ ہوگیا تو ماں کس طرح اپنی مسرت کا اظہار
کرتی ہیں۔ مستورات کی طرزِ گفتگو اور اظہارِ خیالات پر بھی غور کرو ؎

ہاتوں پہ لے چلے جو اُسے شاہِ اتقیا
سیدانیوں کے پاؤں پہ پھر سر کو رکھ دیا
بانوؑ پکاری لونڈی کو صاحب جلا لیا
بولی خدا نے سب کی دعا سے کرم کیا
لب پر تبسّم آنکھوں سے شہ کے نظارے ہیں
ہم تم کوئی نہیں، انہیں بابا ہی پیارے ہیں

یا مثلاً امام حسینؑ کی رخصت کے وقت جناب زینبؑ فرماتی ہیں ؎

امّاں ہیں میرے سر پہ، نہ سایا ہے باپ کا
بھائی! فقط بہن کو بھروسا ہے آپ کا

یا مثلاً جب امام حسینؑ کربلا میں پہونچے تو حضرت زینبؑ اُس مقام کی وحشت

اور گرمی سے گھبرا کر فرماتی ہیں ؎

زینبؑ حسینؑ کے لیے ہو ہو کے بیقرار
کہتی تھی ڈھال روک لو مُنہ پر بہن نثار

گرمی غضب ہی، باگ اُٹھائے ہوئے چلو
اکبرؑ کو بھی سپر میں چھپائے ہوئے چلو

یا مثلاً جب امام حسینؑ نے حضرت عباسؑ کو علم دیا ہی تو حضرت زینبؑ خوش ہو کر اُن کی شان و شوکت کی ثنا کرتے ہوئے دونوں بھائیوں کو دعا دیتی ہیں ؎

زینبؑ پکاری شاہِ نجف یاد آتے ہیں
کس شان سے علم لیے عباسؑ جاتے ہیں

یارب، نشان والے کا نام و نشاں رہے
لشکر رہے، حسینؑ رہے، یہ نشاں رہے
یہ شمس بے زوال، یہ گُل بے خزاں رہے
اس حاملِ علم پہ علیؑ کی اماں رہے

روشن رہے قمر شہِ بدر و حُسینین کا
وہ خاک میں ملے جو ہو دشمن حسینؑ کا

یا مثلاً حضرت زینبؑ اپنے صاحبزادوں پر خفا ہوتی ہیں کہ اُنھوں نے حصولِ شہادت میں کیوں اسقدر تاخیر کی، تو اُن کی محبت آمیز خفگی کا اظہار ان الفاظ میں کیا ہی ؎

کس دن کے لیے سیکھا ہی نیزوں کا ہلانا
کیا بھول گئے تیر کا تودے پہ لگانا
گر آج ہی بھالا کسی شامی پہ نہ تانا
ماموں کے حریفوں کا کرو آج نشانا

جو رنگ لگاتے تھے ہر اک روز وطن میں
اک دو کو بھی جو رنگ نہ تم نے کیا رن میں

کیا پوچھوں میں اکبرؑ کو بُلا کر یہ کیا ہے
شاگردوں کو اپنے یہی تعلیم کیا ہے

بابا کو تمھارے لکھوں، کیا قہر کی جا ہے　　صاحب کے پسر جیتے ہیں حُرؑ قتل ہوا ہے

اولاد سے گر چرخ یونہی شاد کرے گا
کاہے کو کوئی خواہشِ اولاد کرے گا

یا مثلاً جب یزید کی بیوی ہند زندانِ شام میں اہلِ حرم کے دیکھنے کو روانہ ہوئی ہے تو لونڈیوں اور پیش خدمتوں کی خوشامدانہ تقریر کو اس طرح ادا کیا ہے ؎

منت ہے خواصوں کی کہ چادر کو سنبھالو　　یہ رستہ ہے، چہرہ کو برقع میں چھپا لو
وہ کہتی ہے اب ذکر نہ پردے کا نکالو　　چادر کے عوض خاک مرے چہرے پہ ڈالو

کیونکر نہ زمانہ اُسے ان حالوں سے دیکھے
جو خواب میں زہراؑ کو کھلے بالوں سے دیکھے

پھر لونڈیاں باضطراب قید خانہ کی طرف جاتی ہیں اور خوف کے مارے پلٹ کر ہند کو وہاں جانے سے اس طرح منع کرتی ہیں ؎

باندھے ہوئے دامن کو کنیزیں کئی ہشیار　　بڑھ بڑھ کے خبر دیتی ہیں زندان کی ہر بار
کہتی ہیں کہ اے بی بی قیامت کے ہیں آثار　　ہے ہے موئے بے موت یہ زنداں کے گرفتار

در بند ہے، دم رکتا ہے، بیہوش پڑے ہیں
تلواریں نکالے ہوئے دربان کھڑے ہیں

بیرونِ خرابہ کئی سر نیزوں پہ ہیں آہ　　کوئی ہے ستارہ، کوئی خورشید، کوئی ماہ
روتی ہیں جو بیویں تو وہ تھراتے ہیں واللہ　　گھر پھر چلو، تم دیکھو نہ یہ صدمۂ جانکاہ

جب ہائے حسیناؑ کوئی مظلومہ کہے گی
اے توبہ! انھیں سُننے کی کب تاب رہے گی

ان بندوں میں ظاہر کیا گیا ہے کہ لونڈیاں کسی حیلہ اور ترکیب سے ہند کو قید خانہ میں جانے سے روکنا چاہتی ہیں۔ اس غرض کے حاصل کرنے کے لیے اُنھوں نے کئی تدبیریں کیں۔ پہلے تو یہ کہا کہ بی بی قید خانہ میں تو قیامت کے آثار ہیں، دربند ہے، جانے سے دم رُکتا ہے، دروازہ پر خوفناک تلواریں لیے ہوئے دربان پہرہ دے رہے ہیں، پھر یہ قید خانے کے باہر بہت سے سر نیزوں پر لٹکے ہوئے ہیں، بھلا یہ عبرت ناک سین تم سے دیکھا جائیگا؟ پھر یہ کہ عورتیں دلخراش بین کر رہی ہیں۔ یہ آہ و زاری سُننے کی تم کو کب تاب ہوگی!

مگر ہند نہیں مانتی اور زنداں کی طرف برابر قدم اُٹھائے چلی جاتی ہے۔ نہ پردے کا خیال ہے نہ عزت و حشمت کا دھیان۔ جب قید خانے کے قریب پہونچی تو لونڈیوں نے زیادہ اصرار کیا کہ اب قید خانہ قریب آگیا، دربان دروازہ پر موجود ہیں، اب بے پردہ رہنا بالکل غضب ہے۔ چنانچہ اس خوشامدانہ تقریر کو کس خوبی سے ادا کیا ہے

پہونچی درِ زنداں کے برابر جو سواری
بولیں کہ ردا اوڑھ لو، ہم آپ پہ واری
تب ہند کے قدموں پہ گریں لونڈیاں ساری
کل ہم پہ نہ حاکم کا غضب ہو کہیں طاری
دربان تمھیں دیکھ کے کیا دل میں کہیں گے
ہمچشموں کے بی بی پہ سدا طعنے رہیں گے

یہ مجمع زنداں کے قریب پہونچا تو حضرت علی اکبرؑ کے سر کے شکوہ اور تجمل کو دیکھ کر لونڈیاں دنگ رہ گئیں اور حیرت ناک لہجہ میں کنیزانہ ادب کے ساتھ دریافت کرتی ہیں

کوئی سرِ اکبرؑ پہ نظر کرکے پکاری
ہمشکلِ نبیؐ کہتی ہے خلقت اسے ساری
بی بی! یہ پیمبرؐ تو نہیں؟ میں ترے واری
آگے تو مدینے میں سکونت تھی تمھاری

پہچانو تو، ہمشکلِ نبیؐ ہے کہ نبیؐ ہے؟
یہ اور کوئی ہے کہ رسولِؐ عربی ہے؟

دیکھو ان اشعار میں کنیزوں کی ناواقفیت، اور جہالت کی، جو اُن کی فطرت میں داخل ہے، کس بلاغت کے ساتھ تصویر کھینچ دی ہے۔ وہ باوجودیکہ خود کہتی ہیں کہ لوگ حضرت علی اکبرؑ کو ہمشکلِ نبیؐ کہتے ہیں نہ نبیؐ اس پر بھی اُن کو لوگوں کے کہنے کا یقین نہیں اور ہندے سے دریافت کرتی ہیں کہ یہ ہمشکلِ نبیؐ ہے یا خود رسولِ عربی؟ یعنی اس بے خبر فرقے کو یہ بھی معلوم نہیں کہ رسول اللہ کس زمانے میں تھے اور کب رحلت فرمائی۔ یہ شام کے جاہل لوگوں کے خیالات کا حقیقت میں اصلی اور سچا نقشہ ہے جسکی تاریخیں بھی شاہد ہیں۔

جب ہند قید خانے کے دروازے پر پہونچی تو دربانوں سے دروازہ کھولنے کو کہا اُسوقت ے

دربان پکارے کہ ہے انکار ہمیں کیا	پر آپ کی تکلیف کا ہے دھیان سراپا

کل دیکھیو بُلوا کے محل میں انہیں دن کو
اِک رسّی میں ہم باندھ کے لے آئینگے ان کو

غور کرو دربانوں کی خوشامدانہ فطرت کا کس طرح اظہار کیا ہے اور اسی ضمن میں یہ تحقیرانہ فقرہ کسقدر دلخراش ہے کہ آپ قید خانے میں جانے کی کیوں تکلیف اُٹھاتی ہیں۔ کل انکو محل ہی میں دیکھ لینا، ہم سب کو ایک رسّی میں باندھکر حضور میں پیش کر دینگے۔

مگر جب ہندے نے نہ مانا تو دربانوں نے اس خیال سے کہ بادشاہِ وقت کی بی بی کا کسی مرد سے سامنا نہو، لونڈیوں سے فرمائش کی ے

جو مرد ہو باہر اُسے زنداں سے نکالو
بچّوں کو بھی گودی سے اسیروں کی اُٹھالو

پردہ کے اہتمام میں خوشامدانہ مبالغہ کی کسقدر انتہا ہی "بچّوں کو بھی گودی سے اسیروں کی اُٹھالو" دنیوی بادشاہوں کے محلات میں جو نمائشی اہتمام ہوتا ہی اُس کی کیسی صحیح اور سچّی تصویر ہے۔

مرزا صاحب کی طرح میر صاحب نے بھی ایک ایسے ہی موقع پر پردہ کے اہتمام، اور دربانوں کی تحقیرانہ فرمائش کا سماں باندھا ہی۔ یعنی دربانوں نے اس خیال سے کہ قید خانہ میں امام زین العابدینؑ بھی ہیں اور وہ نامحرم ہیں، اہلِ حرم کی طرف مخاطب ہو کر کہا ہے۔ ؎

یا تو بیمار کی آنکھیں اُسے را بند کریں		یا ہم آکر کسی حجرہ میں جُدا بند کریں

ترکیب کی ساخت، الفاظ کی روانی۔ اور بحر کی چستی نے میر صاحب کے شعر کو بلند کر دیا ہی، لیکن معنی کی بلاغت مرزا صاحب کے پُر مضمون شعر میں نہایت خوبی کے ساتھ پائی جاتی ہی۔ چنانچہ تحقیر و تذلیل کا دلخراش پیرایہ بھی اُسی میں زیادہ ہی، کیونکہ امام زین العابدینؑ کی آنکھیں بند کرنے، یا اُن کو کسی حجرہ میں جُدا بند کرنے کی بہ نسبت، زنداں ہی سے باہر نکال دینے کی فرمائش میں تحقیر کا پہلو زیادہ پایا جاتا ہی۔ اس کے علاوہ پردہ کے اہتمام میں دربانوں کا جھوٹا اور نمائشی مبالغہ بھی مرزا صاحب کے شعر میں موجود ہی جو میر صاحب کے ہاں بالکل نہیں، کیونکہ اُنھوں نے پردہ کے اہتمام کا یہ پہلو رکھا ہی کہ دربانوں نے حضرت زین العابدینؑ کو جو بالغ اور نامحرم ہیں حاکمِ وقت کی بیوی کے سامنے سے ہٹانا چاہا ہی جو ایک معمولی بات ہی نہ اس میں کوئی خوشامد ہی نہ مبالغہ، کیونکہ بالغ مردوں کو

عورتوں کے سامنے سے علیحدہ کرہی دیا کرتے ہیں۔ لیکن مرزا صاحب نے یہ اظہار کیا ہی کہ دربان نہ صرف مردوں کو علیحدہ کرتے ہیں بلکہ اُنھوں نے بچّوں کو بھی گودیوں سے اُٹھا لینا چاہا ہی۔ جو انتہا درجہ کی جھوٹی خوشامد اور حد سے زیادہ نمائشی مبالغہ ہے اور صاف معلوم ہوتا ہی کہ اُنکے جادو نگار قلم نے پردہ کے اہتمام میں دربانوں کی خوشامدانہ فطرت کی کیسی سچّی اور اصلی تصویر کھینچدی ہی۔

یا مثلاً حضرت قاسمؑ میدانِ جنگ کو جاتے ہیں تو جناب سکینہؑ دامن تھام کر روکتی ہیں، چنانچہ اُن کے صغرسن کے لحاظ سے روکنے اور منع کرنے کو کس پیرایہ میں ادا کیا ہی۔ ؎

بنتِ شبیرؑ نے رونے سے جو فرصت پائی
نیگ مہدی کا بھی دو کنگنے کی بھی بندھوائی

کہا قاسمؑ سے کدھر جاتے ہو دولھا بھائی
چلو گھر میں، کہ ہی بیہوش مری ماں جائی

آہ و زاری کا بھی کچھ دہیان نہیں لاتے ہو
چھوڑ کر تم مری خواہر کو کہاں جاتے ہو؟

عقد کی صبح دُلہن کو کوئی رُلواتا ہے؟
کوئی اس طرح عزیزوں پہ غضب ڈھاتا ہی

ساس کے گھر سے کوئی روٹھ کے یوں جاتا ہی
اماں روتی ہیں، یہ بھائی تمھیں خوش آتا ہی؟

کیا ہوا گو کہ بلند آہ نہیں ہوتی ہے
چلکے تم دیکھ لو، گھونگٹ میں دُلہن روتی ہے

یا مثلاً جب ہند قید خانے میں آئی ہی تو اُس کی بیٹی بھی ہمراہ تھی۔ وہ جناب سکینہؑ کو اپنا ہمسن پاکر اُنکے پاس گئی، اُسوقت دونوں کی طفلانہ طرزِ گفتگو، اور اظہارِ خیالات کو کس انداز سے ادا کیا ہی۔ چھوٹے بچّے جب اپنے ہم عمروں سے ملتے ہیں تو ایسے موقعوں پر

آپس میں جس قسم کی گفتگو کیا کرتے ہیں اُس کی بعینہٖ تصویر کھینچ دی ہے۔ اسکے ساتھ ہی زبان کی صفائی پر بھی غور کرو۔

زینبؑ تو بیاں کرتی تھی یہ ہند سے رو کر — تھی پاس سکینہؑ کے کھڑی ہند کی دختر
کہتی تھی بہن آتا ہے رونا مجھے تجھ پر — کُرتا ہی پھٹا سی نہیں دیتیں تمھیں مادر
ہم غیروں کے دل پر ترے نالوں کا اثر ہے
اللہ، تری ماں کا بھی کیا سخت جگر ہے !!

بھنیا! مری ماں تو مجھے کرتی ہے بہت پیار — پوشاک بھی اک دن میں بدلتی ہے کئی بار
ماں تیری عجب ہے، جو ہے اس دُکھ کی رَوادار — کنگھی بھی ترے بالوں میں کرتی نہیں زنہار
صورت تو ہے واللہ بہت آپ کی پیاری
تم ماں کی بہت پیاری ہو یا باپ کی پیاری؟

تب اک نفسِ سرد سکینہؑ نے بھرا آہ — فرمایا میں کیا حال سے اپنے کروں آگاہ
تم ماں کی ہو پیاری تو مبارک کرے اللہ — ہم دُکھ میں ہیں کیا چاہیے ہم کو حشم و جاہ
تم خلعتِ زر پہنو کہ آرام ہے تم کو
کُرتا جو پھٹا ہے مرا کیا کام ہے تم کو

ماں باپ کو اپنے تو کبھی ہم بھی تھے پیارے — بابا تھے، برادر تھے، چچا بھی تھے ہمارے
سارے یہ مرے چاہنے والے گئے مارے — تم خوش ہو کہ ماں باپ سلامت ہیں تمہارے
راحت سے ہمیں کام نہ سونے سے غرض ہے
زنداں کے گرفتاروں کو رونے سے غرض ہے

کُرتا ہی نہیں چاک جگر بھی ہے مرا چاک — گھر لُٹ گیا، اسباب جلا، چھن گئی پوشاک

بابا نہیں، جو گرد مرے مُنہ سے کرے پاک | ماں اپنے ہی دُکھ میں ہے مری غور کرے خاک

تم ہم سے نہ بولو کہ دل افگار ہیں بی بی
ہم سب ترے بابا کے گنہگار ہیں بی بی

دل ہند کی بیٹی کا اُمنڈ آیا یہ سُن کر | اور باندھ کے ہاتوں کو کہا، چل تو مرے گھر
پوشاک پنہاؤں میں ضیافت کروں خواہر | وہ بولی یہی گھر ہے ہمارے لیے بہتر

زندان میں رہنے دے ہمیں یاد پدر ہیں
کیا جاؤں پھٹے کرتے سے ہنیا ترے گھر میں

یا مثلاً حضرت عباسؑ جب فوج میں گھر گئے تو جناب سکینہؑ اس خیال سے کہ وہی اُن کی شہادت کا باعث ہوئیں، سراسیمہ ہو کر اظہارِ ملال کرتی ہیں اور بچپن کے انداز سے اُن کو میدانِ جنگ سے بُلا لینے کی تدبیر بتاتی ہیں ؎

شرما کے یہ کہنے لگی وہ نازوں کی پالی | ہے ہے یہ بَلا میں نے چچا جان پہ ڈالی
قربان ہوئی نہر پہ میں بھیجنے والی | اللہ نہ ٹوٹے کمرِ سیّدِ عالی

جس وقت بلائیں میں چچا جان کی لونگی
یہ بالیاں کانوں کی تری راہ میں دونگی

ہے ہے کہیں اس ظلم و ستم کا ہے ٹھکانا | سقّے پہ سُنا ہے کہیں تلوار اُٹھانا
کوئی بھی روا رکھتا ہے سیّد کا ستانا | جائز ہے کسی پیاسے سے پانی کا چھپانا

ہفتم سے غذا کھائی ہے نے پانی پیا ہے
بیرحموں نے کس دُکھ میں ہمیں ڈال دیا ہے

اچھی مری اماں، مرے سقّہ کو بلاؤ | کہدو کہ سکینہؑ ہوئی آخر ادھر آؤ

اب پانی نہیں چاہیے تابوت منگاؤ | کاندھے سے رکھو مشک جنازہ کو اُٹھاؤ

ملنے مری میّت کے گلے آئینگے عباسؑ
یہ سُنتے ہی گھبرا کے چلے آئینگے عباسؑ

یا مثلاً جب دشمنوں نے جھوٹی خبر اُڑائی کہ حضرت عباسؑ ہم سے مل گئے اور یہ خبر بچّوں نے بھی سُنی، تو اُنکے طفلانہ خیالات اور بچپنے کی گفتگو کو کس پیرائے میں ادا کیا ہے :-

سُنکر یہ سخن حضرتِ عبّاسؑ کا دلدار | لپٹا شہِ مظلوم کی گردن سے بس اکبار
پھر بیٹھ کے زانو پہ یہ کرنے لگا گفتار | اے امّاں، نہ بابا سے تم اب بولیو زنہار

ہم آج سے بابا شہِ والا کو کہیں گے
وہ جائیں کہیں، ہم تو چچا پاس رہیں گے

گھبرا کے سکینہؑ نے کہا اے شہِ ذیشاں | بتلاؤ تو، کیوں چھوٹتے ہیں ہمکو چچا جاں ؟
کیا کچھ مری سقّائی سے آزردہ ہیں اس آں | میں اُن کو منالاتی ہوں جا کر سوئے میداں

میں رونے لگونگی تو کہاں جائینگے عبّاسؑ
اُنگلی جو پکڑ لونگی چلے آئیں گے عبّاسؑ

پھر جب حضرت عبّاسؑ کی بیوی نے اُن کو امام حسینؑ کی طرف سے جنگ کرتے ہوئے دیکھا تو خوش ہو کر اہلِ حرم سے اس طرح بیان کرتی ہیں :-

دیکھو تو کہ یہ زخم ہیں کس شوق سے کھاتے | اور مشک سکینہؑ کی ہیں تیروں سے بچاتے
پایا ہی جو پانی تو ہیں ہنستے ہوئے آتے | اسوقت ستمگر نہیں کچھ دھوم مچاتے

اک دوش پہ مشکیزہ ہے اور اک پہ نشاں ہے

خلعت وہ مدینے کی حکومت کا کہاں ہے

اب جاکے یہ مژدہ کوئی پیاسوں کو سناؤ
معصوم سکینہؑ ہی کہاں اُس کو بلاؤ
اے بی بی ہو آغوش میں بچوں کو لے آؤ
عموں کی سواری کا تماشا تو دکھاؤ

پانی مرے والی نے جو تدبیر سے پایا
یہ پیاسی سکینہؑ ہی کی تقدیر سے پایا

جناب حسنینؑ ماں سے لباسِ عید مانگتے ہیں۔ اُن کی طفلانہ ہٹ کی تصویر

بیٹوں نے عرض کی کہ بجاے فلک جناب
پر بے لباسِ عید کو ہوگا بہت حجاب
ہم خادموں پہ آپ کی شفقت ہی بیحساب
ابتو جہاں سے جانو، مہیا کرو شتاب

دعوے ہیں قدویوں کو تمھارے بڑے بڑے
لینگے اسی گھڑی نئے کپڑے کھڑے کھڑے

امّاں! لباسِ عید منگا دو ابھی ابھی
کیا جانیں ہم، کہیں سے منگا دو ابھی ابھی
تیار ہوں تو لا کے دکھا دو ابھی ابھی
رکھ کر سرہانے سوئیں گے لا دو ابھی ابھی

سرتاجِ اوصیاے سلف کے پسر ہیں ہم
آپہونچی سر پہ عید بھی اور ننگے سر ہیں ہم

یا مثلاً جب حضرت علی اکبرؑ نے ماں باپ سے اجازت لیکر میدانِ جنگ کا قصد ظاہر کیا اور یہ خبر حضرت زینبؑ کو بھی مل گئی تو اُن کو ملال ہوا کہ بغیر میری مرضی کے ماں باپ نے رخصت دیدی ہے۔ اُسوقت اُن کی حالت اور گفتگو لکھی ہے۔

اکبرؑ کے سنانے کو یہ کہتی تھی زباں سے
جو کام کیا، پوچھ کے مجھ سوختہ جاں سے
اے عونؑ و محمدؑ تمھیں لاؤں میں کہاں سے
اب قدر ہوئی پیار کی جب چھٹ گئے ماں سے

کیا جان کے دم بھرتی تھی ہمشکلِ نبیؐ کا
سب کہنے کی باتیں ہیں نہیں کوئی کسی کا

پھر بانوؑ کے پاس آکے یہ فرمایا بہ رقّت
بچپن کے بھی کرتے ہیں، جوانی کے بھی خلعت
لو بھابی یہ ملبوس، یہ اکبرؑ کی امانت
اللہ مبارک کرے اب تم کو یہ خدمت

تم والدہ ان کی ہو، پدر سرورِ دیں ہیں
یہ آج کھلا ہم کوئی اکبرؑ کے نہیں ہیں

پھر رونے لگی بیٹھ کے داں زینبؑ ناچار
ہمشکلِ نبیؐ لپٹے یہ کہتے ہوئے اکبار
میری پھوپی امّاں، مری مالک مری مختار
میں تو ہوں غلام آپ کا کیوں آپ ہیں بیزار

ہم چاہتے ہیں۔ تم ہمیں چاہو کہ نہ چاہو
اللہ، اب اک بات پہ بندے سے خفا ہو

ہٹ ہٹ کے وہ بولیں کہ نہ یہ ذکر نکالو
دم رکتا ہے باہیں نہ گلے میں مرے ڈالو
ماں بیٹھی ہے وہ، جاؤ گلے اُس کو لگا لو
بانوؑ کی خوشامد کرو مرنے کی رضا لو

میں پیار نہیں کرتی، میں قرباں نہیں ہوتی
جاؤ میں تمھاری پھوپی اماں نہیں ہوتی

جیتی رہیں بھابی وہ ہیں حقدار تمھاری
میں کاہے کو ہونے لگی مختار تمھاری
جاؤ نہ، سواری تو ہے تیار تمھاری
اٹھارہ برس کی ہوں پرستار تمھاری

کس سے کہوں کیا خونِ جگر پیتی ہوں ہے ہے
دل پر تو چھری چل گئی اور جیتی ہوں ہے ہے

حضرت علی اکبرؑ کو جناب زینبؑ نے پالا تھا اور وہ اُن کو اپنے بچوں سے زیادہ

چاہتی تھیں۔ چونکہ اُن کو یقین تھا کہ پھوپی سے اجازت ملنا بہت مشکل ہی، اس لیے پہلے ماں باپ سے اجازت حاصل کی تاکہ پھر پھوپی سے اجازت حاصل کرنے میں آسانی ہو۔ مگر حضرت زینبؑ کو پہلے ہی سے علم ہوگیا اور ناراض ہوئیں کہ سب نے بغیر میری اجازت کے کیوں رخصت دیدی۔ اُن کی طعن آمیز تقریر کو کس خوبی سے ادا کیا ہے۔

یا مثلاً جب وقتِ سفر حضرت زینبؑ کے صاحبزادے اپنے والد سے جنگ کا اجازت نامہ لکھواتے رہ گئے اور قافلہ روانہ ہوگیا تو حضرت زینبؑ کو تردد اور قلق ہوا کہ لڑکے کیوں ہمراہ نہ آئے۔ اتنے میں بچوں نے آکر سلام کیا۔ ماں اظہارِ ناخوشی فرماتی ہیں۔ ~

بدلی میں چمکتے ہوئے دو چاند برابر
پہونچے جو قریبِ شترِ دخترِ حیدرؑ
گھوڑوں کو لگائے ہوئے پوئی سوئے لشکر
کی عرض، ہم آداب بجا لاتے ہیں مادر

غصّے میں بھری بیٹھی تھی رونے لگی زینبؑ
چلّائی کہ ماں کاہے کو ہونے لگی زینبؑ

کیا کام تھا، کیوں آئے یہاں کس لیے آئے
جاؤ وہیں سائے میں پدر تم کو بٹھائے
کچھ اب تو بہت باپ سے اخلاص بڑھائے
یاں چلتی ہی لُوں پھول سا مُنہ تونس نہ جائے

گرمی کے سفر کا تمھیں اندیشہ ہی غم ہے
سچ بھی ہی کہ سن صغرِ ششماہہ سے کم ہے

یا مثلاً جب جنابِ سکینہؑ کو پیاس سے غش آگیا تو حضرت عبّاسؑ کی بیوی نے اپنے چھوٹے بچے کو اُن کے بلانے کے لیے بھیجا، وہ جا کر کس طرز و طریقہ سے باپ کو اپنی ماں کا پیام

پہونچاتا ہے ؎

عبّاسؑ کی نعلین پہ سر اُس نے جھکایا
غازی نے کہا، شور یہ کیوں سب نے مچایا
کی عرض کہ بابا چلو، اماں نے بُلایا
بولا وہ تڑپ کر کہ سکینہؑ کو غش آیا

سانس اُلٹے بہن لیتی ہے، گردن بھی ڈھلی ہے
قرآں کی ہوا دینے سے کچھ آنکھ کھُلی ہے

شہزادی کے تلوے کبھی سہلاتی ہیں امّاں
نبض اُن کی کبھی دیکھ کے گھبراتی ہیں امّاں
بہنیا کی برابر کبھی غش کھاتی ہیں اماں
آ آ کے درِ خیمہ پہ پھر جاتی ہیں امّاں

پیغام دیا ہے یہ تمھیں غصّے میں آکر
کیوں مجکو سبک کرتے ہو پردیس میں لاکر

بی خوب سکینہ کی خبر رنج و محن میں
اب نام لہو کا نہیں پیاسی کے بدن میں
کہہ آئے تھے کیا والدہ صاحب سے وطن میں؟
سقّائی کا وقت آیا ہے، کیا کرتے ہو رن میں؟

ہے ہے یہ تغافل تو کچھ اچھا نہیں صاحب
مرتی ہے بھتیجی، تمھیں پروا نہیں صاحب

جب حضرت عبّاسؑ خیمہ میں آئے تو اُن کی بیوی کس طرح اظہار ناراضی کرتی ہیں ؎

عبّاسؑ کی زوجہ نے کہا پیٹ کے سر کو
اللہ، یہ صاحب نے کیا سخت جگر کو
اسوقت بھی کیوں آئے سکینہؑ کی خبر کو
ہے ہے میں خجالت سے نکل جاؤں کدھر کو

دیکھو جگرِ شاہِ مدینہ کا تڑپنا
زہراؑ کا تڑپنا ہے سکینہؑ کا تڑپنا

یا مثلاً جب جناب سکینہؑ نے سُنا کہ چچا مشک بھر کر آرہے ہیں تو وہ فضہ کے

کاندھے پر چڑھ کر اُن کو دیکھتی ہیں اُسوقت اُن کی باتوں کو کس انداز سے ادا کیا ہے ؎

نادان نے قبلے کی طرف ٹوپی اُتاری
دریا سے چچا جان کی آتی ہے سواری

فضہ سے کہا کاندھے پہ بٹھلا لے میں واری
دیکھیں تو کہاں دشت میں ہے مشک ہماری

ارمان ہے جو جو وہ قدم گھر کو اٹھائیں
ہم اپنے چچا جان کی لیں یاں سے بلائیں

یا مثلاً حضرت امّ سلمہؓ جناب صغراؑ کو سمجھا رہی ہیں ؎

امّ سلمہ کہتی تھی ہے ہے میں کدھر جاؤں
صغرا ترا یہ حال ہے کس طرح نہ سمجھاؤں

پردیس سے شبیرؑ کو کس طرح سے بلاؤں
اے بیٹی تو فاقہ کرے اور کھانے کو میں کھاؤں

تو غم سے گھلی جاتی ہے کیونکر نہ حزیں ہوں
آخر کو میں نانی ہوں کوئی غیر نہیں ہوں

اس کے بعد مؤلف نے بلاغت کے ایک نازک موقع کی بحث کی ہے یعنی جہاں حریفِ مخالف کا ذکر کرنا ہوتا ہے۔ دشمن کو اگر حقیر و ذلیل ثابت کیا جائے تو مقابلہ میں فتحمندی کا مرتبہ گھٹ جاتا ہے اور شان و شوکت دکھائی جائے تو مذہبی خیال کے خلاف ہوتا ہے۔ ایسے مشکل موقع پر میر صاحب جس طرح ان دو مشکلوں سے عہدہ برا ہوتے ہیں اور مدح و ذم کو پہلو بہ پہلو کہتے ہیں اُسکا اندازہ ذیل کی مثالوں سے ہوگا،، اسکے بعد میر صاحب کے کلام سے چند لطیف مثالیں لکھی ہیں۔ لہذا اس موقع پر ہم بھی مرزا صاحب کے کلام سے بالکل اُسی انداز کی دو ایک مثالیں ذیل میں درج کرتے ہیں ؎

لکھا ہے اک شجاع بڑھا فوجِ شام سے
لرزاں تھی روحِ سام کی جسکی حُسام سے

پرویز کو گریز نہ تھی، اُس کے دام سے | گردانِ روم کان پکڑتے تھے نام سے

جز عیب کفر محض ہنر وہ دلیر تھا
منہ پر جہلم پڑی تھی کہ برقع میں شیر تھا

اک پرتلہ گلے میں زری کا پڑا ہوا | قبضہ طلائی تیغِ رواں پر جڑا ہوا
نقرہ سمند، شیروں سے کشتی لڑا ہوا | نیزہ وہ جس کی زد پہ نہ رستم کھڑا ہوا

چار آئینے سے شہرِ بدن تھا حصار میں
اندھیر اُس کی ڈھال سے تھا رزم گار میں

ایک اور موقع پر لکھتے ہیں ؎

پہلو میں ابنِ سعد کے تھا ایک نابکار | بد شکل، و بد لیاقت، و بد وضع، و بد شعار
اژدر خصال۔ دیو نژاد و سیاہ کار | مکّار و پر فریب۔ و ستمگار۔ و بادہ خوار

تن میں زرہ تھی، خود سرِ بے شکوہ پر
وہ زین پر مکیں تھا کہ اژدر تھا کوہ پر

ایک اور موقع پر ؎

دو اور یلِ روم بڑھے جھوم کے اکبار | یاجوج کے دمساز، یلِ زال کے غمخوار
وہ گھوڑوں پہ یا پریوں پہ آسیب تھے اسوار | تلوار بلا۔ نیزہ غضب۔ ڈھال شب تار

مغفر جو سرِ نحس پہ مغرور دھرے تھے
اُلٹے ہوئے دو لوہے کے تنور دھرے تھے

ایک اور موقع پر ؎

وہ قلعۂ خیبر تھا تو یہ دستِ خدا تھا | وہ دودِ جہنم، تو یہ جنت کی ہوا تھا

وہ قہر میں طوفان، تو یہ خاکِ شفا تھا		وہ زور میں حاکم تھا، تو یہ حکمِ قضا تھا

یہ حق کا خلیل، اور بتِ آذر تھا وہ ناری
حیدر تھا یہ صفدر، اگر اژدر تھا وہ ناری

تسلسلِ بیان

پھر مولف لکھتے ہیں کہ "واقعات کے بیان میں بلاغت کا ایک بڑا ضروری اُصول یہ ہے کہ تسلسل ہاتھ سے نہ جانے پائے۔ اسی ضمن میں اُنھوں نے ناواقفیت سے مرزا صاحب پر اعتراض کیا ہے کہ اُنکے کلام میں ایک واقعے سے دوسرے واقعہ کی طرف منتقل ہوتے ہوئے اکثر بیان کا سلسلہ ٹوٹ جاتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مؤلف نے مرزا صاحب کا نادر کلام دیکھنے کی تکلیف گوارا نہیں کی یا وہ اُن کی حاسدانہ نگاہ میں اُسقدر وقیع ثابت نہیں ہوا جسقدر عظمت کا وہ مستحق ہے۔ اگر کوئی مرثیہ اُن کو ایسا ملا ہو جس میں تسلسل قائم نہ ہو تو یہ غالباً اُن ذاکرین کی عنایت ہوگی جو اپنی مرضی کے مطابق مرثیہ میں کمی بیشی کر دیتے ہیں، یا کہیں کے بند کہیں لگا دیتے ہیں، یا ایک شاعر کا کلام دوسرے شاعر کے کلام میں داخل کر دیتے ہیں۔ بہرحال ہم مؤلف کو اس کوتاہ نظری پر معذور سمجھ کر مرزا صاحب کے کلام سے جناب حرؑ ہی کے مرثیے میں دکھانا چاہتے ہیں کہ اُنھوں نے کس خوبی کے ساتھ تسلسلِ بیان کا خیال رکھا ہے۔ اور اسی ایک مثال سے معلوم ہو سکتا ہے کہ مؤلف نے اپنے دعوے میں کسقدر غلط بیانی سے کام لیا ہے۔

مرزا صاحب کے کلام سے تسلسل بیان کی مثال

سلسلۂ بیان اس طرح شروع ہوتا ہے کہ جب شبِ عاشور ختم ہوئی تو صبح نے دنیا کو اپنا پُرنور چہرہ دکھایا اور آفتابِ درخشاں کی ضیا بار کرنیں اُفقِ مشرق سے طالع ہوئیں اُسوقت ؎

صبحِ شبِ عاشور ہیں تھے حشر کے آثار | سجّادہ نشیں تھا پسرِ احمدِ مختار
باندھے ہوئے صف خیمہ کی ڈیوڑھی پہ تب انصار | مشغولِ نمازِ سحری تھے وہ وفادار

بھائی کے حضور آتے ہوئی جاتی تھی زینبؑ
جوں جوں یہ سحر ہوتی تھی گھبراتی تھی زینبؑ

ادھر لشکرِ اسلام طاعتِ الٰہی میں سرگرم تھا اُدھر اعدائے دیں بھی خواب سے چونکے۔ عمرِ سعد نے سردارانِ فوج سے مخاطب ہو کر کہا کہ آج کا معرکہ بڑا قیامت خیز اور ہولناک ہے، آج اُن دلیرانِ عرب سے مقابلہ ہے جن کی شجاعت کا غلغلہ تمام دنیا میں پھیلا ہوا ہے۔ تم سب جانتے ہو کہ حضرت علیؑ کی خداداد جرأت کیسی شہرۂ آفاق ہے۔ چنانچہ ؎

شاہِ شہدا بھی ہیں اُسی شاہ کے دلدار | طاقت وہی بازو میں، وہی ہاتھ میں تلوار
ابنِ حسنؑ، و اکبرؑ و عباسؑ علمدار | اُس فوج میں یہ تین بہادر ہیں نمودار

کچھ رشتہ میں ہیں، اور کچھ اصحاب نبیؐ کے
بیٹے ہیں، بھتیجے ہیں، نواسے ہیں علیؑ کے

اگر اس معرکہ کو سر کر لیا تو انعام و اکرام سے مالامال ہو جاؤ گے۔ اتنے میں صفوں سے طبلِ جنگ کی صدائیں بلند ہوئیں ؎

ناگاہ بجے بوق و دف و بربط و قرنا | باجوں کی صداؤں سے ہلا گنبدِ خضرا

ادھر جانبازانِ لشکرِ اسلام کی یہ کیفیت ہے کہ ایک ایک جری جوشِ شجاعت میں بھرا، اور سرفروشی پہ تُلا ہوا فرزندِ رسول اللہؐ پر فدا ہونے کے واسطے مستعد تھا۔ دینداری اور خدا پرستی چہروں سے عیاں تھی ؎

فاقوں میں شہِ دیں کی طرح صابر و شاکر | یکساں صفتِ آئینہ تھے باطن و ظاہر

اعزا و اقربا سب سے زیادہ لڑائی کے واسطے بیتاب تھے۔ چنانچہ حضرت عباسؑ شیرِ خدا کی آن بان سے ٹہل رہے ہیں اور ہر مرتبہ دریا کی طرف نظر کرکے فرماتے ہیں ؎

آرام کرینگے وہیں افضالِ خدا سے		نیند آتی ہے شیروں کو ترائی کی ہوا سے

حضرت علی اکبرؑ شکلِ پیمبرؐ اسلحۂ جنگ سے سجے سجائے حسنِ خدا داد کی تصویر بنے کھڑے ہیں۔ اُن کی صفت حدِ بیان سے باہر ہے، کون ہے جو ہمشبیہِ رسولِ خداؐ کی شکل و شمائل سے واقف نہیں۔ کیونکہ ؎

آفاق میں تھا شہرۂ حُسنِ علی اکبرؑ		سرتاجِ حسینانِ جہاں شکلِ پیمبرؐ
زلفوں میں وہی پیچ وہی روئے منوّر		قامت میں وہی حُسن، وہی جسمِ مطہّر

اتنے میں جناب امام علیہ السلام اہلِ حرم کو رخصت کرکے خیمے سے برآمد ہوئے تمام لشکرِ جنگ و جدل کیواسطے بیتاب اور ہر قلب اُلفتِ امامِ ہمام کے ولولوں سے لبریز تھا۔ اُدہر قضا و قدر نے حرؒ کے دل میں ولائے اہلبیتؑ کا جوش پیدا کر دیا، اور تقدیر نے آنکھوں کے سامنے سے غفلت کے پردے اُٹھا دیئے، چنانچہ اُسی جوش و خروش میں ابنِ سعد کے پاس آئے مگر تیور بدلے ہوئے تھے۔ اب اس موقع پر عمر ابنِ سعد اور حرؒ کی مخاصمانہ گفتگو اور سوال و جواب کا بیان کرنا تھا، اسکے لیے ربطِ کلام کا یہ طریقہ نکالا کہ عمر سعد نے حرؒ سے کہا کہ دونوں طرف کی فوجیں صف بستہ ہیں، جا پہلے تو ہی میدانِ وغا میں سبقت کر، حرؒ نے انکار کیا۔ اس طرح دونوں میں تکرار اور ردوکد کا سلسلہ شروع ہوا۔ اس موقع کے اشعار یہ ہیں۔ ؎

حرؒ نے کہا ہم کو کسی سرہنگ سے لڑوا		مظلوم کو، سیّد کو جو مارا تو لیا کیا
ہم سے تو نہو گا، یہ ہمارا نہیں شیوا		بولا پسرِ سعد یہ تقریر ہے بیجا

معلوم ہوا جی کو چُراتا ہے ابھی سے
اے تو سہی یہ کام میں لوں آج تجھی سے

مگر حرؑ نے پھر جرات کے ساتھ انکار کیا اور کہا کہ میرے سامنے ایسے کلمات نہ کہہ کیونکہ مجکو ان الفاظ کے سُننے کی تاب نہیں، اسی طرح دونوں میں دیر تک رد و قدح ہوتی رہی۔ اب اس واقعے کے بیان کرنے کا موقع آیا کہ حرؑ نے امام حسینؑ کی طرف رُخ کیا اور اُن سے جاکر مل گئے۔ اسکو یوں ادا کیا کہ عمر بن سعد حرؑ سے کہتا ہے خبردار جو تو نے اُدھر کا قصد کیا۔ حرؑ جواب دیتے ہیں ؎

تسلیم کروں گا شہ مرداں کے پسر کو
لے روک تو لے مجکو، میں جاتا ہوں اُدھر کو

اس کے بعد یہ بیان کرنا مقصود ہے کہ حرؑ نے فریاد کی اور حضرت امام علیہ السلام خود استقبال کو چند قدم آگے بڑھے۔ اس کی تقریب یوں پیدا کی کہ حضرت زینبؑ کے صاحبزادوں نے جب حر کو اس طرف آتے ہوئے دیکھا تو سمجھے کہ وہ باغیانہ جنگ و جدل کی غرض سے آتا ہے اُنھوں نے تلواریں کھینچ کر رستہ میں روکا حرؑ نے صدا دی کہ میں تو آپ کا جاں نثار خادم ہوں اور ساتھ ہی فریاد کی کہ یا حضرت دو بہادر صاحبزادے مجکو آپ کی خدمت میں نہیں آنے دیتے۔ اے مولا میری فریاد کو پہونچو۔ حضرت نے بھانجوں سے کہا کہ آنے دو یہ ہمارا ناصر و مددگار بنکر مخلصانہ آتا ہے اور یہ فرماکر خود استقبال کو بڑھے۔ حضرت حرؑ نے اپنے قصور کی معافی چاہی آپ نے گلے سے لپٹا لیا اور معافی دی۔ اسکے بعد جناب حرؑ کے اذنِ جنگ طلب کرنے کا نہایت خوبی اور پُراثر طریقے سے ذکر کیا ہے۔ قابل مؤلف غور فرمائیں کہ اس مرثیہ میں کہاں بیان کا

سلسلہ ٹوٹ گیا۔ کہاں زائد یا بھرتی کے الفاظ بھرے پڑے ہیں۔ کہاں معلوم ہوتا ہی کہ زبردستی ایک واقعہ کا دوسرے سے پیوند لگایا ہی۔ تمام مرثیہ پڑھو خاصکر وہ مقامات جہاں ایک واقعہ ختم ہوکر دوسرا واقعہ شروع ہوا ہی۔ خود معلوم ہو جائیگا کہ مختلف واقعات کو بڑی خوبصورتی کے ساتھ ایک لڑی میں پرو دیا ہی۔ ممکن ہی کہ مولف کو یہ قابلِ قدر انداز پسند نہ آئے۔ لیکن منصف مزاج ناظرین کا فیصلہ اُن کو قائل کر دیگا۔
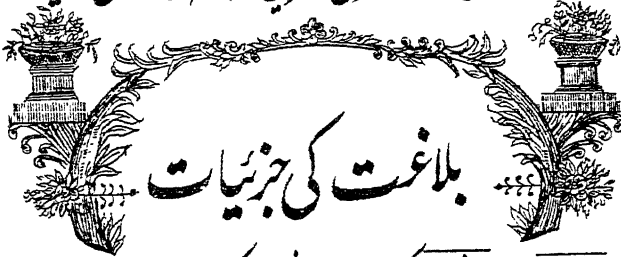
بلاغت کی جزئیات

اب مولف نے بلاغت کی جزئیات شروع کی ہیں۔ لہٰذا ہم بھی شبدیزِ قلم کو اسی میدان میں جولاں کرتے ہیں۔ خدا کا شکر ہی کہ ہمارے پاس بھی اسقدر کافی سامان موجود ہے کہ ہم ہر پہلو سے اُن کو دنداں شکن جواب دے سکیں۔ اُنھوں نے میر صاحب کے کلام سے جزئیاتِ بلاغت کی جو مثالیں تحریر کی ہیں اُن کی خوبی اور نفاست میں کسی کو کلام نہیں لیکن اگر وہ دیدۂ بصیرت سے ڈھونڈتے تو مرزا صاحب کے کلام میں بھی اسالیبِ بلاغت کی بہت سی نادر مثالیں مِل سکتی تھیں۔ مگر خیر لائق مولف کی خاطر ہم ہی چند مثالیں بطور نمونہ لکھتے ہیں۔

لیکن قبل اسکے کہ ہم مرزا صاحب کے کلام سے جزئیاتِ بلاغت کی مثالیں لکھیں پہلے اُس افترا اور بُہتان کو ظاہر کرتے ہیں جو مؤلف نے مرزا صاحب پر لگایا ہے، وہ میر صاحب کے کلام سے جزئیاتِ بلاغت کی پہلی مثال (صفحہ ۵۶) میں جہاں امام حسینؑ کی زبان سے اس مصرع کی بلاغت کا اظہار کرتے ہیں ع مولا نے سر جھکا کے کہا ہیں

حسینؑ ہوں، تو اُسی موقع پر لکھتے ہیں کہ اس واقعہ کو مرزا صاحب نے اس طرح باندھا ہے

ع فرمایا میں حسینؑ علیہ السّلام ہوں۔ میں اس امر کا اظہار ضروری سمجھتا ہوں کہ یہ مصرع ہرگز مرزا صاحب کا نہیں ہے اور نہ ایسا مہمل مصرع اُن کا ہو سکتا ہے۔ میں نے تو مرزا صاحب کی بیسوں جلدیں اور بہت سے قلمی مرثیے دیکھ ڈالے کہیں یہ مصرع نظر سے نہیں گذرا۔ نہ کہیں اسکے ہم مضمون کوئی مصرع دیکھا گیا۔ یہ محض تہمت و افترا ہے۔ اگر مرزا صاحب کے کلام میں کہیں یہ مصرع اُن کی نظر سے گذرا ہو تو اس کو یقیناً ملحقات سے سمجھنا چاہیے۔

مرزا صاحب پر افترا

مرزا صاحب نے تو جہاں جہاں اس قسم کے موقع پیش آئے ہیں، اس مضمون کو نہایت بلاغت اور خوبی کے ساتھ ادا کیا ہے۔ مثلاً ایک مرثیہ میں قیس کی روایت نظم کی ہے کہ اُنھوں نے حضرت امام حسینؑ کو نہ پہچانا اور اظہارِ اسمِ مبارک پر اصرار کیا تو آپ نے جو کچھ اور جس طرح جواب دیا اُسکو مرزا صاحب نے اس طرح ادا کیا ہے ؎

امام حسین اپنا اسم مبارک کس طرح بتاتے ہیں مرزا صاحب کے کلام سے اصلی مثالیں

مجروحِ تیغ و خنجر و تیر و سنین ہوں		اے عاشقِ حسینؑ میں ہی تو حسینؑ ہوں

ایک زائر سے مخاطب ہو کر فرماتے ہیں ؎

مظلوم ہوں ناچار ہوں اور تشنہ جگر ہوں		تو زائرِ حیدر ہے میں حیدر کا پسر ہوں

جب اُس نے کہا کہ کیا آپ حضرت عباسؑ ہیں تو اسکے جواب میں فرمایا ؎

ارشاد کیا شاہ نے با دیدۂ پُر خوں		عباسؑ نہیں میں تو حسینؑ ابنِ علیؑ ہوں

ایک موقع پر فرماتے ہیں ؎

پھر رو کے یہ کہا کہ میں سیّد ہوں قوم کا بابا علیؑ ہے والدہ ہے اشرفُ النّسا		نانا محمدِؐ عربی فخرِ انبیا قرآن ہے کتاب، مدینہ وطن مرا

ڈرتے ہیں یہ نبیؐ سے نہ خالق سے ڈرتے ہیں
مہماں انہیں کا ہوں جو مجھے قتل کرتے ہیں

زعفر جن نے نہ پہچانا تو اُس سے فرماتے ہیں ؎

حضرت نے کہا ہوں میں وہی بیکس و تنہا		مظلوم حسینؑ ابن علیؑ دلبرِ زہراؑ

ایک روایت میں یہودی آپ کا اسمِ مبارک دریافت کرتا ہے اور آپ بتاتے ہیں ؎

واللہ ابنِ فاتحِ بدر و حنین ہوں		میں بیکس و غریبؑ مسافر حسینؑ ہوں

غرض اسی طرح ہر مرثیے میں جہاں جہاں اس قسم کے موقعے آئے ہیں مرزا صاحب نے اظہار کیا ہے کہ حضرت نے اپنا نام عجز و انکسار سے لیا ہے، کہیں اپنے اسمِ مبارک کے ساتھ علیہ السّلام یا کوئی اور کلمہ تفاخر و مباہات کا استعمال نہیں فرمایا۔ نہیں معلوم قابل مولف نے یہ مصرع کیوں ایسے یکتائے عصر شاعر کے نام سے درجِ کتاب کر دیا۔ اب ہم جزئیاتِ بلاغت کی مثالیں شروع کرتے ہیں۔

مثال ۱۔ جب اہلِ حرم اسیر ہو کر دربارِ شام میں پہونچے اور ہند کو جو یزید کی بیوی اور اہلبیتؑ کی جاں نثار تھی، معلوم ہوا کہ یہ عترتِ رسول اللہؐ ہیں، وہ درد و قلق میں بیساختہ محل سے نکل آئی اور اپنی نیازمندی کا اظہار کر کے سب سے پہلے حضرت زینبؑ کی خدمت میں ایک چادر پیش کی۔ حضرت زینبؑ کی غیرت خاندانی گوارا نہیں کرتی کہ ہند کے ہدیہ کو قبول کر لیں، اسکے علاوہ پیارے بھائی کی بےکفنی کا خیال بھی ردا اوڑھنے سے مانع ہوتا ہے، مگر ساتھ ہی یہ بھی خیال ہے کہ ہدیہ کو سختی کے ساتھ رد کر دینا علاوہ دلشکنی کے خلافِ مروت بھی ہے۔ ان سب متضاد باتوں کو

ملحوظ رکھ کر جناب زینبؑ نے کس خوبی سے ہدیہ کو رد کر دیا۔ مرزا صاحب اس مطلب کو کس بلاغت سے ادا فرماتے ہیں جس میں ہر پہلو کو مدِ نظر رکھا ہے۔

زینبؑ کو پھر وہ آپ اُڑھانے لگی ردا
بھائی کے سر سے پونچھ لوں مرضی ہو اُنکی کیا
زینبؑ عرق عرق ہوئی، بولی ٹھہر ذرا
چادر کے لینے سے کہیں بھائی نہوں خفا

واجب متابعت ہے شہ مشرقین کی
مشہور ہے جہان میں غیرت حسینؑ کی

اے ہند منہ چھپانے سے اب فائدہ ہے کیا
رہنے دے سر برہنہ مجھے بھی تو ہے بجا
سب اہلِ شہر دیکھ چکے مجکو بے ردا
زہرا کا سر ہے بیٹے کے غم میں ابھی کھُلا

اوڑھوں میں کیا ردا کہ جگر پاش پاش ہے
دو گز کفن کی بھائی کی خاطر تلاش ہے

اب ہند جناب شہر بانوؑ کی طرف مخاطب ہوتی ہے۔ وہ بھی انہیں امور کا لحاظ کر کے دوسرے پیرایہ میں انکار کرتی ہیں مگر کس خوبی کے ساتھ ؎

بانوؑ سے پھر یہ ہند نے رو کر کیا سخن
بانوؑ پکاری مجھ سے یہ کب ہوگا اے بہن
تم تو سر اپنا ڈھانپ لو از بہرِ پنجتنؑ
میرا تو چھ مہینے کا بچہ ہے بے کفن

اصغرؑ کو جب تلک نہ کفن میں پنہاؤنگی
چادر سے اپنے مُنہ کو نہ ہرگز چھپاؤنگی

"اے بہن" کی فصاحت پر لحاظ کرو۔ باوجود پریشانی اور مصیبت کے اپنے دشمن کی بیوی مگر اپنی عقیدتمند اور خیر خواہ عورت کی اس سے زیادہ کیا خاطر داری ہو سکتی ہے۔ ان اشعار میں اہلحرم کے اخلاق و تحمّل کا ایک ادنیٰ نمونہ دکھایا گیا ہے۔

مثال ۲- حضرت امام حسینؑ کی شہادت کے بعد جب اہلِ حرم یزید کے دربار میں پہونچے تو وہاں سفیرِ روم بھی موجود تھا اُسکو یہ عجیب و غریب حالات دیکھ کر نہایت تعجب ہوا۔ وہ یزید سے متحیر ہو کر پوچھتا ہے ؎

مسکن تھا اس قتیل کا کس سرزمین پر
تھا اور دین پر کہ محمدؐ کے دین پر

زنجیر پہنے کانپتا ہے جو یہ ناتواں
کیا نام اس مریض کا ہے، جلد کر بیاں
یہ ننھی لڑکی جس کے گلے میں ہے ریسماں
اسکا تو ہے وہ سن کہ ہو کافر بھی مہرباں

رانڈوں سے انتقام تو لیتا ہے، حیف ہے
آزار ننھے بچّوں کو دیتا ہے، حیف ہے!!

مذہب پہ اُس سے جنگ ہوئی یا کہ ملک پہ
کیا منحرف تھا قبلے سے لوٹا جو اسکا گھر
کیا تارک الصّلوٰۃ تھا کاٹا جو اسکا سر
زینبؑ سے ضبط ہو نہ سکا بولی پیٹ کر

حق پر موا ہے، فرقۂ باطل سے پوچھ لے
سجدہ میں سر کو کاٹا ہے، قاتل سے پوچھ لے

سفیر کو یقین ہو گیا کہ ضرور یہ کوئی صاحبِ اقتدار اور دیندار شخص تھا۔ اس لئے پھر یزید سے پوچھا کہ اسکا حسب و نسب بتا، تاکہ شاہِ روم پر اظہار کروں اُسوقت ؎

بولا شقی بلند نہ کر شور و شین کو
کہدے بجیو یزید نے مارا حسینؑ کو

اُسنے کہا جو سیّدِ بطحا ہے وہ حسینؑ
ماں جس کی فخرِ مریمؑ و حوّا ہے وہ حسینؑ
تیرے رسولؐ کا جو نواسا ہے وہ حسینؑ
مشکل کشا علیؑ کا جو بیٹا ہے وہ حسینؑ

جسپر نبیؐ نے اپنے پسر کو فدا کیا؟
خالق نے جسکو بچۂ آہو عطا کیا؟

ان تمام اشعار میں سفیرِ روم کا یزید کو طنز و تعریض کرنا کس بلاغت کے ساتھ ادا کیا ہی۔ طنز کا سب سے بڑا نکتہ یہ ہی کہ وہ یزید سے صاف طور پر یہ نہیں کہتا کہ تو نے ناحق امام حسینؑ کو، جو اسلام کے ممتاز رکن، اور تیرے نبیؐ کے نواسے تھے، قتل کر ڈالا ایسی صورت میں بلاغت کا زور گھٹ جاتا، بلکہ وہ تجاہلِ عارفانہ کر کے ایسی دل خراش چوٹیں کرتا ہی جو بظاہر سخت نہ ہوں مگر تیر کی طرح دل میں اتر کر جائیں۔ باوجودیکہ وہ جان گیا ہی کہ یہ وہی امام حسینؑ سبطِ رسول اللہ ہیں مگر دانستہ ناواقف بن کر یزید سے پوچھتا ہی کہ کیا یہ وہ حسینؑ تو نہیں جو سیّدِ بطحا ہی؟ جس کی ماں فخرِ مریمؑ و حوّا ہی، جو تیرے رسولؐ کا نواسا ہی، اور جسکے والدِ بزرگوار حیدرِ کرّار ہیں؟ جسکا مطلب یہ ہی کہ نانا کو رسولؐ بھی جانتا ہی اُنکا کلمہ گو بھی بنتا ہی لیکن ایسی بیدردی کے ساتھ نواسے کو قتل کر ڈالا۔

ان طنزیہ فقروں میں امام حسینؑ اور اُنکے بزرگوں کو جن الفاظ سے یاد کیا ہی وہ بالکل تعریض سے بھرے ہوئے ہیں۔ سیّدِ بطحا۔ فخرِ مریم و حوّا۔ مشکل کشا جسپر نبیؐ نے اپنے پسر کو نثار کیا۔ جسکو خدا نے بچۂ آہو بھیجا۔ ان سب الفاظ کے یہ معنی ہیں کہ تم مسلمان لوگ اپنے عقیدے میں ان پیشوایانِ دین کو ایسا سمجھتے ہو لیکن عملی طور پر اُن کی اولاد کے ساتھ وہ عجیب برتاؤ کیا کہ کوئی کافر بھی ایسا نہ کرتا۔

مثال ۳۔ جب جناب زینبؑ کے صاحبزادے حضرت امام حسینؑ سے

رضائے جنگ لیکر ماں سے ملنے آئے تو انھوں نے یہ کہہ کر رخصت کیا کہ جب ماموں کے بدلے زخم تیر و سناں کھا کر آؤ گے اُسوقت تم کو پیار کروں گی۔ چنانچہ جب وہ زخمی ہو کر خیمہ میں آئے تو اُسوقت کی حالت لکھی ہے ؎

بنتِ علیؑ کی، لاشوں پہ جسدم پڑی نگاہ — سجدے میں جھک گئی جگرِ ضیغمِ الٰہ
بیٹوں نے ہاتھ اُٹھائے جو تسلیم کے لیے
دیکر دعا کھڑی ہوئیں تعظیم کے لیے

اس میں بلاغت کا کیسا موثر نکتہ ہے کہ حضرت زینبؑ بیٹوں سے محض اسلیے خوش ہوئیں کہ اُنھوں نے امام علیہ السلام پر اپنی جانوں کو قربان کر دیا۔ کوئی ماں بیٹوں کی تعظیم کے لیے کھڑی نہیں ہوتی لیکن حضرت زینبؑ اس شرف پر کہ اُنھوں نے فرزندِ رسول الثقلینؐ پر جان دیکر سعادتِ دارین حاصل کی بیٹوں کو تعظیم دیتی ہیں۔ اس سے بھی زیادہ یہ کہ بچوں کے واسطے جو بین کرتی ہیں اُسکے ایک ایک لفظ میں بھائی کی محبت کا اظہار ہے اور یہ امر صاف نظر آتا ہے کہ اُن کو بیٹوں سے جو کچھ الفت ہے وہ محض اسوجہ سے ہے کہ وہ اُن کے بھائی پر نثار ہوئے۔ چنانچہ فرماتی ہیں ؎

کہتی تھی واہ پیارو بڑا کام کر چلے
ماموں پہ صدقے ہو کے مرا نام کر چلے

ایسا تمھیں نہ جانتی تھی بنتِ مرتضےٰؑ — جی بھر کے تم کو پیار نہ میں نے کبھی کیا
جب چاہا بے قصور بھی تم کو گھڑک لیا — پیارو! خدا کیواسطے بخشو مری خطا
جنت میں سامنا ہو جو اماں بتولؑ کا
شکوہ نہ اُن سے کیجیو مجھ دل ملول کا

یعنی میں تمھاری دلیری پر تحسین و آفریں کرتی ہوں کہ تم نے ماموں پر فدا ہو کر میرا نام روشن کردیا۔ پھر ع ایسا تمھیں نہ جانتی تھی بنت مرتضیٰ۔ یعنی مجکو پہلے سے یہ نہ معلوم تھا کہ تم اس جانبازی کے ساتھ میرے بھائی پر اپنی جانوں کو فدا کردوگے ورنہ اس سے زیادہ تمھاری قدر افزائی کرتی۔ افسوس ہے کہ ایسے سعید و رشید بچوں کو کبھی جی بھر کے پیار کیا مرزا صاحب نے اس موقع پر جس بلیغ و لطیف انداز سے بہن کی عدیم المثال الفت کا مرقع آنکھوں کے سامنے کھینچ دیا ہے اس سے زیادہ خیال میں بھی نہیں آسکتا۔

مثال ۴۔ واقعۂ کربلا کے بعد جب اہلبیتؑ دربارِ یزید میں گئے ہیں تو وہ اپنی جفا شعاری اور سفاکی پر اس طرح فخر و مباہات کرتا ہے ؎

روشن[1] تھا نامِ شیرِ خداؑ مشرقین میں	مارا مرے بزرگوں کو بدر و حنین میں
اب روئیں اہلبیتؑ فراقِ حسینؑ میں	یاد آئیگا یہ جشن اُنھیں شور و شین میں

رویا کرینگے شاہِ مدینہ کے واسطے
محتاج ہونگے نانِ شبینہ کے واسطے

سرتاجِ کائنات کا سر زیرِ تخت ہے	کیا میری سرنوشت ہے کیا اوجِ بخت ہے
زرّیں کلاہ اور امیری کا رخت ہے	اب رنجِ زندگانیِ عابدؑ کا سخت ہے

طالع یہ میرے، اوج کا اب خاتمہ ہوا
شکرِ خدا زوالِ بنی فاطمہؑ ہوا

شہزوروں کے گروہ میں میں بے بدل ہوا	قاتل نبیؐ کی آل کا پہلے پہل ہوا

[1] یہ مرثیہ ابتدائی زمانہ کا معلوم ہوتا ہے کیونکہ زبان زیادہ صاف نہیں ہے۔ لیکن ناظرین الفاظ کی چمک دمک کی پروا نہ کریں بلکہ معنی کی خوبی اور مضمون کی لطافت پر دھیان رکھیں جسکے لحاظ سے ہم نے ان بندوں کو انتخاب کیا ہے۔

مجکو نصیب تیغ سے نصرت کا پھل ہوا	دنیا میں ایک حکم ہوا اک عمل ہوا

کیا دل رہے گا چین سے اب عمر بھر مرا
کاٹا نبی صلعم کا دل کوئی دیکھے جگر مرا

یہ مثال میر صاحب کی مثال نمبر (۴) سے بہت کچھ ملتی ہوئی ہے۔ جن الفاظ یا مصرعوں پر ہم نے خط کھینچ دیئے ہیں وہ قابلِ غور ہیں کیونکہ اُن میں بلاغت کے کئے دلچسپ نکتے پائے جاتے ہیں۔ ان اشعار میں یزید کے کفر و ارتداد اور سنگدلی کا نہایت لطیف اور سچّے پیرایہ میں مرقع دکھا دیا ہے۔ سب سے پہلے یہ کہ وہ جناب امیرؑ کی اولاد سے اپنے آبا و اجداد کا عوض لیتا ہے جو بحالتِ کفر۔ بحکم خدا و رسولؐ جنگِ بدر و حنین میں حضرت علیؑ کی تلوار سے مارے گئے تھے[۲]۔ جسکے یہ معنی ہوئے کہ اُس کے زعم میں رسول اللہؐ کی لڑائیاں جو کفار سے ہوئیں دینداری پر مبنی نہ تھیں بلکہ مُلکی جنگیں تھیں جنکا بدلہ وہ اب لے رہا ہے۔ جس سے ضمناً یہ پایا گیا کہ اُسکو خود جناب رسالتمآبؐ کی رسالت کا شک ہے اور اسلام کی صداقت کا مطلق یقین نہیں۔ پھر ان اشعار میں امام حسینؑ کو جن الفاظ سے خطاب کیا ہے وہ بالکل طنز و تعریض سے بھرے ہوئے ہیں۔ شاہِ مدینہ۔ سر تاجِ کائنات۔ ان سب الفاظ کا یہ مطلب ہے کہ گویا اُس کے خیال میں امام حسینؑ دعویدارِ سلطنت بنکر اپنے آپ کو ایسا سمجھتے تھے اور اُنھوں نے حصولِ حکومت کے واسطے جنگ و جدل کی تھی۔ اس سے بھی زیادہ یہ کہ گو اُسکو تسلیم ہے کہ امام حسینؑ نبیؐ کا دل ہیں، اسپر بھی وہ اُن کے قتل کرنے یا نبیؐ کا دل کاٹنے پر اپنے جگر کی ثنا و توصیف، اور اپنی قسمت

[۲] یہ یزید کے اشعار کا ترجمہ ہے جو اُسنے فخریہ پڑھے تھے۔ یہ اشعار معتبر کتبِ تواریخ میں لکھے ہوئے ہیں ۱۲

کے عروج اور سرنوشت کی بلندی پر ناز اور فخر کر رہا ہے۔ اور نبیؐ کی آل کا قاتل ہونے پر اُسکو اپنی شہزوری اور شجاعت کا غرّہ ہے۔ جسکے یہ معنی ہیں کہ اُسکو خود رسول اللہؐ کی ایذا کی خوشی اور مسرت ہے۔ ان سب پر طرّہ یہ کہ وہ زوالِ بنی فاطمہؑ پر خدا کے احسان کا شکر گزار ہے، گویا اُس کے زعمِ باطل میں یہ امر خدا کو مرغوب اور پسند تھا۔

مثال ۵-ب

صغراؑ نے ادہر اور اُدہر پاس سے دیکھا کہنے لگی، تم میری سفارش کرو بھیّا		پھر جھولے سے اصغرؑ کو اُٹھا لائی وہ دُکھیا سب کہہ ہی بابا کی طرف اور میں تنہا

صغراؑ کو تو سمجھاتے ہیں بابا کی طرف سے
کچھ باپ سے کہتے نہیں صغراؑ کی طرف سے

تم اپنی زباں کھولو سفارش میں ہماری صغراؑ کو نہ چھوڑو، یہ بہن ہے مجھے پیاری		ہونٹوں کو ہلا کر یہ اشارہ کرو واری اصغرؑ میں بڑی چاہنے والی ہوں تمہاری

اس تپ میں بھی جب ہوش میں آجاتی ہوں واری
ڈوری ترے جھولے کی ہلا جاتی ہوں واری

یہ وہ موقع ہے کہ حضرت امام علیہ السلام آمادۂ سفر ہیں اور حضرت عباسؑ ہمراہیوں کے نام لکھ رہے ہیں۔ جناب صغراؑ اپنا نام بھی لکھنے کو کہتی ہیں مگر وہ بمصلحتِ امامؑ خاموش ہو جاتے ہیں، امامِ حسینؑ سے منت وزاری کرتی ہیں لیکن وہ بھی لیجانے پر رضامند نہیں ہوتے، پھر گھر میں ایک ایک سے سفارش کی خواستگار ہوتی ہیں۔ لیکن کوئی ہامی نہیں بھرتا اور ہر شخص بجائے خود سفر کی طیّاریاں کر رہا ہے۔ اُسوقت وہ نہایت یاس و اضطراب کی حالت میں حضرت اصغرؑ کو جو شش ماہہ بچے ہیں گہوارے سے

اُٹھالاتی ہیں اور خطاب کر کے کہتی ہیں کہ اے ننھے بھائی بابا مجکو لیجانے پر آمادہ نہیں ہیں، سب کنبہ ایک زبان ہی اور میں محض تنہا، میرا کوئی مددگار نہیں۔ میں تمھاری خدمت کرتی ہوں ہر وقت جھولا جھلاتی ہوں ان خدمات کے عوض میں اب تم ہی باباسے سفارش کرو کہ مجکو بھی ہمراہ لے چلیں۔ تمام کنبے سے مایوس ہوکر ایک بے زبان بچے سے سفارش کرانا حسرت اور ناکامی کی کیسی دردانگیز تصویر ہی۔

مثال ۶۔ ۵

کسدن کے واسطے طلب رایتِ ظفر یہ دوپہر رولائے گی زینبؑ کو عمر بھر		واری بہت جیو گے جواب تم تو دوپہر دنیاسے آج فوجِ حسینیؑ کا ہے سفر
	گھرسے تمھیں حسینؑ کے صدقہ کو لائی ہوں میں بے نصیب ہونے کو تربت سے آئی ہوں	

جناب زینبؑ کے صاحبزادوں کو خیال تھا کہ ہم مستحقِ علمداری ہیں۔ مگر جب اُن کو علم نہ ملا تو ملال ہوا۔ اسپر اُن کی والدہ اُن کو سمجھاتی ہیں۔ سمجھانے کا پہلو یہ ہی کہ آج میدان کربلا میں دوپہر تک تمام اعزا و اقربا اور امام حسینؑ شہید ہوجائینگے تو اتنے قلیل عرصہ کے لیے اس منصب کی ہوس بیکار ہے۔

اس مضمون کو مرزا صاحب نہایت بلاغت سے ادا فرماتے ہیں۔ اُنھوں نے حضرت زینبؑ کی زبان سے اس دردانگیز واقعہ کو کھُلے الفاظ میں صاف صاف نہیں بلکہ اشارۃً اور کنایۃً ادا کیا ہی۔ چنانچہ اُنھوں نے اپنے صاحبزادوں کی شہادت کا تو کھُلے الفاظ میں اظہار کردیا (واری بہت جیو گی جواب تم تو دوپہر) کیونکہ اُن کو جاں نثاری اور حصولِ شہادت پر آمادہ کرنا تھا۔ لیکن باقی مطلب یعنی حضرت امام حسینؑ حضرت

عباسؑ اور تمام کنبے کی شہادت اُسکو پوشیدہ الفاظ میں اشارۃً بیان کرتی ہیں مثلاً ع یہ دوپہر رولائیگی زینبؑ کو عمر بھر۔ اس میں امام حسینؑ کی شہادت اور اپنی تمام عمر کی سوگواری کا اشارہ ہی مگر صاف الفاظ میں نہیں۔ پھر ع دنیا سے آج فوجِ حسینیؑ کا ہی سفر۔ اس میں کنایۃً ظاہر کیا ہی کہ آج تمام کنبے اور خود امام حسینؑ کا خاتمہ ہی۔ کیونکہ تمام لشکر کے قتل ہوجانے کے بعد سردار کی شہادت لازمی ہی۔ سب باتوں کو درپردہ ظاہر بھی کردیا لیکن باقتضاے الفت و محبت کسی بات کو صاف صاف نہ کہا۔ اس مضمون کو انہیں الفاظ میں میر صاحب مرحوم نے بھی ادا کیا ہی۔ بعض مصرع قریب قریب ہم مضمون ہیں۔ مثلاً ؎

میر انیس۔ تم ہوگئے تابعصر نہ عباسؑ خوشخصال
مرزا دبیر۔ داری بہت جیئیگے جواب تم تو دوپہر

میر انیس۔ مجکو یقیں نہیں کہ بچے فاطمہؑ کا لعل
مرزا دبیر۔ دنیا سے آج فوجِ حسینیؑ کا ہے سفر

مثال ۷۔ امام حسینؑ کے وعظ و پند سے متاثر ہوکر جناب حرؑ نے بیساختہ حضرت کے لشکر کی طرف رخ کیا؛ امام علیہ السلام کے اعزا و رفقا سمجھے کہ یہ ہماری فوج میں مخالفانہ آرہے ہیں۔ چنانچہ اس خیال پر وہ سب کے سب برہم ہوگئے۔ اس موقع کی تصویر اس طرح کھینچتے ہیں ؎

پہونچا قریبِ فوجِ خدا جب وہ باوفا
ہشیار اے حسینؑ کے اصحابؓ اقربا
چرچا ہوا حسینؑ کے لشکر میں جابجا
ہاں نیزے تانو، تیغیں سنبھالو غضب ہوا
لو آتا ہی وہ سامنے شاہِ دلیر کے

لایا ہی کربلا میں جو سید کو گھیر کے

اس متوحش خبر کو جب خیمہ گاہ میں حضرت زینبؑ نے سُنا تو وہ جوشِ محبت میں پریشان و متردد ہو کر فرماتی ہیں ؎

زینبؑ کے کان میں یہ خبر پہونچی ناگہاں
بیتاب ہو کے ڈیوڑھی پہ آئی وہ خستہ جاں
رو کر پکاری، اکبرؑ و عباسؑ ہیں کہاں
میرے حسینؑ بھائی کے لوگو نگاہباں

کہدو ہمارے شیروں سے سینے سپر کریں
زینبؑ نے دودھ بخشا نثار اپنے سر کریں

حضرت علی اکبرؑ جناب زینبؑ کے بھتیجے، حضرت عباسؑ بھائی، عونؑ و محمدؑ صاحبزادے، اور دوسرے لوگ امام علیہ السلام کے یار و انصار ہیں۔ اس موقع پر بلاغت یہ ہی کہ حضرت زینبؑ کو جن جن لوگوں پر جسقدر اختیار تھا اُسی نسبت سے اُن کو امام حسینؑ کی حفاظت کا حکم دیتی ہیں۔ انصار سے فقط یہ کہا کہ لوگو میرے بھائی کے نگہبان رہو، اکبرؑ و عباسؑ کو پکارتی ہیں کہ دیکھو وہ کیا کرتے ہیں، لیکن چونکہ اپنے بیٹوں کی مختارِ کل ہیں اُن کو حکم دیدیا کہ سینے سپر کر دو اور ماموں پر اپنے سروں کو نثار کر ڈالو۔ اس فرقِ مراتب کو اس خوبی سے ادا کیا ہی کہ واقعہ کی تصویر کھینچدی ہے۔

مثال ۸۔ جناب صغراؑ رخصت کیوقت حضرت عباسؑ سے منت و زاری کرتی ہیں ؎

کرنا نہ سکینہؑ کی طرح میری مدارات
خدمت کو سکینہؑ ہی کی لے چلیے مجھے سات
وہ سوئیگی شب کو تو میں بیدار رہونگی

رستے میں سکینہؑ کی خبردار رہونگی

امام حسینؑ سے عرض کرتی ہیں ؎

بابا مجھے چھوڑو نہ یہاں، تم پہ میں واری | بیٹی نہیں میں آج سے لونڈی ہوں تمہاری

منہ ہاتھ دُہلاؤنگی میں صغرؑ کا تمہارے
گہوارہ جھلاؤنگی میں اصغرؑ کا تمہارے

یہ وہ موقع ہی کہ حضرت امام حسینؑ جناب صغرؑا کے سوا سب کو سفر میں ساتھ لیے جاتے ہیں۔ حضرت صغرؑا کو حالت یاس میں یہ خیال پیدا ہو گیا ہی کہ ہر شخص اُن بچّوں کو جن سے محبت ہی ساتھ لیے جاتا ہی مگر مجھ سے کوئی الفت نہیں کرتا۔ اسلیے اُنھوں نے منت زاری اور استدعا کا یہ حسرت خیز طریقہ اختیار کیا ہے کہ اُنکے خیال میں جو بچہ جس بزرگ کو عزیز تھا اُسی کی خدمت کے لیے اپنی ہمراہی کی درخواست کرتی ہیں تاکہ اُن بچّوں کی خاطر سے منظور کر لی جائے۔ مثلاً حضرت عباسؑ سے کہتی ہیں کہ مجکو سکینہؑ کی خدمت کے لیے ساتھ لیچلو۔ امام حسین علیہ السلام سے جو استدعا کی ہی اُس میں عرض کرتی ہیں کہ "گہوارہ جھلاؤنگی میں صغرؑ کا تمہارے"، اس موقع پر "اصغرؑ کا تمہارے" ایک خاص اثر پیدا کرتا ہی۔ حضرت اصغرؑ جناب صغرؑیٰ کے چھوٹے بھائی تھے، ہو سکتا تھا کہ وہ اُن کو اپنا بھائی کہکر مخاطب کرتیں، لیکن اُن کو حضرت امام حسینؑ کا اصغرؑ کہکر خطاب کیا ہے اور کہتی ہیں کہ مجکو اس لیے ساتھ لیچلو کہ میں تمہارے اصغرؑ کا گہوارہ جھلاؤنگی۔

اس اسلوب بیان میں حسرت اور خوشامد کا جو دردناک اور پُرتاثیر پہلو پایا جاتا ہے اُسکا لطف خود ظاہر ہی۔ اور اسی پردے میں ایک چھپا ہوا شکوہ بھی ہی یعنی آپ

اصغرؑ کو اپنا فرزند سمجھتے ہیں جو ساتھ لیے جاتے ہیں، لیکن مجکو ایسا نہیں سمجھتے۔ دیکھو شکایت بھی کی ہی تو کسقدر تہذیب اور ادب کے پردے میں۔

مثال ۹ ۔ شمر سے اور جناب عباسؑ کی والدہ سے کچھ دُور کی قرابت تھی۔ اعدائے دین تاراجیِ خیام کو آئے تو اُس شقی کو کچھ غیرت آئی اور کہا کہ ہیں عباسؑ کی بیوہ کو ہرگز اسیر نہ ہونے دونگا۔ اس مضمون، اور اُسوقت اہلبیت علیہم السلام کی حسرت ناک حالت کو کن دردانگیز الفاظ میں اور کس خوبی کے ساتھ ادا کرتے ہیں

یہ کہہ کے درِ خیمہ پہ چلایا وہ بے پیر
اب ہوئینگی سر ننگے یہ سب عترتِ شبیرؑ

اے بیوہ عباسؑ علیؑ صاحب توقیر
اور حضرتِ زہراؑ کی بہو ہوئیگی تشہیر

پر تم مری خواہر کی بہو ہو، یہ ادب ہی
تشہیر جو تم ہو سرِ بازار، غضب ہی

سُن لی یہ صدا زینبؑ بیکس نے قضارا
لو بھابی! بنا شمر طرفدار تمھارا

بیساختہ عباسؑ کی زوجہ کو پکارا
اچھا تو ہے اسوقت کرو ہم سے کنارا

وارث نہیں، بے وارثوں پر دیکھیے کیا ہو
دُکھ سے جو تمھیں چین ملے ہم سے جدا ہو

پھر بھر کے دمِ سرد یہ بانوؑ نے کہی بات
برگشتہ نصیبوں سے کرو ترکِ ملاقات

ہاں بھابی لُٹو کا ہے کو بے وارثوں کے سات
کنبے کی محبت میں نہ ہو موردِ آفات

یہ دشمنِ دیں باندھیں گے اب ہات ہمارے
کیا فائدہ جو قید ہو تم سات ہمارے

مجھ میں تو نہیں ہوش تمھیں بچوّں کو بہلاؤ
بے وارثی بھاوج کی اسیری کا نہ غم کھاؤ

تم جاؤ تو اے بھابی سکینہ کو بھی لے جاؤ
لپٹاؤ کلیجے سے اسے گود میں بٹھلاؤ
پاس آپ کے یہ لاڈلی میری جو رہے گی
ظالم کے طمانچوں کی تو ایذا نہ سہے گی

پر شمر جو پوچھے کہ یہ ہے کون تمہاری
بیٹی اسے حضرت کی نہ بتلانا میں واری
کہیو کہ علمدارِ دلاور کی ہے پیاری
جب سے وہ ہوئے قتل قلق اس پہ ہے طاری
بیٹی نہ سمجھنا نہ عزیز اپنی سمجھنا
بن باپ کی بچی کو کنیز اپنی سمجھنا

اصغرؑ کو بھی تم اپنا ہی فرزند بتانا
ممکن ہو تو ننھی سی لحد اس کی بنانا
موقع جو سفارش کا میں صدقے گئی پانا
بیمار بھتیجے کو اسیری سے بچانا
جو ہو سکے سیدانیوں سے کیجیو بھابی
زندان سے زینبؑ کو چھڑا لیجیو بھابی

اک رات کی بیاہی ہری بیٹی جو ہے کبرؑا
رنڈسالہ کا جوڑا بھی نہیں جس کو مہیا
کس طرح بسر ہوگا یہ بچپن کا رنڈاپا
بابا ہے سو محتاجِ کفن، ماں ہے سو دکھیا
بھیجے جو تمہیں شمرِ لعیں یاں سے وطن کو
لیجائیو ہمراہ بھتیجے کی دلہن کو

ان بندوں میں بلاغت کے نکتوں پر غور کرو۔ سب سے پہلے، عورتوں کی اسیری و تاراجی میں جو توہین و تذلیل ہے اُس کی دلخراش تصویر کھینچی گئی ہے۔ یعنی شمر کو باوجود اس بے انتہا شقاوت اور بے رحمی کے کہ چشم و چراغ نبویؐ کے ذبح کرنے میں رحم نہ آیا، زوجہ حضرت عباسؑ کی اسیری گوارا نہیں ہے۔ اسکے بعد، اُس زمانے کے لوگوں کو

رسولؐ مقبول اور اُن کے خاندان سے جو بے تعلقی اور اجنبیت تھی، اُسکو نہایت دلنشین اور موثر پیرایہ میں ادا کیا ہے۔ یعنی شمر جیسے جفا شعار کو حضرت عباسؓ کی بیوہ کی توہین و تفضیح منظور نہوئی حالانکہ اُسکا تعلق حضرت عباسؓ سے صرف اسی قدر تھا کہ اُن کی والدہ شمر کے قبیلے سے تھیں، لیکن لاکھوں کلمہ گویوں اہل بیتِ رسولؐ کا کوئی اتنا بھی ہمدرد اور دلسوز نہ تھا کہ اُن کی رسوائی اور تحقیر سے کسی دل کو بھی تکلیف محسوس ہو۔ اس کے بعد شمرِ شقی کی بے انتہا سنگدلی اور بے دینی کا نقشہ بھی آنکھوں کے سامنے کھینچ دیا ہے، وہ صاف صاف کہتا ہے کہ آج زہرؑا کی بہو تو ضرور اسیر ہوگی لیکن چونکہ تم میری بہن کی بہو ہو اسلیے تمہارا تشہیر ہونا غضب ہے۔ جسکے یہ معنی ہوئے کہ اُس کی نگاہوں میں جناب سیدہؑ کی اتنی بھی عظمت نہیں جتنی اپنی بہن کی۔ اسکے بعد حضرت شہر بانوؑ اپنے بیٹے اور بیٹی کی زوجۂ حضرت عباسؓ سے سفارش کرتی ہیں۔ معمولی طریقۂ کلام یہ تھا کہ وہ یہ کہتیں کہ تم میرے بیٹے (سجّاد) کو اسیری سے بچا لینا اور میری بیٹی (کبرا) کو اپنے ساتھ وطن لے جانا، لیکن حضرت بانوؑ اپنے بیٹے کو اُن کا بھتیجا اور اپنی بیٹی کو اُن کے بھتیجے کی دلہن کہکر خطاب کرتی ہیں اور کہتی ہیں کہ موقع ملے تو اپنے بیمار بھتیجے کو قید سے بچا لینا اور وطن جاؤ تو اپنے بھتیجے کی دلہن کو بھی ساتھ لیتی جانا۔ دستور ہے کہ جب اپنے کسی عزیز و ہمدرد سے اپنی اولاد کا کوئی کام لینا ہوتا ہے تو اُن کو اپنی طرف نہیں بلکہ اُسی عزیز کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ گویا اُس کی محبت۔ و ہمدردی۔ اور قرابت مندی کے جذبات کو تحریک دینے کی غرض سے ایسے الفاظ بیان کیے جاتے ہیں کہ یہ کام درحقیقت اُسی عزیز کا کام ہے۔ اس طرز بیان نے کلام کو جو بیحد موثر اور پُرحسرت بنا دیا ہے وہ خود ہی

ظاہر ہے۔

مثال ۱۰۔ تمام اعزا و انصار کے بعد جب امام **حسین** علیہ السلام تنہا رہ گئے اور زخمی ہو کر زمین پر تشریف لائے، تو اس دردناک حالت کو اہلبیتؑ سے نہ دیکھا گیا۔ چنانچہ اُسوقت حضرت قاسمؑ کی والدہ اپنے صغیر السن بچّہ کو میدانِ جنگ میں جانے اور چچا پر سینہ سپر ہونے کے واسطے آمادہ کرتی ہیں۔ اُنھوں نے بچّہ کو ہمت دلانے کے لیے درجہ بدرجہ جو ولولہ انگیز الفاظ فرمائے ہیں اُن کو کس بلاغت کے ساتھ بیان کرتے ہیں ؎

ماں روکے بولی، کیا کہوں کیا پوچھتے ہو لال
واری! ابتر اچھا ہی تعب ہے یہ لہو میں لال
ناطاقتی کا زور ہے، قوت کا ہے زوال
بھیجوں کسے مدد کو کہ ہو تم تو خُرد سال
افسوس بھوک پیاس سے تم بیقرار ہو
کیونکر کہوں کہ جاکے چچا پر نثار ہو

کمسن ہو کیا بساط ہے روتے ہو باپ بن
پر ہاں تمہارے دادا کے قائل ہیں انس و جن
جب نیمچہ وہ چڑھے تھے تو تھا نو برس کا سن
مرتے ہیں مرد نام پہ دنیا ہے چار دن
انساں کرے وہ بات کہ اجر و جزا ملے
بندہ چلے وہ راہ کہ جس میں خدا ملے

جھولے میں تھے یہ زور جنابِ امیرؑ کے
تکیے کے نیچے رکھدیا اژدر کو چیر کے
رستم ہوئے غلام شہِ قلعہ گیر کے
کیوں تم بھی پوتے ہو اُسی شیرِ قدیر کے
بابا حسنؑ چچا ترا شاہِ شہید ہے

* اس مصرع کی بلاغت دیکھو۔ سب کچھ کہدیا اور پھر کچھ بھی نہیں۔

گر تم بھی ایسے کام کرو کیا بعید ہے

شیر خدا کے چھوٹے بڑے شیر ہوتے ہیں
بانوؑ کے شیر خوار تلک رن میں سوتے ہیں
بچّے بھی آبرو کے لیے جان کھوتے ہیں
خاطر ہے جمع، آپ بھی حیدرؑ کے پوتے ہیں

واری! ارادہ شرط ہے کارِ ثواب میں
حصہ دھرا ہوا ہے خدا کی جناب میں

حسرت ہے سوگ پیارے کا میں گوار لوں
دولہا بنو گے کنگھی سے زلفیں سنوار لوں
رن پر چڑھو گے شاہِ نجف کو پکار لوں؟
گردن سے طوق کانوں سے بُندے اُتار لوں

ننھی سی تیری لاش بھی اصغرؑ کے پاس ہو
سب منتیں بڑھاؤں جو پوری یہ آس ہو

آمین کہکے اُس نے کہا لو نہ کھاؤ غم
اماں ابھی تو ہوتے ہیں صدقے چچا پہ ہم
تم دودھ بخشو ہم سے بھی بابا کی لو قسم
مجکو خبر نہ تھی کہ ہیں مولا پہ یہ ستم

لو یہ مرے چچا ہیں، شہِ مشرقین ہیں!
ہی ہی یہ میرے قبلہ و کعبہ حسینؑ ہیں!!

جھک جھک کے اہلبیتؑ کو اُسنے کیا سلام
زینبؑ پکاری بھابی خدارا پسر کو تھام
لیکر سلام دوڑ کے لپٹے حرم تمام
اب اک یہ آسرا ہے ترا اور خدا کا نام

وہ بولی، مجکو آرزوے زندگی نہیں
دنیا میں جب حسینؑ نہیں تو کوئی نہیں

کیا بلاغت ہے کہ شروع کے بندوں میں مطلق کوئی حکم نہیں، مگر بتدریج اپنے فرزند کو نصرتِ امامِ مظلوم پر آمادہ کیا جاتا ہے۔ سب سے پہلے امام علیہ السّلام کی بیکسی و

مظلومی کا حال سُنا کر اُن کی دردناک حالت کا نقشہ کھینچتی ہیں۔ ع واری ترا چچا ہی تو ہے یہ لہو میں لال۔ ع ناطاقتی کا زور ہے قوت کا ہے زوال۔ اُسپر ترقی کرکے فرماتی ہیں کہ اب اسوقت اُن کا کوئی مددگار نہیں، ایک تم ہو سو خُرد سال ہو۔ ع بھیجوں کسے مدد کو کہ ہو تم تو خُرد سال۔ ع کم سِن ہو کیا بساط ہے روتے ہو پانی بن۔ اُسپر ترقی کرکے فرزند دلبند کو دادا کے کارنامے سُنا کر جوش دلایا جاتا ہے کہ گو تم خرد سال ہو مگر تمھارے دادا نے تو خرد سالی میں بڑے بڑے کارہاے نمایاں کیے ہیں ع جب رن پہ وہ چڑھے تھے تو تھا نو برس کا سن۔

جھولے میں تھے یہ وہ جناب امیر کے ۔۔۔ تکیے کے نیچے رکھدیا اژدر کو چیر کے

ع۔ گر تم بھی ایسے کام کرو کیا بعید ہے۔

ع۔ مرتے ہیں مرد نام پہ دنیا ہے چار دن۔

جب جوش انگیز الفاظ سے اپنے نورِ نظر کے دل میں جاں نثاری اور ہمت کا کافی ولولہ پیدا کرلیا تو اُسوقت بطرزِ استفہام کہتی ہیں۔ ع۔ رن پر چڑھو گے شاہِ نجف کو پُکار لوں۔ اس میں بھی گو کوئی صریح حکم نہیں لیکن ایسا بلیغ استفہام ہے جس میں ضمناً و کنایۃً نہایت خوبی کے ساتھ میدانِ جنگ کی ترغیب دی گئی ہے۔ اس سے اور زیادہ ترقی کی تو ایک تمنا کے پیرایہ میں اپنے مقصد کا صاف اظہار کردیا۔ ع۔ ننھی سی تیری لاش بھی اصغرؑ کے پاس ہو۔ ان بندوں میں رفتہ رفتہ اسلوبِ کلام کی ترقی سے جو بلاغت و لطافت پیدا ہوگئی ہے وہ نکتہ دانوں پر مخفی نہیں۔

مثال ۱۱۔ ہند زوجۂ یزید نے جب زندانِ شام میں قدم رکھا تو حضرت

زینبؑ کو دیکھ کر شک ہوا کہ شاید یہ دخترِ جنابِ امیرؑ ہیں۔ لیکن پھر ساتھ ہی اہلبیتؑ نبوی کی عظمتؐ شان پر غور کرتے ہوئے یہ امر قیاس میں نہیں آتا تھا کہ اُن کا اس حالِ تباہ میں ہونا ممکن ہے۔ اسلیے اُس نے چاہا کہ اپنا شبہ رفع کرے تاکہ اصلِ حقیقت معلوم ہو جائے۔ اس غرض سے اُس نے جناب زینبؑ کو اس طرح مخاطب کیا ؎

سُنی جو ہند نے آوازِ دخترِ زہراؑ
قریب آکے پُکاری، اُٹھاؤ سر تو ذرا
ہے آشنا مرے کانوں سے کچھ تمہاری صدا
زمیں پہ رکھدیا زینبؑ نے سر کو اور یہ کہا

یہ سر اُٹھانے کے قابل نہیں رہا بی بی
یہ مُنہ دکھانے کے قابل نہیں رہا بی بی

پُکاری ہند نہ منہ کو چُھپایئے للّٰہ
تمہاری شکل پہ پہلے جو میری تھی نگاہ
تو ایک بی بی کا گذرا تھا شبہ تم پر آہ
اس اشتباہ سے ہے میرے دل کا حال تباہ

میں یاد کرتی ہوں، ایسا جمال کسکا ہے
زباں پہ لا نہیں سکتی، خیال جسکا ہے

خدا نہ جھوٹ کرے، راست ہے یہ میرا گماں
کہیں مدینے میں لاریب آپ کا ہے مکاں
جنابِ زینبؑ و کلثومؑ کا مکاں ہے جہاں
کبھی جناب بھی جاتی تھیں اُنکے گھر مہماں؟

شریکِ آلِ پیمبرؐ میں تم کو دیکھا ہے
جنابِ فاطمہؑ کے گھر میں تم کو دیکھا ہے

تمہاری شکل ہے زینبؑ کی شکل سے ممتاز
وہ میری بی بی ہے، یادش بخیر، عمر دراز
سخن میں آپ کے اُنکے سخن کا ہے انداز
وہی زباں وہی لہجہ ہے اور وہی آواز

جلالؔ و دبدبہ زینبؑ کا آپ میں سب ہے
تمھارا نام ہی کچھ اور، یا کہ زینبؑ ہے

دیکھو ہند ابتدا میں صاف صاف اپنے شبہ کا اظہار نہیں کرتی، کہ شاید گمان غلط ہو، اسلیے اُس نے رفتہ رفتہ اسلوبِ کلام کو ترقی دی ہی۔ پہلے کہا کہ میرے کان تمھاری آواز سے آشنا ہیں۔ اس سے زیادہ ترقی کی تو کہا کہ تمھاری شکل پر ایک بی بی کا خیال گذرتا ہی جنکا نام زبان پر نہیں لاسکتی۔ پھر کہا کہ کیا آپ کا مکان مدینے میں ہی جہاں حضرت زینبؑ و کلثومؑ تشریف رکھتی ہیں؟ کیا آپ کبھی اُن کے گھر بھی مہمان جاتی تھیں؟ اسکے بعد کہا کہ میں نے تم کو حضرت فاطمہؑ کے گھر میں دیکھا ہی۔ مگر جب رفتہ رفتہ شبہ کم ہوتا گیا تو کہا کہ تمھاری شکل تو حضرت زینبؑ سے ملتی ہی اور گفتگو میں بالکل اُنہیں کا انداز ہی۔ آخر جب شک ایک کافی حد تک رفع ہوگیا تو صاف الفاظ میں کہدیا کہ آپ کا نام زینبؑ ہی یا کچھ اور۔ ان اشعار میں درجہ بدرجہ عاقلانہ و مودبانہ طرزِ گفتگو نے جو بلاغت پیدا کر دی ہی اُسکا لطف اربابِ نظر خود معلوم کرسکتے ہیں۔

مثال ۱۲۔ واقعۂ کربلا کے بعد جب اہلِ بیتؑ یزید کے دربار میں گئے اور امامِ ہمام کا سرِ مبارک طشت میں رکھا گیا تو ہند آپ کو پہچان کر بیساختہ پردے سے باہر نکل آئی، اُسوقت اپنے ناموس کی ہتک پر یزید کی تشویش و ندامت، اور اہلِ دربار کی پریشانی کی تصویر اس بلاغت کے ساتھ کھینچتے ہیں ؎

لرزے امرا، کانپ گیا حاکمِ اکفر	پردے سے یہ نکلی، وہ ہوا جامے سے باہر
درباریوں کو حکم دیا تخت سے اُٹھ کر	ہاں ڈھانپ لو رومالوں سے چہروں کو سراسر

رسوا ہوا اقلیم میں اب نام ہمارا
ناموس نکل آیا سرِ عام ہمارا

بانوئے حزیں سہم کے عابدؑ کو پکاری
زینبؑ پہ عجب قہر کا غصہ ہوا طاری
منہ پھیر لو تم بھی یہاں ہند آتی ہے واری
چلائی اب انصاف ترے ہاتھ ہے ناری

بنتِ شہِ مرداں ہوں نہ مرنے سے ڈرونگی
اسوقت تو قائل تجھے سب مجمع میں کرونگی

ان اشعار میں یزید اور اہلِ دربار کے کفر و ارتداد۔ اور بے حمیتی و جفا شعاری کو کیسے بلیغ اور لطیف پیرایہ میں ادا کیا ہے۔ یزید اچھی طرح جانتا ہے کہ ناموس کا بے پردہ ہو جانا کیسی جانفرسا ذلت ہے، اپنی بیوی کے بے پردہ نکل آنے پر وہ بدحواس ہو گیا باوجودیکہ وہاں صرف معدودے چند امرا موجود تھے ہجوم عام نہ تھا، محل بھی اُسی کا تھا نہ کوچہ و بازار، پھر بھی اُسکو صدمہ ہوا اور درباریوں کو حکم دیا کہ اپنے چہرے ڈھانپ لیں، اس درد و قلق کے احساس پر بھی اُسکو حضرت زین العابدینؑ کی دردانگیز مصیبت سے کچھ ہمدردی نہیں ہوتی جو اپنی ماں بہنوں کو بلوائے عام میں دیکھ رہے ہیں اور دم نہیں مار سکتے۔ اسپر بھی اکتفا نہیں بلکہ زبان سے صاف صاف کہتا ہے کہ دربار میں ہمارے ناموس کے نکل آنے سے مُلک مُلک رسوائی ہوئی لیکن وہ محسوس نہیں کرتا کہ اہلبیتؑ کی دربدری سے خود رسول اللہؐ اور علی مرتضیٰؑ بلکہ اسلام کی توہین ہو رہی ہے۔

اُمرا بادشاہ وقت کی بیوی کو باہر دیکھ کر لرز گئے، مگر وہ جفا شعار امام حسینؑ کے حرم اور رسولؐ مقبول کی نواسیوں کو بے تکلف دیکھتے ہیں نہ دل لرزتا ہے

نہ بدن کانپتا ہی۔ حضرت شہربانوؑ کی زبانی آخر بند کا دوسرا مصرع جو حضرت زین العابدینؑ سے کہا ہی ع۔ منہ پھیر لو تم بھی یہاں ہند آتی ہو واری۔ بلاغت کے سانچے میں ڈھلا ہوا ہی جس میں فصاحت و بلاغت کا عجب نکتہ مضمر ہے، یعنی علاوہ اپنی دینداری اور پابندی شرع کے وہ یزید کو غیرت دلاکر متنبہ بھی کرتی ہیں کہ کسی نامحرم کی صورت دیکھنا بیدینی اور سنگدلی ہی، اسلیے وہ سہم کر اپنے بیٹے کو تاکید کرتی ہیں کہ تم بھی ہند کی جانب سے منہ پھیر لو "سہم کر" کا لفظ اور زیادہ پُر حسرت اور موثر و فصیح ہی۔ یعنی اُن کو مردوں کی مجلس میں ایک عورت کا بے پردہ نکل آنا ایسا عجیب امر معلوم ہوا کہ پریشان ہوکر سہم گئیں۔

مثال ۱۳۔

پہونچی صدا یہ کان میں حضرت کے الحذر اور خاک پر وہ بیٹھ گئے تھام کر جگر	مندیل پھینک دی شہِ دیں نے زمین پر زینبؑ پکاری خیر ہی یا شاہِ بحر و بر

شہ بولے ہمشبیہ پیمبرؐ ہوا شہید
زینبؑ تمہارا لاڈلا اکبرؑ ہوا شہید

یہ مثال مولوی شبلی کی مثال نمبر ۱۱ (صفحہ ۶۶) کے بالکل ہم مضمون ہی جس میں اُنھوں نے میر صاحب کے اس مصرع کی بلاغت کا اظہار کیا ہی۔ ع۔ یہ ہم تمہارے لال کے خوں میں نہائے ہیں۔ پس ہم بعینہ اُنھیں کے الفاظ میں اس مثال کی بلاغت کا بیان کرتے ہیں۔

یہ وہ موقع ہی کہ حضرت علی اکبرؑ کی شہادت کے وقت امام حسینؑ مضطرب ہوگئے ہیں، اور جناب زینبؑ کے دریافت کرنے پر اُن کی شہادت کا واقعہ

بیان فرماتے ہیں۔ اس موقع پر الفاظ "تمہارا لاڈلا اکبرؓ" ایک خاص اثر پیدا کرتے ہیں
حضرت علی اکبرؓ امام حسینؑ کے صاحبزادے ہیں لیکن آپ اُن کو حضرت زینبؑ
کا لاڈلا کہہ کر خطاب کرتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ میں جو ایسا مضطرب ہو گیا ہوں،
یہ تمہارے لاڈلے کی شہادت کا قلق ہے۔ انسان کو رنج و غم کی حالت میں جب
کوئی نہایت قریب کا عزیز ہمدرد اور غمگسار مل جاتا ہے تو جوشِ محبت میں اُس غم کو
اپنی ذات کے ساتھ نہیں بلکہ اُسی شخص کی طرف منسوب کرتا ہے، گویا اُس سے ایسی
ہمدردی کی امید کرتا ہے کہ وہ واقعہ خود اُسی شخص پر پیش آیا ہے۔ یہاں اس طرزِ بیان
نے زیادہ اثر اس وجہ سے پیدا کیا ہے کہ فی الواقع حضرت زینبؑ کو جناب
علی اکبرؓ سے نہایت محبت تھی، علی اکبرؓ کو بچپن سے اُنھوں نے پالا تھا اور
اُن کو اپنے بیٹوں سے زیادہ عزیز رکھتی تھیں۔ میر صاحب کے "تمھارے لال" کی طرح
مرزا صاحب کا "تمھارا لاڈلا" بھی نہایت پُرحسرت اور پُرتاثیر ہے۔

مثال ۱۴-ب

پردہ اُٹھا کے ڈیوڑھی سے زینبؑ نے کی نظر بیساختہ پکاری بہن صدقے آپ پر	دیکھا سلاح بانٹتے ہیں شاہِ بحر و بر حقدار امیدوار کھڑے ہیں اِدھر اُدھر

آقا ہر اک غلام کے جوہر شناس ہیں
دو بچے بھی تیغِ حسینؑ کے پاس ہیں

یہ وہ موقع ہے کہ حضرت امامِ حسین علیہ السلام تمام اعزا و انصار کو ہتھیار تقسیم
کر رہے ہیں، اور جناب زینبؑ چاہتی ہیں کہ بزرگوں کے تبرکات میں سے اُنکے
بچے بھی حصہ پائیں۔ اس مضمون کو کیسے حُسنِ طلب کے ساتھ ادا فرمایا ہے اور کس بلیغ

پیرایہ میں اپنے لڑکوں کی سفارش کرتی ہیں - ع - حقدار امیدوار کھڑے ہیں ادہر اُدہر - اخیر کا مصرع - دو بچے بھی تیغِ حسینؑ کے پاس ہیں - انتہا درجہ کا پُرمضمون موثر - اور بلیغ ہی جسکا لطف دقیقہ رس اور نکتہ شناس طبیعتیں خود محسوس کرسکتی ہیں - اگرچہ حقدار ایک ہی شخص ہو، لیکن شریف زادیاں ہر موقع پر حقدار - امیدوار - دونوں لفظوں کو ایک ساتھ استعمال کرتی ہیں؛ یہاں زیادہ بلاغت یہ ہے کہ حقدار - امیدوار بھی دو ہی ہیں - ادہر اُدہر کے الفاظ نے ایک اور لطف پیدا کر دیا ہے -

مثال ۱۵ - امام حسینؑ جب جناب علی اصغرؑ کو فوجِ شام کے سامنے پانی مانگنے کیواسطے لے گئے ہیں تو اُن لوگوں سے جس انداز اور جس طریقے سے آپنے گفتگو کی ہے اُسکو اس طرح بیان کرتے ہیں ؎

بھائی کے غم سے ٹوٹ گئی شاہ کی کمر	ناگاہ رن میں قتل ہوا نوجواں پسر
اکبرؑ کے بعد شہ کو ملا وقفہ اسقدر	پرسا کھڑے کھڑے دیا بانوؑ کو آنکر

روتے ہی آئے روتے ہی رن کو چلے گئے
اکبرؑ کی لاش رکھ گئے اصغرؑ کو لے گئے

آئے جو شاہ متصل لشکرِ جفا	چادر اُلٹ کے حال دکھایا صغیر کا
آنکھوں کے حلقے خشک زباں چھوٹا سا گلا	چاہا کہ پانی مانگیں، مگر آگئی حیا

مشکل سے اتنا لفظ کہا دردِ یاس سے
یارو! قریبِ مرگ یہ بچہ ہے پیاس سے

بلاغت کے ہر پہلو پر غور کرو - ممکن تھا کہ امام حسینؑ اپنی جانب سے اپنے خرد

سال بچے کیواسطے پانی مانگتے، لیکن تقاضائے غیرت زبان کو روکتا ہی؛ اسکے علاوہ یہ بھی خیال ہی کہ سنگدل دشمن اُن کی درخواست کو کبھی قبول نہ کرینگے۔ اسلیے خود علی اصغرؑ کی طرف سے طلب کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن اُن کی طرف سے بھی صاف صاف سوال کرنا طبیعت گوارا نہیں کرتی، اسلیے پہلے تو کچھ کہنے کی عوض صرف بچے کا حالِ زار دکھا دینے ہی کو کافی سمجھا تاکہ زبان سے کچھ کہنا نہ پڑے

؎ چادر اُلٹ کے حال دکھایا صغیر کا ؛ آنکھوں کے حلقے خشک زبان۔ چھوٹا سا گلا۔ لیکن جب دشمنوں پر اسکا بھی کچھ اثر نہوا تو چاہا کہ بچّے کی طرف سے پانی مانگیں مگر اُس کی طرف سے درخواست کرنے پر بھی حیا آگئی۔ ع۔ چاہا کہ پانی مانگیں مگر آگئی حیا۔ مگر اسکے بعد بالکل مجبور ہوکر سوال آپ کرتے ہیں لیکن وہ بھی مشکل سے۔ پھر کچھ کہا بھی تو صاف صاف نہیں جس میں مذلّتِ سوال کا شائبہ بھی پایا جائے بلکہ صرف اسی پر اکتفا کرتے ہیں کہ "یہ بچہ شدتِ تشنگی سے قریبِ ہلاکت ہے" جس سے اپنا مطلب بھی پورا ہوجاتا ہی، اور حقیقت میں دیکھو تو ایک امرِ واقع کا اظہار ہی اور کچھ نہیں۔ حضرت امام حسینؑ سے غیور اور باحمیت بزرگ کی عالی حوصلگی اور غیر تمندی کی یہ اصلی اور سچّی تصویر ہی جسکو مرزا صاحب کے جادو رقم قلم نے نہایت بلیغ اور لطیف پیرایہ میں کھینچکر دکھا دیا ہی۔

مثال ۱۶۔ واقعۂ کربلا کے بعد جب اہل حرم زندانِ شام میں گئے اور ہندنے وہاں پہونچکر اور جناب زینبؑ کو پہچان کر لونڈیوں سے کہا ہی کہ یہی میری بی بی حضرت زینبؑ ہیں تو وہ متعجب ہوکر ہند سے اس طرح کہتی ہیں ؎

چلائیں کنیزیں کہ سعادت ہی ہماری	سچ کہتی ہو بی بی؟ یہی بی بی ہیں تمہاری؟

کھاؤ تو قسم پنجتنؑ پاک کی واری — یہ حضرت زینبؑ ہیں ید اللہ کی پیاری!

نانا کو اسی بی بی کے معراج ہوئی ہے؟
ہے ہے نہ کہو یہ تو کوئی پیاروں موئی ہے

بخشی ہے قطار اونٹوں کی حیدرؑ نے گدا کو — اس عہد میں بیٹی ہوئی محتاج ردا کو
کیا بھول گئے لوگ پیمبرؐ کو خدا کو — پہچانیے خوب ان کی شباہت کو صدا کو

ہودج میں نہ محمل میں نہ ایوان میں دیکھا
کونین کی شہزادی کو زندان میں دیکھا

ان اشعار میں لونڈیوں کے تحیر و استعجاب کو نہایت بلیغ اور لطیف پیرایہ میں ادا کیا ہے۔ وہ خوب جانتی ہیں کہ جناب زینبؑ ید اللہ کی پیاری ہیں جنکے جاہ و جلال کا سکہ دنیاے اسلام پر بیٹھا ہوا ہے، وہ اچھی طرح واقف ہیں کہ اُنکے جلیل القدر نانا کو معراج کا شرف حاصل ہوا ہے، اُن کو اس بات کا بھی علم ہے کہ اُنکے باپ نے سائل کو اونٹوں کی قطار بخشدی تھی، اُن کو اسکا بھی یقین ہے کہ لوگ اسقدر جلد پیغمبر اسلام کو بھول نہیں سکتے۔ ان سب باتوں کے جاننے کے بعد وہ کیونکر مان سکتی ہیں کہ ایسے رفیع الشان خاندان کی عورتیں اسیر ہو جائیں۔ ان بندوں میں یہ دونوں مصرعے۔ ع کھاؤ تو قسم پنجتنؑ پاک کی واری۔ اور ع۔ پہچانیے خوب ان کی شباہت کو صدا کو بلاغت کی جان ہیں۔ قسم کھانے اور شباہت کو خوب غور سے دیکھنے کی فرمائش اسلیے ہے کہ لونڈیوں کے نزدیک خاندان رسالت کی عظمت و شان اسقدر مسلم ہے کہ اُن کا زندان شام میں آنا عقل میں نہیں آسکتا اسلیے کہتی ہیں کہ تم کو کچھ دھوکا تو نہیں ہو گیا ان کی صورت اور آواز کو خوب پہچانیے "خوب" کا لفظ اور زیادہ فصیح اور

موثر ہے۔

مثال ۱۷۔ مدینہ میں کربلا سے قاصد آیا ہے، اور حضرت ام البنینؑ اُس سے امام حسینؑ کے حالات دریافت کرتی ہیں۔ اُنکے سوالات اور قاصد کے جوابات کو اس طرح نظم کیا ہے ؎

کیا خطاب یہ قاصد سے پھر بحال تباہ
لے اب سُنا خبر بادشاہِ عرش پناہ
وہ بولا حال سُنو اپنے تینوں بیٹوں کا آہ
گیا جہاں سے پُر ارمان تیرا عبداللہؑ

غریب مرگیا برچھی کلیجے پر کھا کے
وہ بولی صدقے کلیجے یہ ابنِ زہراؑ کے

خبر حسینؑ کی دے مجکو اب برائے حسینؑ
وہ بولا عونؑ بھی تیرا ہوا فدائے حسینؑ
پکاری وہ کہ یہ قربانِ خاکپائے حسینؑ
سعادت اُنکی تھی اب کہہ تو ماجرائے حسینؑ

وہ بولا خون میں جعفرؑ بھی تیرا لال ہوا
گلا بھی کٹ گیا، لاشہ بھی پائمال ہوا

یہ بات سن کے ہوئی غصے زوجۂ حیدرؑ
کہا سوال دگر قاصدا جواب دگر
میں تجھ سے پوچھتی ہوں ابنِ فاطمہؑ کی خبر
تو حال عونؑ کا کہتا ہے، قصہ جعفرؑ

یہ کون اور میں کون، اور کس کے چار پسر
فدا حسینؑ پہ ایسے مرے ہزار پسر

ان تمام اشعار میں حضرت ام البنینؑ کی بے انتہا دلی محبت و الفت کا، جو انکو امامِ حسینؑ سے تھی، موثر و دلنشین مرقع کھینچدیا ہے۔ مثلاً مقتضائے فطرتِ عام یہ تھا کہ وہ سب سے پہلے اپنے بیٹوں کی خیریت دریافت کرتیں، مگر انھوں نے

ایسا نہیں کیا بلکہ پہلے امام حسینؑ ہی کا حال پوچھتی ہیں۔ لیکن قاصد خود ہی اس خیال سے کہ ماں کو اپنی اولاد سے زیادہ تعلق ہوا کرتا ہے، سب سے پہلے اُنکے بیٹوں کے حالات بیان کرتا ہے۔ اس نازک موقع پر تقاضاے فطرت عام یہ تھا کہ جناب ام البنینؑ بیٹوں کے اچانک حادثہ کی خبر سُنتے ہی بیقرار ہو جائیں اور امام حسینؑ کا حال دریافت کرنے کے ہوش وحواس نہ رہیں، لیکن نہیں وہ اپنے بچوں کے مرنیکا حال سُنکر بدحواس نہیں ہوتیں، اور یہ دلشکن واقعات بھی جذبۂ محبت پر کوئی اثر نہیں ڈالتے۔ وہ بیٹوں کے حالات کو بے توجہی سے سُنکر بدستور امام حسینؑ کا حال دریافت کرتی جاتی ہیں، بلکہ آخر میں ناخوش ہوتی ہیں کہ میں فرزندِ فاطمہؑ کا حال پوچھتی ہوں اور تو غیر متعلق باتیں بیان کر رہا ہے۔ ایک درد رسیدہ ماں کا ایسے نازک موقع پر اپنے فطرتی جذبات کو قابو میں رکھکر امام حسینؑ کے حالات سے اسقدر گرویدگی ظاہر کرنا حقیقت یہ ہے کہ ایک عدیم النظیر محبت کی اس سے زیادہ نمایاں مثال مشکل سے ملیگی۔ اور اس عجیب وغریب اُلفت کا سماں جس خوبی اور پُراثر طریقہ سے مرزا صاحب نے دکھایا ہے اُس سے اُنکے قلم کا زور اور زبانِ اُردو پر قدرت کا اظہار ہوتا ہے۔ اُنھوں نے اس موقع پر عام لوگوں کے فطرتی جذبات اور اہلبیتؑ کے خیالات کو الگ الگ دکھا کر ایک امتیازِ خاص پیدا کردیا ہے اور یہی بلاغت کا اصل اصول ہے۔

استعارات وتشبیہات مولف نے استعارات وتشبیہات کا جو بیان کیا ہے، بہت صحیح اور درست ہے، سوا اس غلطی کے کہ وہ ہر جگہ استعارہ اور تشبیہ کی ساتھ ساتھ تعریف کرتے ہیں اور کہیں اُن کی عبارت سے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ دونوں میں

فرق کیا ہے۔ گویا وہ استعارہ اور تشبیہ کو دو مترادف الفاظ سمجھے ہوئے ہیں حالانکہ دونوں میں بہت فرق ہے۔ مثالیں جو اُنھوں نے دی ہیں وہاں بھی استعارہ اور تشبیہ کی مثالوں میں کوئی امتیاز قائم نہیں کیا، دونوں کی الگ الگ مثالیں دینا لازم تھا چونکہ اُنھوں نے دونوں کے علیحدہ علیحدہ عنوان نہیں لکھے اسلیے ہم بھی اُنہیں کی تقلید کرتے ہیں۔

آگے چلکر وہ میر صاحب کے کلام میں تشبیہ کی خوبیوں کا اظہار کرتے ہیں۔ اتنا ہم بھی اُنکے ہمخیال ہیں کہ "تشبیہ کی قابلِ قدر خوبیاں میر انیس صاحب کے کلام میں پائی جاتی ہیں" سوا اس فقرہ کے کہ "اُردو زبان میں اُن کی نظیر نہیں مل سکتی" اسلیے کہ اُنہیں کے مقابلے میں ہم ایک دوسرے بلیغ اور نازک خیال شاعر مرزا دبیر صاحب کے کلام سے بھی چند ایسے ہی دلکش اور دلفریب نمونے پیش کرتے ہیں جس سے اُن کا کلّیہ بالکل باطل ہوا جاتا ہے۔

مرزا صاحب نے خاص طور پر استعارات و تشبیہات میں وہ وہ حیرت انگیز جدّت طرازیاں اور بلند پروازیاں دکھائی ہیں کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے، اور انھیں عدیم المثال نازک خیالیوں نے اُن کو شعرا میں ایک ممتاز فوقیت دیدی ہے، لیکن مؤلف کی طبع نازک سے اندیشہ ہے کہ وہ اس قسم کے نازک اور باریک استعاروں کو قدر کی نگاہ سے نہ دیکھ سکیں گے اور صاف کہدینگے کہ تکلف اور تصنع سے اثر میں کمی آجاتی ہے اور ہر چیز کا نیچرل حالت میں رہنا لازمی ہے۔

تمام حالتوں کو ظاہر کرنے کیواسطے نیچر سے کام نہیں لینا پڑتا بلکہ بعض اوقات مبالغہ اور استعارہ اور مضامینِ بلند کی چاشنی دیکر کلام کو پُر زور اور پُر شوکت بنانا

پڑتا ہے۔ اگر شعر و سخن میں معنی آفرینی نہ پائی جائے تو شاعری عبث ہے، اور پھر معنی میں لطافت و نزاکت نہ ہو تو شعر کو شعر نہیں کہہ سکتے۔" قدما اُردو روزمرہ اور صفائی بیان کو سب باتوں سے زیادہ اہم اور مقصود بالذات جانتے تھے۔ برخلاف متاخرین کے کہ وہ ہر شعر میں ایک نئی بات پیدا کرنے اور اسالیبِ بیان میں نئے نئے تعجب انگیز اور لطیف و پاکیزہ اختراعات کرنے ہی کو کمالِ شاعری سمجھتے تھے۔ اور زبان کی صفائی اور روزمرہ کی نشست کو محض خیالات ظاہر کرنے کا ایک آلہ (نہ کہ مقصودِ شاعری) تصور کرتے تھے۔ چنانچہ مرزا غالب ایک دوست کو خط میں لکھتے ہیں کہ بھائی! شاعری معنی آفرینی ہے قافیہ پیمائی نہیں ہے[۲]۔"

مرزا غالب کے فروغ کا باعث اُن کی بیمثال مضمون آفرینی۔ جدت طرازی۔ اور بلند پروازی ہے، اور اسی مضمون آفرینی اور لطافتِ معنوی نے عرفی۔ و ظہوری کو اقلیمِ بلاغت کا تاجدار بنا دیا۔ لیکن ہم کو مولوی صاحب کی خاطر منظور ہے اسلیے ہم اُسی قسم کے استعارات و تشبیہات کی مثالیں دینگے جو اُنکے مرغوبِ طبع ہیں مولف نے میر صاحب کی تشبیہات کی جو خصوصیات لکھی ہیں۔ اُن کی تفصیل یہ تحریر کی ہے۔

(۱) اکثر تشبیہات مرکّب ہیں (مرزا دبیر کے کلام میں بھی اکثر ایسی تشبیہات مل سکتی ہیں)

(۲) اکثر تشبیہات قریب الفہم اور سریع الانتقال الی الذہن ہیں، اور یہی تشبیہ کا کمال ہے (مرزا صاحب اعلی اللہ مقامہ کا کلام بھی ان تشبیہات سے خالی نہیں ہے)

---

۲ یادگار غالب صفحہ ۱۲۴۔

(۳) پھر لکھتے ہیں "علماے معانی[1] نے لکھا ہے کہ تشبیہ کی غرض کبھی مشبّہ کی رفعت و حُسن، اور کبھی تحقیر و ذلت، اور کبھی رعب و ہیبت ہوتی ہے، یہ باتیں میر انیس کی تشبیہات میں کمال کے درجہ پر پائی جاتی ہیں" اسکے بعد مولف نے مثالیں لکھی ہیں۔ ہم بھی اس موقع پر مرزا صاحب کے کلام سے اسی قسم کی تشبیہیں لکھتے ہیں مثلاً حضرت سید سجّادؑ کی حالتِ اسیری کو اس طرح ظاہر کیا ہے ؎

مشبہ کی تزئین و تعظیم

درازئ مو

بڑھ گئے ہیں جو اسیری کے سبب سر کے بال
ہے عیاں آیۂ رحمت کا نزولِ اجلال
سنبلِ گلشنِ قدرت ہے فقط انکی مثال
بال اُن زلفوں کے ہیں بالِ ہماے اقبال

طولِ کاکل کا اسیری میں جو یہ طور ہوا
سلسلہ بخششِ امت کا دراز اور ہوا

عریانی

تن میں ملبوس نہ ہے دوشِ مبارک پہ عبا
قطع اس قد پہ ہے پیراہنِ تسلیم و رضا
بے لباس اس تنِ پُر نور کی ہے اور ضیا
طور کے شمع کو فانوس کی حاجت ہے کیا

پیرہن میں بھی تنِ پاک نہیں چھپتا ہے
نورِ خالق کا چھپائے سے کہیں چھپتا ہے

داغِ کفِ دست

بسکہ کھینچی ہے مہارِ شترِ آلِ عباؑ
سو کفِ دست میں کس حُسن سے گٹّا ہے پڑا
فی المثل مہر میں ہے داغِ قمر جلوہ نما
مُہرۂ مہر کجا، داغِ دلِ ماہ کجا

پشتِ احمدؐ پہ تو تھی مُہرِ نبوت پیدا
یاں کفِ دست میں ہے مُہرِ شفاعت پیدا

[1] تشبیہ کے حالات بیان کرنے کو علماے علم معانی کی جانب منسوب نہ کرنا چاہیے۔ کیونکہ تشبیہ و استعارہ و کنایہ و مجاز کے حسن و قبح سے بحث کرنا علماے علمِ بیان کا کام ہے نہ علماے علم معانی کا۔

حالتِ اسیری میں بالوں کا بڑھ جانا، یا جسم پر لباس کا نہ ہونا، یا اونٹوں کی رسن کھینچتے کھینچتے ہاتھوں میں گٹے پڑجانا، عموماً ایک بدنما حالت ہی۔ اور اسکے اظہار سے ایک محترم اور معزز بزرگ کی نسبت ذلت کا خیال پیدا ہوتا تھا، مگر ان نادر تشبیہات نے بدنمائی اور ذلت کے عوض ایک خاص شان پیدا کر دی ہی۔

اسیری اہل حرم

یا مثلاً جب تمام اہلبیتؑ ایک ہی رسّی میں اسیر کیے گئے ہیں تو اس حالت کو اس طرح بیان کیا ہے۔

ع سب درِ نجف رشتے کے حلقے میں دُر آئے

ع رسّی میں بندھا جبکہ وہ گلدستۂ اسلام

رسّی میں بندھے سب حرمِ شاہِ شہیداں		جس طرح سے شیرازے میں سیپارۂ قرآن

رسّی میں باندھا جانا اور وہ بھی ایک ہی رسّی میں، بظاہر نہایت ذلت نما حالت تھی، لیکن تشبیہات نے بدنمائی کو حُسن سے بدل دیا۔

یا مثلاً جب حضرت سجادؑ کی پشت مبارک پر دُرّوں کے زخم پڑ گئے ہیں تو اس حالت کو اس طرح بیان کیا ہی ؎

زخم تازیانہ

اور پشت ہی تختۂ چمنِ خلد کا بیشک		دُرّوں کے گُلِ زخم شگفتہ ہیں ابھی تک

داغ کفِ دست

اب داغ کفِ دست میں حیران نظر ہی		یہ مردمکِ باصرۂ شمس و قمر ہے
یا زیبِ سمن لالے کا یہ داغِ جگر ہی		امت کے لیے حشر میں دوزخ کی سپر ہے
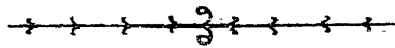
طوق گلوگیر

طوقِ گلوگیر کی اس طرح تشبیہ دیتے ہیں ؎

کرتا ہوں ثنا طوقِ گلوگیر کی اس جا — مدت سے ہے خورشید امامت کا یہ ہالا

بیڑیاں

بیڑیوں کی اس طرح تشبیہ دیتے ہیں ؎

اور پاؤں میں ہیں بیڑیاں دو دو جو برابر — جوہر میں ہے آئینہ اور آئینہ میں جوہر
پُر نور قدم سے ہوئے حلقے جو منور — اب سلسلۂ سلکِ ثریا سے ہیں بہتر
پائے قدِ بالا میں یہ زنجیریں کہاں ہیں
طوبیٰ کے تلے موجیں یہ کوثر کی عیاں ہیں

ہتکڑی

یا مثلاً حضرت سجاد کی خوبصورت مگر لاغر کلائی میں ہتکڑی کی تشبیہ اس طرح دی ہے ؎

ہتکڑی میں ہے یہ پتلی سی کلائی روشن — یا ہلالِ شبِ اول کے ہے چوگرد گہن

نابینائی

یا مثلاً نابینائی ایک قبیح اور بدنما حالت ہے، لیکن تشبیہ نے کس طرح بدنمائی کو حُسن سے بدل دیا ہے ؎

شہرہ ہے ان سفید بھوؤں کے کمال کا — ہے رنگ بھی ہلال کا خم بھی ہلال کا
مردم عبث ہیں آنکھوں کے یاں اشتیاق میں
ہوتے نہیں چراغ مہِ نو کے طاق میں

بے چشم کے بھی باغ ہے چہرے کا خوشنما — نرگس نہو چمن میں تو نقصِ چمن ہے کیا
خیبر شکن کے شیعوں میں صف شکن ہوئے
خود شیر تھے سو چشم کے آہو ہرن ہوئے

یا مثلاً زندانِ شام میں ہند کی نظر اہلبیتؑ پر پڑی تو ؎

قدرت کے آفتاب سے چمکتے نظر پڑے — باغِ نبیؐ کے پھول مہکتے نظر پڑے

یا مثلاً حضرت امام حسینؑ کا سر مبارک چاہ سے نکلتا ہے تو اُس کی تشبیہیں لکھتے ہیں ؎

نکلی دہن سے شیشہ کے نگہت گلاب کی	یا چاہِ مشرقی سے کرن آفتاب کی
یا نافۂ بہشت سے بو مشکناب کی	یا آب و تاب دُرج سے لعلِ خوش آب کی

ع۔ شمعِ نبیؐ عیاں ہوئی فانوسِ چاہ سے

یوں فرقِ شاہ چاہ سے نکلا بحسن و جاہ	جیسے دہن سے کلمۂ حق، آنکھ سے نگاہ
مخزن سے گنج، شب سے سپیدۂ گہن سے ماہ	ظلمت سے خضر، غار سے پیغمبرِ اِلٰہ

ظلمت کی سیر کر کے سکندر عیاں ہوئے
بیر العلم سے ساقیِ کوثر عیاں ہوئے

یا مثلاً حضرت حبیبؓ ابن مظاہر کی پیری، ارتعاشِ اعضا اور ثابت قدمی کی مثال دی ہے ؎

سر ہلتا ہے پر ہر کفِ یارن میں جمی ہے	جنبش میں ہے لو شمع کو ثابت قدمی ہے

یا مثلاً جب اعدا نے حبیبؓ ابن مظاہر کو پیری اور قد کی کجی کا طعنہ دیا تو وہ جواب دیتے ہیں ؎

قد خم ہو تو ہو عقل تو کج میری نہیں ہے	اس وجہ سے مائل مرا سر سوئے زمیں ہے
پوشیدہ زمیں میں نبیؐ عرش نشیں ہے	جھکنے ہی سے روشن بخدا نامِ نگیں ہے

غافل کو اشارہ ہے کہ محکومِ خدا ہو

ملنا ہی اسی خاک میں باطل سے جدا ہو

جھکنا شرفا کا ہے تقاضائے شرافت
جھکنے ہی سے افلاک کو حاصل ہوئی رفعت
خم ہونے سے محراب بنی جائے اطاعت
شاہد ہے رکوع اسپہ کہ جھکنا ہی عبادت

ڈرتے نہیں تم قدِ خمیدہ سے عجب ہے
جو تیغ کہ خمدار ہو کاٹ اُسکا غضب ہے

یا مثلاً اس شعر میں تشبیہ سے دشمن کی زشتی اور بداعمالی ثابت کی ہے ؎

تھا قلب میں صف کے عمرِ سعدِ ستمگر
جیسے دلِ کفار میں ہو کینۂ حیدرؑ

یا مثلاً ان اشعار میں تشبیہ سے دشمنوں کے قد و قامت - تلوار - نیزہ - ڈھال اور مغفر کی زشتی و بدنمائی کو کس انداز سے ظاہر کیا ہے ؎

وہ گھوڑوں پہ یا پریوں پہ آسیب تھے اسوار
تلوار بلا - نیزہ غضب - ڈھال شبِ تار

مغفر جو سرِ نحس پہ مغرور دھرے تھے
اُلٹے ہوئے دو لوہے کے تنور دھرے تھے

؎ چار آئینے سے شہرِ بدن تھا حصار میں
اندھیر اُس کی ڈھال سے تھا روزگار میں

؎ تن میں زرہ تھی، خود سرِ بے شکوہ پر
وہ زین پر لعیں تھا کہ اژدر تھا کوہ پر

؎ نیزہ بکف اُن پر وہ شقی یک بیک آیا
گویا کہ پہاڑ اپنی جگہ سے سرک آیا

یا مثلاً جب حضرت حرؑ لشکرِ اعدا سے جدا ہوئے ہیں تو فوجِ مخالف کی زشتی ان الفاظ میں بیان کی ہے ؎

غل تھا وہ مشرکوں سے مسلماں جدا ہوا
ظلمت سے نورِ کفر سے ایماں جدا ہوا
نصرانیوں سے عیسیٔ دوراں جدا ہوا
بادل سے آفتابِ درخشاں جدا ہوا

جنّت کو کس طریقے سے حرؑ بر محل گیا
عقرب سے چاند، چاہ سے یوسفؑ نکل گیا

حضرت زینبؑ کے صاحبزادے کا نیزہ دشمن کے منہ سے پار ہوتا ہے ؎

نیزے کی زباں تھی دہنِ نحس کے اندر ۔۔۔ عقرب میں قمر، دلو میں خورشیدِ منوّر

ع ۔ انگشتِ یداللہ میں ہے کلۂ اژدر

(۴) پھر لکھتے ہیں "محسوسات سے جو تشبیہ دیجاتی ہے، نہایت عمدہ خیال کی جاتی ہے، کیونکہ محسوسات رات دن محسوس ہوتے رہتے ہیں اسلیے اُنکے ذکر کے ساتھ فوراً اُن کی صورت ذہن میں آجاتی ہے اور اسلیے مشبّہ کی تصویر بھی آنکھوں میں پھر جاتی ہے۔" یہاں ہم مرزا صاحب کے کلام سے بھی محسوسات کی تشبیہوں کی چند نفیس مثالیں درج کرتے ہیں ۔

مثلاً بھاگڑ اور اضطراب کا بیان ؎

یوں جسمِ رعشہ دار سے جانیں ہوئیں رواں ۔۔۔ جس طرح بھاگیں زلزلے میں چھوڑ کر مکاں

یہاں یہ تشبیہ دی گئی ہے کہ جسموں سے جانیں اس طرح نکل گئیں جیسے لوگ زلزلے میں گھر چھوڑ کر بھاگ جاتے ہیں ۔ اس مقام پر رعشہ دار جسم کو زلزلے والے مکان سے جو تشبیہ دی ہے اُسنے ایک خاص لطافت پیدا کر دی ہے ۔

تلوار کے جوہروں کی تعریف ؎

جوہر نہ تھے وہ تیغِ شہِ خوش خصال میں ۔۔۔ دن کو چمک رہے تھے ستارے ہلال میں

دو حریف برچھیوں سے ایک دوسرے پر وار کر رہے ہیں اور نیزوں کی انیاں متحرک ہوتی ہیں ؎

پھل نیزوں کے اس طرح لرزنے لگے نہیں	جس طرح زباں سانپ کی ہلتی ہو دہن میں

حضرت علی اکبرؑ کی نیزہ برداروں سے لڑائی سے

دکھلاتے تھے داداکے ہنر اہلِ دغل کو	پھولوں کی طرح توڑتے تھے نیزوں کے پھل کو

نیزوں کے لچکنے کی تشبیہ ع نیزے افعی کی طرح ہاتھوں میں بل کھانے لگے۔

تلوار اعدا کی ڈھالوں میں ڈوب کر کس طرح نکلتی ہے

فوراً سپر میں ڈوب کے باہر پھل گیا	گویا گہن میں آکے مہِ نو نکل گیا

حضرت عباسؑ کا جسمِ مبارک زرہ میں سے

مابینِ زرہ ہے تنِ عباسِؑ علمدار	یا موجوں میں لہراتا ہے خورشیدِ ضیابار
یا چاند کے آئینے سے جوہر ہیں نمودار	یا گرد ہے طوبیٰ کے عیاں سنبلِ گلزار

تشبیہیں مرے ہاتھ یہ جوشن سے لگی ہیں
تاروں کی یہ آنکھیں تنِ روشن سے لگی ہیں

تلوار زرہ کو کاٹ کر نکل جاتی ہے سے

کاٹ کر یوں زرہِ جسمِ لعیں پار ہوئی	دام سے جیسے نکل جائے تڑپ کر مچھلی

یا مثلاً باوجود پیری اور ارتعاشِ اعضا کے حضرت حبیبؓ ابن مظاہر کی ثابت قدمی کی مثال دی ہے

سر ہلتا ہے پر ہر کفِ پا رن میں جمی ہے	جنبش میں ہے لو شمع کو ثابت قدمی ہے

یا مثلاً آنکھوں کی سیاہی و سفیدی کی کیسی نادر تشبیہ دی ہے

اس سپیدی و سیاہی کا بہم ہے یوں نور	آبِ حیواں کا ہو جس طور سے ظلمت میں ظہور

چشمۂ کوثر و تسنیم کے یہ جام ہیں دو

ایک گردش میں نمایاں سحر و شام ہیں دو

یا مثلاً تلوار کے زرہ اور جسم کو کاٹنے کی یہ تشبیہ دی ہے ؎

غائب ہوئی زرہ جو بدن پر یہ چل گئی چار آئینہ لہو سے ڈبو کر نگل گئی	یونسؑ پکارے جال کو مچھلی نگل گئی پتھر نگل کے لعل بدخشاں اگل گئی

حضرت امام حسینؑ کے دستِ منوّر میں نیزہ ؎

نیزے کی چمک دستِ منوّر میں کہوں کیا	ہی خطِّ شعاعی کفِ خورشید میں پیدا

(۵) پھر کہتے ہیں کہ "بعض جگہ تشبیہ سے مبالغہ مقصود ہوتا ہی، اگرچہ فی الحقیقت اس سے تشبیہ کی اصلی غرض نہیں حاصل ہوتی کیونکہ مبالغہ خود ایسی چیز ہی جو اصلیت سے دور کر دیتی ہی" اس کی مثالیں مرزا صاحب کے کلام سے ملاحظہ ہوں۔

گرمی کی شدت کا بیان ؎

مثلِ تنورِ گرم تھا پانی میں ہر حباب گلخن صدف تھے، دانۂ بریاں درِ خوش آب	ہوتی تھیں سیخ موج پہ مرغابیاں کباب آتش سے اپنی لعلِ بدخشاں تھا آب آب

یہ دھوپ تھی کہ دانے کا بچنا محال تھا
دانہ بچا بھی جلنے سے تو خال خال تھا

پوشیدہ چشمِ خلق سے مرغِ نگاہ تھا	کیا دھوپ تھی کہ رنگ فلک کا سیاہ تھا

۴ چار آئینہ کو پتھر سے تشبیہ دی ہی اور اُسکا لہو سے ڈوب جانا بالکل گم ہو جانا ہی۔ لہو کو لعل سے تشبیہ دی ہی پس گویا تلوار نے پتھر (زرہ) کو نگل کر لعل بدخشاں (خون) اُگلا ہی۔

کیا دھوپ ہے کیا تابشِ خورشیدِ فلک ہے — سایہ اسی گرمی سے سیہ آج تلک ہے

حضرت عباسؑ کی شمشیر شرربار کی دہشت ؎

یہ ہیبتِ شمشیر کا واں جوش ہوا تھا — جو موجوں سے دریا بھی زرہ پوش ہوا تھا

یکسر صفتِ بختِ سیہ ڈھالیں تھیں بیکار — تھی تن میں زرہ نامۂ عصیاں سے گرانبار
برش نہ رہی تیغوں میں عاری ہوئے کفار — اور خوف سے خاموش تھے گویا لبِ سوفار
دہشت سے جواں بھاگتے تھے تیر کی مانند
تھا نیزوں کو رعشہ قدمِ پیر کی مانند
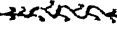
کم زور خوف سے ہوئے ایسے عدوئے دوں — مغفر کا بوجھ کوہِ گراں سے ہوا فزوں
بارِ سپر سے گرتا تھا یوں ہر قدِ زبوں — جس طرح بارِ سقف سے افتادہ ہو ستوں
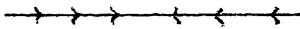
اب ہم چند اشعار ہر قسم کی تشبیہ کے ایک جا نقل کرتے ہیں، جن سے اندازہ ہوگا کہ مرزا صاحب نے تشبیہ میں کیا کیا لطافتیں اور نزاکتیں پیدا کی ہیں ؎

صف بستہ تھا اس طرح سے شبیرؑ کا لشکر — تسبیح میں جس طرح سے دانے ہوں برابر

ولہ

بہر گریز تھے قدم فوج یوں بہم — خامے کے جس طرح سے برابر نہیں قدم
لرزاں تھے مثلِ شعلہ ہر اک ہاتھ میں علم — جویاں تھی تیغ دیدۂ جوہر سے دمبدم
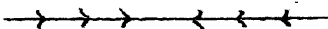
اِستادہ تھے رسولؐ کے پیارے زمین پر ‏ ‏ ‏ روشن تھے دن کو عرش کے تارے زمین پر

پیوستہ تیر سینے میں پیکاں جگر میں تھے ‏ ‏ ‏ وہ مہر میں کرن، یہ ستارے قمر میں تھے

یوں زین پہ زینت تھی علمدارِ جری کی ‏ ‏ ‏ جیسے دلِ مومن میں جگہ حبِّ علیؑ کی

ماتم یہ تھا کہ مالکِ کوثر ہے تشنہ کام ‏ ‏ ‏ بالکل اُلٹ دیئے تھے حبابوں نے اپنے جام

دریا جو دور پیاس میں تھا تشنہ کی فوج سے ‏ ‏ ‏ منہ پر طمانچے مارتا تھا دستِ موج سے

نعرے میں ہیں ضیغم، یہ عجب تیز پری ہے ‏ ‏ ‏ افلاک کے نوشیشوں میں بس ایک پری ہے

چمکا جو علم چار طرف یہ خبر آئی ‏ ‏ ‏ لو کاہکشاں آج زمیں پر اُتر آئی

جب ہاتھ میں تلوار کا پرتو نظر آیا ‏ ‏ ‏ خورشید کے پنجے میں مہِ نو نظر آیا

آخر پسینہ آگیا ماتھے پہ، تھک گئے ‏ ‏ ‏ زہرا کے آفتاب پہ تارے چھٹک گئے

کیا تیغِ آبدار تھی جوہر سے خوش جمال ‏ ‏ ‏ منجدھار میں کھڑی تھی پری کھولے سر کے بال

ابرو کا رخِ صاف میں پرتو نظر آیا
خورشید کے پلّے میں مہِ نو نظر آیا

عباسؑ سے کیا زین مزیّن نظر آیا
یوسفؑ بھی نہ یوں چشمِ زلیخا میں سمایا

پھر میان سے تیغِ دوزباں کھینچ لی اک بار
اژدر کے دہن سے ہوئے دو شعلے نمودار

خاصانِ حق کے خاص ہیں نیکوں کے نیک ہو
مثلِ نگاہ تم مری آنکھوں میں ایک ہو

شمشیر بھی غلاف سے باہر نکل پڑی
غُرفے سے حورِ خلد کھُلے سر نکل پڑی

کیا تیغِ دوزباں کی تجلّی تھی میں فدا
دو شعلے ایک شمع، زہے قدرتِ خدا

آگے بڑھی جو دل پہ یہ قبضہ کیے ہوئے
غل تھا پری وہ اُڑ گئی شیشہ لیے ہوئے

تیغ کے سائے نے دکھلا دیا آتش کا اثر
آبلے پڑ گئے گویا بدنِ دریا پر

سب شیرِ حق کے لال ہیں زہرا کے پیارے ہیں
دُرِ نجف ہیں عرشِ معلّے کے تارے ہیں

کیا حُسن ہے کیا نور ہے کیا جلوہ گری ہے
یاں شب کی طرح صبح ستاروں سے بھری ہے

قطرے رخِ پُرنور سے ڈھلتے ہوئے دیکھو		عطرِ گلِ خورشید نکلتے ہوئے دیکھو

| دندان و دہن کی ہی ثنا میرے سبق ہیں | | دنداں ہیں دہن ہیں کہ ستارے ہیں شفق میں |

| غل تھا کہ دھوپ دیکھنے کو سب ترستے ہیں | | چھایا ہی ابرِ تیغِ علیؑ سر برستے ہیں |

| پیاسا ہوا جو ذبح پسر بوتراب کا | | اُلٹا ہی دستِ موج نے کاسہ حباب کا |

| تھے آس پاس یوں رفقا اُس جناب کے | | تارِ شعاع جیسے ہوں گرد آفتاب کے |

حضرت امام حسینؑ کی تلوار کا ابر میدان میں چھایا ہوا ہی دشمن خوف سے بھاگ گئے ہیں ۔ ع ۔ بدلی بھی تھی گھری ہوئی مطلع بھی صاف تھا۔

| گھوڑے عرق آلودہ ادہر اور اُدہر آئے | | بجلی سے برستے ہوئے باراں نظر آئے |

| باندھی سپر و تیغ تو جلوہ ہوا گھر میں | | خورشید تھے شانوں پہ مہِ نو تھے کمر میں |

| رُخ کرتا تھا جس صف کو وہ ابنِ شہِ مرداں | | ایک پل میں اُلٹی تھی وہ مثلِ صفِ مژگاں |

اکبر لیے ہیں ہاتھ میں تیغ جدال کو	پنجے میں آفتاب کے دیکھو ہلال کو
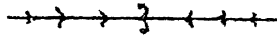
صنائع و بدائع

اب مولف اُس مقام پر آپہونچے جہاں مرزا دبیر کی شاعری کا آفتاب اوج کمال پر نظر آنے لگیگا۔ کیونکہ اُنھوں نے صنائع و بدائع میں عجیب و غریب کمالات دکھائے ہیں۔ یہی وجہ ہو کہ اُنکے ذہن کی بلند پروازی اور خیالات کی رفعت قابلِ تعریف سمجھی جاتی ہو۔ اُنکے نفیس کلام نے جو نکتہ سنجانِ سخن کے دلوں کو تسخیر کرلیا ہے اُس میں بہت سا حصہ صنائع بدائع کی دلفریبیوں کا ہو۔ مگر ان پاکیزہ نکات کی قدر صرف اہلِ مذاق ہی کر سکتے ہیں، قابل مولف نے تو عام طور پر فتویٰ لگا دیا کہ اکثر صنائع و بدائع شاعری اور انشا پردازی کا دیباچۂ زوال ہیں، حالانکہ ہر زبان اور ہر زمانے میں صنائع بدائع کی گرم بازاری رہی ہو، عربی و فارسی کے تمام نامور شعرائے اُن کو برتا ہی اور اب بھی کوئی زبان اس چاشنی سے خالی نہیں۔ ہر زبان کے لٹریچر کے مختلف مدارج ہوا کرتے ہیں، پہلا عام درجہ جس میں معمولی روزمرہ کے خیالات سیدھی سادھی زبان میں ادا کیے جاتے ہیں، اور اس موقع پر صاف رستہ اختیار کرلیا جاتا ہی، مگر جب یہ لٹریچر عام درجہ سے خاص اور خاص سے خاص الخاص کے درجے پر پہونچ جاتا ہی تو اسکے واسطے صنائع و بدائع۔ تشبیہات و استعارات لازمی ہوجاتے ہیں تاکہ کلام میں رفعت و دلفریبی کی ایک شان پیدا ہوجائے۔ جن صنائع بدائع سے مولف کو نفرت ہو وہ اُن عام شعرا کی نازک خیالیاں ہیں

جنھوں نے گویا اپنے کلام کی بنیاد ہی صنائع بدائع پر رکھی ہے، اور تکلّف و تصنّع جا و بیجا بھونڈے طریقے پر اُن کو استعمال کرتے ہیں، جن کی توجہ محض الفاظ کی کاریگری پر رہتی ہے اور معنی کا خیال بالکل جاتا رہتا ہے۔ لیکن جو عالی دماغ اور قادر الکلام شاعر ہوتے ہیں اُن کا مقصود اصلی تو یہی ہوتا ہے کہ کلام پُرزور۔ پُر تاثیر۔ پر مضمون اور لفظاً و معناً فصاحت و بلاغت کے سانچے میں ڈھلا ہوا ہو، اسکے بعد ضمناً صنائع و بدائع کا استعمال ایسی بے تکلفی اور بیساختگی سے کرتے ہیں کہ وہ معنی مقصود میں مطلق مخل نہوں بلکہ اُس میں اور زیادہ قوت پیدا کردیں، شعر کا حُسن دوبالا ہوجائے گویا شاہدِ معنی کو زیور سے آراستہ کردیا۔ چنانچہ اس موزونیت کے ساتھ صنائع بدائع کے استعمال کو نیچرل شاعر بھی قدر کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں۔ مولانا حالی صاحب جو نیچرل شاعری کے سب سے زیادہ دلدادہ، اور صنائع بدائع کے بیحد مخالف ہیں، مقدمۂ شاعری میں فرماتے ہیں" خاص خاص صنائع عربی اور فارسی کے نامور شعرا نے برتی ہیں، مگر کبھی اُن کا التزام نہیں کیا اور کلام کی بنیاد اُن پر نہیں رکھی، ہاں اگر حُسنِ اتفاق سے کوئی ایسا مناسب لفظ سوجھ گیا جس سے معنی مقصود میں کوئی خلل واقع نہ ہو اور بیان میں زیادہ حُسن پیدا ہوجائے ایسے موقع کو بلاشبہ ہاتھ سے جانے نہیں دیا[1]"

دوسرے موقع پر فرماتے ہیں" شعر کی اصلی خوبی یہ ہے کہ نیچرل ہو موثر ہو لفظاً و معنیً سانچہ میں ڈھلا ہو، اگر اسکے ساتھ کوئی لفظی رعایت بھی اس میں پائی جائے تو اَور بہتر ہے ورنہ اس کی کچھ ضرورت نہیں[2]" آگے چلکر مولف خود صنائع بدائع کی ہردلعزیزی

[1] مقدمۂ شاعری صفحہ ۱۷۰   [2] مقدمۂ شاعری صفحہ ۱۷۱

تسلیم کرتے ہیں چنانچہ لکھا ہے "میر انیس جس زمانے میں تھے اُس زمانہ میں عام طور پر صنائع بدائع کو بنظر استحسان و مقبولیت دیکھا جاتا تھا" اس سے معلوم ہوا کہ جس رنگ کو مرزا صاحب نے کمال پر پہونچا دیا اُس کی دنیا کو کسقدر تلاش تھی، یہی وجہ ہے کہ اُنھوں نے زمانے کا رُخ دیکھکر اسی پر زیادہ توجہ کی اور اُسکو ترقی کی اُس منزل پر پہونچا گئے کہ اب اُس سے ایک قدم بڑھنا ناممکن ہے۔ اگر زباندانی اور سلاست پسندی کا زیادہ چرچا ہوتا تو وہ سب کو چھوڑکر ہمہ تن اسی پر متوجہ ہوجاتے پس اُنھوں نے سلاست و سادگی پر اُسیقدر توجہ کی جسقدر اُس زمانے میں اسکی مانگ تھی تاکہ یہ اچھی طرح معلوم ہو جائے کہ وہ کسی صنف میں عاجز اور مجبور نہیں اور اُنکے کلام سے ہر مذاق کے لوگوں کو حظ حاصل کرنے کا موقع ملے۔ پھر وہ لکھتے ہیں "میر انیس نے لغو صنعتوں (اہمال - لزوم مالایلزم وغیرہما) کو بہت کم برتا باقی صنعتوں کو اس طرح برتا کہ کلام کی اصلی خوبی یعنی برجستگی - صفائی اور سادگی میں فرق نہ آنے پائے ہم ان تمام صنعتوں کی کچھ کچھ مثالیں نقل کرتے ہیں جو میر صاحب کے کلام میں پائی جاتی ہیں"۔ معلوم ہوا کہ مولف کو صنعتوں سے تو کچھ مخالفت نہیں، لیکن وہ چاہتے ہیں کہ اُن کو اس طرح برتا جائے کہ کلام کی برجستگی میں فرق نہ آنے پائے۔ لہذا ہم بھی مرزا صاحب کے کلام سے اُسی قسم کی صنعتیں بیان کرینگے جو نہایت صفائی کے ساتھ استعمال کی گئی ہیں۔

پہلے ہم اُن صنعتوں کو لکھتے ہیں جو مولف نے میر صاحب کے کلام سے انتخاب کی ہیں، اسکے بعد مرزا صاحب کے کلام سے چند جدید صنعتیں لکھیں گے۔

ایہام - یعنی ایک لفظ کے دو معنی ہوں ایک معنی مراد ہوں اور دوسرے معنی

اگرچہ مراد نہوں لیکن مقدم و موخر الفاظ سے اُن کو مناسبت ہو۔ مثلاً ع۔ ایک پھول کا مضموں ہو تو سو رنگ سے باندھوں۔ رنگ کے دو معنی ہیں ایک تو معمولی رنگ، دوسرے بمعنی طرز و قسم اور یہاں اسی سے مراد ہی پہلے معنی مراد نہیں لیکن گل سے اُن کو مناسبت ہی۔ اب ہم اس صنعت میں مرزا صاحب کے کلام سے چند مثالیں لکھتے ہیں ؎

برجوں کو اپنی مہر سے شمس و قمر ملے | دریا کو اپنی چاہ سے لعل و گہر ملے
بے پر نے مس کیا جو ہمیں بال و پر ملے | فطرس کے ذہن میں نہ پرتبے تھے پر ملے
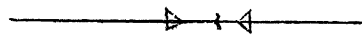
پر تیرا باپ کون تھا دل میں خیال کر | حیرت ہی سعد کا پسر اور نحس اسقدر
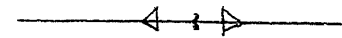
نظارہ غنیمت رخِ پرنور کا جانا | موسیٰ کو پہاڑ آج ہوا طور کا جانا
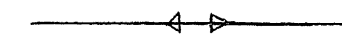
پہلے خطاب قاریوں سے شہ نے نہ کیا | قرآں کے حفظ کرنے میں ہو وقف دائما
پر حفظِ آبروے پیمبر نہیں ذرا | معنوں کو چھوڑ کر ہوئے حرف آشنا تو کیا
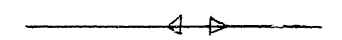
ثابت ہی کہ ستیارہ ہر اک ماند ہوا ہے | سیّارے ہیں کیا شہر بدر چاند ہوا ہے
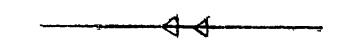
اس نیزے سے مباحثہ کی کسکو تاب ہے | گویا زباں کی طرح یہ حاضر جواب ہے
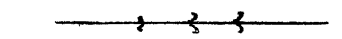
جان اِس طرف رواں تھی قرار اُس طرف فرار	قالب سے رُوح بھاگ گئی دل تو در کنار
احمدؐ مدینہ علم کا در بو تراب ہے	اس باب میں حدیثِ رسالتمآب ہے
ہستی پکاری وہ نظر آئی اجل مجھے	چلایا دن کہ آج ملے گی نہ کل مجھے
مصری نبات کر سکے سب بولے الاماں	بُت بن کے گبر رہ گئے پتھرائیں انگلیاں
اس نام کے لیتے ہی طبیعت کا بڑھا زور	شیریں سخنی کا مری عالم میں ہوا شور
بازارِ قدرِ آبِ بقا ہے ذقن سے سرد	پانی کے آگے جیسے تیمم کا حکم گرد
کیوں مُنہ پھرا کے خلد سے دوزخ میں جاتے ہو	بیوجہ تم حسینؑ کا نقشہ مٹاتے ہو
مجرے کو خم کماں لیے چرخِ بریں ہوا	اور تیر شستہ سہم کے چلہ نشیں ہوا
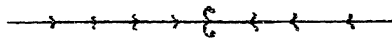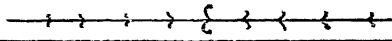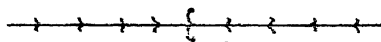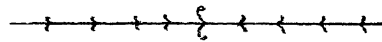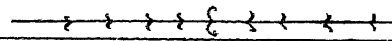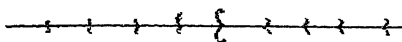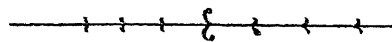
ع۔ ہر حال میں حسینؑ پہ رونا ہے فرضِ عین

ع۔ پلّے پہ تم ہو شیعوں کے میزاں کا ڈر نہیں

ع۔ زخموں کا خون راہ میں تیری سبیل ہے

ع۔ سر جاتا ہے پر فرق نہیں بات میں آتا۔

ع - پنکھا لیے جعفر بھی ہیں طیار پروں کا

ع - تھی عین آنکھ میں یہ نظر کو خبر نہ تھی

مبالغہ مبالغہ، یعنی کسی وصف کی شدت یا ضعف کا اُس حد تک دعویٰ کرنا کہ اُسکا وہاں تک پہونچنا بعید یا محال ہو، تاکہ سامع کو یہ گمان نہ رہے کہ اس وصف کی شدت یا ضعف کا کوئی مرتبہ باقی ہے' فن بدیع کے لحاظ سے یہ تین قسم کا ہوتا ہے۔ اوّل یہ کہ عقلاً و عادتاً ممکن ہو اسکو تبلیغ کہتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ باعتبار عقل ممکن اور باعتبارِ عادت محال ہو اسکو اغراق کہتے ہیں۔ تیسرے یہ کہ باعتبار عقل و عادت دونوں کے محال ہو اسکو غلو کہتے ہیں۔ واقعی مبالغہ اُسی حد تک دلفریب معلوم ہوتا ہے کہ جس میں حد سے زیادہ استبعاد نہ پایا جائے، لیکن اہلِ مذاق کو کیا کیا جائے، خود عرب میں جب تکلّف و تصنّع کو ترقی ہو گئی تو مستبعد و ناممکن مبالغات قدر کی نگاہوں سے دیکھے جانے لگے۔ مولف بھی مقر ہیں کہ "میر انیس کے زمانے میں مبالغہ کمال کی حد تک پہونچ چکا تھا اور یہ حالت ہو گئی تھی کہ جب تک مبالغہ میں انتہا درجہ کا استبعاد نہو، سامعین کو مزہ نہیں آتا تھا" ہمارے خیال میں بھی سامعین کی یہ گرویدگی کچھ معیوب نہیں کیونکہ علمائے علم بدیع کے نزدیک اُن مبالغوں میں جو عقلاً و عادتاً محال ہوں، اگر ایسے الفاظ لائے جائیں جو اُن کو قرینِ صحت بنا دیں تو پھر ایسے مبالغے مقبول سمجھے جاتے ہیں مثلاً سودا کا ایک شعر ہے ؎

اس گلشنِ ہستی میں عجب دید ہے لیکن جب آنکھ کھُلی گُل کی تو موسم ہے خزاں کا

شاعر کو اس مضمون کا بیان کرنا مقصود ہے کہ گلشنِ دنیا کی بہار اسقدر ناپائدار ہے کہ آنکھ کھولنے کے ساتھ ہی جاتی رہتی ہے، لیکن یہ قرینِ صحت نہیں ہو سکتا کیونکہ ساری

فصل کا اس قلیل عرصہ میں بسر ہو جانا نہ باعتبارِ عقل ممکن ہی نہ بلحاظِ عادت۔ لیکن جب آنکھ کھُلنا گُل کی طرف منسوب ہوا تو وہ امر مقرون بصحت ہو گیا۔ کیونکہ پھُول کھلنے کے بعد ہی (جو گویا اُسکا آنکھ کھولنا ہی) ٹوٹ کر گر جاتا ہی اور یہی اُس کی خزاں ہے۔ یا اسی طرح ایسے مبالغوں کے ساتھ نازک و لطیف خیالات ہوں تو ان خیالات کی لطافت کے سبب وہ مبالغے باوجود قرینِ صحت نہ ہونیکے بھی مقبولِ طبائعِ اہلِ بلاغت ہو جاتے ہیں۔ جیسا کہ ہم مرزا صاحب کے کلام میں اس امر کو اچھی طرح ثابت کرینگے۔ لیکن میر صاحب نے مبالغہ کو اُسی حد تک جائز سمجھا جہانتک اُن کے کلام کی بیساختگی و سلاست متحمل ہو سکے یعنی اکثر تبلیغ و اغراق سے تجاوز نہیں کیا شاید اسی وجہ سے اُنکے مبالغوں کو بقول مولف لوگوں نے دلچسپی کی نگاہوں سے نہ دیکھا ہو، اور اس میدان میں وہ اپنے حریف مرزا دبیر سے پیچھے رہ گئے ہوں۔ مرزا صاحب چونکہ ہمیشہ زمانے کے رخ اور مذاق خاص و عام کے مطابق کام کرتے تھے اسلیے اُنھوں نے مبالغوں میں بھی وہی انداز اختیار کیا جو اہلِ مذاق کو مرغوب و مطلوب تھا کیونکہ شعرا ہمیشہ سامعین کے مذاق کا لحاظ رکھتے ہیں۔ مرزا صاحب نے اگرچہ دوسرے بلند خیال شعرا کی طرح مبالغوں میں بعض بعض جگہ تبلیغ سے گذر کر اغراق و غلو سے بھی کام لیا ہی۔ لیکن ایسے دلچسپ پیرائے میں ادا کرتے ہیں کہ طبیعت کو ایک حظ حاصل ہوتا ہی اور بیساختہ اُن کی جدت۔ رسائی طبع۔ باریک بینی۔ نکتہ سنجی بلند پروازی کی داد دینی پڑتی ہی۔ اب ہم اس موقع پر اُن نفیس و نادر مبالغوں کو بھی پیش کرینگے جنکو جمہورِ انام نے قدر کی نگاہوں سے دیکھا گو مؤلف کو ناپسند ہوں اور پھر وہ مبالغے بھی تحریر کرینگے جو مولف کو مرغوب ہیں اور جیسے اُنھوں نے

میر صاحب کے کلام سے انتخاب کیے ہیں یعنی جو حد سے زیادہ مستبعد و ناممکن نہوں اور جس میں کلام کی بیساختگی ہاتھ سے نہ جانے پائے۔

گرمی کی شدت کے بیان میں لکھتے ہیں ؎

لکھا ہے عجب فصل میں یثرب سے چلے شاہ
ان روزوں میں چلتا تھا مسافر نہ کوئی راہ
یہ دھوپ کی شدت تھی کہ العظمۃ للہ
پرواز سے تھا مرغِ تصور کو بھی اکراہ
لوں چلتی تھی ایسی کہ جلے جاتے تھے ذرّے
اسپند کی مانند نظر آتے تھے ذرّے

تپتی تھی زمیں آہنِ حدّاد کی تمثال
خرمن میں ہر اک دانہ سیہ تھا صفتِ خال
شہبازِ نگہ کھول نہ سکتا تھا پر و بال
بے رنگِ شفق منہ فلکِ سبز کا تھا لال
اس فصل کی شدّت اگر آجائے بیاں میں
غلب ہے کہ چھالے پڑیں خامے کی زباں میں

تھی اس برس وہ شدّتِ گرما کہ الحذر
مثلِ چنار آگ سے جلتا تھا ہر شجر
جائے غبار ریگ سے شعلے بلند تھے
مجمر زمینِ گرم تھی ذرّے سپند تھے

مثلِ تنور گرم تھا پانی میں ہر حباب
گلخن صدف تھے دانہ بریاں دُرِ خوش آب
ہوتی تھیں سیخ موج پہ مرغابیاں کباب
آتش سے اپنی لعلِ بدخشاں تھا آب آب
یہ دھوپ تھی کہ دانے کا بچنا محال تھا
دانہ بچا بھی جلنے سے تو خال خال تھا

مٹی خراب چرخ پہ ہے برجِ آب کی — رنگت ہی برجِ حوت میں ماہی کباب کی
دریا میں آنکھ بیٹھ گئی ہے حباب کی — حدّت ہی موج موج میں تیرِ شہاب کی

فوّارے کو نہ حوض میں گرمی سے کل پڑی
پانی کی بھی زبان دہن سے نکل پڑی

چھالا ہے آفتاب کا گردوں کے پاؤں میں — خود چھپ رہی ہے دھوپ درختوں کی چھاؤں میں

آتش بدل بھنور ہیں تو موجیں ہیں شعلہ وش — آتے ہیں مچھلیوں کو حرارت سے غش پہ غش

بنٹیں چھٹیں شرر کی سقر کانپنے لگے — شعلے زبان نکال کے خود ہانپنے لگے

گھوڑے کی تعریف

چالاکیِ رہوار سے مردم تھے مکدّر — ابرو کی طرح رکھتا تھا نعل آنکھوں کے اوپر
گھر پھرتا تھا پتلی کی طرح آنکھوں کے اندر — گہ مثلِ نگہ صاف نکل جاتا تھا باہر

کھنچتی نہیں اب توسنِ چالاک کی تصویر — عاجز میں نہیں ہوں کہ ہوا کو کروں تسخیر
آتا ہی نہیں ذہن میں کیا کیجیے تدبیر — دل آپ کو حیرت زدہ، عقل آپ کو دلگیر

ہرگز صفتِ اسپِ ہنرمند نہ ہوگی
اس شیشۂ دل میں یہ پری بند نہ ہوگی

ہی تیز قدم یہ، جو پہنا ؤ اُسے ہیکل
ہیکل کی صدا سنتے ہی یہ اسپ ہو بیکل

ہیکل کی صدا کان کے اندر نہ در آئے
اس عرصہ میں یہ سیر دو عالم کی کر آئے

کہتا تھا فرس ڈھونڈھ تو لے کوئی کہاں ہوں
آنکھوں میں تو پھرتا ہوں نگاہوں سے نہاں ہوں

یہ کہہ کے بڑھایا جونہی گھوڑے کو اُدھر سے
مانندِ تصوّر ہوا پوشیدہ نظر سے

سرعت یہ ہی گر آئینہ خانہ میں رواں ہو
ہرگز نہ کسی آئینے میں عکس عیاں ہو

چالاک ہی اس درجہ عقابِ علی اکبرؑ
آرام نہیں مدح کے حرفوں کو ورق پر

جولانیِ فرس کو کروں کیا میں آشکار
آہو کی طرح ہوتے ہیں مضمون بھی فرار

اس ابروے شمشیر کی جنبش ہوئی بھونچال
مگر اُسکا چلا کوئی نہ پھرتی کی کوئی چال
مانندِ مگس چہرے سے ظالم کے اُڑے خال
خود پلکوں میں چھپنے لگی پتلی کی طرح ڈھال

تارِ نظر اس تیغ کے بڑھنے سے گھٹے تھے
آنکھوں میں جو تھے نشہ کے ڈورے وہ کٹے تھے

وجہ خمِ شمشیر مرے سب قبضے میں آئی
دنیا میں جگہ سر کے اُٹھانے کی نہ پائی

مغروروں کو تصویر تواضع کی دکھائی	یا بوجھ نے جوہر کے کمر اُس کی جُھکائی

رُک رُک کے قدم رکھتی تھی ہر سر پہ ادب سے
جُھک جُھک کے مثالِ شرفا ملتی تھی سب سے

خون اعدا کا ہوا نہر صفت رن میں رواں	تھے تپاں مچھلیوں کی طرح زرہ پوش جواں
خوف سے زندہ ہوئے مُردوں میں جا جا کے نہاں	ناوک انداز چھپے گوشہ میں لے لیکے کماں

غائب ہوئی یاں تیغ تو واں سے نکل آئی	حیرت کو بھی حیرت تھی کہاں سے نکل آئی
اللہ رے بل موے میاں سے نکل آئی	رشتے کی طرح سوزنِ جاں سے نکل آئی

کس تیغ کے وہ مُنہ سے ہو بات اُس سے جو ہوئی	زخمی کے لب سے آہ جو نکلی تو دو ہوئی

اللہ رے وغا آنکھ نے دیکھی نہ چمک بھی	پُتلی تو سناں لیگئی جھپکی نہ پلک بھی

ہو قطع بُرائی جو چلے عمرِ رواں پہ	یہ بات پر آئے تو پھرے نوکِ زباں پہ

فق ہو گیا ہے چہرۂ پیر و جواں کا رنگ	باغِ جہاں دکھاتا ہے فصلِ خزاں کا رنگ
بدلا ہوا ہے گلشنِ نُہ آسماں کا رنگ	اُڑتا ہے بوئے گُل کی طرح بوستاں کا رنگ

پژمردگی سے پھولوں کی رنگت بدل گئی

نکہت صبا کے ساتھ چمن سے نکل گئی

دریا میں موج موج تلاطم سے آشکار
بے ساختہ نہنگ اُچھلتے ہیں بار بار

مچھلی ہے زیرِ آب مگر جاں ہے بیقرار
موتی ہیں آب آب صدف سے جگر فگار

اندھیر دیکھ کر یہ خضر کائنات میں
چھپ بیٹھے جا کے ظلمتِ آبحیات میں

خود رفتہ ہوئے بھاگنے کے قصد میں بے پیر
جی کر کے جو ٹھہرے بھی دمِ دار و دمِ گیر

ترکش میں رکھیں تیغیں نیاموں میں رکھے تیر
قبضے کے بدل ہاتھ میں پکڑا سرِ شمشیر

یاد آئے اگر روشنیِ طبع ید اللہ
اور کور جو دے سرمۂ خاکِ قدمِ شاہ

بھولے شبِ یلدا میں مسافر نہ کبھی راہ
بے شمع پڑھے شب کو وہ قسمت کا لکھا واہ

اگر دھیان گراں گوش کرے شاہ کے لب کا
ناگفتہ سخن کان سے سُن لے ابھی سب کا

وہ چشمہ تھا جاری صفتِ فیضِ الٰہی
شستہ کرے آب اُسکا رخِ شب کی سیاہی

جن پھولوں کا تھا کوئی نزاکت میں نہ ہمسر
پڑتا تھا رگِ گل کا نشاں پاؤں کے اوپر

ہوتے تھے خراماں جو کبھی خرمنِ گل پر
گھوڑوں سے کچلواتے ہیں اُنکے تنِ اطہر

گرداسی کا بیان

کوچوں میں یہ ہجومِ خلائق کا حال تھا	سایہ کو ساتھ لیکے گذرنا محال تھا
مجمع تھا یہ رواقِ رسالت پناہ میں	سرمہ نگاہ ہوگئی پس پس کے راہ میں
فردوسیوں کا در پہ ہجوم اسقدر ہوا	رضواں بنا بہشت کی بوجب گذر ہوا
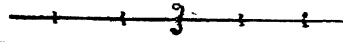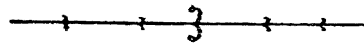
حُسن التعلیل۔ یہ ایک لطیف صنعت ہے، اس کی حقیقت یہ ہے کہ کسی چیز کیواسطے کسی شے کو علت فرض کریں جو درحقیقت اُس کی علت نہو، مثلاً ؎

بھلائی جو کرے دنیا میں ہووے وہ پامال	بسانِ جادہ کسی کو تو راہ مت بتلا

جادہ یعنی رستہ پامال ہوتا ہے اور وہ اس سبب سے ہے کہ لوگ اُسپر راہ چلتے ہیں، لیکن شاعر اس کی یہ وجہ قرار دیتا ہے کہ رستہ لوگوں سے بھلائی کرتا ہے اسلیے پامال ہے یہ ایک قسم کی تخئیل ہے اور اس لحاظ سے یہ صنعت عین شاعری ہے کیونکہ شاعری دراصل تخئیل کا نام ہے۔ مولف لکھتے ہیں کہ "اس صنعت میں اُسوقت زیادہ لطافت پیدا ہوجاتی ہے جب وہ وصف بھی جس کی علت بیان کرنی ہے تخئیل پر مبنی ہو" مثلاً میر انیس کا یہ شعر ؎

ڈر سے ہوا فرات کی موجوں کو اضطراب	اور آب میں سروں کو چھپانے لگے حباب

موجوں کے اضطراب اور حباب کے سر چھپانے کی علت ڈر اور خوف کو قرار دیا ہے، لیکن موج کا اضطراب اور حباب کا پانی میں سر چھپانا، خود کوئی واقعی چیز نہیں، بلکہ شاعر نے موج کی حرکت کو اضطراب قرار دیا ہے اور حباب جو ٹوٹ جاتا ہے، تو اُسکو

فرض کیا ہے، کہ اُس نے پانی میں منہ چھپالیا" بالکل اسی قسم کی نادر مثال مرزا صاحب کے کلام سے ملاحظہ ہو ؎

چاروں طرف تھا بسکہ ہجومِ سپاہِ شام	گویا سیاہ پوش تھا آبِ رواں تمام
ماتم یہ تھا کہ مالکِ کوثر ہے تشنہ کام	بالکل اُلٹ دیئے تھے حبابوں نے اپنے جام

دریا جو دورِ پیاس میں تھا شہ کی فوج سے
منہ پر طمانچے مارتا تھا دستِ موج سے

حبابوں کے اپنے جام اُلٹ دینے، اور دریا کے اپنے منہ پر طمانچے مارنے کی علت، مالکِ کوثر کی پیاس کے قلق کو قرار دیا ہے، لیکن حبابوں کا جام اُلٹ جانا، اور دریا کا دستِ موج سے اپنے منہ پر طمانچے مارنا، خود واقعی کوئی چیز نہیں، بلکہ شاعر نے حبابوں کی قدرتی وضع کو جام اُلٹ دینا قرار دیا ہے۔ اور موج کی حرکت کو، فرض کیا ہے کہ دریا اپنے منہ پر طمانچے مار رہا ہے۔

اسکے بعد مولف نے میر صاحب کے کلام سے حسن التعلیل کی مثالیں درج کی ہیں۔ مرزا صاحب کے کلام سے اس صنعت کی یہ چند نادر نظیریں پیش کیجاتی ہیں۔ مثلاً ؎

تن پر کمانیں سہم کے چسپیدہ ہوگئیں	تیغیں سمٹ کے قبضوں میں پوشیدہ ہوگئیں

کمانوں کا بدن پر لپٹ جانا، یا تلواروں کا قبضوں میں پوشیدہ ہونا ایک وصفِ ثابت ہے اور یہ ظاہر ہے کہ یہ اسوجہ سے ہے کہ سلاح پوشوں نے اُنکے واسطے یہی جگہ مقرر کی ہے، لیکن شاعر نے اس کی علت ڈر اور خوف کو قرار دیا ہے اور اس طرح پر اس میں جو لطافت پیدا ہوگئی ہے وہ حسن شناسانِ معنی پر ظاہر ہے۔ اس صنعت کے مرزا دبیر

نے اکثر جگہ نہایت خوبی سے برتا ہی۔ مثلاً ؎

پیاسا ہوا جو ذبح پسر بو تراب کا		اولٹا ہے دستِ موج نے کاسہ حباب کا
ناگہ عمر کے قصد پہ قرنا نے کی فغاں	ولہ	بیداد کی گواہی کو ہر سو اُٹھے نشاں
چلاّئے ہاتھ مل کے جلاجل کہ الاماں		نقارے سینہ پیٹتے آگے ہوئے رواں

بے جسم شے کا کاٹنا تیغوں کی خو نہ تھی	ولہ	بُرّش سے اُسکی ڈھال کے پھولوں میں بو نہ تھی
کس تیغ کے وہ منہ سے ہو بات اُس سے جو ہوئی	ولہ	زخمی کے لب سے آہ جو نکلی تو دو ہوئی
یہ ہیبتِ جہادِ شہِ نیک خو ہوئی	ولہ	خود ذوالفقار میان سے کھچتے ہی دو ہوئی
یہ ہیبتِ شمشیر کا واں جوش ہوا تھا	ولہ	جو موجوں سے دریا بھی زرہ پوش ہوا تھا
رن گرم ہوا جوش پہ طبعِ اجل آئی	ولہ	تیغوں کی زباں میانوں کے منہ سے نکل آئی
کیا دھوپ ہے کیا تابشِ خورشیدِ فلک ہی	ولہ	سایہ اسی گرمی سے سیہ آج تلک ہی
اکبرؑ کے غم میں تیغ ہوئی تارکِ لباس	ولہ	جوہر سے یہ کھلا کہ پریشان ہیں حواس
سقّے کی حرب سے یہ ہوا غل جہان میں	ولہ	دیں اُنگلیاں فرات نے موجوں سے کان میں
پیاسے تھے جو اطفال شہِ تشنہ گلو کے	ولہ	تھی غم کی گرہ دل میں حباب لبِ جو کے
اللہ رے ہیبتِ خلفِ حضرتِ امیرؑ	ولہ	دہشت سے تیر تھے دلِ اعدا میں گوشہ گیر

ع ۔ اور خوف سے خاموش تھے گویا لبِ سوفار

صنعتِ طباق ۔ یعنی دو متضاد یا مقابل چیزوں کو یکجا جمع کرنا ۔

ع۔ کھلتا نہیں کیوں آنسوؤں کا تار بندھا ہے۔

ع۔ ہات ہم باندھتے ہیں عقدہ کشائی کردے

ے ٹھنڈی ہوئی ہوا جو یہ گرم عناں ہوا ‏ صرصر کی سانس رُک گئی جب یہ رواں ہوا

ع۔ فاقوں کی تو یہ حد ہے کہ جینے سے ہوئے سیر

ے جنبش سوے یسار جو قطب یمیں نے کی ‏ سکتے میں چرخ آگئے گردش زمیں نے کی

ے کھلنا سرِ حرم کا کسی سے چھپا نہیں ‏ امت کے پردہ پوشوں کے سر پردا نہیں

ے القصہ گئی نہر پہ غازی کی سواری ‏ واں گرم وغا ہوتے ہی ٹھنڈے ہوئے ناری

ع۔ تیغیں وہ کھولنے لگے جنکی بندھی تھی دھاک

ع۔ پُرزے ہوا بدن پہ نہ ثابت خطا ہوئی

مُراعات النظیر۔ یعنی الفاظ کی رعایت۔ اس صنعت میں کئی چیزیں متناسب غیر متضاد ایک کلام میں مذکور ہوتی ہیں۔ غیر متضاد کی قید سے طباق نکل گیا۔ یہ وہی صنعت ہے جو آج عوام شعرا کا سرمایۂ کمال ہے، اور جسکو مہذب ضلع جگت کہہ سکتے ہیں۔ جیسے ذوق کا یہ شعر ے

خط بڑہا زلفیں بڑہیں کاکل بڑہے گیسو بڑہے ‏ حسن کی سرکار میں جتنے بڑھے ہندو بڑھے

خط۔ زلف۔ کاکل۔ گیسو باہم متناسب ہیں۔ لیکن اگر اسی سادہ طریقہ پر اس صنعت کو برتا جائے تو کچھ تعریف اور لیاقت کی بات نہیں، البتہ شاعر کی جولانی فکر کا نمونہ اور قابلِ تعریف و پُرلطف اس کی وہ قسم ہے جسکو ایہام التناسب کہتے ہیں۔ اور وہ یہ ہے کہ مثلاً دو معنی جمع کریں جنکو آپس میں کچھ مناسبت نہو مگر ان

ایہام التناسب

معنوں کو جن دو لفظوں سے تعبیر کریں اُن میں ایک لفظ کے دو معنی ہوں اور معنیِ دوم
جو غیر مقصود ہوں اُن کو پہلے لفظ سے مناسبت ہو۔ جیسے میر کے اس شعر میں ؎

میر کا ہجر میں وصال ہوا ۔ چلو جھگڑا ہی انفصال ہوا

یہاں ہجر اور وصال (بمعنی مرگ) کو جمع کیا ہے اور ظاہر ہے کہ ان دو معنوں میں باہم
کچھ مناسبت نہیں ہے مگر وصال کے دوسرے معنی یعنی وصل البتہ ہجر کے مناسب
ہیں۔

صنعتِ ایہام التناسب کو مرزا صاحب نے نہایت لطف و خوبی کے ساتھ
استعمال کیا ہے۔ چنانچہ اُن کی صناعی کے چند نمونے درج کیے جاتے ہیں ؎

روشن ہے قمر پر کہ علیؑ نورِ خدا ہیں		بندوں پہ کھلا ہے کہ علیؑ عقدہ کشا ہیں
اس کی چمک سے مہر کو بھی انفعال ہے	وله	طوبیٰ جو اسکے سائے میں آئے نہال ہے
بارش تھی آبِ تیغ کی برسات سے فزوں	وله	بدلی تھی فوجِ شام کی رنگت گھٹا تھا خوں
چہرہ نہ رہا دفترِ انجم میں کسی کا	وله	پروانہ چراغوں کو ملا برطرفی کا
چاہے زرہ بنا کے جو داؤد کا وقار	وله	واللہ جالسازی کیا اُس کا اعتبار
کھولے علم اور باندھ لیے گوشے قبا کے	وله	رستے میں ہوئے ہوش ہوا ایک صبا کے
دانتوں کی طرح سب رفقا گرد پڑے تھے	وله	حیران امام اپنی جماعت میں کھڑے تھے
نورِ نظرِ فاطمہؑ نے چشمِ کرم کی	وله	یہ عینِ عنایت ہے شہنشاہِ امم کی
کھینے نہ جرس ناقہ کا دل گرمِ فغاں تھا	وله	ڈنکے کی یہ نوبت تھی کہ خود سینہ زناں تھا

پوشاک سے خوزادوں کی یہ شان ہوگئی	ولہ	اک عید صدقے دوسری قربان ہوگئی
آئینہ روبروے جہاں ہی جو خوشنما	ولہ	وہ اُن کا روشناس ہی، بس اور وجہ کیا
آقا نے مجکو سب میں نمودار کردیا	ولہ	بے بال و پر کو جعفرِ طیار کردیا
یاں حیدریوں کو خلشِ خار نہیں ہی	ولہ	باغی کے لیے حکم نہیں بار نہیں ہی
جب ان میں ذوالفقار علم کی حسینؑ نے	ولہ	دکھلائے دو ہلال شہِ مشرقین نے
عباسؑ سے بھی چھوٹ چکے تھے شہِ زمن	ولہ	بازو نہ تھا یہ قبضے میں تھا زورِ پنجتنؑ
کفنا چکے ملک شہِ عالی جناب کو	ولہ	مٹی دو آنکر خلفِ بوترابؑ کو
دریا میں نہنگوں کے جگر کانپ رہے ہیں	ولہ	پوشیدہ ہیں پانی میں مگر کانپ رہے ہیں
ساتھ اُسکا دیا جائے ہوا سے نہ پری سے	ولہ	شہبازِ نگہ باز رہے تیز پری سے
قبضہ تو رہا تیغ کا دستِ شہِ دیں میں	ولہ	پھل جا کے لگا شاخِ سرِ گاوِ زمیں میں
کچھ وصف لبِ لعل و دہن کا جو سنایا	ولہ	شیریں سخنی کے ہوئے قائل سخن آرا

ع۔ جب میان سے نکلی تو میانِ سرِ تن تھی

ع۔ اسیر بھی کیے لاکھوں ہی جن آپ نے بے جاں

ع۔ جلوہ کیا کرسی پہ شہِ عرش نشیں نے

ع۔ بن بن کے ہوا خواہ صبا بولی میں قرباں

ع۔ ہر مورچہ لرزاں ہی سلیماں کی ہے آمد

لف و نشر

لف و نشر۔ لغت میں لف بمعنی لپیٹنے اور نشر بمعنی پراگندہ کرنیکے ہے۔ لف و نشر کی تعریف اصطلاح میں یہ ہے کہ پہلے کئی چیزوں کو ذکر کریں اُسکو لف کہتے ہیں اور بعد اسکے ہر ایک کے منسوبات و متعلقات کو بغیر تعین بیان کریں اسکو نشر کہتے ہیں۔ اور تعین نہ کرنا اس اعتماد پر ہے کہ سُننے والا ہر ایک منسوب کو اُسکے منسوب الیہ سے متعلق کریگا۔ اس کی دو قسم ہیں مرتب و غیر مرتب ؎

اس زخش سے برق و شرر و شعلہ و سیماب
خورشید۔ و سحاب۔ و فلک۔ و انجم و مہتاب

لرزندہ۔ و شرمندہ۔ و درماندہ و بیتاب
سوزان و خروشان۔ و سراسیمہ۔ و بیخواب

بازارِ گل۔ و موج۔ و صبا۔ سرد ہے اس سے
وہ داغ ہے۔ وہ آب ہے۔ وہ گرد ہے اس سے

یاں بخت۔ وہاں عمر۔ ادہر عقل۔ اُدہر ہوش
یاں ناطقہ۔ واں حافظہ۔ خاموش و فراموش

خوابیدہ۔ و برباد۔ و پراگندہ۔ و روپوش
بے نور ادہر چشم۔ تو بے بہرہ اُدہر گوش

ایمان و کفر توبہ و عصیاں دمِ جہاد
یہ زندہ۔ اور وہ مردہ۔ یہ خوشدل و نامراد

نے چرخ ہے نے دشت۔ نہ کہسار۔ نہ قلزم
وہ سکتہ ہے۔ وہ گرد۔ وہ رعشہ۔ وہ تلاطم

شرمندہ رُخسار و قد و گیسوے پُرتاب
دندان و دہان و لبِ جان بخش سے آب آب

باغ ترو سرو سہی۔ و سنبل سیراب
سلکِ دُرر۔ و لعلِ یمن۔ و دانۂ عناب

تفضیل

تفضیل

حق سے علاحدہ کیا باطل کو یک قلم
وحدت سے شرک۔ خیر سے شر۔ دیر سے حرم

کعبے سے بت۔ یقین سے شک۔ عدل سے ستم
عصیاں سے توبہ۔ کفر سے دیں۔ بخل سے کرم
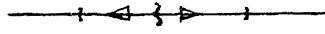
ہیبت سے یہ بندے کی دیا خوفِ خدا ہے
سر خود سے۔ دل سینے سے۔ جاں تن سے جدا ہے
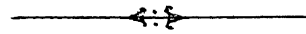
آمد شہِ عادل کی ہے انصاف کی رہبر
بلبل سے قفس۔ گل سے خزاں۔ شمع سی صرصر

خرمن سے شرر بھاگتے تھے شیشہ سی پتھر
شبنم سے جو سورج۔ تو کتاں سے مہِ انور

نیکی سے بدی۔ نام سے اب ننگ جدا ہی
توبہ سے شکست۔ آئینے سے زنگ جدا ہی

اسپ امام حسین

لڑنے میں ہی یہ عقل۔ بگڑنے میں جہالت
جانے میں حواس، آنے میں عاشق کی طبیعت

بڑھنے میں ہی حرص، تو گھٹنے میں قناعت
مخفی ہی تو اسرار، عیاں ہے تو کرامت
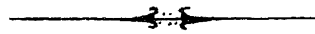
نذرانہ لب خلف الصدق بوتراب
ادنے خراج گیسوے شاہِ فلک جناب

لالے سے رنگ، لعل بدخشاں سے آب و تاب
آہو سے نافہ، نافۂ آہو سے مشکِ ناب
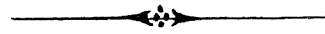
اول خراج تیغ کو یہ فوج سے ملا
گردن سے سر، جگر سے قرار، آنکھ سے ضیا

قالب سے روح، سینے سے دل، عمر سے وفا
چہروں سے رنگ و آبرو، اندام سے قوا
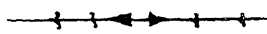
مہملہ یعنی بے نقط۔ اس صنعت میں مرزا صاحب کے کئی مرثیے ہیں۔ اُن میں سے ایک مرثیہ کا مطلع ہے۔ ع۔ مہر کرم سرور اکرم ہوا طالع۔ اُسکے چند بند اس موقع پر لکھے جاتے ہیں سب بے نقط مرثیوں میں اپنا تخلص عطارد رکھا ہے[۱]۔

علام ہر اک علم کا۔ اور مورد الہام
روح اسد اللہ۔ محمدؐ کا دل آرام

وہ اُسکا ہوا حکم۔ کہ اسلام ہوا عام
صدر دوسرا، علم کا گھر، مصدر اکرام

محکوم احد، حاکم سرکار محمدؐ
مداح رُسل، محرم اسرار محمدؐ

مالک ارم و حور کا۔ عالم کا مددگار
صمصام صمد۔ عسکر اسلام کا سالار

سردار اُمم اور اسد اللہ کا دلدار
احمدؐ کا اسد۔ علم کا در۔ سرور وسردار

سالک رہ اللہ کا۔ مالک دوسرا کا
ہمسر اسد اللہ کا۔ ہمدرد گدا کا

اسکے علاوہ بہت سے سلام اور بکثرت رباعیاں اس صنعت میں لکھی ہیں۔ بخوف طوالت صرف چند رباعیاں تحریر کی جاتی ہیں۔ رباعی۔

درد اکہ ملول امام معصوم رہا
مالک ہوا ساحل کا گروہ گمراہ

ہر اہل طمع عمر کا محکوم رہا
اور ہائے امام عصر محروم رہا

واللہ کہ طالع رسا حُر کو ملا
گھر اُس کا ہوا احمد مرسل کا دل

سردار امام دوسرا حُر کو ملا
حور۔ و ارم۔ و حلۂ صلا حُر کو ملا

[۱] عطارد تخلص کے بارہ میں لکھتے ہیں ع ڈھونڈھا جس دم تخلص بے نقط۔ ہمنام دبیر کا عطارد نکلا۔

حرؑ کو مددِ حرم کا الہام ہوا ۔۔ ہر درد و الم، سُرور و آرام ہوا
مسلمؑ ہوا سرور کا ہراوّل ہو کر ۔۔ حاصل حرؑ کو کمال اسلام ہوا

تلمیح - مرزا صاحب اپنی نظم میں عربی فقرات کو نہایت خوبی کے ساتھ چسپاں کر دیتے ہیں - چنانچہ اس صنف میں جو جو لطافتیں اُنھوں نے پیدا کی ہیں، اُن کی چند نظیریں پیش کی جاتی ہیں ؎

قرآں میں قتل نفس کی حُرمت ہے جابجا ۔۔ سیّد کا خون حلال کہاں سے تمہیں ہوا
ہے نفسِ مصطفٰے بخدا سبطِ مصطفٰے ۔۔ آخر جزائے مَنْ قَتَل مومنًا ہے کیا

سید نہیں، امام نہیں، مقتدا نہیں
مومن بھی ہیں تمھارے عقیدے میں کیا نہیں؟

تھی نور سے پیدا جو وہ رشکِ شرِ طور ۔۔ حل کرنے لگی ترجمۂ ینفخ فی الصّور
میداں میں قلم کر کے سرِ ظالمِ مقہور ۔۔ لفظِ غضب اللہ علیہم کی مسطور

پھر یوں پکارتا ہوا شہ کی طرف چلا ۔۔ اے یادگارِ فاطمہؑ رُوحی لک الفدا

اُس چہرۂ انور سے ہوا رن میں اُجالا ۔۔ سب کہنے لگے سلّمک اللہ تعالیٰ

پوشش مہِ عارض کی ہے یہ زلفِ شب آسا ۔۔ لو حل ہوئی شرح جعل اللیل لباسا

صلوا علی النبیؐ و آل محمدؐ		کہتے ہیں اس جمال پہ سب کو دک و مسن

یہانتک وہ صنعتیں ختم ہوئیں جو مؤلف نے میر صاحب کے کلام سے لکھی ہیں۔ دونوں کے دیکھنے سے معلوم ہوگا کہ میر صاحب کی طرح مرزا صاحب نے بھی صنائع بدائع میں کیا کیا خوبیاں پیدا کی ہیں۔ اب یہاں ہم چند جدید صنعتیں شروع کرتے ہیں جنکی مثالیں مولوی صاحب نے میر صاحب کے کلام سے درج نہیں کیں، اور جنکو مرزا صاحب نے اس خوبی اور صفائی سے استعمال کیا ہے کہ الفاظ کا حسن دوبالا ہوجانے کے علاوہ معنی اور مضمون میں بے انتہا قوت اور شان پیدا ہوگئی ہے۔

صنعت معاد۔ یہ صنعت رد العجز علی الصدر کے قبیل سے ہے، اس میں وہ الفاظ جو مصرع اوّل کے آخر میں ہوتے ہیں اُن کو مصرع دوم کے اوّل میں لاتے ہیں، اور جو مصرع دوم کے آخر میں ہوتے ہیں ان کو مصرع سوم کے اول میں لاتے ہیں وعلیٰ ہذا القیاس۔ مرزا صاحب نے اس صنعت میں اکثر نفیس اشعار فرمائے ہیں جو بہت پُر لطف اور دلچسپ معلوم ہوتے ہیں۔ بطور نمونہ چند بند لکھے جاتے ہیں جو مسلسل اسی صنعت میں ہیں ؎

یہ اختر صدبرج شرف، در نجف ہے یہ حیدر صفدر کا خلف حق کی طرف ہے		زہرا کا گہر، اختر صدبرج شرف ہے یہ در نجف، حیدر صفدر کا خلف ہے

یہ حق کی طرف، مثل رخ قبلہ نما ہے
یہ قبلہ نما، کعبۂ تسلیم و رضا ہے

یہ کعبۂ تسلیم و رضا، فخرِ پدر ہے
یہ فاطمہؑ کا نورِ نظر، رشکِ قمر ہے

یہ فخرِ پدر، فاطمہؑ کا نورِ نظر ہے
یہ رشکِ قمر، درجِ امامت کا گہر ہے

یہ درجِ امامت کا گہر، جانِ نبیؐ ہے
یہ جانِ نبیؐ، خاصِ خدائے احدی ہے

یہ خاصِ خدائے احدی، قبلۂ دیں ہے
یہ کعبۂ اربابِ یقیں، عرش نشیں ہے

یہ قبلۂ دیں، کعبۂ اربابِ یقیں ہے
یہ عرش نشیں، مُہرِ نبوّت کا نگیں ہے

یہ مہرِ نبوت کا نگیں، دُرِ عطا ہے
یہ دُرِّ عطا، ماہرِ اسرارِ خدا ہے

صنعتِ رجوع - یہ ایک دلچسپ صنعت ہی۔ اس کی حقیقت یہ ہی کہ شاعر کسی خاص لفظ سے ایک چیز کی تعریف کرتا ہی، پھر کلام اول کو باطل کر کے کسی خاص فائدہ اور نکتہ کی غرض سے دوسرے کلام کی طرف مصروف ہوتا ہی۔ مثلاً ؎

رخ ہی تیرا ماہ یا خورشید، پر ہے یہ غلط
قد ہی تیرا اک صنوبر باغِ عالم میں، ولے

دلستانی اسقدر مہ میں کہاں، خور میں کہاں
راستی جو ہی ترے قد میں صنوبر میں کہاں

پہلے معشوق کے چہرے اور قد کی ایک صفت کی، پھر اس صفت سے رجوع کر کے اُن کی خوبی اور دلفریبی کو اور زیادہ ترقی دیدی، اور فائدہ اس رجوع سے یہ ہے کہ معشوق کا چہرہ ماہ سے اور قد صنوبر سے کہیں زیادہ اچھا ہی۔ مرزا صاحب نے اس صنعت کو اکثر مقام پر نہایت خوبی سے برتا ہی ؎

رو دار ہی خورشید، پہ ابرو نہیں رکھتا
ابرو مہِ نو رکھتا ہے، یہ رو نہیں رکھتا

قد رکھتا ہی شمشاد، پہ گیسو نہیں رکھتا | سنبل کے ہیں گیسو، قدِ دلجو نہیں رکھتا

گل گوش ہے، پر گوشِ سماعت نہیں رکھتا
غنچہ ہے دہن، طرزِ فصاحت نہیں رکھتا

بو ہے گلِ جنّت میں، پہ رخسار نہیں ہے | ایمن میں تجلّی ہے، پہ دیدار نہیں ہے
قد رکھتا ہے طوبیٰ، پہ یہ رفتار نہیں ہے | شیریں لبِ کوثر ہی، پہ گفتار نہیں ہے

آئینے میں رو ہی پہ خطِ سبز کہاں ہے
غنچے کے دہن ہی نہ زباں ہی نہ بیاں ہے

ـــــــــــــــ

بسکہ کھینچی ہی مہارِ شترِ آلِ عبا | سو کفِ دست میں کس حسن سے گٹا ہی پڑا
فی المثل، مہر میں ہے داغِ قمر جلوہ نما | مہرۂ مہر کجا، داغِ دلِ ماہ کجا

پشتِ احمدؐ میں تو تھی مہرِ نبوّت پیدا
یاں کفِ دست میں ہی مہرِ شفاعت پیدا

ـــــــــــــــ

صنعتِ ترصیع - یعنی تمام یا اکثر الفاظ دو فقروں یا دو مصرعوں میں مقابل اور متحد الوزن والقوافی ہوں۔ جیسا غالب کا یہ شعر ؎

تیری دانش مرے اصلاحِ مفاسد کی رہین | تیری بخشش مرے انجاحِ مقاصد کی کفیل

مرزا صاحب کی صناعی کے یہ نمونے ہیں ؎

میزانِ خدا - مفتیِ دیں - قاضیِ فردا | سلطانِ ازل - شاہِ ابد - عروۂ وثقا

خورشیدِ نجف ۔ بدرِ حرم ۔ رونقِ بطحا
اقبالِ عرب ۔ اوجِ حرم ۔ خسروِ دنیا

بیعت کو سند ہاتھ سے، قرآں کو قلم سے
خطبے کو شرف نام سے، منبر کو قدم سے

کس نے یہ مجزّا کیے سیپارۂ ایام
مجموعہ یہ کس نے کیا شیرازۂ آرام
کس نے یہ مصفّا کیے رخسارۂ اسلام
مرفوع یہ کس سے ہوا آوازۂ انعام

کس نور سے آدم کا شرف خاک نے پایا
کس طور سے نورِ ابد افلاک نے پایا

جس روز سے ہی ملکِ خضر آبِ بقا پر
جس عہد سے ہی ابرِ کرم دوشِ ہوا پر

ہی کوہِ فرازندہ جو ساکن ہو ترا ال
ہی جلوۂ گلزار اُسے گشتِ بیاباں
ہی ابرِ خرامندہ اگر ہو یہ خراماں
ہی قلّۂ کہسار اُسے تختِ سلیماں

ہی برقِ شرر خیز اگر جلوہ کناں ہے
ہی ابرِ گہر ریز اگر قطرہ زناں ہے

حاتم کا کرم مجل ہے فیض و کرم ایسا
گردوں کا حشم پست ہی جاہ و حشم ایسا

تنسیق الصفات - اسکے یہ معنی ہیں کہ ایک موصوف کے لیے متواتر کئی اوصاف کا ذکر کریں - جیسے ؎

تیری شمشیر سرِ خصم پہ ہے میداں میں
صاعقہ - برق - بلا - قہرِ خداوند تعالیٰ

مرزا صاحب فرماتے ہیں ؎

رخشِ حسین - قدرتِ حق - صنعِ کبریا
دلدل خرام و برق بجام و براق پا
پروین دُم - و سہیل دُوال - و قمر ضیا
گلگونِ شاہِ دیں کی نزاکت کہوں میں کیا
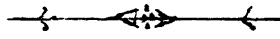
چھل بل تھی - چھلاوہ تھی - طلسمات تھی - اسرار
چالاک - سبکبار - نمودار - طرحدار
نیزہ کہیں - خنجر تھی کہیں - اور کہیں تلوار
بجلی تھی کسی جا - تو کہیں نور - کہیں نار

سیماب تھی - سیلاب تھی - طوفاں تھی - ہوا تھی
شعلہ تھی - شرارہ تھی - قیامت تھی - بلا تھی

شبیر کے بازو بھی ہیں - اور زور کمر بھی
رشتے میں برادر بھی ہیں - الفت میں پسر بھی
خادم بھی - مصاحب بھی - دل و جاں بھی جگر بھی
اللہ کی شمشیر - شہِ دیں کی سپر بھی

باقی تنسیق الصفات کی مثالیں صفحہ ۸۳ پر دیکھو جو ہم پچھلے اوراق میں لکھ آئے ہیں -
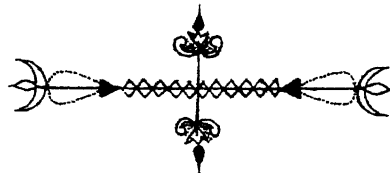
سیاقۃ الاعداد

سیاقۃ الاعداد - یہ وہ صنعت ہی کہ کلام میں اعداد کو ذکر کریں خواہ ترتیب سے ہوں یا بے ترتیب ؎

گو صف تھی ہر اک نظم مسلسل کے مقابل
ہر چار عناصر کی رباعی ہوئی باطل
ابتر صفت نثر پریشاں ہوئے قائل
خمسہ تھا حواس سپہ شام کا زائل
دو کر کے کیا چار ہر اک اہل حسد کو
کیا قطع کیا تیغ نے ہر مصرع قد کو

تصنیف مسدس میں رہا ششدر و قاصر
تھے پانچ حواس ایک مخمس پہ نہ قادر

اک شب میں دم خواب دعا میں ہوا گویا
وہ خمسہ قدرت کہ دو عالم میں ہی یکتا
اے ناظم بیت دوسرا، موجد اشیا
یعنی حسنینؑ و نبیؐ و حیدرؑ و زہراؑ
اب اُنکے تصدق سے پذیرا یہ دعا کر
مجکو شرف مرثیہ گوئی تو عطا کر

کیا یکدل و یکتن تھے دم جنگ وہ خوشذات
تلواریں تو دو تھیں مگر اک ضرب اور اک ہات
اک طرز تھا۔ اک ڈھنگ تھا اک قول تھا اک بات
سب کہتے تھے حیرت سے کہیں دیکھی یہ ہی بات
دو تیغیں اور اک ہاتھ نیا ربط یہاں ہے
قبضے میں یداللہ کی تیغ دو زباں ہے

صنعت ذوقافیتین و ذو القوافی۔ یعنی اشعار میں دو یا زیادہ قافیے ہوں۔ اس صنعت میں مرزا صاحب کے دو چار اشعار لکھے جاتے ہیں ؎

معبود جز و کل نے کریمانہ رضا دی		اور صاحبِ دلدل نے بزرگانہ دعا دی
فوج اپنی توکل نے دلیرانہ بڑھا دی		آمد کے تجمل نے نقیبانہ ندا دی

کبھی دو قافیوں کے بیچ میں ردیف بھی لاتے ہیں انکو ذوی القافیتین مع الحاجب کہتے ہیں۔ اس صنعت میں مرزا صاحب کے یہ اشعار ہیں ؎
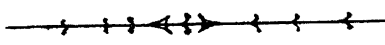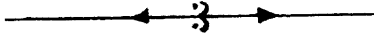
یاں سب کو تھا یقیں کہ وہاں بھی وہیں تھی		واں اتفاق تھا کہ یہاں تھی یہیں نہ تھی
ہر جا تھی، اور پوچھو کہاں تھی کہیں نہ تھی		لاکھوں کے قتل کرنے کو ہاں تھی نہیں نہ تھی

بجلی کا جست شیر کی آمد ہوا کا شور		قدرت کا کھیل قہر کی طاقت بلا کا زور

جمعیت الفاظ۔ اگرچہ علم بدیع میں اسکو کسی صنعت میں شمار نہیں کیا گیا ہے لیکن چونکہ یہ بھی شاعر کی جولانیِ فکر کا ایک دلچسپ نمونہ ہے، اسلیے ہم اس عنوان کے تحت میں مرزا صاحب کے کلام سے چند بند نقل کرکے صنائع بدائع کی بحث کو ختم کیے دیتے ہیں۔

نخل و گل و برگ و ثمر و میوہ و طوبےٰ		خلد و ارم و کوثر و فردوسِ معلےٰ
ہر مصحف و سیپارہ و ہر سورہ ہر آیہ		انسان جن و حور و ملک آدم و حوا
ان سب سے کہو کون امامِ ازلی ہے		

صنعت ذوقافیتین و ذو القوافی
جمعیت الفاظ

بیساختہ چلّائیں حسینؑ ابنِ علیؑ ہے

کرسی و فلک مہر و قمر عرشِ معلّے ‏— ارضِ نجف و ماریہ و یثرب و بطحا
ہر ذرّہ و ریگ و جبل و قریہ و صحرا ‏— دُرِّ نجف و لعل و دُرّ و قطرہ و دریا

واللہ جو مخلوقِ خدائے احدی ہیں
سب تابعِ فرمانِ حسینؑ ابنِ علیؑ ہیں

نامِ نامی ہے حسینؑ ابن علیؑ صلِّ علے ‏— اور لقب بیوطن و بیکس و شاہِ شہدا
مخزنِ صبر و رضا معدنِ الطاف و عطا ‏— مرجعِ رحمتِ حق، مبدءِ افضالِ خدا

سورۂ نور سے بھی نور دوچند اُسکا ہی
رتبہ تکبیر کے نعرے سے بلند اُسکا ہی

شرفِ کلکِ قضا۔ گلشنِ قدرت کی بہار ‏— زینتِ لوح و قلم عرشِ الٰہی کا وقار
راکبِ دوشِ نبیؐ۔ مُہرِ نبوّت کا سوار ‏— مصحفِ ناطق۔ و تفسیرِ کلامِ غفّار

فخر وہ شکل نہ کیوں چاند پہ دوچند کرے
جسپہ یہ پیرِ فلک تاروں کو اسپند کرے

شمع و چراغ۔ و آئینہ۔ و صبح و آفتاب ‏— باغ و بہار و یاسمن و لالہ و گلاب

ناہید و بدر و مشتریؑ قطب ماہتاب ‏ ‏ آبحیات۔ لعلِ بدخشاں دُرِ خوش آب

یوسفؑ اور اُنکے سارے خریدار اک طرف
سب اک طرف یہ روئے ضیا بار اک طرف

گُل پیرہن و گلبدن و گلرخ و گلفام ‏ ‏ شمشاد قد، و غنچہ دہان، وسمن اندام
خوش قامت، و خوشرو و خوش آغاز، و خوش انجام ‏ ‏ حُسنِ چمنِ شرع، بہارِ گُلِ اسلام
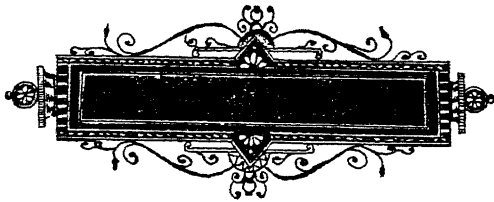
انسانی جذبات یا احساسات

اس میں شک نہیں کہ صنائع بدائع جنکا ذکر ہو چکا، شاعری کے اصلی جوہر نہیں البتہ شاہدِ سخن کے واسطے ایک خوشنما زیور ضرور ہیں۔ اصلی شاعری دلی جذبات اور خیالات کا ہو بہو اور صحیح صحیح نقشہ اُتارنا ہے۔ اور یہ نقشہ جسقدر اصل کے مطابق ہوگا اُسیقدر موثر و دلنشین ہوگا۔

کسی شے کی تصویر کھینچنا درحقیقت ایک مصوّری ہے۔ لارڈ مکالے کا قول ہے کہ "مصوّر صرف اشیاء خارجی کا صحیح نقشہ اُتار سکتا ہے، انسان کا بطون جہاں کسی مصوّر کی رسائی نہیں صرف شاعر ہی کی قلمرو ہے۔ نفسِ انسانی کی باریک، گہری، اور بوقلموں کیفیات صرف الفاظ ہی کے ذریعے سے ظاہر ہوسکتی ہیں۔ شاعری کائنات کی تمام اشیاے خارجی و ذہنی کا نقشہ اُتار سکتی ہے۔ عالمِ محسوسات، دولت کے انقلابات۔ سیرتِ انسانی۔ تمام چیزیں جو فی الحقیقت موجود ہیں۔ اور تمام وہ چیزیں جنکا تصوّر مختلف اشیا کے اجزا کو ایک دوسرے سے ملاکر کیا جاسکتا ہے سب شاعری کی سلطنت میں محصور ہیں" ایک دوسرے محقق نے شعر کی تعریف اس طرح کی ہے کہ "جو خیال ایک غیر معمولی اور نرالے طور پر لفظوں کے ذریعہ سے اسلیے ادا کیا جائے کہ سامع کا دل اُسکو سُنکر خوش یا متاثر ہو وہ شعر ہے" شاعر اپنی خداداد قوت احساس کی مدد سے، پہلے اُس کیفیت سے جسکا بیان کرنا منظور ہے، خود متاثر و متکیف ہوجاتا ہے، اور اپنے دل میں وہ تمام فطری

جذبات جو ایسے مواقع پر پیش آنا ضروری ہیں، پیدا کر لیتا ہے اسکے بعد جو کچھ بیساختہ اُس کی زبان و قلم سے نکلتا ہے وہ اُن محسوسات و جذبات و کیفیات کا اصلی پرتو ہوتا ہے اسلیے دلی خیالات کی اصلی اور سچی تصویر پیش نظر ہو جاتی ہے، اور دردناک و موثر الفاظ اُس تصویر میں تاثیر کا رنگ بھر دیتے ہیں۔ دلی جوش جو شاعر سے جذباتِ صادقہ کا نقشہ کھنچوا دیتا ہے اُس کی تعریف یہ کی گئی ہے کہ "مضمون بیساختہ الفاظ اور موثر پیرایہ میں بیان کیا جائے، جس سے معلوم ہو کہ شاعر نے ارادہ سے مضمون نہیں باندھا بلکہ خود مضمون نے شاعر کو مجبور کر کے اپنے تئیں اُس سے بندھوایا ہے۔ ایسا جوش شاعر کے ہر قسم کے کلام میں، عام اس سے کہ اپنی حالت بیان کرے یا دوسرے کی، خوشی کا بیان کرے یا غم کا، تعریف کرے یا مذمت، سب میں پایا جانا ممکن ہے۔ شاعر کی ذات میں ہر چیز سے متاثر ہونے، ہر شخص کی خوشی و غم میں شریک ہونے، اور ہر ایک کے جذبات سے متکیف ہو جانے کا ایک خداداد ملکہ ہوتا ہے۔ وہ بے زبان بلکہ بے جان چیزوں کی حالت اُن کی زبانِ حال سے ایسا ہی بیان کر سکتا ہے کہ اگر اُن میں گویائی ہوتی تو وہ بھی اپنی حالت اس سے زیادہ بیان نہ کر سکتیں، پس فصیح و بلیغ شاعر کا اصلی جوہر یہ ہے کہ وہ جس واقعہ کا ذکر کرے اُسکے اطراف و جوانب و متعلقات کا اس خوبی کے ساتھ خیال رکھے کہ جس جس واقعہ کے ساتھ جو جو امور ہمیشہ پیش آتے رہتے ہیں الفاظِ مناسب بعینہٖ اُن کی تصویر کھینچدیں۔ تاکہ آنکھوں کے سامنے وہی سماں بندھ جائے۔ ورنہ واقعہ کی اصلی تصویر کھینچنے سے جسقدر بُعد ہو جائیگا اُسیقدر تاثیر میں کمی آجائے گی۔

شاعرانہ جذبہ و ولولہ

واقعات کی تصویر

۴

۷ مقدمۂ شاعری مولوی حالی

مرزا صاحب کی طبیعت گداز تھی،

مرزا دبیر صاحب نے چونکہ طبیعت نہایت گداز پائی تھی اسلیے پہلے تو وہ خود ہر کیفیت سے متاثر ہو جاتے تھے اور جب اُنکے دل پر چوٹ لگتی تھی تو زبان سے درد انگیز الفاظ نکلتے تھے، اور سُننے والوں کے دل پر بھی وہی حالت طاری ہو جاتی تھی جو خود اُنکے دل پر پیدا ہوئی تھی۔ پس اُنکے اشعار گویا اُنکے اندرونی احساس کی اصلی تصویریں ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اُنھوں نے ایسے مضامین کے ادا کرنے میں کمال پیدا کر لیا ہے۔ وہ جس واقعہ کا نقشہ اُتارتے ہیں، جس کیفیت کی تصویر کھینچتے ہیں اُسکو ایسے دردناک اور دلنشیں پیرائے سے شروع کرتے ہیں کہ سامعین کی طبیعت بے چین ہو جاتی ہے، الفاظ کی جادوگری سے سننے والوں کے درد و غم۔ فرحت و انبساط کے فطرتی ولولے جوش میں آجاتے ہیں، اور تمام قدرتی جذبات میں حرکت پیدا ہو جاتی ہے۔ اُن کا کلام ظاہر کرتا ہے کہ اُنھوں نے رنج و غم۔ مہر و محبت۔ غیظ و غضب۔ شکوہ و شکایت۔ ہمدردی و الفت۔ بیقراری و بیتابی۔ مسرت و خوشی۔ غرض جس واقعہ کی تصویر کھینچی ہے اُس میں دلربائی اور تاثیر کی رُوح پھونک دی ہے۔ اور جسقدر اصل واقعہ پیش آنے سے انسان کی طبیعت میں کوئی خاص کیفیت محسوس ہوتی ہے، بعینہٖ اُن کا کلام سامعین کے دلوں میں جذبات و تاثیر کی وہی کیفیت پیدا کر دیتا ہے۔

مثال ۱۔ جب امام حسین علیہ السلام نے قصدِ ملکِ عراق کیا تو چاہا کہ اہلبیتؑ کو بھی ساتھ لیجائیں۔ حضرتِ صغراؑ اُس زمانہ میں علیل تھیں اسلیے اُن کو ہمراہ لے جانا مناسب نہ سمجھا۔ جنابِ صغراؑ کو جب امام علیہ السلام کے سفر اور اپنے ساتھ نہ جانے کا علم ہوا تو سخت بیتاب ہوئیں۔ اُن کو ضد اور اصرار ہے کہ

ہیں عزیزوں سے چھٹ کر اس بیماری کی حالت میں کہ زندگی کا کچھ بھروسا نہیں، تنہا نہیں رہ سکتی۔ وہ حالتِ اضطراب میں سب سے سفارش کی خواستگار رہیں مگر امام علیہ السّلام کی مصلحتوں کے خیال سے کوئی کچھ کہہ نہیں سکتا اور جناب صغرا کو ہر طرف سے مایوس ہونا پڑتا ہی۔ یہ سین بجائے خود نہایت ہی دردناک اور طبیعت پر ایک خاص اثر پیدا کرنے والا ہی، اور جب شاعر بھی زورِ کلام سے اسکو اور زیادہ پُرحسرت بنا دے تو یہ دردو حرماں کی جانکاہ تصویر دل کو پاش پاش کر دیتی ہی۔ حضرت صغرا کی رخصت مرثیہ گوئی کا ایک خاص واقعہ ہے جسپر شعرا نے بڑی بڑی طبع آزمائیاں کی ہیں۔ اس مضمون کے طرزِ بیان میں میر صاحب اور مرزا صاحب نے انتہا درجہ کا سوز و گداز پیدا کیا ہی اور ایک ایک مصرع کو دردو غم کا مرقع بنا دیا ہی۔ اس جانکاہ واقعہ کی جزئیات یہ ہیں۔ حضرت صغرا کا اپنی نازک حالت کو ظاہر کرنا۔ ساتھ جانے پر ضد کرنا۔ ایک ایک سے سفارش کے لیے خوشامد کرنا۔ ماں بہنوں سے روٹھ جانا۔ پھر خود ہی من جانا۔ حضرت امام حسینؑ کی مجبوری اور پریشانی۔ آخر ماں باپ۔ بھائی بہنوں کا اُن کو بیقراری کے ساتھ رخصت کرنا۔ حضرت صغرا کا اپنے چھوٹے شیرخوار بھائی اصغرؑ سے وداع ہونا۔ رخصت کے وقت تمام کنبے کو یاس و حسرت کی نگاہوں سے دیکھنا ان سب باتوں کا جس طرح اظہار ہوا اُسکو مرزا صاحب اس طرح ادا کرتے ہیں

یثرب سے شہِ صابر و شاکر کا سفر ہی	اقلیم شہادت کے مسافر کا سفر ہی
ہی شور کہ یہ منزلِ آخر کا سفر ہی	لو، قبرِ پیمبرؐ کے مجاور کا سفر ہی

گر پوچھتا ہی کوئی کہاں جاتے ہیں شبیرؑ

آتی ہے ندا سوئے جناں جاتے ہیں شبیرؑ

سب کہتے تھے اللہ شتابی نہیں لانا — تقدیر یہ کہتی تھی کہ اب ہوگا نہ آنا
اک کہتا تھا یارب علی اصغرؑ کو بچانا — کہتی تھی اجل تیر کا ہونگے یہ نشانا
فرماتے ہیں خود سبطِ پیمبرؑ یہ زباں سے
واں جاتا ہوں کوئی نہیں پھرتا ہے جہاں سے

شعبان میں گھر سے شہِ والا کا سفر ہے — اب فاطمہؑ صغرا ہے، اور اُجڑا ہوا گھر ہے
اشک آنکھوں میں اور باپ کے چہرہ پہ نظر ہے — دامانِ پدر ہاتھ میں ہے، پاؤں پہ سر ہے
یوں دیکھتی ہے یاس سے شبیرؑ کی صورت
جو آنکھ جھپکتی نہیں تصویر کی صورت

صغراؑ کا تو یہ حال ہے، مولا کو ہے سکتا — سینے سے لگاتے ہیں اُٹھا کر سرِ صغراؑ
فرماتے ہیں کیوں روتی ہو اے باپ کی شیدا — کہتی ہے تمہیں تو ہمیں رُلواتے ہو بابا
کبراؑ و سکینہؑ تو چلیں ساتھ سفر میں
صغراؑ رہے رونے کو اس اُجڑے ہوئے گھر میں

دیکھا علی اکبرؑ کو تو بولی وہ دل افگار — پیاری تھی سکینہؑ چلی ہمراہِ علمدار
دعوے ہی ہمیں تم پہ گواہ اسکا ہے غفار — لے چلتے ہو بھیا ہمیں یا کرتے ہو انکار
گر بالی سکینہؑ علی اصغرؑ کی بہن ہے
صغراؑ کو یہ ہے فخر کہ اکبرؑ کی بہن ہے

بولے علی اکبرؑ کہ یہ دشوار ہے بہنا! — پر کوفے میں آرام اگر پائینگے بابا
ہم آنکے واں سے تمہیں لیجائینگے صغراؑ — تقدیر پکاری نہ وفا ہوگا یہ وعدا

سینے سے ترے پارا نی ہوئیگی اکبرؑ
پردیس میں وعدہ شکنی ہوئیگی اکبرؑ

بے آس ہوئی سُنتے ہی اس بات کو صغراؑ
منہ دیکھا عجب یاس سے ہمشکل نبیؐ کا
آنسو تھے جو اُمڈے ہوئے بہنے لگا دریا
دل سے تو نہ نکلا، پہ زباں سے کہا اچھا
بچ جائینگے گر موت سے لیجائیو بھائی
مختار ہو، جب چاہیو تب آئیو بھائی

ناگاہ روانہ ہوئی ذریت حیدرؑ
اُم سلمہؑ تھیں وہاں استادہ کھُلے سر
زینبؑ نے سلام آخری اُن کو کیا جھک کر
جینے کی دعا دیکے یہ بولی وہ مکرّر
اللہ رکھے تجکو سدا امن و اماں میں
زہراؑ کی طرح پردہ رہے تیرا جہاں میں

نقّارہ بجا کوچ کا مولا ہوئے اسوار
رونق تھی جو یثرب میں وہ جاتی رہی اکبار
تھرّائی زمیں ایسی کہ کانپے در و دیوار
ناگاہ پس پشت ہوا حشر نمودار
کیا دیکھتے ہیں شاہ کہ چلاتی ہے صغراؑ
ہمجولیوں کے ساتھ چلی آتی ہے صغراؑ

بانوئے حزیں پردہ اُلٹ کر یہ پکاری
تکلیف نہ کر اے مری بی بی مری پیاری
تھرّائے ہوئے پاؤں سے آنکلے میں واری
جا گھر کو خدا صبر دے رخصت ہے ہماری
اب ننّھا سا سجادہ بقیعہ میں بچھا کر
زہراؑ کے مسافر کے لیے حق سے دعا کر

محمل کے قریب آکے پکاری وہ پریشاں
جھولے کی جگہ مجکو نظر آئی جو ویراں

تڑپا علی اصغرؑ کے لیے دل مرا اس آن | امّاں ترے صدقے ترے واری ترے قربان

میں یہ نہیں کہتی کسی محمل میں بٹھا دو
پر دُور سے بھیّا علی اصغرؑ کو دکھا دو

صغرؑا کی صدا سُنکے ہمکنے لگا اصغرؑ | الفت سے سوے راہ لگا دیکھنے مڑ کر
دیکھا نگہِ یاس سے صغرؑا نے مکرّر | اور بولی کہ اللہ نگہبان برادر

بچپن میں مدینے سے نکلتے ہوئے دیکھا
گھر میں نہ تمھیں گھٹنوؤں چلتے ہوئے دیکھا

جب سر آسیمہ وطن سے شہِ ابرار چلے | سر فروشی کو شہادت کے خریدار چلے
کہتی تھی فاطمہ صغرؑا کہ ہمیں مار چلے | لو مسیحا بھی مجھے چھوڑ کے بیمار چلے

ساتھ امّاں کے نہ ہمراہِ پدر جاتی ہوں
لوگو بتلاؤ تو میں کیوں نہیں مر جاتی ہوں

جب شہِ دیں کو دیا موت نے پیغامِ سفر | گریہ آغاز کیا سوچ کے انجامِ سفر
آگے صغرؑا کے کسی نے نہ لیا نامِ سفر | گھر میں ہنگامۂ محشر ہوا ہنگامِ سفر

شور تھا قبر میں محبوبِ خدا روتے ہیں
بیوطن آج حسینؑ ابنِ علیؑ ہوتے ہیں

منزلِ گور کا حضرت نے جو سامان کیا | گھر کو برباد کیا، شہر کو ویران کیا
بولی صغرؑا مجھے اس کوچ نے بیجان کیا | میرے آزار پہ عیسٰے نے نہ کچھ دھیان کیا

بے اجل آج موئی رنج کے مارے صغرؑا

علی صغرؑیٰ رخصت

مطلع ثانی

چھٹکے بابا سے ہوئی گور کنارے صغراؑ

ہاتھ پکڑے ہوئے اکبرؑ کا ہیں بابا تیّار
یہ نہ جانا ہی مرے دم سے لگی اک بیمار

بھیّا اصغرؑ کو لیے ہوگئیں امّاں بھی سوار
رو کے مجرا تو لیا اور نہ کہا برخوردار

ٹھہرو اے صاحبو ٹھہرو، مجھے آ لینے دو
بھیّا اصغرؑ کو کلیجے سے لگا لینے دو

ساربانوں سے کہو اونٹوں کو ٹھہراؤ ذرا
تم کو ہر چند ہے ملنے کی مرے کیا پروا

ناتوانی پہ مری رحم کرو بہرِ خدا
میری آواز سے بیزار ہو، صورت سے خفا

جلد اس طرح سے تشریف لیے جاتے ہو
آج گویا کہ مجھے دفن کیے جاتے ہو

مجھ سے بے آس ہو تم مجکو شفا کا ہی یقیں
ورنہ ایسی بھی تو بیمار نہیں ہیں غمگیں

اور جو دم نکلے تو اب باپ کے آگے آئیں
گرتی پڑتی ہوئی تم پاس میں آئی کہ نہیں

بھائی کے بیاہ کا میں کام کرونگی لوگو
دیکھ کر سہرا میں اکبرؑ کا مرونگی لوگو

مجکو الفت ہی تمھاری تھیں اُلفت ہی نہیں
امّاں لیں گود میں ایسی مری قسمت ہی نہیں

ساتھ دوڑوں جو سواری کے سو طاقت ہی نہیں
پیار آجائے پدر کو سو یہ صورت ہی نہیں

لونڈیاں ساتھ چلیں آج عزیزوں کی طرح
میں جو بیٹی تھی رہی گھر میں کنیزوں کی طرح

جب نے چلنے کو کہا سب سے کہا بسم اللہ
گر خطا ہی یہ خطا ہے، جو گنہ ہے یہ گناہ

مجھ سے جھوٹوں بھی نہ پوچھا میں گنہگار تھی آہ
ان دنوں شدّتِ تپ سے مری حالت ہی تباہ

یہی نہ، دو دو پہر غش میں پڑی رہتی ہوں
اب تو ہشیار ہوں چلنے کے لیے کہتی ہوں

بیٹھے بیٹھے مرا اسوقت کا چلنا دیکھو
تپ میں کیا دیکھا تھا اب دل کا اچھلنا دیکھو
گرنا بیساختہ، مشکل سے سنبھلنا دیکھو
ہاتھ میں باندھتی ہوں ہاتھوں کا ملنا دیکھو

زردی آنکھوں کی تڑپ دل کی، دھڑک سینے کی
سب یہ مر جانے کی باتیں ہیں، یا جینے کی

یک بیک میرے مقدر کا بگڑنا دیکھو
سانس کا بات کے کہنے میں اکھڑنا دیکھو
پاؤں پڑتی ہوں مرا پاؤں رگڑنا دیکھو
حال یہ، اُس پہ عزیزوں کا بچھڑنا دیکھو

غیر بھی ایسے مریضوں کو نہ تنہا چھوڑیں
حیف ہے بیٹی کو اسوقت میں بابا چھوڑیں

یہ تو اس کوچ سے اب ہو گیا صغرا کو یقیں
سب کو بابا نے مرے سامنے اسواریاں دیں
باپ کے ہاتھ کی مٹی مری قسمت میں نہیں
مجھکو تابوت ہی چھوٹا سا منگا دیں شہ دیں

بعد مرنے کے لب گور جو جائے صغرا
باپ کے ہاتھ کا تابوت تو پائے صغرا

آہ الزام سے خالی نہیں مرنا بھی مرا
پر مرا سوگ بھی کا ہے کو کوئی رکھنے کا
بھیا اکبر کا نہ بیاہ ایک برس تک ہوگا
لاڈلی کسکی ہوں اور کسکی ہوں پیاری میں بھلا

کیوں سبک سمجھے نہ ہر ایک مجھ آزاری کو
طول سا طول کھچا ہے مری بیماری کو

میں نے چاہا تھا کہ دکھلاؤں یہ حالِ زبوں
جاؤں در پر بھی نہ رخصت کے لیے میں محزوں

پھر یہ سوچی کہ حقیر اور بھی بنتی میں ہوں
بات ہی جب نہ کوئی پوچھے تو کس سے روٹھوں
متوجہ جو کسی کو میں نہیں پاتی ہوں
آپ ہی روٹھتی ہوں آپ ہی من جاتی ہوں

ہائے اب میں ہوں یہ تنہائی ہے اور سونا گھر
نہ خبر مجکو تمھاری نہ تمھیں میری خبر
دل کے بہلانے کو تم سب کے ہیں بھیا اصغرؑ
خالی جھولے سے میں ٹکراؤنگی یاں اپنا سر
الفتیں دیکھ کے ایک ایک کی میں سیر ہوئی
ہائے اللہ مری موت کو کیوں دیر ہوئی

ہوش میں آئی جو صغراؑ تو کیا شہ نے مقال
اس نقاہت پہ مری جان سفر کا ہی خیال
بولی وہ میں بھی تو بابا یہی کرتی ہوں سوال
چھوڑو تنہا اسے تم گھر میں ہو جسکا یہ حال
بعد اگر آپکے جانے کے غش آتا مجھ کو
کون اس پیار سے گودی میں اٹھاتا مجھ کو

گو کہ میں غش میں تھی پر صاف یہ کانوں سے سنا
مجکو غش آیا تو چلا کے یہ اماں نے کہا
دوڑو صاحب کہ ہوئی غش مری بیٹی صغراؑ
بعد انکے بھی کوئی چاہے گا مجکو ایسا؟
نانی صاحب کو بھی گو میری بہت الفت ہے
ماں کی شفقت میں مگر اور ہی کچھ لذت ہے،

درد سر، سوزش دل، رنج بخار ایک طرف
اور یہ ہجر شہ عرش وقار ایک طرف
سو علاج ایک طرف۔ آپ کا پیار ایک طرف
لاکھ چین ایک طرف شہ کا کنار ایک طرف
گر قضا ہے تو فراق شہ ابرار سے ہے

گر شفا ہے تو اسی شربتِ دیدار سے ہے

اب کہو یا نہ کہو، تم پہ یہ بیٹی ہو نثار　　اونٹ بٹھلائیے ہو جاتی ہوں میں آپ سوار
والدہ ہاتھ پکڑ کر مجھے کیا دینگی اُتار　　کبھی تو راہ میں آئے گا تمھیں مجھ پہ پیار
پھوپی زینبؑ کو سفارش کے لیے لاؤنگی
پاؤں پڑ کر یہ خطا آپ سے بخشاؤنگی

جب کسی پر کچھ اثر نہ ہوا تو اُنھوں نے غصّے میں آکر اپنا زیور اُتار کر پھینک دیا ہے
حضرتِ بانوؑ مضطرب ہو کر فرماتی ہیں کہ لوگو میری بیٹی غصّے ہو گئی ہے اسکو مناؤ۔
اُس کے جواب میں حضرت صغراؑ کہتی ہیں ؎

کہا صغراؑ نے کہ بس بس نہ کڑھاؤ امّاں　　کون ہوں میں مجھے کاہے کو مناؤ امّاں
اب یہ زیور بھی سکینہؑ کو پنہاؤ امّاں　　میں نہیں بولتی جاتی ہو تو جاؤ امّاں
جان پر کھیلی ہوں زنہار نہیں جینے کی
لو قسم کل سے دوا بھی میں نہیں پینے کی

کہا بانوؑ نے میں صدقے گئی کچھ ماں کی خطا　　مجھ پہ غصّے ہوئیں دربار سے کچھ بس نہ چلا
بولی صغراؑ کہ میں ناحق تو نہیں تم سے خفا　　تم جو لے چلتیں مجھے، کیا کوئی شکوہ کرتا
ہے شکایت تمھیں صغراؑ کے خفا ہونے کی
میری غربت پہ یہ ہے اسوقت جگہ رونے کی

ماں کی آغوش میں واں پی رہا تھا دودھ اصغرؑ　　سُن کے بیمار کی آواز وہ ہمکا رو کر
کی ہر ایک سمت کو الفت بھری آنکھوں سے نظر　　کہا صغراؑ نے ادھر دیکھو کھڑی ہوں میں ادھر
سہمے سہمے ہوئے کچھ تم نگراں ہوتے ہو

سرمہ آنکھوں سے بہا جاتا ہے کیوں روتے ہو

الوداع اے مرے ننھے سے مسافر ناداں
آج ہی منہ پہ ہیں پردیسیوں کے سارے نشاں
الوداع اے مرے معصوم میں تجھ پر قرباں
مسکرانا نہ اشارہ نہ ہمکنا اس آں
میرے بھولے مرے پیارے مرے کمسن بھائی
گھٹنوؤں بھی نہ چلے گھر میں تم اک دن بھائی

چشم بد دور جب ان آنکھوں کا آئیگا خیال
دل پہ لہرائینگے جس دم یہ جھنڈولے ترے بال
آنکھیں رو رو کے شب و روز کرونگی میں لال
انہیں بالوں کی طرح ہوگا پریشاں مرا حال
چوسنے پر ان انگوٹھوں کے ہو قربان صغراؑ
اب رہیگی یہاں انگشت بدنداں صغراؑ

ایک اک دم میں ترے لاکھ دم اے نور نگاہ
صد و سی سال ترے سر پہ سلامت رہیں شاہ
مصطفیٰؐ تیرے نگہبان، علیؑ پشت و پناہ
باپ کے سائے میں پروان چڑھائے اللہ
تپ میں ہوں اسلیے گودی میں نہیں لیتی ہوں
ضامنی میں تمھیں اللہ کی میں دیتی ہوں

پھر یہ کبراؑ سے لگی کہنے بہ فریاد و بکا
خیر اب گھر میں جب آؤ گی تو کرلونگی گلا
منہ پھرائے ہوئے شرمائی ہوئی بیٹھی ہو کیا
سونپا اصغرؑ کو تمھیں اور تمھیں حق کو سونپا
آجتک کام بہن نے کیا اس جانی کا
ذمہ اب تم کرو اصغرؑ کی نگہبانی کا

دو دو راتوں کو پیا کرتے ہیں یہ پچھلے پہر
میں لیا کرتی تھی یاں راتوں کو اٹھ اٹھ کے خبر
ہاتھوں سے ڈھونڈھتے ہیں ماں کو ادھر اور ادھر
بارہا سوتے میں تکیے سے سرک جاتا ہے سر

جاگتی رہیو تمھیں گر مرا اصغرؑ سو جائے
ننّھی گردن کہیں بھائی کی نہ بیکل ہو جائے
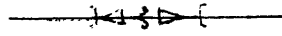
مثال ۲ - حضرت علی اکبرؑ کی رخصت اور ماں باپ کی حالت -

اکبرؑ نے کیا عزم جو میدانِ ستم کا
رو کر کہا مجکو ہے بھروسا ترے دم کا
تغیر ہوا حال شہنشاہِ امم کا
عباسؑ موئے میں بھی ہوں مہماں کوئی دم کا

کس منہ سے کہوں مرنے کو جاؤ علی اکبرؑ
بانوؑ کی کمائی کو لُٹاؤ علی اکبرؑ

میں تو نہ کہونگا کبھی، تم مرنے کو جاؤ
اور خاک میں سب بانوؑ کے ارمان ملاؤ
سر باپ کے تن پر رہے تم سر کو کٹاؤ
سہرا نہ دکھاؤ مجھے لاش اپنی دکھاؤ

عباسؑ کے ماتم سے کمر خم ہے پدر کی
اکبرؑ یہ دوا کرتے ہو تم دردِ کمر کی

منصف کیا ہم نے تمہیں بتلاؤ یہ بیٹا
پتھر نہیں آخر ہے یہ انساں کا کلیجا
بیٹے کو کسی باپ نے ہے مرنے کو بھیجا
کس طرح سے بھیجوں تمہیں جلّاد نمیں بیٹا

ہر گز نہ میں مانونگا نہ کچھ مجھ سے کہو تم
تنہائی میں، غربت میں، مرے ساتھ رہو تم

میں کرتا ہوں منّت تمہیں اسکا بھی نہیں دھیاں
بابا کی ضعیفی پہ کرو رحم میں قرباں
ماں بیاہ کی حسرت میں تمہیں مرنے کا ارماں
پیارے کی جدائی ہے مری موت کا ساماں

تنہا ہمیں ان ظالموں میں چھوڑتے ہو تم

بھائی نے کمر توڑی ہے، دل توڑتے ہو تم

اٹھارہ برس کا ابھی کُل سن ہے تمہارا
نے بیاہ ہوا ہے نہ کوئی بیٹا ہے پیارا
بیٹا تمہیں انصاف سے بتلاؤ خدارا
کس طرح مجھے داغ تمہارا ہو گوارا

دل کو غم فرقت میں سنبھالا نہیں جاتا
سینے سے کلیجے کو نکالا نہیں جاتا

سُن سُن کے بیاں باپ کا رونے لگے اکبرؑ
کی عرض کہ ارشاد بجا ہے یہ سراسر
پر مجھکو مناسب ہے یہی اے شہِ مضطر
اعدا سے لڑوں صدقے ہوں مولا کے قدم پر

حسرت ہے نہ شادی کی، نہ اولاد کی بابا
شادی ہے یہی اکبرؑ ناشاد کی بابا

گر بیاہ کے قابل بھی مجھے کرتا مرا غفار
کیوں آپ مصیبت میں یہاں ہوتے گرفتار
اب تو یہی شادی ہے مری اے شہِ ابرار
ہو آپ کے قدموں پہ فدا آپ کا دلدار

آغاز سے بہتر ہو اب انجام ہمارا
روشن رہے دنیا میں سدا نام ہمارا

اکبرؑ کا بیاں سُن کے یہ بولے شہِ ابرار
بس بس نہ کڑھاؤ نہ کڑھاؤ مجھے دلدار
میں تو نہ اجازت کبھی دوں گا تمہیں زنہار
بانوؑ سے تمنائے دلی اب کرو اظہار

مرنے کے لیے اپنے نہ شبیرؑ سے پوچھو
جو پوچھنا ہو بانوؑئے دلگیر سے پوچھو

ناگاہ قریب آ کے بانوؑ یہ پکاری
قربان گئی کس لیے تم کرتے ہو زاری
کس بات پہ ضد کرتے ہو بتلا مجھے واری
محکوم ہوں میں، تابعِ فرماں ہوں تمہاری

تو جلد بتاؤ کہ کلیجہ مرا شق ہے
کیا بات ہے، کیوں غصے ہو کیوں رنگ فق ہے

میں بھی تو سنوں واری ہے کیا قصد تمھارا — اکبرؑ نے کہا کوچ ہے دنیا سے ہمارا
وہ بولی کہ یہ تو نہ کہو مجھ سے خدارا — ان باتوں کے سننے کا نہیں ہے مجھے یارا
مادر کے کڑھانے کی نہ تقریر کرو تم
خنجر کے تلے ماں کا کلیجہ نہ دھرو تم

انصاف سے للہ بتاؤ مجھے بیٹا — مجھ سی جو کوئی اور ہو ماں غمزدہ دکھیا
اور اسکا بھی ہمشکل نبیؐ بیٹا ہو تم سا — وہ چاہے گی مرجائے مری گود کا پالا
تم چاہتے ہو ماں کو یہ خدمت کا صلہ دوں
اب خاک میں بانوؑ کے سب ارمان ملادوں
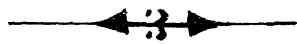
اسدم کوئی برچھی ہے مرے دل پہ لگاتا — گویا ہے کلیجہ کوئی میرا لیے جاتا
بے چین ہے دل، دم نہیں سینے میں سماتا — اسدم مری آنکھوں سے نظر کچھ نہیں آتا
لذت مرے جینے کی لیے جاتا ہے کوئی
بے تیغ مجھے ذبح کیے جاتا ہے کوئی

آگاہ تو ہے نزع کی حالت سے زمانا — گر پاؤں رگڑنا، کبھی آنکھوں کا پھرانا
پر کوئی نہیں دیکھتا ہے روح کا جانا — اسوقت سنے کوئی مرے غم کا فسانا
چھاتی غم اکبرؑ سے پھٹی جاتی ہے میری
میں دیکھتا ہوں جان چلی جاتی ہے میری

دریا کی طرف دیکھ کے کہتے ہیں کہ آؤ
اک عمر کی دولت مری لٹتی ہے بچاؤ
عباسؑ کہاں ہو، علی اکبرؑ کو مناؤ
کیا کہہ کے میں روکوں اسے، اللہ بتاؤ

اک درد نیا اٹھتا ہے رہ رہ کے جگر سے
فرزند برابر کا بچھڑتا ہے پدر سے

ناگاہ یہ غل آلِ پیمبرؐ نے مچایا
کیا جانیے کیا آ کے فضہ نے سنایا
یا شاہ خبر لیجیے زینبؑ کو غش آیا
جو ہوش میں پھر زینبؑ بیکس کو نہ پایا

عرصہ ہوا کھولا تھا ذرا دیدۂ نم کو
اب نبض کسی ہاتھ کی ملتی نہیں ہم کو

زینبؑ سے زیادہ یہاں بیہوش تھے شبیرؑ
ہے خیر تو، یہ شور ہے کیا بانوؑئے دلگیر!
یہ غل جو سنا بانوؑ سے کرنے لگے تقریر
کیا جھولے میں دم توڑتا ہے اصغرِؑ بے شیر

کیا مر گیا وہ کل سے جو بیہوش پڑا تھا
بیمار تھا۔ مظلوم تھا۔ محتاج دوا تھا

بانوؑ نے کہا یہ جو کمر باندھے کھڑے ہیں
اور زخم اٹھانے کے بھی مشتاق بڑے ہیں
اور آپ سے فردوس کے جانے پہ اڑے ہیں
انکے لیے ہم لوگ مصیبت میں پڑے ہیں

تم آ کے دیکھو تو، نہیں ہوش کسی کو
غش آیا ہے صاحب! علی اکبرؑ کی پھوپی کو

پھر خیمۂ عصمت میں جو آئے شہِ والا
زینبؑ کو زمیں سے شہِ بیکس نے اٹھایا
ایک ایک کو مُردہ وہاں شبیرؑ نے پایا
بولے کہ میں ناحق اسے پردیس میں لایا

قربان کیا بیٹوں کو مجھ بھائی کے اوپر

ہے تیسرا فاقہ مری ماں جائی کے اوپر

پھر شانہ ہلا کر کہا لو ہوش میں آؤ
بانوؑ نے کہا شاہ سے شانہ نہ ہلاؤ
ہم کہتے نہ تھے جی کو نہ اکبرؑ سے لگاؤ
خوشبو نہیں تم گیسوے اکبرؑ کی سنگھاؤ

پھر ہوش میں یا شاہ ابھی آئیگی زینبؑ
گر مر بھی گئی ہوگی تو جی جائیگی زینبؑ

بو گیسوے مشکیں کی جو اکبرؑ نے سنگھائی
شہ سے کہا میں جیتی ہوں کیوں روتے ہو بھائی
پھر خواہر شاہِ شہدا ہوش میں آئی
پر خوب ہے مر جاؤں جو میں غم کی ستائی

بیخود مجھے حضرت کی محبت نے کیا ہے
بیٹوں کا بھی مرنا مجھے اب بھول گیا ہے

پھر دیکھ کے اکبرؑ کی طرف بولی وہ دکھیا
حضرت نے کہا تھام کے ہاتھوں سے کلیجا
بھیّا مجھے بتلاؤ کہ یہ کہتے ہیں اب کیا
یہ دھیان نہیں کرتے کہ مظلوم ہے بابا

میں کیا کہوں جو جو کہ خوشامد مری کی ہے
قسمیں مجھے دے دے کے رضا مرنے کی لی ہے

ہوش اڑ گئے زینبؑ کے لگی کرنے یہ گفتار
تم عابدؑ و اصغرؑ کے ہو مالک شہِ ابرار
تھے آپ بھلا کون رضا دینے کے مختار
مشہور ہے سب کنبے میں اکبرؑ مرا دلدار

کیوں اذن دیا تم نے یہی رنج و الم ہیں
مختار رضا دینے نہ دینے کے تو ہم ہیں

کہتے تو کہا شاہ سے یہ با دلِ مضطر
شہ نے کہا ہمشیر کو چھاتی سے لگا کر
پھر ڈھانپ کے منہ رونے لگی دخترِ حیدرؑ
کیوں روتی ہو، روتا ہے تمھارا علی اکبرؑ

خیمے کی زمیں ہلتی ہے آہیں نہ بھرو تم
رو رو کے کلیجہ مرا ٹکڑے نہ کرو تم

وہ بولی نہ کیوں روؤں کہ رونیکی ہے یہ جا
تم نے سب مجھے اکبرؑ سے جدا کر دیا بھیا
کل تک یہ مجھے کہتے تھے ماں، میں نہیں بیٹا
بے پوچھے مرے کام کچھ کرتے تھے اصلا

ٹھہری نہ کوئی آج میں ہمشکل نبیؐ کی
سچ تو یہ ہے تقدیر نہ پھر جائے کسی کی

کچھ پالنے کا حق بھی نہ ثابت ہوا زنہار
وہ میری مشقت وہ مرے دکھ وہ مرے پیار
کیا یاد نہیں ہیں تمہیں اے سیّد ابرار
بانوؑ تو فقط دودھ پلانے کی ہے مختار

جو رسم محبت تھی میں لائی تھی عمل میں
قرآں کی طرح سے لیے پھرتی تھی بغل میں

میں نے اسے اب تک نظر بد سے بچایا
کھانا بھی اسے اوٹ میں دامن کے کھلایا
الحمد کو دم کر لیا پانی جو پلایا
ثمرہ مگر اس پالنے کا آج یہ پایا

اپنا جسے سمجھی تھی وہ بیگانہ ہوا ہے
قسمت کا نہیں پھیر تو صدقے گئی کیا ہے

منہ دیکھ کے ہمشیر کا رونے لگے سرور
اور ڈال دیا بیٹے کو خواہر کے قدم پر
فرمایا بہن، تجھ پہ ہو قرباں یہ برادر
کب میں نے کہا آپ کا بیٹا نہیں اکبرؑ

بانوؑ کا ہی کچھ زور نہ کچھ دخل مرا ہے
میں اُسکا ہوں مختار نہ وہ اہل غزا ہے

وہ بولی اگر آپ سمجھتے مجھے مختار
بن پوچھے مرے ان کو رضا دیتے نہ زنہار

کی تم نے خبر بھی نہ مجھے اے شہِ ابرار
جو درد مرے دل میں ہے کس سے کروں اظہار

کیوں نکلیں نہ آنسو کہ چھری دل پہ چلی ہے
اسوقت بڑی آس مری ٹوٹ گئی ہے

اور سچ بھی ہے کیا ان پہ بھلا زور ہمارا
ہم کون ہیں، تم باپ، یہ فرزند تمھارا
بھیّا! مری تقدیر کا ہے پیچ یہ سارا
دُکھیا وہ نہ کرتے ہیں سبھی دُکھ میں کنارا

کوئی بھی نہیں اے شہِ مظلوم ہمارا
یہ بخت، یہ تقدیر، یہ مقسوم ہمارا

پھر بولی یہ اکبرؑ سے وہ دُکھ درد کی ماری
تمنے بھی نہ سمجھا کوئی اپنا مجھے واری
گو عمر کروں صرف میں خدمت میں تمہاری
بانوؑ سے زیادہ نہ مگر ہونگی میں پیاری

بالفرض کہ مادر نہیں میں زارِ حزیں ہوں
کیا چاہنے والی بھی تمھاری میں نہیں ہوں

لیکن ہے غرض ہمکو تو جینے سے تمہارے
ماں باپ کے تم ہوکے جیو اے مرے پیارے
شہ نے کہا اب جائینگے یہ گور کنارے
اکبرؑ ہیں نہ انکے، نہ تمھارے، نہ ہمارے

اب آج محمدؐ کی نشانی نہ رہیگی
یہ قد نہ رہے گا یہ جوانی نہ رہیگی

مثال ۳ - حضرت امام حسینؑ بہن۔ بیٹی، اور بیوی سے رخصت ہوتے ہیں ؎

اُسوقت اہلبیتؑ میں تھی طرفہ واردات
جز نوحہ کچھ سخن تھا نہ جز آہ کوئی بات

کہیے نہ صبح قتل قیامت کی تھی وہ رات | غل تھا حسینؑ چھوڑتے ہیں بیکسوں کا ساتھ

بے وارثی کا آلِ نبیؐ کو پیام ہے
لو رخصتِ حسین علیہ السّلام ہے

جب صبح بے ردائی زینبؑ عیاں ہوئی | اور آخری سپاہِ خدا میں اذاں ہوئی
ناموسِ مصطفٰےؐ میں بپا یہ فغاں ہوئی | بس اب بہارِ گلشنِ زہراؑ خزاں ہوئی

کانپے گا عرش فاطمہؑ کے شور و شین سے
جس دم وداع ہوئیگی زینبؑ حسینؑ سے

فارغ ہوئے نماز سے ناگہ شہِ امم | آئے حرم سرا میں پئے رخصتِ حرم
فضہ کو دیکھ کر یہ پکارے بچشمِ نم | لا کہنہ جامہ کوچ ہے اپنا سوئے عدم

روداد آج کی نہ فراموش ہوتی تھی
یہ دن وہ ہے کہ فاطمہؑ جس دن کو روتی تھی

زینبؑ سے پھر کیا شہِ بیکس نے یہ کلام | لو خواہر الوداع کہ ہے رخصتِ امام
یہ صبحِ قتل ہم کو شہادت کا ہے پیام | اب رات بھی تمام ہے اور بات بھی تمام

جاتا ہوں میں تو شیعوں پہ قرباں ہونے کو
دنیا میں تم رہو مری غربت پہ رونے کو

ہاتھوں سے دل پکڑ کے گری دخترِ بتولؑ | دامن سے لپٹی شاہ کے وہ بیکس و ملول
تھرا کے دل کو بولی کہ اے نائبِ رسولؐ | مرنا قبول ہے ترا ماتم نہیں قبول

زینبؑ کو پہلے ذبح کرو خیمہ گاہ میں
پھر جاؤ سر کٹانے کو خالق کی راہ میں

تنہا جو چھوڑتے ہو مری کچھ خطا بھی ہے
کوئی بزرگ سر پہ ہمارے رہا بھی ہے
کوئی بجز حضور مرا آسرا بھی ہے
یہ درد لا علاج ہے، یا کچھ دوا بھی ہے
دم اتنے بیکسوں کا ترے دم کے ساتھ ہے
بھیا! خدا کی ذات ہے یا تیری ذات ہے

مرقوم ہیں یوں شاہ کے اخبارِ مصیبت
گھر آنے کی میداں سے نہ تھی شاہ میں طاقت
جب رو چکے ہفتاد و دو تن کیلئے حضرت
پر کھینچ کے لے آئی سکینہؑ کی محبت
یاں آنکے دیکھا تو اُسے پیاس بڑی ہے
ماں بیٹھی ہے بالیں پہ وہ بیہوش پڑی ہے
زینبؑ سے یہ رو رو کے گلا کرنے لگے شاہ
ہے خاک پہ بیہوش، خبر تم کو نہیں۔ واہ
جیتے جی مرے حال سکینہؑ کا یہ ہے آہ
جانو اُسے بن باپ کی شفقت کرو للہ
غافل مرے بچوں سے جو اس آن ہوئی ہو
ہاں پال کے اکبرؑ کو پشیمان ہوئی ہو
لے لیکے بلائیں کہا زینبؑ نے میں واری
میں نے اسے گودی میں اُٹھایا کئی باری
تو ہی مجھے پیارا۔ تری اولاد بھی پیاری
ہوش آتا ہے تو کہتی ہے پیاس کی ماری
اے صاحبو الفت مری تم دل سے بھلا دو
یا مجکو تڑپنے دو۔ دیا پانی پلا دو
یہ کہکے سکینہؑ کو لیا گود میں اک بار
ہوش آیا سکینہؑ کو تو کی اُس سے گفتار
بابو نے ملے بیٹی کے رخسار پہ رخسار
بابا مرے آئے جو مجھے کرتے ہیں سب پیار

لی میری خبر آکے حسینؑ ابنِ علیؑ نے
ابتک تو زمیں سے نہ اُٹھایا تھا کسی نے

شہ نے بھی پکارا کہ مری جان ہم آئے — یاں آؤ کہ بابا تمھیں چھاتی سے لگائے
یہ کہہ کے تب اُس پیاسی نے ہاتھ اپنے بڑھائے — حضرت کے سوا کون مرے ناز اُٹھائے
بن باپ کی دُنیا میں نہ کہلائے سکینہؑ
اب لیجیے بلا آپ کی مرجائے سکینہؑ

یہ سُن کے ہوا چاک دلِ سیدِ ابرار — مانند یتیموں کے اُسے شہ نے کیا پیار
پھر کان میں آہستہ یہ کی شاہ نے گفتار — لائی ہے مجھے رن سے تری حسرتِ دیدار
درگاہِ خدا میں طلبِ سرورِ دیں ہے
اب اس سے سوا حکم ٹھہرنے کا نہیں ہے

پر تم سے وصیت یہ پدر کی ہے خبردار — اب یاد نہ تم کیجیو مجکو، نہ مرے پیار
ہر بات پہ بانوؑ سے نہ تم روٹھیو زنہار — وہ اکبرؑ و اصغرؑ کے ہے ماتم میں گرفتار
تم روٹھوگی تو اور وہ گھبرائیگی پیاری
اچھی بھی اُسے بات نہ خوش آئیگی پیاری

زینبؑ کو بھی تازہ ہے ابھی ماتمِ اولاد — اور بعد مرے آئینگے فرزند بہت یاد
ہوئیگا مرے غم میں مریض اور بھی سجادؑ — ایک ایک ترے کنبہ میں ہے بیکس و ناشاد
بھائی سے، نہ ماں سے، نہ بہن سے، نہ پھوپی سے
اب بعد مرے ناز بھی کرنا نہ کسی سے

سینے پہ مرے سو چکیں۔ اب خاک پہ سونا — آخر ہے زمیں بھی تو غریبوں کا بچھونا

گو قہر ہے اس سن میں جُدا باپ سے ہونا　　لاشا مرا تڑپیگا بہت مجکو نہ رونا

گر چاہو مری روح ہو نا شاد سکینہؑ
تو غم میں مرے کیجیو فریاد سکینہؑ

اک آہ سکینہؑ نے کی اور بولی یہ رو رو　　دریا سے بُلا لو مرے عبّاسؑ چچا کو
گر چھوڑتے ہو تم تو چچا کو مجھے سونپو　　حضرت نے کہا نام نہ عبّاسؑ کا تم لو

دریا پہ فقط لاش ہی اور مشک و نشاں ہے
عبّاسؑ تو مارا گیا۔ عبّاسؑ کہاں ہے

رخصت ہوئے القصہ شہِ صابرؑ شاکر　　سب بیبیاں بولیں کہ خدا حافظ و ناصر
تھی موت رکابِ شہِ مظلوم میں حاضر　　اور فاطمہؑ کی روح جلو داری کی خاطر

مینھ تیر و تبر کا پڑنے لگا کفّار کی صف سے
پیغامِ قضا آنے لگے چار طرف سے

اب فرضِ عینؑ سب کو خیالِ حسینؑ ہے　　رن میں عجیب صورتِ حالِ حسینؑ ہے
دن ڈھل چکا ہی وقتِ زوالِ حسینؑ ہے　　ہفتم سے بھوکی پیاسی سب آلِ حسینؑ ہے

مُنہ پیٹو۔ ابنِ فاطمہؑ پا در رکاب ہے
صورت یہی نجات کی روزِ حساب ہے

نو لاکھ کی جفائیں برابر اُٹھا چکے　　اور ایک دل پہ داغ بہتّر اُٹھا چکے

لہ مرثیہ غیر مطبوعہ و غیر منقسمہ ہے جسکا مطلع یہ ہی۔ ع۔ عشق خدا کا بار نہ کہسار سے اُٹھا۔

اکبرؑ کی لاش، صدمہ صغرؑ اُٹھا چکے
دنیا سے ہاتھ سبطِ پیمبرؐ اُٹھا چکے

آئے ہیں بیکسوں سے وداعِ اخیر کو
حسرت سے دیکھتے ہیں صغیر و کبیر کو

زین العبا کو رازِ امامت بتا چکے
زینبؑ کو اپنا صاحبِ ماتم بنا چکے
بانوؑ سے مہر بھی شہِ دیں بخشوا چکے
پیغام موت کا ملک الموت لا چکے

زہراؑ کی قبر ہلتی ہے پوتی کے بین سے
لپٹی ہے چار سال کی بیٹی حسینؑ سے

جب دیکھتے ہیں اُسکی طرف تھرتھراتے ہیں
کُرتے میں گھنڈی دیتے ہیں ٹوپی پہناتے ہیں
دکھلا کے اُسکا حال بہن کو سُناتے ہیں
اس سن کے بچے اور بھی یہ دُکھ اُٹھاتے ہیں

دریا پہ خون بی بی کے سقّے کا بہ گیا
یہ خشک ہونٹ دیکھنے کو باپ رہ گیا

کیا حال ہو گیا ہے مری بے وطن کا آہ
کیا دل دھڑک رہا ہے مری خستہ تن کا آہ
کیا منہ اُتر گیا ہے مری کم سخن کا آہ
کیا تن لرز رہا ہے مری گلبدن کا آہ

سانس ایسے لے رہی ہے کہ بابا میں دم نہیں
اکبرؑ کی لاش دیکھنے سے کچھ یہ کم نہیں

زینبؑ جواب دیتی ہیں۔ فاقہ ہے تیسرا
بھیّا ابھی سکینہ کا سن کیا، بساط کیا
دیتی ہے وہ قسم نہ کڑھیں شاہِ کربلا
سر پر ہیں آپ۔ ہے یہ بڑی نعمتِ خدا

دل پر نہ داغ قبلہ و کعبہ کا لونگی میں
جان اپنی دونگی آپکو جانے نہ دونگی میں

یہ جو کہا سکینہؑ نے ٹھہرا سبھوں کا دم ۔۔۔ کبرا نے عرض کی شہ دیں سے بچشم نم
خالق نے عاجزی پہ ہماری کیا کرم ۔۔۔ خاموش تھے حضور کے پاس ادب سے ہم

کیا یاور اس گھڑی بھی نہ مقسوم ہوئیگا
اب رن کو جائیے گا تو معلوم ہوئیگا

لی ہم سے، انسے آپ رضا لیں تو جانیں ہم ۔۔۔ گردن سے ننھی باہیں ہٹا لیں تو جانیں ہم
ہاتھوں سے انکے ہاتھ چھڑا لیں تو جانیں ہم ۔۔۔ کہنا سکینہؑ جان کا ٹالیں تو جانیں ہم

روٹھیں تو پھر حضور نہیں کی خوشی کریں
یہ اپنی ضد کی ہیں۔ جو کہیں پھر وہی کریں

شہ بولے بے جدائی کے چارہ نہیں ہمیں ۔۔۔ اب رو و پیٹو۔ دھیان تمہارا نہیں ہمیں
اللہ کے عتاب کا یارا نہیں ہمیں ۔۔۔ کوئی خدا کے سامنے پیارا نہیں ہمیں

عشق خدا کا روز ازل دم بھرے حسینؑ
دنیا میں آکے وعدہ خلافی کرے حسینؑ!!

مثال ۴۔ حضرت امام **حسین** علیہ السّلام، اپنے بھائی حضرت **عباسؑ** کے مرنے کی خبر سنکر رزمگاہ میں جاتے ہیں ؎

گھوڑے سے گرے جب تو برادر کو پکارا ۔۔۔ کام آیا یہ خادم یہ نمک خوار تمہارا
سنتے ہی نہ حضرت کو رہا ضبط کا یارا ۔۔۔ بس ہائے اخی کہکے گریباں کیا پارا

کانپا جو بدن، حیدرؑ صفدر نے سنبھالا
غش کھاکے گرے تھے کہ جو اکبرؑ نے سنبھالا

پھر مڑ کے جواں بیٹے کو چلائے کہ جلد آؤ ۔۔۔ اکبرؑ مرے ٹوٹے ہوئے بازو سے لپٹ جاؤ

بیتاب ہوں میں جلد مرے بھائی کو دکھلاؤ
دم آنکھوں میں آپہونچا، ہمیں نہر پہ پہونچاؤ

آنکھوں سے مرے خونِ دل اسوقت بہا ہے
چھریوں سے کلیجے کو کوئی کاٹ رہا ہے

اب دل میں ہے وہ درد جو پہلے تھا کمر میں
شانوں کی طپش پھیل کے آئی ہے جگر میں
یوں کوئی مسافر نہ لُٹا ہوگا سفر میں
بیٹا مرے عبّاسؑ کا باہر ہے کہ گھر میں؟

سمجھا دو پھپی کو کہ اُسے پاس بُلالیں
بہنوں سے یہ کہدو کہ سکینہؑ کو سنبھالیں

مظلوم کو مظلوم کے بیٹے نے سنبھالا
ہاتھوں کو کیا فاطمہؑ کے چاند کا ہالا
پر گرتے تھے اسپر بھی تڑپ کر شہِ والا
جس طرح کہ بسمل کا جگر ہوتہ و بالا

اکبرؑ کا یہ عالم تھا کہ گھبرائے ہوئے تھے
عبّاسؑ کے ماتم کی سناں کھائے ہوئے تھے

سر پیٹتے روتے ہوئے میداں کو چلے شاہ
بابا کی کمر تھام کے اکبرؑ ہوئے ہمراہ
عبّاسؑ کا لاشہ جو نظر آگیا ناگاہ
بھائی سے بغل گیر ہوئے سرورِ ذیجاہ

کچھ کہنے نہ پائے کہ مسافر ہوئے عبّاسؑ
مُنہ دیکھتے ہی دیکھتے آخر ہوئے عبّاسؑ

بولے شہِ مظلوم یہ شانے کو ہلا کر
اُٹھتے نہیں، کیا سو گئے عبّاسؑ دلاور
ہمراہ تھے ہم بھی، نہ توقّف کیا دم بھر
اللہ! یہ جلدی ہوئی اے جانِ برادر

پایا جو مکاں سرد تو نیند آگئی تم کو
ہاں شیر تھے دریا کی ہوا بھا گئی تم کو

ڈیوڑھی پہ علم غرق بخوں آیا کہ محشر
پھر تو کوئی غش تھا کوئی بیخود کوئی ششدر
ماتم کا اشارہ کیا پنجے نے لچک کر
ڈیوڑھی پہ حرم پیٹتے تھے لونڈیاں باہر

سردار بھی بیہوش تھا اور اہلِ حرم بھی
مُنہ ڈھانپ کے رُوتا تھا پھریرے سے علم بھی

ایک دوسرے مرثیے میں فرماتے ہیں ؎

واں ایک بلندی جو درِ خیمہ کے تھی پاس
سیّد کی تو آنکھیں نگراں تھیں سوئے عباسؑ
بے فوج کا سردار کھڑا تھا وہاں بے آس
منہ دیکھتے تھے اُن کا حرم در سے بصد یاس

واں نہر پہ غل اُٹھتا تھا یاں درد جگر میں
تاریک تھا دن آلِ پیمبرؐ کی نظر میں

چہرہ شہِ بیکس کا ہوا زرد قضا را
گھبرا کے درِ خیمہ سے زینبؑ نے پکارا
اکبرؑ نے دعا کے لیے عمّامہ اُتارا
عبّاسؑ پہ کیا گذری، کہو جلد خدا را

سنتی ہوں کہ اب خیر سے خیمے کو پھرے ہیں
حضرتؑ نے ملے ہاتھ کہ لشکر میں گھرے ہیں

منہ پیٹ کے بانوؑ یہ سکینہؑ کو پکاری
لو ہوتی ہیں اب رانڈ چچی جان تمھاری
ہر بات پہ ضد کرنا بُرا ہوتا ہے واری
اب کس کے چچا جان کو گھیرے ہیں ناری

حضرت نہیں جینے کے اس اندوہ و تعب سے
سب گھر کی تباہی ہوئی بی بی کے سبب سے

شرما کے یہ کہنے لگی وہ نازوں کی پالی
قربان ہوئی نہر پہ میں بھیجنے والی
ہی ہی، یہ بلائیں نے چچا جان پہ ڈالی
اللہ نہ ٹوٹے کمرِ سیّدِ عالی

جسوقت بلائیں ہیں چچاجان کی لونگی
یہ بالیاں کانونکی تری راہ میں دونگی

ناگاہ ہوا عرصۂ مقتل تہ و بالا
منہ پردے سے پھر زینبِؑ بیکس نے نکالا
اور بیٹھ گئے دل کو پکڑ کر شہِ والا
پوچھا تو کیا شاہِ شہیداں نے یہ نالا

اب منہ سے نکلتا ہی کلیجہ مرا پھٹ کر
سینے پہ لگا تیر گرے بھائی اُلٹ کر

زینبؑ نے بھی گردن طرفِ نہر پھرائی
اک چیز چمک کر مجھے گرتی نظر آئی
چلائی کہ ہی ہی شیرِ مرداں کی دہائی
پنجہ یہ نشاں کا ہی کہ پرچم ہی طلائی

بازوے علمدار قلم ہو گیا لوگو
ٹھنڈا مرے بھائی کا علم ہو گیا لوگو

کیوں صاحبو اسر ننگے میں اب خیمے سے جاؤں
دریا پہ صفِ ماتمِ عباسؑ بچھاؤں
ماتھے پہ لہو سقے کے شانے کا لگاؤں
اماں کو بھی اسوقت بقیعے سے بلاؤں

بابا کی شہادت کا قلق تازہ ہوا ہی
سیدانیو امیرا علَوی بھائی موا ہی

پھر بیوۂ مسلمؑ کو پکاری وہ دل افگار
دے اذن تو ساماں کروں ماتم کا میں ناچار
بھائی ہی حقیقی ترا عباسؑ علمدار
وہ بولی کہ مالک ہیں حضور اور شہِ ابرار

پر آپ ترائی میں جو کھوے ہوئے سر جائیں
اکبرؑ تو نہ غیرت سے گلا کاٹ کے مر جائیں

سیدانی نے منہ اکبرِؑ مظلوم کا دیکھا
موڑ لیا شہزادے نے تھرا کے سر اپنا

سمجھی کہ رضائے علی اکبرؑ نہیں اصلا
زینبؑ نے وہیں پیٹ کے منہ پر لیا پلا
یاں شور و فغاں گنبدِ دوّار پہ پہونچا
سردار وہاں لاشِ علمدار پہ پہونچا

شہ بولے لپٹ کر یہ برادر ترے صدقے
بھائی! مرا بابا مری مادر ترے صدقے
بھائی! مرا اکبرؑ مرا اصغرؑ ترے صدقے
بھائی! مرے شیعہ مرا سب گھر ترے صدقے
تجھ سا نہ کوئی اہلِ وفا ہوئیگا عبّاسؑ
میں اُس پہ تصدّق جو تجھے رُوئیگا عبّاسؑ

غازی نے دعا دی کہ ہمیشہ ہو آباد
خالق علی اکبرؑ کو کرے صاحبِ اولاد
شیعوں کی ترقی ہو، مَوالی رہیں دلشاد
لو جاتا ہوں، اللہ نے بندے کو کیا یاد
لبیک پیمبرؐ مجھے فرماتے ہیں آقا
بابا بھی وہ سر ننگے چلے آتے ہیں آقا

حالتِ نزع

یہ کہکے تبسّم کیا پھر لب نہ ہلایا
سینے میں رُکی سانس، جبیں پر عرق آیا
آنکھوں کی سیاہی کو سفیدی نے چھپایا
منکا جو ڈھلا، سر قدمِ شہ پہ جُھکایا
غش ہوگئے شبّیرؑ قضا کرگئے عبّاسؑ
تھرّا کے بدن رہ گیا اور مرگئے عبّاسؑ

جا کر درِ خیمہ پہ کسی نے یہ سُنایا
ہمشکلِ نبیؐ دوڑو کہ حضرت کو غش آیا
آکر علی اکبرؑ نے جو حضرت کو اُٹھایا
شہ بولے کہ بھائی سے مقدّر نے چھڑایا
روتا ہمیں عبّاسؑ نے چھوڑا علی اکبرؑ
دم بھی مری آغوش میں توڑا علی اکبرؑ

پھر لاش پہ یہ مرثیہ پڑھنے لگے رو کر
افسوس تری بیکسی و یاس برادر
ہی ہی مرے عاشق تجھے گھیرے رہا لشکر
ہم بہرِ مدد آ نہ سکے وائے مقدر

غم سے ترے تڑپیگی مری روح بدن میں
جب تک نہ بدن ہوئیگا پوشیدہ کفن میں

پھر گھر کو چلے لاش اُٹھا کر شہِ والا
آگے علم و مشک لیے گو د کا پالا
ٹکڑے تھا جو عباسؑ علیؑ کا قد بالا
گہ آپ سنبھالا کبھی اکبرؑ نے سنبھالا

لاشے کو تو معراج تھی دوشِ شہِ دیں پر
اور پاؤں رگڑتے ہوئے آتے تھے زمیں پر

سیدانیوں میں لاشۂ عباسؑ جو آیا
گھبرا گئیں بہلا کے سکینہؑ کو چھپایا
اور جعفرِ طیار کی مسند کو بچھایا
آہستہ سے لاشہ اسی مسند پہ لٹایا

شہ بولے، علمدار سفر کر گئے زینبؑ
لشکر کا ہوا خاتمہ ہم مر گئے زینبؑ

اب لاش پہ سیدانی ہر اک اشک بہائے
زینبؑ نے کہا پہلے بہن رونے کو جائے
یاں سے تو نبی زادی چلی سر کو جھکائے
واں بیوہ نے مُردے کے کئے شانے ہلائے

چلائی کہ صاحب مرے، تسلیم کو اُٹھو
ہمشیرِ حسینؑ آتی ہیں تعظیم کو اُٹھو

زینبؑ نے کہا سونیکی یہ کون گھڑی ہے
اے بھائی اُٹھو فوجِ ستم گرد کھڑی ہے
رو لونگی میں پھر رونے کو سب عمر پڑی ہے
پر اب تو مجھے تم سے شکایت یہ بڑی ہے

اسوقت سدھارے جو ملاقاتِ نبیؐ کو

سونپا کسے عبّاسؑ حسینؑ ابن علیؑ کو

ناگاہ کہا ماں سے سکینہؑ نے یہ کیا ہی
سر کھولے کُنبہ مرا مصروفِ بُکا ہی
دم گھٹتا ہی تم نے مجھے کیوں روک رکھا ہی
ہی ہی کہیں مظلوموں کا مرنا بھی چُھپا ہی

میں نے اُنہیں مشکیزہ دیا کیا کہ خطا کی
اب لاش بھی مجکو نہ دکھاؤگی چچا کی

امّاں اب مجھے عمّوں کی زیارت سے نہ ترساؤ
رومال سے تم ہاتھ مرے باندھ کے لیجاؤ
گر ہوں میں گنہگار سفارش مری فرماؤ
دیدار چچا کا اسی تقریب سے دکھلاؤ

لونڈی کی طرح گردِ علمدار پھرونگی
زانو پہ نہ بیٹھوں گی میں قدموں پہ گرونگی

مثال ۵ - علی اکبرؑ نزع کی حالت میں ہیں اور امام حسینؑ اُنکے پاس جاتے ہیں ؎

گُم ہوگیا ہی کہا کے سناں یوسفِ حسینؑ
صابر، غریب، تشنہ دہاں یوسفِ حسینؑ
بن بیاہا، نامراد جواں یوسفِ حسینؑ
ہونٹوں پہ پھیرتا ہی زباں یوسفِ حسینؑ

گر گر کے لوٹتا نہیں بیجا حسینؑ کا
برچھی کی نوک میں ہی کلیجا حسینؑ کا

بیٹا لہو میں لال ہی، منہ انکا زرد ہی
واں لب پہ العطش ہی یہاں آہِ سرد ہی
زلفوں میں بال بال بیاباں کی گرد ہی
واں نیزہ ہی جگر میں یہاں دلمیں درد ہی

روتے ہیں شہ کے صاحبِ اولاد روتے ہیں

وہ حال ہے کہ دیکھ کے جلاّد روتے ہیں

یعقوبؑ یوں پھرے تھے نہ یوسفؑ کی چاہ میں
تاریک آسمان و زمیں ہے نگاہ میں
تھالے لہو کے سونگتے ہیں قتل گاہ میں
ہاتھوں سے لاش ڈھونڈتے ہیں گر کے راہ میں

جو پوچھتا ہے گم ہوئی کیا شے حضور کی
فرماتے ہیں تلاش ہے آنکھوں کے نور کی

دولت ملی ہے خاک میں اٹھارہ سال کی
سو خاک چھانتا ہوں میں دشتِ قتال کی
للہ لو خبر کوئی بانوؑ کے لال کی
چھائی ہے میرے چاند پہ بدلی زوال کی

ڈھونڈے کہاں حسینؑ، کدھر جائے کیا کرے
معذور آنکھوں سے نہ کسی کو خدا کرے

اے عاشقِ حسینؑ سنبھالو حسینؑ کو
نرغہ سے ظالموں کے نکالو حسینؑ کو
تلواریں پڑ رہی ہیں، بچالو حسینؑ کو
کس جا ہو، کسطرف ہو، بلا لو حسینؑ کو

پالا تھا تم کو ہاتھ پکڑنے کے واسطے
یا ایڑیاں زمیں پہ رگڑنے کے واسطے

خنجر بکف کھڑے ہیں رسالے، مدد کرو
گھیرے ہوئے ہیں برچھیوں والے، مدد کرو
دیکھو جگر پہ چلتے ہیں بھالے، مدد کرو
بنتِ علیؑ کی گود کے پالے! مدد کرو

بیٹا جواب دو، کہ مرے دل کو کل پڑے
وہ وقت ہے کہ منہ سے کلیجا نکل پڑے

کیا کیا تڑپ تڑپ کے بیاں شاہ نے کیا
اکبرؑ کو دردِ دل نے نہ واں بولنے دیا
دردِ جگر سے بیٹھ گئے شاہِ اتقیا
تڑپے حسینؑ اور کلیجہ پکڑ لیا

چلّائے ہائے کونسی صورت نکالوں میں
فرزند کو پکاروں کہ دل کو سنبھالوں میں

اے کردگارِ لم یزلی آہ الغیاث
یا مرتضیٰؑ علیؑ ولی آہ الغیاث
نانا چھری گلے پہ چلی آہ الغیاث
زینبؑ نے خاک منہ پہ ملی آہ الغیاث

اے موت اور ایک سہارے کو لے گئی
مقتل سے کسطرف مرے پیارے کو لے گئی

اے آسماں زمیں کا ستارہ کدھر گیا
اے نہر تشنہ لب مرا پیارا کدھر گیا
اے آفتاب چاند ہمارا کدھر گیا
اے عرش و فرش نور تمھارا کدھر گیا

اے خاکِ پاک درِ نجف کی تلاش ہے
اے کربلا بتا کدھر اکبرؑ کی لاش ہے [۱]

ناگاہ اک طرف سے صدا آئی الوداع
لینے کو روحِ شیرِ خدا آئی الوداع
باباحسینؑ آو قضا آئی الوداع
سرننگے دادی خیرِ نسا آئی الوداع

لیکن یہ عرض ہے کہ نہ گھبرا کے آئیو
اماں کو میری خیمہ میں بٹھلا کے آئیو

بچے کہیں نہ ہو کے ہراساں نکل پڑیں
بہنیں نہ بال کر کے پریشاں نکل پڑیں

[۱] ٹیپ کا آخری مصرع عجب رقت خیز اور درد انگیز ہے اور لفظوں میں وہ اثر بھرا ہوا ہے کہ دل بے قرار ہو جاتا ہے۔ کربلا میں امام حسینؑ کو کسی سنگدل سے یہ امید نہ تھی کہ وہ اُن کے نورِ نظر کی لاش کا پتہ بتائیگا۔ اسلیے کبھی آسمان کو کبھی نہر کو، اور کبھی کربلا کو مخاطب کر کے اپنے فرزند کی لاش کا نشان پوچھتے ہیں۔ اس خطاب سے کیسی مایوسی حسرت۔ اور بیکسی کا اظہار ہوتا ہے۔

سیدانیاں نہ باسرِ عریاں نکل پڑیں — ایسا نہو مری پھوپی امّاں نکل پڑیں

ہوگا مقامِ خندہ زنی اہلِ شام کو
اللہ آبرو سے اُٹھا لے غلام کو

بولے حسینؑ کنبے کے پردے کا دھیان ہے — اس آن بھی تمہاری وہی آن بان ہے
سینے میں پھل ہے برچھی کا، ہونٹوں پہ جان ہے — سب تم میں ہمّتِ شہِ مرداں کی نشان ہے

خاطر نشاں رکھو ابھی سب ہیں خیام میں
مغرب کیوقت ہوئینگی بلوائے عام میں

آیا حسینؑ آیا، کدھر ہو تم اے پسر — اکبر پکارے قبلہ و کعبہ ادھر ادھر
ہے ہے حضور ضعفِ بصارت ہے اسقدر — پہلو میں ہے غلام اور آتا نہیں نظر

بیٹے کی لاش پر شہِ غمناک گر پڑے
گویا زمیں پہ قبّۂ افلاک گر پڑے

گودی میں لاش لیکے چلے شاہِ نامدار — فضّہ کھڑی تھی راہ میں اُسوقت بیقرار
آکر کہا یہ کان میں رانڈوں کے ایکبار — اکبرؑ کی لاش آتی ہے، بانوؑ سے ہوشیار

جیتے تھے جسکو دیکھ کے وہ قتل اب ہوا
اللہ سب کی خیر کرے کیا غضب ہوا!!

بانوؑ کی اوٹ کرکے کھڑے ہوگئے حرم — گھبرا کے بانوؑ بولی ارے لوگو سمجھے ہم
آمد ہے لاشۂ علی اکبرؑ کی ہے ستم! — سر کو خدا کیواسطے، گھُٹتا ہے میرا دم

عزّت سے لاؤ شاہِ اُمم کے فدائی کو
رستے میں جاؤں لاش کی میں پیشوائی کو

تسکین سب نے دی یہ تمھیں کیا خیال ہے
زندہ خدا کے فضل سے حضرت کا لال ہے
بولی خدا یونہی کرے پر جی نڈھال ہے
ہو خیر اسکی جان کی میٹھا یہ سال ہے
رن سے ابھی صدا کسی بسمل کی آئی تھی
برچھی کسی جواں نے کلیجے پہ کھائی تھی

٤ ◄ ۲ ► ٤
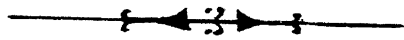
جب چمن خاک میں اکبرؑ کی جوانی کا ملا
پانی پانی کہا اک قطرہ نہ پانی کا ملا
داغ سیدانیوں کو احمدؐ ثانی کا ملا
رن میں شہ کو نہ پتہ بانوؑ کے جانی کا ملا
رو کے کہتے تھے نہ طاقت ہے نہ بینائی ہے
بیٹا مارا گیا اور عالم تنہائی ہے

ہائے ہم دور ہیں پاس اپنے بلا لو اکبرؑ
نکلا پڑتا ہے جگر منہ سے سنبھالو اکبرؑ
مرتا ہوں ضعف بصارت سے بچا لو اکبرؑ
زندہ در گور ہوں تم آ کے نکالو اکبرؑ
نظر آتی نہیں تصویر تمھاری بیٹا
زندگی موت سے بدتر ہے ہماری بیٹا

اے مرے شیر تو جنگل میں کہ خرگاہ میں ہے
شور رونے کا مزار اسد اللہؑ میں ہے
مرے یوسفؑ مجھے آواز دے کس چاہ میں ہے
تیرا یعقوبؑ سراسیمہ کھڑا راہ میں ہے
کیسی مجبوری سے رستے کی طرف تکتا ہوں
اٹھ کے گر پڑتا ہوں گر کر نہیں اٹھ سکتا ہوں

اے جوانمرگ مرے ہائے مری پیری کے عصا
دولت آل نبیؐ، رونق آل کسرا
اے مرے نام و نشاں حیف ترا نام مٹا
کیا کوئی صاحب اولاد نہ اس فوج میں تھا

سب زیارت کو تری ہوتے تھے حاضر بیٹا
کس نے تجویز کی برچھی تری خاطر بیٹا

جان تن میں ہے، نہ اب تن میں توانائی ہے
جشن ہے ظالموں میں، اور صف آرائی ہے
مُردنی چہرے پہ چھائی ہے، اجل آئی ہے
یاں پریشانی و مظلومی و تنہائی ہے

نہ کوئی ہات پکڑنے کو، نہ سمجھانے کو
ہم ہیں رونے کو، جدائی تری رلوانے کو

ناگہاں گوشۂ صحرا سے اک اسوار آیا
اور یہ کہتا ہوا پیشِ شہِ ابرار آیا
خوں بھرا نیزہ ہلاتا، وہ جفاکار آیا
جسکو تم ڈھونڈھ رہے ہو میں اُسے مار آیا

قبر میں پاؤں ہیں، اور خاک پہ سر اُسکا ہے
دیکھو، برچھی کی انی میں یہ جگر اُسکا ہے

وہ تو دم توڑتے ہیں، پاس بلاتے ہو کسے
ہوش اُنکو نہیں، آواز سناتے ہو کسے
وہ نہیں ملنے کے، تم ڈھونڈنے جاتے ہو کسے
خود وہ بیحال ہیں، حال اپنا دکھاتے ہو کسے

موت کے گھر سے کوئی پھر کے بھلا آتا ہے
کہیں مُردہ بھی بلانے سے چلا آتا ہے

خوش نصیبوں کو پسر ایسا خدا دیتا ہے
خاک میں دُرِ نجف کوئی ملا دیتا ہے
ایسی دولت بھی کوئی پا کے لٹا دیتا ہے
کوئی باپ ایسا چراغ اپنا بجھا دیتا ہے

روئیے، پیٹیے، چلائیے، کیا ہوتا ہے
وہی ہوتا ہے جو قسمت میں لکھا ہوتا ہے

ناگہاں آئی یہ آواز، کہ بابا آؤ
جاں بلب ہے یہ غلام، آؤ مسیحا آؤ

اے مرے خضر سوے گوشۂ صحرا آؤ
پر مری ماں نکل آئی ہو تو سنبھلا آؤ

رن سے جنگل میں گئے شہ تو وہ محبوب ملا
بولے سب یوسفِ گم گشتہ سے یعقوبؑ ملا

کہا اکبرؑ نے کہ روئیں نہ مرے غم میں جناب
ہائے پیری مری اور آہ تری مرگِ شباب
بولے شہ تیرے ہی ماتم میں تو رونا ہے ثواب
نہ تو تابوت کا ساماں نہ عزا کا اسباب

جنکے مہمان ہیں وہ دیکھ کے خوش ہوتے ہیں
نہ ہمیں دیتے ہیں پرسا نہ تمھیں روتے ہیں

لائے تب لاش کو خیمہ میں شہنشاہِ امم
دیکھا بانوؑ نے یہ سامان غضب کا جسدم
یہاں بانوؑ کو سنبھالے ہوئے روتے تھے حرم
رو کے چلائی مری کوک لٹی وائے ستم

لاش گھوڑے پہ ہے شہ آگے بڑھے آتے ہیں
علی اکبرؑ مرے پروان چڑھے آتے ہیں

شہ نے چلا کے کہا بانوؑ بڑھانا نہ قدم
گھوڑا لاشہ لیے آپہونچا جو گردن کیے خم
علی اکبرؑ کے بدن میں ابھی باقی ہے دم
لاش اُتروانے لگے بانوؑ کی ہمراہ حرم

ٹکڑے بانوؑ کے کلیجے کے ہوئے جاتے تھے
ہاتھ بھی کانپتے تھے پاؤں بھی تھرّاتے تھے

کہتی تھی ماں کہ یہ کیا کام لیا واری ماں
ہائے دنیا میں تو اتنا نہ جیا واری ماں
لاش اُتروانے سے ممتاز کیا واری ماں
ماں کے تابوت کو کاندھا نہ دیا واری ماں

گود میں لیتی ہوں لاشہ میں تمھارا ہے ہے
تم نے اماں کو لحد میں نہ اتارا ہے ہے

کہہ کے یہ خوب بہ کلیجے سے لگایا لاشہ
جا کے مسند پہ پیمبرؐ کے لٹایا لاشہ
غل ہوا بانوؑ کے بن بیاہے کا آیا لاشہ
آس تھی سہرہ کی قسمت نے دکھایا لاشہ
نبض ہمشیر شہنشاہ امم دیکھتی تھی
ہاتھ رکھے ہوئے ماں سینے پہ دم دیکھتی تھی

کسی کا خانۂ امید بے چراغ نہ ہو
جوان بیٹے کا دل کو پدر کے، داغ نہ ہو
ہزار باغ لٹیں، پر خزاں یہ باغ نہ ہو
پسر کے غم میں پریشاں دل و دماغ نہ ہو
فلک بلا کا حشر کربلا پہ ٹوٹا ہے
مسافری میں برابر کا لال چھوٹا ہے

وہ لال جسکو نہ پہونچے کوئی در شہوار[ھ]
وحید عصر، شباہت میں احمدؐ مختار
ہمیشہ مثل علیؑ روزہ دار و شب بیدار
شجاع، و متقی، و خوش مزاج، و غیرت دار
یہ سب کمال سے ملے زیر خاک اک دن میں
تمام ہو گئے اٹھارہ سال کے سن میں

مطیع رب ہدا والدین کا محکوم
حیا و خلق و مروت میں سید معصوم
وغا میں حمزہؑ، جلالت میں ہاشم مرحوم
بتول پاک کا حسن، حسینؑ سا مظلوم
صحیفۂ رخ محبوب کردگار مٹا
نشان سارے بزرگوں کا ایکبار مٹا

جدا ہوئے ہیں عجب وقت دونوں عرش جناب
پدر کا عہد ضعیفی پسر کا سن شباب
یہ درد دل سے، وہ زخم جگر سے ہیں بیتاب
حسینؑ تشنۂ دیدار ہیں وہ تشنۂ آب

ھ یہ دو بند جلد مرزا صاحب میں دو مرثیوں میں مکرر طبع ہوئے ہیں۔ وقت انتخاب اس کتاب میں بھی سہواً

وہ راہوار پہ تھامے جگر تڑپتے ہیں
یہ دل کو پکڑے ہوئے خاک پر تڑپتے ہیں

لکھا ہی واابتا کی جو نہیں صدا آئی
حسینؑ امام کے چہرے پہ مردنی چھائی
وہ آہ کی، کہ ضریحِ رسولؐ تھرائی
روانہ ہو گئی اشکوں کے ساتھ بینائی

سوارِ دوشِ پیمبرؐ کی آس ٹوٹ گئی
عنانِ صبر تو تھامی، لگام چھوٹ گئی

قدم قدم پہ ٹھہرتے تھے شاہِ تشنہ گلو
ہوا میں سونگھتے تھے اپنے لال کی خوشبو
زمیں پہ بیٹھ کے گاہے بہاتے تھے آنسو
تلاش کرتے تھے ہاتھوں سے لاش کو ہر سو

جو کوئی پوچھتا تھا، کیا حضور ڈھونڈتے ہیں
تو رو کے کہتے تھے آنکھوں کا نور ڈھونڈتے ہیں

قریبِ فوج، جو سلطانِ بحر و بر آئے
پکارے ہنس کے عدو، خیر ہے کدھر آئے
یہ کون مر گیا، جو آپ ننگے سر آئے
پیادہ دھوپ میں تھامے ہوئے جگر آئے

یہ کون چاند ہوا آج دور آنکھوں سے
کہ چین دل سے گیا اور نور آنکھوں سے

کہا حسینؑ نے رو کر، تمھیں نہیں معلوم
[illegible]ے گھر میں ہے محشر، تمھیں نہیں معلوم
مٹی شبیہِ پیمبرؐ، تمھیں نہیں معلوم
چھٹا حسینؑ سے اکبرؑ، تمھیں نہیں معلوم

رولانے کو یہ امامِ امم[1] سے پوچھتے ہو

---

[1] شاید ناواقف معترض کو یہ لفظ کھٹکے کہ حضرت خود اپنے کو امامِ امم فرماتے ہیں۔ لیکن ایسے الفاظ اکثر مرثیہ گویوں نے بلا تکلف استعمال کیے ہیں۔ مثلاً امام حسینؑ کی زبان سے میر صاحب فرماتے ہیں ؎ سر دینے کو موجود امامِ دو جہاں ہے
بھیجو اُسے خنجر ہے کہاں شمر کہاں ہے (جلد ۳ صفحہ ۲۶)

چھُرے پھرا کے کلیجے پہ ہم سے پوچھتے ہو

تمہارے تیرِ جفا کا تو میں نشانا تھا
بھلا نبیؐ کے مرقع کو کیا مٹانا تھا
کہ فیضیاب زیارت سے سب زمانا تھا
جو نیزہ سینے پہ مارا تھا دل بچانا تھا
رکا کسی سے نہیں، جو ہوا سو خوب ہوا
بتاؤ، چاند ہمارا کہاں غروب ہوا؟

پدر کا گیسوؤں والا، کہاں ہے بتلاؤ
پھوپی کی گود کا پالا کہاں ہے بتلاؤ
حرم کے گھر کا اُجالا، کہاں ہے بتلاؤ
اور اُس کے سینے پہ بھالا کہاں ہے بتلاؤ
~~جگر پہ ملتے ہیں نیزے کہ دل ہمارے ہیں~~
تمام ہو گئے، یا منتظر ہمارے ہیں

یہ کون شخص ہے، کیا ہے نہ دیکھ بھال لیا
کلیجہ تاک کے بھالے کو بس سنبھال لیا
نبیؐ کے سارے عزیزوں کا دل نکال لیا
تمام گھر کا مرے اپنے سر وبال لیا
جو منہ کو پیٹتا ہوں میں تو منہ پھراتے ہو
یہ اور ظلم ہے لاشہ نہیں بتاتے ہو

پکارا شمر، کہ کوئی نہیں بتانے کا
بڑا ثواب ہے سادات کے رلانے کا
نہ زندہ چھوڑیں گے بچّہ بھی اس گھرانے کا
ارادہ ہے علی اصغرؑ کے خوں بہانے کا
جو تیر پار ہو ننھے گلے سے، عید کریں
تمہاری گود میں شش ماہے کو شہید کریں

نہ آپ دیکھیں گے لاشِ پسر تو کیا ہوگا
نکل پڑے گا جو منہ سے جگر، تو کیا ہوگا
لحد میں تڑپیں گے خیر البشرؐ، تو کیا ہوگا
جناب فاطمہؑ پیٹیں گی سر تو کیا ہوگا

پھرا ہے حاکمِ وقت آپ کے گھرانے سے
تمہارے واسطے رحم اُٹھ گیا زمانے سے

یہ سُنکے اُور طرف شاہِ حق شناس چلے
نہ تھا یہ ہوش کدھر آئے کسکے پاس چلے
کبھی حواس ہیں اور گاہ بیحواس چلے
پکارتے ہوئے ہر سو بحالِ یاس چلے
مرے جواں مرے عاشق مرے جگر بولو
کدھر سدھارے کہاں چھپ رہے پسر بولو

مرے غیور مرے کم سخن علی اکبرؑ
مرے غریب مرے بیوطن علی اکبرؑ
مرے دلیر مرے صف شکن علی اکبرؑ
مرے حسین مرے نازکبدن علی اکبرؑ
بڑے سعید ہوئے اور بڑے رشید ہوئے
پدر کے بدلے جوانی میں تم شہید ہوئے

جواب دو مرے پیارے کدھر گئے بولو
نہیں ہیں ہوش ہمارے کدھر گئے بولو
ہماری آنکھ کے تارے کدھر گئے بولو
پدر ہے گور کنارے کدھر گئے بولو
گلا نہ کیجو کہ مجھ تک پدر نہیں آتا
ہماری آنکھوں سے بیٹا نظر نہیں آتا

گئے جو زیرِ شجر اپنے گُل کی بو پائی
وہ شوق دیکھنے کا اور وہ ضعفِ بینائی
مگر نہ لاشِ پسر شاہ کو نظر آئی
تڑپ تڑپ کے گیا دل اور روح گھبرائی
جدھر سے آئی تھی بو اُسطرف کو جانے لگے
پسینہ آنے لگا پاؤں تھرتھرانے لگے

پکارے گر کے کدھر ہو کہاں ہو اے بیٹا
پسر نے ہاتھ اُٹھایا ادھر ادھر بابا

یہ حال قبلہ و کعبہ کا آہ کب سے ہوا | حسینؑ بولے تمہارا مزاج ہے کیسا

کہا پسر نے کوئی دم کی اور ایذا ہی
قدم حضور کے دیکھے، غلام اچھا ہی

یہ سُنکے جانب آواز شاہِ تشنہ چلے | قریب جاتے ہی، ملنے لگے پسر کے گلے
جبیں جبیں سے ملی، لب پسر کے لب سے ملے | اُٹھا کے سر کو رکھا ایک ہاتھ سر کے تلے

پکارے ہائے غضب چہرہ زرد ہوتا ہی
وہ بولا میرے کلیجے میں درد ہوتا ہی

وَداع ہوتے ہیں، جنّت کو جاتے ہیں بابا | یہ دیکھیے وہ پیمبر بُلاتے ہیں بابا
برہنہ سر، مرے دادا بھی آتے ہیں بابا | چچا حسنؑ بھی وہ تشریف لاتے ہیں بابا

جبیں پہ موت کا ٹھنڈا پسینہ آتا ہی
رگوں کے کھچنے سے جی سنسنایا جاتا ہی

یہ کہہ کے کلمے کی اُنگلی بلند کی ناگاہ | کہا کہ اشہد ان لا الہ الاّ اللہ
پھرا کے آنکھوں کو کی جانبِ حسینؑ نگاہ | حسینؑ رونے لگے اور پکارے واویلاہ

میں زندہ بیٹھا ہوں تم میرے آگے مرتے ہو
پدر کو کلمے کا اپنے گواہ کرتے ہو

سُن لی یہ صدا شاہ نے اکبرؑ کی جو ناگاہ | سر پیٹتے میداں کو چلے سیّدِ ذیجاہ
ہر ایک قدم گرتے تھے اور کہتے تھے یہ شاہ | اکبرؑ! نظر آتا نہیں اب کچھ مجھے واللہ

واللہ تری مرگ کے اندوہ و محن سے

نورآنکھوں سے جاتا رہا اور نہ دم باقی ہے

افسوس یہ تنہائی مری اور یہ ماتم
کس طرح سے پہونچوں ترے لاشے پہ میں اس دم

بے یار نہ غمخوار نہ مونس رہا ہے نہ ہمدم
میں روتا ہوں اور ہنستا ہی سب لشکرِ اظلم

کیا جانیے کس سمت کو میں جاتا ہوں رہ نہیں
آنکھوں میں بصارت ہے نہ طاقت ہی بدن میں

پھر دیکھ کے دریا کی طرف بادلِ پُرغم
عباسؑ اُٹھو، بیکس و بے یار ہوئے ہم

بھائی کے تصور میں یہ بولے شہِ عالم
دو چار قدم چلنے کی طاقت نہیں اس دم

ہے شور مرے خیمے میں فریاد و فغاں کا
تم لے چلو لاشہ مرے فرزند جواں کا

پھر مڑکے سوئے گنجِ شہیداں یہ پکارے
اکبرؑ تو ہمیں چھوڑ کے جنّت کو سدھارے

نوشاہ! تمہیں آؤ ذرا پاس ہمارے
اسوقت مرے جسم میں طاقت نہیں پیارے

کاندھے پہ دھرو لاشۂ ہمشکلِ نبیؐ کو
یہ چاند سی تصویر دکھا لاؤ پھپھی کو

مثال ۶ - حضرت علی اکبرؑ نزع کی حالت میں امام حسین علیہ السلام کو پکارتے ہیں اور وہ بدحواس قتل گاہ کی طرف جاتے ہیں۔ اسوقت کی اضطرابی حرکات اور باپ بیٹے کی گفتگو ٭

آواز سُنی بیٹے کی شہ نے جو قضا را
سر پیٹ کے ہاتوں نے گریباں کیا پارا

گھبرا گئے، باقی نہ رہا ضبط کا یارا
بیکس یاس کے عالم میں سوئے خیمہ پکارا

میداں میں ضائع مری دولت ہوئی زینب
ہے ہے علی اکبرؑ کی بھی رحلت ہوئی زینب

پھر اور یہ پُر درد صدا کان میں آئی
بیتاب ہوئے اور شہِ کرب و بلا ئی

یارب! مرے بابا نے کہاں دیر لگائی
آواز کی جانب کو چلا حق کا فدائی

کہتے تھے کہ اب صبر نہیں آتا ہے مجکو
کس درد سے بیٹا مرا چلاتا ہے مجکو

روتے ہوئے یہ کہہ کے چلے رن کی طرف کو
یوں پوچھتے تھے دیکھ کے جلادوں کی صف کو

آتا تھا نظر کچھ نہ پیمبرؐ کے خلف کو
کس خاک میں پوشیدہ کیا دُرِ نجف کو

للہ بتا دو علی اکبرؑ کو بتا دو
گر مر گئے ہوں جلد مجھے لاش دکھا دو

اس کلمے پہ منہ پھیر کے ہنسنے لگے اعدا
مڑ مڑ کے ہر اک سو یہ ندا دیتے تھے آقا

اور آگے بڑھے روتے ہوئے سیدِ والا
کس سمت ہو آواز سُناؤ مجھے بیٹا!

آنکھوں سے نہیں کچھ بھی نظر آتا ہے پیارے
ہر ایک قدم منہ کو جگر آتا ہے پیارے

قربان پدر اے مرے پیارے تو کدھر ہے
اے یثرب و بطحا کے ستارے تو کدھر ہے

اے نورِ نظر چاند ہمارے تو کدھر ہے
بابا ہے ترا گور کنارے تو کدھر ہے

مجبور ہوں اب صبر کا مقدور نہیں ہے
مر جائے تڑپ کر جو پدر دور نہیں ہے

اے مہ کہاں ہے وہ مرا گیسوؤں والا
اے چاند کدھر ہے وہ مرے گھر کا اُجالا

اے دشت ہی کس جا مری آغوش کا پالا
کس چاہ میں یوسفؑ کو مرے موت نے ڈالا

اے نہر بتا وہ دُرِ نایاب کہاں ہے
اے بادِ صبا وہ گُلِ شاداب کہاں ہے

جب کچھ نہ پتا لاشۂ فرزند کا پایا
دریا کی طرف لختِ دلِ فاطمہؑ آیا
واں بھائی کے لاشہ کو یہ رو رو کے سُنایا
عباسؑ! فلک نے ہمیں اکبرؑ سے چھڑایا

کھویا گیا ہمشکل پیمبرؐ نہیں ملتا
لاشا مجھے اکبرؑ کا برادر نہیں ملتا

بھیا ہمیں آنکھوں سے سُجھائی نہیں دیتا
کانوں سے بھی اسوقت سُنائی نہیں دیتا
تسکین ہمیں دردِ جُدائی نہیں دیتا
کیا سات بُرے وقت میں بھائی نہیں دیتا

کیا لیٹے ہو اُٹھّو بجھے مرنے سے بچا دو
لاشہ علی اکبرؑ کا تمھیں چلکے دکھا دو

تھرانے لگا لاشۂ سقائے حرم آہ
مقتل سے چلے دشت کی جانب شہِ ذیجاہ
گھوڑا علی اکبرؑ کا ملا راہ میں ناگاہ
روتے ہوئے شبیرؑ چلے گھوڑے کے ہمراہ

ناگاہ صدا آئی کہ شبیرؑ نہ آئے
در دا اجل آئی شہِ دلگیر نہ آئے

دوڑے سوئے آواز شہِ یثرب و بطحا
دکھلائے پدر کو نہ خدا بیٹے کا لاشا
فرزندِ جواں کو جو تڑپتے ہوئے دیکھا
بس ہائے پسر کہہ کے گرے خاک پہ مولا

اعدا میں ہوا غل کہ قضا کر گئے شبیرؑ
لو دیکھتے ہی لاشِ پسر مر گئے شبیرؑ

پھر رونے لگے لاشۂ فرزندِ حزیں پر
کس قہر کا صدمہ تھا شہِ عرش نشیں پر
اُٹھتے تھے کبھی، اور کبھی گرتے تھے زمیں پر
لب پر کبھی مُنہ رکھتے تھے اور گاہ جبیں پر
بیٹے کو جو ہر بار لگاتے تھے جگر سے
آلودہ تھا ملبوسِ بدن خونِ پسر سے

چلّاتے تھے اے نورِ نظر آنکھ تو کھولو
آیا ہے پدر خاک بسر، آنکھ تو کھولو
حاضر ہے یہ مظلوم پدر، آنکھ تو کھولو
جانا سوئے فردوس، مگر آنکھ تو کھولو
زخمی ہے جگر، سینے میں نیزے کی انی ہے
بتلاؤ مری جان، کہ کیا جی پہ بنی ہے

بولو مرے پیارے، مرے عاشق، مرے شیدا
مظلوم سے کس بات پہ تم روٹھے ہو بیٹا
ہاں آنے میں عرصہ ہوا، میں جلد نہ پہونچا
منصف ہو تمہیں اس میں ہے تقصیر مری کیا
آنکھوں میں نہ بینائی، نہ قابو میں جگر ہے
جس طرح یہاں آیا ہوں، خالق کو خبر ہے

یوں رن میں تڑپتے تھے جنابِ شہِ والا
اور خیمے میں رانڈوں کا جگر تھا تہ و بالا
ہر چند کہ زینبؑ نے بہت دل کو سنبھالا
پالے کی محبت نے مگر گھر سے نکالا
یوں گھر سے وہ سر پیٹتی باہر نکل آئی
جو قبر سے زہرا ابھی کھُلے سر نکل آئی

چلّاتی تھی سر پیٹ کے، اے گیسوؤں والے
اے نورِ نظر اے مری آنکھوں کے اُجالے
اے میرے بُرارماں، مری آغوش کے پالے
نکلی ہے پھوپی خیمے سے پاس اپنے بُلا لے
بے دیکھے ترے گھر کو نہ میں جاؤنگی پیارے

آواز سناؤ نہیں مرجاؤنگی پیارے

باقی مجھے اب ضبط کا یارا نہیں بیٹا
اب تیرے سوا کوئی سہارا نہیں بیٹا
زندہ کوئی فرزند ہمارا نہیں بیٹا
کیوں تم نے ہمیں مرکے پکارا نہیں بیٹا

تکرار میں رخصت کی خفا ہوگئے واری
اپنی پھوپی اماں سے جدا ہوگئے واری

منہ پھیر کے حضرت نے جو یہ حادثہ دیکھا
شانہ علی اکبرؑ کا ہلا کر ہوئے گویا
غیرت سے لرزنے لگا تخت دل زہراؑ
کیا غش میں ہو اٹھو کہ غضب ہوگیا بیٹا

برباد مری عزت و حرمت ہوئی اکبرؑ
ہمشیر نکل آئی قیامت ہوئی اکبرؑ

لاش کو خیمے میں لے آئے شہ جن و بشر
اور کہا ان کو مری گود میں دو اے سرور
تب لٹا نیکے لیے ماں نے بچھادی چادر
یہ تصدق ہوئے تم پر میں تصدق اکبر

سینے پر پالا ہے سینے پہ لٹالوں آقا
اپنے اس روٹھے مسافر کو منالوں آقا

اتنے میں سنا شہیداں نے لٹایا لاشہ
بین کرنے لگی اکبرؑ تمہیں ڈھونڈوں کس جا
گرد لاشے کے تڑپنے لگی مادر دکھیا
تجکو روؤں کہ جوانی کو تری اے بیٹا

لو خبر درد مرے دل میں اٹھا ہے پیارے
اس تڑپنے کی ترے پاس دوا ہے پیارے

مجکو برباد کیا کیا کہ کہیں کا نہ رکھا
پردہ رہ جائے ہوں پیوند زمیں میں دکھیا

موت تو میرے مقدر میں نہیں ہے بیٹا ۔۔۔ حیف دم میرا نہ نکلا، ترا لاشا دیکھا

ہم سے منہ موڑ کے تم خلد میں لدا رگئے
آپ کیا مرگئے ساتھ اپنے ہمیں مار گئے

دل امڈا ہی جاتا ہے کروں فکر میں کیا ۔۔۔ ہاتھ باندھوں میں ترے پاؤں پڑوں اے بیٹا
تم تسلی نہیں دیتے ہو جیوں خاک بھلا ۔۔۔ اتنا صدقے گئی تم کہدو کہ ہاں بولونگا

ورنہ ہو جائے گی کم قدر ہماری بیٹا
میں وہی پالنے والی ہوں تمہاری بیٹا

دل میں نیت نہ کرے پہلے سے انساں کوئی ۔۔۔ کیونکہ اُس قصد کی ہو جاتی ہے اُفتاد بُری
میں یہ کہتی تھی جواں ہو چکا ہمشکلِ نبیؐ ۔۔۔ بیاہ لاؤنگی دُلہن چاند سی اک دن اسکی

حیف پورے مرے دل کے نہ یہ ارمان ہوئے
بیاہ بھی ہونے نہ پایا تھا کہ بے جان ہوئے

میں یہ کہتی تھی کہ اکبرؑ مجھے دفنائیں گے ۔۔۔ رکھ کے تابوت مرا کاندھے پہ لیجائینگے
یہ نہ معلوم تھا پہلے ہی مرجائیں گے ۔۔۔ صدمۂ داغِ جوانی یہ مجھے دکھلائیں گے

ہائے یہ مرگئے میں اور ہی تدبیر میں تھی
انکے ہاتھوں کی نہ مٹی مری تقدیر میں تھی

کس خوشی سے تمہیں پہنائی تھی میں نے پوشاک ۔۔۔ اب وہی خون میں ہے غرق و آلودۂ خاک
دمبدم چومتی تھی میں یہ ترا سینۂ پاک ۔۔۔ اب وہاں نیزے کو پاتی ہے یہ بانوئے غمناک

اتنی طاقت نہیں جو اُٹھ کے کھڑے ہو بیٹا
تم کفن کے لیے محتاج پڑے ہو بیٹا

دیس بیگانہ ہے کچھ بس نہیں چلتا میرا — ورنہ میں اوڑھ کے چادر کو نکلتی بیٹا
کہتی ہر ایک مسلمان سے یہ اشک بہا — ایک سیدؔ ہی کفن کے لیے محتاج پڑا
اُسکے لاشے کو کفن دیکے جو گڑواؤگے
حشر میں اسکا صلہ فاطمہؑ سے پاؤگے
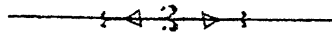
عزیز و بخیۂ زخمِ جگر نہیں ہوتا — کسی سے چارۂ داغِ پسر نہیں ہوتا
یہ درد وہ ہے کہ جانبر بشر نہیں ہوتا — ہزار صبر کرے کوئی، پر نہیں ہوتا
امامِ دیں سے برابر کا لعل چھٹتا ہے
جوانیِ علی اکبرؑ کا باغ لُٹتا ہے

تلف ہوئی جو شہِ خوش خصال کی دولت — عدو نے لوٹ لی اٹھارہ سال کی دولت
تباہ کی نبیؐ ذوالجلال کی دولت — ملا دی خاک میں زہراؑ کے لال کی دولت
نہ جان تن میں، نہ بینائی چشمِ تر میں رہی
کہ اب رسولؐ کی تصویر بھی نہ گھر میں رہی

وہ لعل جسکو نہ پہونچے کوئی دُرِ شہوار — وحیدِ عصر، شباہت میں احمدِ مختار
ہمیشہ مثلِ علیؑ روزہ دار و شب بیدار — شجاع و متقی و خوش مزاج و غیرت دار
دعائیں پوتے کی ماں کا ہر ایک سال کٹا
ثمر کی فصل جب آئی تو یہ نہال کٹا

جدا ہوئے ہیں عجب وقت دونوں عرش جناب — پدر کا عہدِ ضعیفی، پسر کا سنِ شباب
یہ دردِ دل سے وہ زخمِ جگر سے ہیں بیتاب — حسینؑ تشنۂ دیدار ہیں وہ تشنۂ آب

وہ راہوار پہ تھامے جگر تڑپتے ہیں
یہ دل کو پکڑے ہوئے خاک پر تڑپتے ہیں

مرقعِ نبوی موت نے مٹایا ہے
چراغ شہ کا بجھایا ہی دل جلایا ہے
فلک نے خاک پہ خورشید کو گرایا ہے
قضا نے خاک میں دُرِّ نجف ملایا ہے

قلم عدو نے عرب اور عجم کا باغ کیا
مدینے اور مدائن کو بے چراغ کیا

وہ شمع گل ہوئی جس سے کہ نام روشن تھا
دلِ حسینؑ علیہ السلام روشن تھا
نبیؐ کی آل کا گھر صبح و شام روشن تھا
مدینہ کیا کہ زمانہ تمام روشن تھا

نصیب بانوؑ کے دل کو جگر کا داغ ہوا
پکارتی تھی کہ ٹھنڈا مرا چراغ ہوا

کہو امام سے مقتل کچھ ایسا دور نہیں
حسینؑ کہتے تھے آنکھوں میں میری نور نہیں
پسر کو ڈھونڈتے کیوں سیدِ غیور نہیں
خدا گواہ ہے بانوؑ مرا قصور نہیں

جو دل کا حال ہے اسدم سُنا نہیں سکتا
پسر بلاتا ہے، اور باپ جا نہیں سکتا

یہ کہہ کے پاؤں جو بیساختہ بڑھانے لگے
حضورِ فوجِ ستم جا کے پھر سُنانے لگے
گرے زمین پہ تھرّا کے اور غش آنے لگے
بتاؤ جیتے ہیں اکبرؑ دہا ڑھکانے لگے

جگر پہ مارے ہیں نیزے کہ دل پہ پارے ہیں
تمام ہو گئے، یا منتظر ہمارے ہیں

سنبھالتا ہوں بہت، دل نہیں سنبھلتا ہے
جگر کو ہاتوں سے رہ رہ کے کوئی ملتا ہے

بتاؤ جلد کدھر وہ لہو اُگلتا ہے | کہ اب تو منہ سے کلیجہ مرا نکلتا ہے

جگر کی چوٹ سے بیدل ہوں بیقرار ہوں میں
لعینو رحم کا تم سے امیدوار ہوں میں

ہزار درد کی تقریر لب پہ لاتے تھے | پہ دل ہیں سنگدلوں کے اثر نہ پاتے تھے
مدد کے واسطے عباسؑ کو بُلاتے تھے | ہر ایک سمت سراسیمہ ہو کے جاتے تھے

پکارتے تھے کدھر ہو جواب دو اکبرؑ
تباہ پھرتا ہے بابا پکار لو اکبرؑ

یہ جاں نثار تو حاضر تھا تم بُلا لیتے | نثار ہوتے، بلا سے تمہیں بچا لیتے
تمہارے بدلے سناں ہم جگر پہ کھا لیتے | غش آتا پیارے کو، تو گود میں اُٹھا لیتے

غضب ہے سینے سے برچھی دمِ دغا گذری
جگر پہ اے مرے نازک مزاج کیا گذری

یہ سُنکے شاہ چلے اُس طرف بحالِ تباہ | عقاب لاش لیئے آیا ۔ وبروئے نگاہ
حسینؑ بیٹے سے لپٹے تو بولا وہ ذیجاہ | غلام صدقہ ہو، خیمے میں لیچلو یا شاہ

پھوپی کو دیکھ لیں قدموں پہ سر کو چُھڑا لیں
جناب والدہ صاحب سے دودھ بخشا لیں

حسینؑ بولے چلو میری جان بسم اللہ | پھوپی بھی بہنیں بھی ماں بھی تڑپتی ہیں ہمراہ
درِ خیام پہ لاشہ لیئے جو پہنچے شاہ | پکاری بانوؑ کہ رستہ دو بیبیو للہ

بتولؑ بال کھُلے ساتھ ساتھ آتی ہے
علیؑ کے پوتے کی رن سے برات آتی ہے

بچھاؤ مسندِ محبوبِ کبریا لوگو ! — بٹھاؤ دولہ کو آرام سے ذرا لوگو
میں ہاتھ باندھتی ہوں اوڑھ لو ردا لوگو — کہیں گھر آتے ہی اکبرؑ نہو خفا لوگو
امامِ جن و ملک اُسکو جا کے لائے ہیں
یہ مجھ سے رُوٹھے تھے حضرت منا کے لائے ہیں

سنبھالا بیبیوں نے لاشۂ علی اکبرؑ — کسی نے پاؤں کسی نے کمر کسی نے سر
لٹایا مسندِ خیر الانام پر لا کر — یہ حال دیکھ کے پہلو میں گر پڑی مادر
نہ غیرتِ پسرِ مہ لقا کا ہوش رہا
نہ سر کا ہوش رہا نے ردا کا ہوش رہا

ہلا کے ہونٹوں کو اکبرؑ نے کچھ پھوپی سے کہا — پھرا کے منہ کو بہت روئی دخترِ زہراؑ
کہا یہ بانوؑ سے رو کر کچھ آپ نے بھی سنا — مزاج داں ہو تم اکبرؑ کی سارے گھر سے سوا
نہ جان بوجھ کے غصہ دلاؤ اکبرؑ کو
اشارہ کرتا ہے اکبرؑ کہ ڈھانپ لو سر کو

عالمِ نزع

یہ گفتگو تھی کہ دم توڑنے لگے اکبرؑ — کہا یہ بانوؑ نے زینبؑ سے دیکھئے تو ادہر
یہ سانس لیتے ہیں کیوں جلد جلد گھبرا کر — یہ آنسو آنکھ سے کیسے بہے ہیں عارض پر
سران کا تکیے سے کیوں خود سرک گیا ہی
مجھے گماں ہی کہ منکا ڈھلک گیا ہی

رگوں کے کھنچنے سے لونڈی کا دل دھڑکتا ہی — پھرا کے پتلیاں قبلے کو کیوں یہ تکتا ہی
یہ کیا سبب ہے کہ تالو بہت لپکتا ہی — اور ایک بال پلک کا نہیں جھپکتا ہی
جگر سے ہاتھ اُٹھا کر جبیں پہ دھرتے ہیں

گذر ہوا ہے علیؑ کا سلام کرتے ہیں

یہ دیکھتی تھی کہ جو رہ گیا بدن ہل کر
لپٹ کے لاش سے چلائی بانوئے مضطر

پکاری پلٹ کے زینبؑ کہ چل بسے اکبرؑ
تباہ کر گئے بانوؑ کو آہ اے دلبر

ابھی تو آنکھ سے اپنی نظارہ کرتے تھے
ردا اُٹھانے کا مجھ سے اشارہ کرتے تھے

اہل حرم کے بین

ہتیار پسر کے تنِ مجروح کے سارے
سر رکھ دیا تکیے پہ اور اُٹھ کر یہ پکارے

اُس لاش کے گرد آپ نے مسند پہ اُتارے
لو بی بیو بیٹو علی اکبرؑ گئے مارے

اک حشر ہوا، سینوں میں دل رہ گئے پھٹ کر
ماں نے یہ پڑھا مرثیہ، لاشے سے لپٹ کر

ہی ہی مرا بن بیاہا مرا گیسوؤں والا
ہی ہی مری فاقوں کی کمائی مرا پالا

ہی ہی مرا خورشید مرے گھر کا اُجالا
ہی ہی مرا محبوب، حبیبِ شہِ والا

میں مر گئی برباد جوانی ہوئی اس کی
ہی ہی مرے یوسفؑ کو نظر کھا گئی کس کی

ہی ہی کسی قاتل نے تری قدر نہ جانی
ہونے نہ دیا چاند تمہیں لے مرے جانی

ہی ہی ابھی تھے تم تو ہلال احمدِ ثانی
ہی ہی مرے پیارے ترے ہاتھ آیا نہ پانی

اماں ترے اس روئے کتابی کے تصدق
اماں تری دستارِ گلابی کے تصدق

ہی ہی مرے پیارے کی مسین خون سے بھیگیں
ہی ہی نہ جنازہ نہ نماز اور نہ تلقیں

ہی ہی مرے بن بیاہے کا جوڑا ہلو انگیں
لے گور نہ تابوت نہ تجہیز نہ تکفیں

پڑھتے تھے درود اہلِ نظر تجھپہ وطن میں
سو فاتحہ بھی اب ترا ہوئیگا نہ رن میں

یہانتک انسانی جذبات و احساسات کی وہ مثالیں ختم ہو چکیں جس قسم کی قابل مولف نے میر صاحب مرحوم کے کلام سے دی تھیں۔ انکے علاوہ مرزا صاحب مرحوم کے کلام میں اور بھی چند ایسی نادر مثالیں ہماری نظر سے گذری ہیں جن میں انتہا درجہ کا یاس و قلق بھرا ہوا ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ دو چار جدید مثالیں دیگر چند درد و الم کے مرقعے اور بھی ناظرین کے سامنے پیش کر دیں۔

مثال ۹۔ امام حسینؑ کا نانا کی قبر سے رخصت ہونا

جب کوچ کی شب قبرِ نبیؐ پر گئے شبیرؑ
قندیلیں جو روشن کیں تو غش کر گئے شبیرؑ

رخصت کو مع آلِ پیمبرؐ گئے شبیرؑ
زینبؑ نے یہ جانا کہ ہیں مر گئے شبیرؑ

تھی غش میں ندا، ہم ہی حسرت میں مرینگے
اب روشنی اس قبر پہ کاہے کو کرینگے

اے نانا کے روضے، مرا گھر ہوتا ہی ویراں
کل صبح مری منزلِ آخر کا ہی ساماں

اے قبرِ حسینؑ آج کی شب ہے ترا مہماں
کل روح مرے نانا کی ہوئیگی پریشاں

اے قبر میں دکھ پاؤنگا پردیس میں جا کر

تو شق ہو تو نانا سے لپٹ جاؤں میں آکر

اے قبر میں کیسا ترے صاحب کا ہوں پیارا
اب خنجر جلاد ہے اور سینہ ہمارا

سجدے میں مجھے پشت سے اپنی نہ اُتارا
سُنیو کہ مجاور ترا پیاسا گیا مارا

تیری تو ملاقات کی یہ رات ہے باقی
پھر خنجر و گردن کی ملاقات ہے باقی

پانی ہو وہ شے پیتے ہیں سب مومن و کافر
دنیا سے کفن لیتے ہیں عقبےٰ کے مسافر

پر قحط اسی پانی کا ہو گا مری خاطر
لیکن نہ کفن پائے گا ترا یہ مجاور

کس شخص کو مرقد پس مردن نہ ملے گا
اے قبر پیمبرؐ ہمیں مدفن نہ ملے گا

مثال ۱۰۔ حضرت عباسؑ فوج میں گھر گئے ہیں امام حسینؑ اُنکے واسطے دعا کرتے ہیں

یاں حال یہ تھا غش تھے اُدھر سبط پیمبرؐ
فرماتے تھے، بیکس ہوں میں اے خالق اکبر

سر سجدے میں تھا، ہاتھوں پہ عمامہ اطہر
کر رحم بچھڑتا ہے برادر سے برادر

عالم ہی عجب سینۂ سوزاں میں نفس کا
ساتھ آج چھٹا جاتا ہے اکتیس برس کا

غمخوار جگر بند پیمبرؐ نہیں کوئی
اس بیکس و محتاج کا یاور نہیں کوئی

ہمدرد دل حیدر صفدر نہیں کوئی
اب اس کے سوا اور برادر نہیں کوئی

تلوار و نیسے اس گیسوؤں والے کو بچانا
یارب! مری آغوش کے پالے کو بچانا

مثال ۱۱- حضرت قاسمؑ کی وفات پر امام حسینؑ کی آہ و زاری اور اہلِ حرم کا اضطراب

لاشے سے لپٹ کر شہِ مظلوم پکارے — کیا سوتے ہو اُٹھو مرے پیارے مرے پیارے
کرتے نہیں اب نرگسی آنکھوں سے اشارے — مُرجھا گئے یہ پھول سے لب پیاس کے مارے
دیکھا کیے ہم، حشر کا ساماں ہوا بیٹا
پامال ترا لاشۂ بے جاں ہوا بیٹا

ہے ہے مرے جرّار مرے شیرِ دلاور — اے میرے بہادر مرے غازی مرے صفدر
اے میرے کلیجے، مری آنکھیں مرے دلبر — قربان تری لاش کے میں بیکس و مضطر
دنیا سے پُر ارماں سفر کر گئے بیٹا
باتیں بھی نہ شبیرؑ سے کیں مر گئے بیٹا

تھا آلِ محمدؐ میں عجب طرح کا ماتم — پکڑے ہوئے ماں کوکھ کو چلاتی تھی پیہم
آنسو نہیں تھمتے تھے، یہ تھا بچوں کا عالم — سر پیٹتے تھے ننھے سے ہاتوں سے بصد غم
بھائی کے قلق میں جو نہ خواہر کو کل آئی
قاسمؑ کی بہن خیمے سے باہر نکل آئی

سر پیٹ کے ہاتوں سے یہ کہتی تھی وہ مضطر — ہے ہے مرا ماں جایا مرا شیر دلاور
اب ضبط کا یارا نہیں، قابو نہیں دل پر — ملنے کے لیے بھائی سے نکلی ہوں کھلے سر
مجھ بیکس و مضطر پہ یہ احساں کرو لوگو
لیچل کے مجھے لاش پہ قرباں کرو لوگو
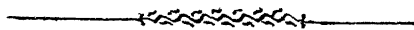
مثال ۱۲۱ - امام حسینؑ ذبح ہوتے ہیں اور جناب زینبؑ یہ قیامت خیز نظارہ دیکھ رہی ہیں اُسوقت بہن کی مضطربانہ اور مایوسانہ حالت اور شمر سے منت و زاری کی دردانگیز تصویر۔

جس دم نگین خاتمِ پیغمبراں گرا
گرنے پہ سب گروہ لیے برچھیاں گرا
رونق اُٹھی زمیں سے، امامِ زماں گرا
ہی ہی! نہ اِن جفاؤں پہ بھی آسماں گرا

زہراؑ سے پوچھیے یہ قلق نورِ عین کا
تپنا زمیں کا، اور وہ تڑپنا حسینؑ کا

لکھا ہی جبکہ غش ہوئے مولائے حق شناس
وہ بیکسی، وہ درد، وہ اندوہ، وہ ہراس،
آئی عزیز مُردہ بہن شاہِ دیں کے پاس
قابو نہ کچھ مدد کا، نہ فریاد کے حواس

کچھ بس نہ تھا کہ بھائی کے بدلے نثار ہو
پوچھو یہ درد اُس سے جو بے اختیار ہو

آگے ہے وہ مقام کہ غش ہونگے مومنیں
گردنؐ پہ تیغ، دل میں سناں، سینے پر لعیں
وہ سامنے حسینؑ ہی وہ زینبؑ حزیں
زینبؑ یہ حال دیکھتی ہی اور بس نہیں!!

نامحرموں کا دھیان نہ پردے کا ہوش ہی
یہ سب لہو کا جوش ہی، الفت کا جوش ہی

وہ رونا بیکسی کا، وہ گھبرانا یاس کا
کہنا بلک بلک کے یہ کلمہ ہراس کا
وہ تھرتھرانا دل کا وہ اُڑنا حواس کا
اے شمر واسطہ علی اصغرؑ کی پیاس کا

للہ تین روز کے پیاسے کو چھوڑ دے
صدقہ نبیؐ کا اُن کے نواسے کو چھوڑ دے

پھر رو کے بولی اُس قلق و اضطرار میں
اے شمر دل نہیں ہے مرا اختیار میں

باہر نکل پڑی ہوں میں بھائی کے پیار میں
یہ ایک تن ہے پنجتنؑ نامدار میں
تھم جا، دعائیں دینگے سب اہلِ حرم تجھے
تو جسکو مانتا ہے اُسی کی قسم تجھے

تھم جا، خدا کو مان حبیبِ خدا کو مان
زہراؑ کو مان حضرتِ مشکل کشا کو مان
سوگندِ فقر و فاقۂ آلِ عبا کو مان
اپنی رسول زادی کی تو التجا کو مان
سارے بزرگ مر گئے مجھ بدنصیب کے
میرا کوئی نہیں ہے سوا اس غریب کے

اب ہم نہ بھائی کو نہ ہمیں بھائی پائینگے
اب واں سدھارتے ہیں جہاں سے نہ آئینگے
ہم ننگے سر پھرینگے، نہ چادر اوڑھ لینگے
ہاں نیزے پر تڑپ کے یہ آنسو بہائینگے
للہ دیکھ پیاس سے حضرت کا دیکھنا
دل ٹکڑے کر رہا ہے یہ حسرت کا دیکھنا

اے[۱] شمر! پاس بھائی کے آؤں جو تو کہے
زخموں سے جلتی ریت چھڑاؤں جو تو کہے
چادر بدن کے نیچے بچھاؤں جو تو کہے
بیکل ہے سر زمیں سے اُٹھاؤں جو تو کہے
پانی تو یاں ملے گا نہ زہراؑ کی جائی کو
آنسو چھڑک کے ہوش میں لاؤں گی بھائی کو

[۱] جناب زینبؑ کے اس استغاثہ سے عجب حسرت اور بیکسی ٹپک رہی ہے۔ اور فاضل شاعر نے جوشِ الفت اور فرطِ محبت کی عجب حسرت ناک اور مضطربانہ کیفیت دکھائی ہے۔ حضرت زینبؑ خوب جانتی ہیں کہ شمرِ جفاکار نے تمام کُنبہ کا خاتمہ کر دیا اور اب امام حسینؑ کے قتل کے درپے ہے، اور ایسے سنگدل سے ہرگز رحم کی امید نہیں، باایںہمہ باوجود قطعی ناامیدی کے اُس سے التجا کرنا ایک سخت مجبوری اور بیحد مایوسی ظاہر کرتا ہے۔

سونپا کسے بہن کو یہ پوچھونگی بھائی سے | پردیس میں بچھڑتے ہیں زہرا کی جائی سے
یہ بے خطا ہی پوچھ لے ساری خدائی سے | دعوی ہی کیا بے تجھے مری ماں کی کمائی سے

کچھ قرض ہو تو بیچ کے گھر کو ادا کروں
سمجھاؤں کس طرح سے تجھے، آہ کیا کروں؟[1]

اے شمر میں گلے سے لگا لوں تو ذبح کر | کچھ درد اپنے دل کا سنا لوں تو ذبح کر
سید کو قبلہ رو میں لٹا لوں تو ذبح کر | بھائی سے ملکے خیمے میں جا لوں تو ذبح کر

پانی نہ بھوکے پیاسے کو اے بدخصال دے
پر وقت ذبح آنکھوں پہ کپڑا تو ڈال دے

مثال ۱۳۔ امام علیہ السلام کی شہادت کے وقت حضرت زینبؑ کی بیقرار حالت کا اظہار۔ شہدا کو مدد کے واسطے بلانا۔ ۵

زینبؑ کا جگر ہل گیا گر کر یہ پکاری | آؤ علی اکبرؑ میں تمھارے گئی واری
بھائی موئے نکلی ہی پھوپی گھر سے تمھاری | ہے ہے مرا ماں جایا، مرا عاشق باری

مر جاؤنگی حسرت میں ہیں پاؤں رگڑ کر
تم لاش پہ لیجاؤ مرا ہاتھ پکڑ کر

عباسؑ کدھر ہو، ادھر آؤ ادھر آؤ | قاسمؑ! مجھے بچھڑے ہوئے بھائی سے ملاؤ

[1] ٹیپ کا آخری مصرع (سمجھاؤں کس طرح سے تجھے آہ کیا کروں) اپنے اثر بیان سے جگر و دل کو مجروح کر دیتا ہی۔ غور کرو کسقدر مجبوری اور مایوسی ہی۔ یہ خیال ہوتا ہی کہ شمر لعین کی شقاوت اس درجہ بڑھی ہوئی تھی کہ بنت شیر خدا اُسکو کسی طرح سمجھا نہیں سکتیں اس لیے مجبور ہو کر فرماتی ہیں "آہ کیا کروں"

اے عونؑ و محمدؑ تمہیں رستے سے لگاؤ
شبیرؑ کے لاشے کے مجھے گرد پھراؤ
لا لا کے خبر دیتے تھے تم فوجِ عمر کی
ماموں پہ چھُری چل گئی مجکو نہ خبر کی

دھڑکا یہ ہی کہ ذبح نہ ہو جائیں شاہِ دیں
واں لڑکھڑائیں، اور یہاں منہ کے بل گریں
چلتی ہیں جلد اور زمیں سوجھتی نہیں
آنکھیں کہیں، خیال کہیں ۔ اور دل کہیں
بو سونگتی ہیں، خون کے تھلے جو ملتے ہیں
دل کی طرح سے کان کے بُندے بھی ہلتے ہیں

تا حشر وہ نہ بھولے گی زینبؑ خدا گواہ
اک آنکھ بند کرتے تھے اک کھولتے تھے شاہؑ
جس شکل سے حسینؑ ملے وا مصیبتا!
پھیلا تھا ایک پاؤں تو سمٹا تھا ایک آہ
کچھ سر پہ کچھ زمیں پہ گلابی عمامہ تھا
آلودہ خاک و خوں میں پیمبرؐ کا جامہ تھا

لگتا ہی جب جگر پہ لگا تھا یہ تیر آہ
چلائی، ہائے کیا ہوئی مظلوم کی سپاہ
زینبؑ کھڑی تھی ڈیوڑھی پہ با حالتِ تباہ
ہے ہے تڑپ رہے ہیں امامِ فلک پناہ!!
عباسؑ آکے تھام لے، اکبرؑ سنبھال لے
کوئی جگر سے تیرِ سہ پہلو نکال لے

ناگہ امامِ پاک گرے خاکِ پاک پر
چلّو کو رکھا زیرِ جراحت جھکا کے سر
کھینچا جو تیر سینے سے تڑپے دل و جگر
جب بھر چکا لہو سے تو کی ریشِ پاک تر

پوچھا جو ظالموں نے کہا یہ زبان سے
فردوس میں ملونگا یوں ہی نانا جان سے

آیا جو شمر بولے پیمبرؐ لعیں ٹھہر
اوروں سے اسکو پوچھ لے گر تو ہی بیخبر
سہواً یہ ظلم کرتا ہے تو یا کہ جان کر
ہے ہے یہ کس غریب کا تو کاٹتا ہی سر؟
ہاں ہاں یہ میری فاطمہؓ کا نورِ عین ہی
یہ میرے دل کا چین ہی، میرا حسینؑ ہی

بس بس یہ بے گناہ ہی یہ بے گناہ ہی
مونہ کے نیچے گنجِ علومِ الٰہ ہے
خالق گواہ مخبرِ صادق گواہ ہی
خنجر جہاں رکھا ہے مری بوسہ گاہ ہے
تو حلق کاٹتا ہے وہ کہتا ہی پیاس ہے
کیوں بے لحاظ کیا ہی مہماں کا پاس ہے

لے تو ہی کہہ نہیں یہ پیمبرؐ کا پیارا ہے
امت نے کس نبیؐ کے نواسے کو مارا ہے
کُل حق کی کائنات میں یہ اک ستارا ہے
اسکو نہ ذبح کر یہ نواسا ہمارا ہے
دیتے ہیں پانی نزع میں یٰسین پڑھتے ہیں
مذہب میں تیرے سینۂ زخمی پہ چڑھتے ہیں

مثال ۱۴ - حضرت امام حسینؑ کے گھوڑے کا خیمے میں آنا اور اہلحرم کے بین

ماتم سرا کی ڈیوڑھی پہ پہنچا جو راہوار
زینبؑ ہلا کے شانہ کو چلائی ایک بار
غش میں پڑی ہوئی تھی سکینہؑ جگر فگار
لو اُٹھو آئے بی بی کے بابا پھوپی نثار
سُن لو صدا سمندِ شہِ مشرقین کی

واری گئی کھڑی ہے سواری حسینؑ کی

اٹھی یہ مژدہ سنکے سکینہؑ خوشی خوشی
بولی کہ آپ بھی مرے ساتھ آیئے پھوپی
فرمائیو پدر سے سفارش مری ذری
اب کے نہ چھوڑ جائیں مجھے نائب علیؑ
بچپن پہ حق نے مہر کیا میرے دن پھرے
شکر خدا کہ رن سے شہِ انس و جن پھرے

مجرا کرونگی قدموں پہ رکھدوں گی اپنا سر
اور التجا کروں گی میں ہاتوں کو جوڑ کر
لونڈی کی پیاس کو ہی یہ چوبیسواں پہر
اور ابتلک حضور کو ہے یہ نہیں خبر
کنبہ ہیں قدر آپ کے لطف و کرم سے ہے
میری تو زیست قبلہ و کعبہ کے دم سے ہے

کہکر یہ بات در پہ جو آئی وہ خستہ جاں
دیکھا کہ گھوڑے پر نہیں سلطانِ دو جہاں
باگیں کٹی ہیں زین ہے سارا لہولہان
چشمِ رکاب سے بھی زمیں پر ہے خوں رواں
شادی تھی جسکے آنے کی ہی وہی نہیں
مرکب تو ہی یہ راکب دوشِ نبیؐ نہیں

بیساختہ تڑپ کے سکینہؑ نے کی فغاں
خالی ہے زین اے پھوپی اماں پدر کہاں
بیکس یتیم ہو گئی ہے میں خستہ جاں
بی بی شہید رن میں ہوئے شاہِ دو جہاں
چوتھے برس نصیب نے بیکس کیا مجھے
بچپن میں ہائے داغِ یتیمی دیا مجھے

اب دمبدم گلے سے لگائیگا ہائے کون
بچپن کے میرے ناز اٹھائیگا ہائے کون
کہہ کر سکینہؑ جان بلائیگا ہائے کون
روٹھونگی کس سے اور منائیگا ہائے کون

غربت میں جان دی مرے بابا امام نے
میں بے نصیب مر نہ گئی اُن کے سامنے

بیساختہ پھر اگلے سموں سے لپٹ گئی
اے ذوالجناح کیا مری قسمت اُلٹ گئی؟
رو کر پکاری ۔ ننھی سی چھاتی جو پھٹ گئی
گردن ترے سوار کی خنجر سے کٹ گئی

نانا کے گھوڑے کہہ مرے بابا کو کیا کیا
آرام جانِ فاطمۂ زہرا کو کیا کیا

تھا عہد سے نبیؐ کے تو پیارا حسینؑ کو
بتلا کہاں زمیں پہ اُتارا حسینؑ کو
تنہائی میں ترا تھا سہارا حسینؑ کو
زندہ ہیں یا کہ شمر نے مارا حسینؑ کو

بچپن میں آسرا مرا توڑا غضب کیا!
نو لاکھ میں سوار کو چھوڑا غضب کیا!!

آنسو بہا کے زینبؑ مضطر سے پھر کہا
سچ مچ یتیم ہو گئی میں غم کی مبتلا
کیا ذہن میں حضور کے آتا ہے، میں فدا
شبیرؑ کے گلے پہ پھرا خنجرِ جفا

زینبؑ پکاری ہاں ترا بابا ہوا شہید
پیغمبرِ خدا کا نواسا ہوا شہید

دنیا سے تیرا چاہنے والا گذر گیا
پانی تھا ماں کا مہر، وہ پیاسا گذر گیا
بابا کی لاڈلی! ترا بابا گذر گیا
اس کربلا میں ہم پہ بھی کیا کیا گذر گیا

ستّر دو تن تمام ہوئے بھائی چھٹ گئے
آلِ نبیؐ اُجڑ گئے سادات لُٹ گئے

بے وارثوں کا مونس وغمخوار مر گیا
رانڈوں کا بیکسوں کا مددگار مر گیا

پڑ دا تھا جس کے دم سے وہ سردار مرگیا
سب مومنوں کا قافلہ سالار مرگیا

برباد احمدِ عربی کا چمن ہوا
قربان جاؤں، خاتمۂ پنجتنؑ ہوا

دشتِ بلا میں مرگیا زہرؑا کا لاڈلا
تن سے جدا ہوا سرِ اقدس حسینؑ کا
پانی کی طرح خاک پہ پیاسے کا خوں بہا
ہے ہے جہازِ آلِ پیمبرؐ کا ناخدا

لاشے پہ بال کھول کے ماتم بپا کرو
واری حقوقِ شاہِ شہیداں ادا کرو

زینبؑ نے پیٹ کر جو سکینہؑ سے یہ کہا
ماتم سرا سے ہائے حسینا کا غل اُٹھا
سیدانیاں تڑپنے لگیں گر کے جا بجا
گھر میں شفیعِ حشر کے محشر بپا ہوا

وارث کے غم سے منہ جو حرم ڈھانپنے لگے
طوبیٰ و سدرہ لوح و قلم کانپنے لگے

رو کر سکینہؑ کہتی تھی بابا حسینؑ ہائے
چلا رہی تھی دخترِ زہرؑا حسینؑ ہائے
زہرؑا کی یہ فغاں تھی کہ بیٹا حسینؑ ہائے
بانو پکارتی تھی کہ آقا حسینؑ ہائے

سونپا کسے حضور نے اس واردات میں
لونڈی کا ہاتھ تم نے دیا کس کے ہات میں

آنکھوں کے آگے قتل ہوئے اکبرؑ جواں
بے شیر کھا کے تیر سدھارے سوئے جناں
والی کے سوکھے حلق پہ خنجر ہوا رواں
اب قبر کے سوا ہے ٹھکانا مرا کہاں

ایراں سے نکلی، شاہِ مدینہ سے چھٹ گئی
میکہ مرا اُجڑ گیا سسرال لٹ گئی

سب رنج ہوں، مگر نہ رنڈاپے کا ہو تعب
در پیش مجکو ہائے یہی حادثہ ہے اب
شوہر کی موت سامنے عورت کے ہے غضب!
تم تشنہ لب شہید ہوئے میں ہوں جاں بلب

کیونکر نہ بارِ غم سے کمر اُس کی ٹوٹ جائے
جو خادمہ بڑھاپے میں آقا سے چھوٹ جائے

دو بچوں کے سوا مری دولت تھی اور کیا
بیجان ایک تیر سے اک نیزے سے ہوا
آنکھوں کے آگے لے گئی وہ لوٹ کر قضا
وارث کی آس تھی سو گلا اُس کا بھی کٹا

پانی ہے بند، خونِ جگر کب سے پیتی ہوں
اب ہائے کس جفا کے اُٹھانے کو جیتی ہوں

لوٹیں گے یا جلائیں گے اب گھر کو اشقیا
ماتم کی صف بچھے گی تو کون آکے روئیگا
والی! کہاں ہیں آپ کا ماتم کروں بپا
ہمسایہ دُور، کُنبہ مصیبت میں مبتلا

صاحب! تمہاری بیوہ کا پرساں نہیں کوئی
رونا یہ ہے کہ سوگ کا ساماں نہیں کوئی

مثال ۱۵- شمر سے اور جناب عباس علیہ السلام کی ماں سے کچھ دور کی قرابت پائی جاتی تھی۔ اعدائے دین تاراجیِ خیام کو آئے تو اس شقی کو کچھ غیرت آئی اور کہا کہ میں عباسؑ کی زوجہ کو ہرگز لوٹنے نہ دونگا۔ چنانچہ وہ ان کو اہلِ حرم سے علیحدہ کرنا چاہتا ہے۔ اس مضمون کو اور نیز اُسوقت اہلِ حرم کی جو حسرتناک حالت تھی اُسکو کس دردانگیز پیرایہ سے ادا کرتے ہیں۔ جس سے انسانی جذبات کی ہوبہو تصویر کھچ جاتی ہے۔

یہ کہہ کے درِ خیمہ پہ چلّایا وہ بے پیر
اے بیوۂ عباسؑ علیؑ صاحبِ توقیر

اب ہوئیگی سر ننگے یہ سب عترتِ شبیرؑ — اور حضرتِ زہراؑ کی بہو ہوئیگی تشہیر

پر تم مری خواہر کی بہو ہو یہ ادب ہے
تشہیر جو تم ہو سرِ بازار غضب ہے

عباسؑ سے مشہور قرابت ہی ہماری — یاں بعدِ عمر آج حکومت ہی ہماری
در در جو پھرو تم تو حقارت ہی ہماری — سب قوم میں سب کنبے میں ذلّت ہی ہماری

کچھ کہنا ہے سُن جاؤ خدارا نہ ڈرو تم
پردے تلک اب جلد قدم رنجہ کرو تم

سُن لی یہ صدا زینبِ بیکس نے قضارا — بیساختہ عباسؑ کی زوجہ کو پکارا
لو بھابی بنا شمر طرفدار تمہارا — اچھا تو ہے اسوقت کرو ہم سے کنارا

وارث نہیں بے وارثوں پر دیکھیے کیا ہو
دُکھ سے جو تمھیں چین ملے ہم سے جُدا ہو

پھر بھر کے دمِ سرد یہ بانوؑ نے کہی بات — ہاں بھابی لُٹو کاہیکو بے وارثوں کے سات
برگشتہ نصیبوں سے کرو ترکِ ملاقات — کُنبے کی محبت میں نہ ہو موردِ آفات

یہ دشمنِ دیں باندھیں گے اب ہاتھ ہمارے
کیا فائدہ جو قید ہو تم ساتھ ہمارے

مجھ میں تو نہیں ہوش تمھیں بچوں کو بہلاؤ — بیوارثی بھاوج کی اسیری کا نہ غم کھاؤ
تم جاؤ تو اے بی بی سکینہؑ کو بھی لیجاؤ — لپٹاؤ کلیجے سے اُسے گود میں بٹھلاؤ

پاس آپ کے یہ لاڈلی میری جو رہے گی
ظالم کے طمانچوں کی تو ایذا نہ سہے گی

پر شمر جو پوچھے کہ یہ ہے کون تمھاری
کہیو کہ علمدارِ دلاور کی ہے پیاری
بیٹی اسے حضرت کی نہ بتلانا میں واری
جب سے وہ ہوئے قتل قلق اس پہ ہے طاری
بیٹی نہ سمجھنا نہ عزیز اپنی سمجھنا
بن باپ کی بچی کو کنیز اپنی سمجھنا

اصغرؑ کو بھی تم اپنا ہی فرزند بتانا
موقع جو سفارش کا میں صدقے گئی پانا
ممکن ہو تو ننھی سی لحد اُس کی بنانا
بیمار بھتیجے کو اسیری سے بچانا
جو ہو سکے سیدانیوں سے کیجیو بھائی
زندان سے زینبؑ کو چھڑا لیجیو بھائی

اک رات کی بیاہی مری بیٹی جو ہے کبریٰؑ
کس طرح بسر ہوگا یہ بچپن کا رنڈاپا
رنڈسالے کا جوڑا بھی نہیں جسکو مہیا
بابا ہی سو محتاجِ کفن، ماں ہے سو دُکھیا
بھیجے جو تمھیں شمرِ لعیں یاں سے وطن کو
لیجائیو ہمراہ، بھتیجے کی دُلہن کو

مثال ۱۶- حضرت زینبؑ کا قبر سید الشہداؑ سے رخصت ہونا

چہلم جو کربلا میں بہتّر کا ہو چکا
اور فاتحہ حسینؑ کے لشکر کا ہو چکا
پیوند بیکسوں کے تن و سر کا ہو چکا
قبروں پہ شور آلِ پیمبرؐ کا ہو چکا
ماتم میں تین روز رہے شور و شین سے
روئے لپٹ لپٹ کے مزارِ حسینؑ سے

مثلِ چراغ گورِ غریباں یہ دل جلائے
پھولوں کے ساتھ قبروں پہ لختِ جگر چڑھائے

پیاروں کی بود و باش کے ساماں جو یاد آئے
زینبؑ کلیجہ تھام کے بولی کہ ہائے ہائے
اب کس کے ساتھ داخلۂ کربلا ہوا
لایا تھا جو مدینے سے ہم کو وہ کیا ہوا

آئے تھے دوسری کو محرّم کی کس کے سات
خیمے بپا ہوئے تھے برابر لبِ فرات
اُترے تھے ہم، تو روکی تھی عبّاسؑ نے قنات
تاکید تھی پکار کے کوئی کرے نہ بات
ہی ہی کہاں بچھڑ کے وہ آرام دل گئے
پردہ تھا جن سے خاک کے پردے میں مل گئے

آتا ہی یادِ داخلۂ شاہِ دوسرا
کیسی چہل پہل تھی نہ تھا رنج اک ذرا
اُترے تھے یاں رفیق، اُدھر تھی محل سرا
برساتوں سے ٹوٹتا جاتا تھا آسرا
نقارہ و نشان کی یاں زیب و زین تھی
انجامِ کار نوبتِ قتلِ حسینؑ تھی

بازار اک طرف تھا، خریدار اک طرف
سردار اک طرف تھا، علمدار اک طرف
اکبرؑ کا تھا عروج پہ دربار اک طرف
ابنِ حسنؑ کی چھوٹی سی سرکار اک طرف
اصطبل واں تھا دوشِ نبیؐ کے سوار کا
جھولا پڑا ہوا تھا یہاں شیرخوار کا

ہی ہی وہ شیر مر گئے افسانہ رہ گیا
ارمان نوجوانوں کو کیا کیا نہ رہ گیا
نے بارگہ رہی نہ جلو خانہ رہ گیا
بستی علیؑ کی لٹ گئی، ویرانہ رہ گیا
وحشت سے آج تاب نہیں یاں قیام کی
کل یاں کھڑی ہوئی تھی جماعت امام کی

زہرؑا کی یادگار کے صدقے میں سوگوار
گھوڑے سے واں گرے تھے شہنشاہِ مدارؑ
تنہا رہے تو ٹوٹ پڑے آکے سو ہزار
قاتل ہوا تھا سینے پہ حضرتؑ کے یاں سوار

سینے کا درد کرتا تھا بیدم حسینؑ کو
ہم کو حسینؑ دیکھتے تھے ہم حسینؑ کو

راضی ہوں جو رضائے امامِ جلیل ہے
بے کوئی دادرس ہے نہ کوئی کفیل ہے
پر قابلِ ملاحظہ بازو کا نیل ہے
بھائی! بغیر آپ کے زینبؑ ذلیل ہے

پشت و پناہ اُٹھ گیا بے خانماں ہوئی
دیکھو یہ پشت قابلِ نوکِ سناں ہوئی

حضرتؑ کی قبر ہل گئی زینبؑ کے بین سے
شہزادے! جاں بلب ہے پھوپی شور و شین سے
رو کر کہا بشیر نے ابنِ حسینؑ سے
چلیے وطن کو قبرِ شہِ مشرقین سے

عابدؑ نے پوچھا کیوں پھوپی اماں قبول ہے
وہ بولی اختیار ہے کیا، ہاں قبول ہے

ہونے لگا سوار رسالہ بشیر کا
خیمہ اُٹھا لحد سے شہِ بے نظیر کا
ڈنکا بجا حرم کے وداعِ اخیر کا
اور سب تبرکات جنابِ امیرؑ کا

تربت کے گرد اونٹ برابر کھڑے ہوئے
رخصت کو جمع قبر پہ چھوٹے بڑے ہوئے

زینبؑ پکاری کوچ کا سامان ہو گیا
پھر مقبرہ حسینؑ کا سنسان ہو گیا
پھر شہر میرے بھائی کا ویران ہو گیا
ہُو کا مکان، قتل کا میدان ہو گیا

آئی مسافروں کو مرے وہ زمیں پسند

دنیا میں جس زمین کو بستی نہیں پسند

اے کربلائے سرورِ دلگیر الوداع
اے قتلگاہِ حضرتِ شبیر الوداع
اے قبر ابنِ صاحبِ تطہیر الوداع
لو بھائی جان جاتی ہے ہمشیر الوداع

کیا بے نصیب ہے یہ نواسی رسولؐ کی
تم نے مجاوری نہ ہماری قبول کی

بے آپ کے بقیعے میں کس منہ سے جاؤنگی
نانا کے بھی مزار پہ عزت نہ پاؤنگی
گر جاؤنگی نجف تو ندامت اُٹھاؤنگی
پوچھیں گے سب بزرگ تو میں کیا بتاؤنگی

رخصت کیا حضور نے کیونکر یہاں رہوں
جاؤں تو کسطرف، جو رہوں تو کہاں رہوں

بھیا اُٹھو کجاوے پہ مجکو تمھیں بٹھاؤ
بھیا میں بے نقاب ہوں رہگیروں کو ہٹاؤ
روکیں قنات، اکبرؑ و عباسؑ کو بُلاؤ
خالی ہے گود بھابی کی اصغرؑ کو لیتے آؤ

سردار سارے قافلے میں آگے ہوتے ہیں
تیار کارواں ہوا اور آپ سوتے ہیں

مثال ۱۵ - اہلحرم کی وطن کو واپسی اور حضرت زینبؑ کے بین

جب گورِ غریباں سے وطن میں حرم آئے
سر پیٹتے سجاد بزیرِ علم آئے
کہتے تھے نہ اکبرؑ نہ امامِ امم آئے
اٹھارہ بنی فاطمہؑ کو کھو کے ہم آئے

آوازِ بتولؑ آئی کہ تاریک جہاں ہے
زینبؑ مرا یوسف مرا شبیرؑ کہاں ہے

زینبؑ! مرے بچے کو کہاں چھوڑکے آئی
زینبؑ مرے مظلوم سے کی تونے جدائی
زینبؑ مرے پردیسی کو شربت نہ پلائی
زینبؑ تو لٹا آئی بزرگوں کی کمائی

نکلی تھی تو سب کنبے کی اولاد کو لیکر
آئی ہے فقط عابدِ ناشاد کو لیکر

زینبؑ کو قلق سے یہ خبر بھی نہ تھی اصلا
پھر یک بیک اُسنے جو سُنا نالۂ زہراؑ
جنگل ہے کہ بستی ہے مدینہ ہے کہ بطحا
عابدؑ سے کہا کونسی منزل ہے یہ بیٹا

وہ بولے یہ مسجد ہے وہ روضہ ہے نبیؐ کا
وہ خانۂ ویراں ہے حسینؑ ابنِ علیؑ کا

گھبرا گئی منہ پیٹ کے عابدؑ کو پکاری
میں کہتی نہ تھی مجکو نہ گھرلے چلو واری
کچھ تم نے سُنی فاطمہؑ کی گریہ و زاری
بولو تو میں اب کیا کہوں دادی سے تمہاری

وہ طالبِ شبیرؑ ہے شبیرؑ نہیں ہے
شبیرؑ نہیں ہے مری توقیر نہیں ہے

کیوں لائے وطن میں مجھے کیا کام وطن سے
ہے ہے میں اُٹھی کیوں لحدِ شاہِ زمن سے
بچھڑی ہے بہن بھائی سے اور بھائی بہن سے
بہتر تھا وہ ویرانہ مدینے کے چمن سے

سب طعنے مجھے دینگے میں ہے ہے کدھر آئی
بھائی کا تو سر کٹ گیا پھر کس کے گھر آئی

نے بھائی نہ بھائی کی لحد پھر یہاں کیا ہے؟
نے رونے کی لذت ہے، نہ ماتم کا مزا ہے
نے گنجِ شہیداں نہ یہاں خاکِ شفا ہے
واری! مجھے مقتل ہی میں لے چل تو مزا ہے

پہلو میں مزارِ شہِ کونین سے ملے گا

بے چین ہوں یاں، مجکو وہیں چین ملے گا

ناگہ خبرِ آمدِ سادات ہوئی عام
مردوں سے بھرے راستے اور عورتوں سے بام
ہر سمت تصدق کا، ضیافت کا سرانجام
پر نوحۂ زہراؑ سے بقیعہ میں تھا کہرام

یہ کہتے ہوئے لوگ چلے آتے تھے گھر سے
کہدو کوئی صغراؑ سے حسینؑ آئے سفر سے

زنجیر درِ فاطمہ صغراؑ کی ہلا کر
اک لڑکی نے جلدی سے یہ آواز دی آکر
لے بی بی پدر آیا ترا شکرِ خدا کر
مل آتی ہوں کبراؑ و سکینہؑ سے میں جا کر

مرضی تری اماں کی اگر پاتی ہوں بی بی
تو گود میں اصغرؑ کو اٹھا لاتی ہوں بی بی

اتنے میں عجب حشر کا ساماں نظر آیا
یعنی شترِ زینبؑ نالاں نظر آیا
ماتھے پہ جما خونِ شہیداں نظر آیا
سر فاطمہؑ کی بیٹی کا عریاں نظر آیا

خوں بہتا تھا زخموں کی طرح دیدۂ تر سے
آتی تھی صدا ہائے حسینا کی جگر سے

انبوہِ جوانانِ وطن جو نظر آیا
دل بانوؑ کا اکبرؑ کے تصور میں بھر آیا
تھرایا جگر یاد جو لختِ جگر آیا
بیساختہ یہ حرف لبِ پاک پر آیا

بیٹے کی جدائی میں مجھے صبر نہیں ہے
یثرب کے جوانو! مرا اکبرؑ بھی کہیں ہے؟

صغراؑ نے سنی مادرِ بیکس کی جو زاری
دوڑی گئی محمل کے قریب اور یہ پکاری
اے والدۂ ماجدہ، تسلیم ہماری
اصغرؑ کو دکھا دو ہمیں ٹھہراؤ سواری

کہدو کہ تمنا ترے ملنے کی بڑی ہے
بیمار بہن ہاتوں کو پھیلائے کھڑی ہے

مثال ۱۶۔ حضرت اصغر کی فرقت میں اُن کی ماں کے جگر خراش بین

بانو پچھلے پہر اصغر کے لیے روتی ہے ایک وہ جاگتی ہے خلقِ خدا سوتی ہے
سر کو بھی پیٹتی ہے جان کو بھی کھوتی ہے پر عجب غم ہے کہ تسکین نہیں ہوتی ہے
پیٹتے پیٹتے بیہوش جو ہو جاتی ہے
دل سے ہے ہے علی اصغر کی صدا آتی ہے

سوگ کا فرش ہے، اور سامنے جلتا ہے چراغ بازووں میں داغِ رسن، سینے میں اولاد کا داغ
جان اندوہ میں، دل رنج میں، آشفتہ دماغ نہ وہ گل ہیں، نہ وہ غنچے ہیں، نہ زہرا کا وہ باغ
گوشۂ چادر کا اگر سر سے سرک جاتا ہے
ننگے سر کوفے میں پھرنا اُسے یاد آتا ہے

کبھی گوشے میں وہ منہ ڈھانپ کے چلاتی ہے اور کبھی صحن میں گھبرا کے نکل آتی ہے
کوکھ پکڑے ہوئے ہر ایک طرف جاتی ہے ڈھونڈتی ہے، مگر اصغر کو نہیں پاتی ہے
تن کو لغزش ہے جدا، اور ہے منہ زرد جدا
دل تڑپتا ہے جدا، سینے میں ہے درد جدا

کہتی ہے بعدِ خزاں باغ میں آتی ہے بہار پھولتے پھلتے ہیں، ہوتے ہیں ہرے سب اشجار
مل گیا خاک میں اس طرح ہمارا گلزار جسکا اب پھولنا پھلنا ہے نہایت دشوار
پھر بسا شہر، اگر ظلم سے برباد ہوا

اک مرا گھر ہے کہ لٹ کر نہ پھر آباد ہوا

گود پھیلا کے کبھی کہتی کہ دلبر آؤ
دل تڑپتا ہے مرا، گود کے اندر آؤ
روح بے چین ہے آؤ علی اصغرؑ آؤ
فاطمہؑ کے لیے آؤ پئے حیدرؑ آؤ

بوند پانی کے لیے ہائے تری جان گئی
اماں صدقے گئی، واری گئی قربان گئی

آ کے سینہ مرے سینے سے لگاؤ پیارے
خشک منہ اپنا مرے منہ سے ملاؤ پیارے
آگ بھڑکی ہے کلیجے میں بجھاؤ پیارے
اک نظر چاند سی تصویر دکھاؤ پیارے

جائیو خلد کو، یاں تم کو نہ بہلاؤں گی
ایک دم سے نہ زیادہ تمہیں ٹھہراؤں گی

اس جہاں سے چمنِ خلد ہے برسوں کی راہ
کس سے منگواؤں خبر میں تری اے نورِ نگاہ
ہائے جس ملک میں قاصد بھی نہیں جاتا آہ
یاں سوا صبر کے کچھ بس نہیں چلتا واللہ

ماں سے بچھڑے رہو، پر خرّم و مسرور رہو
دل سے نزدیک ہو آنکھوں سے تم دُور رہو

ہائے اصغرؑ نہ ترا دین ہوا ماں سے ادا
نہ تری سالگرہ کی نہ ترا بیاہ کیا
بوجھ کوئی مری گردن سے نہ اُترا تیرا
نہ لحد تجکو ملی اور نہ کفن تجکو ملا

ذبح تم ہو گئے سینے پہ لِٹاؤں کس کو
چھوٹے چھوٹے یہ شلوکے میں پہناؤں کس کو

واقعاتِ شام

انسانی جذبات یا احساسات کی جگرسوز تصویر واقعاتِ شام کے دردانگیز حالات میں سب سے زیادہ نظر آتی ہے، جو اہل حرم کے مصائب کا نہایت دلخراش واقعہ ہے مرثیہ گویوں نے ان عبرت انگیز واقعات کو تاثیر کا رنگ دینے میں زورِ طبیعت کا کوئی دقیقہ اُٹھا نہیں رکھا۔ لیکن افسوس ہے کہ لائق مؤلف اس اہم اور ضروری واقعہ کو بالکل نظر انداز کر گئے۔ مشہور ہے کہ زندانِ شام اور ہند کے حالات کو مرزا صاحب نے نہایت پُرتاثیر انداز سے لکھا ہے۔ اور حقیقت میں یہ شہرت بجا معلوم ہوتی ہے۔ مرزا صاحب خود بھی اس امر پر فخر کرتے ہیں۔

بے مثل مرثیے کہے احوالِ ہند میں ۔۔۔ تیرا جواب ہے نہ عرب میں نہ ہند میں

واقعاتِ شام کے افسوسناک حالات میں مختلف جزوی واقعات ہیں، اور ان میں سے ہر ایک کی الگ الگ خصوصیات ہیں۔ مثلاً قید خانے کی وحشت و ویرانی کا سماں، اہلِ حرم کی پریشانی، وارثوں کی یاد، اور بچوں کا اضطراب، اُدھر ہند کا خود بخود اس جانکاہ واقعہ کے اثر سے متاثر ہو کر قید خانے میں جانے کا قصد کرنا۔ اہلِ حرم کا یہ خبر سُنکر اس لحاظ سے کہ ہند نے اُن کو پہلے شان و تجمل کی حالت میں دیکھا تھا اور اب اس درماندہ حالی میں ملاقات ہوتی ہے، فطرتاً بدحواس اور پریشان ہو جانا؛ ہند کا داخلِ زندانِ شام ہو کر اسیروں کے سچے حالات معلوم کرنے کے مختلف طریقے اختیار کرنا، پھر صحیح صحیح حالات

معلوم ہو جانے پر اُس کے دل کی مضطربانہ کیفیت وغیرہ وغیرہ - ان میں سے ہر ایک واقعہ جُدا جُدا انداز رکھتا ہی - ان مختلف اور کثیر الانواع خصوصیات کو مرزا صاحب نے جن موثر پیرایوں میں ادا کیا ہی اُس سے معلوم ہوتا ہی کہ وہ فطرت کے کتنے بڑے نکتہ داں تھے - اُنھوں نے ہر واقعے کے بیان میں جو دلخراش الفاظ استعمال کیے ہیں اور جو درد انگیز سماں دکھایا ہے اُس سے ہر چیز - ہر واقعہ - ہر حالت - اور ہر کیفیت کی اصلی تصویر آنکھوں کے سامنے پھر جاتی ہی، سامعین کے فطرتی جذبات جوش میں آجاتے ہیں، اور درد و قلق حسرت و یاس کا دریا دلوں میں موجزن ہو جاتا ہی -

مضامین کی نوعیت کے لحاظ سے الفاظ ایسے موزوں اور مناسب لائے ہیں جن سے بے انتہا درد و غم ظاہر ہوتا ہی اور ہر لفظ تیر و نشتر کا کام دیتا ہی، اور یہ اُنکے کلام کی تاثیر کا بڑا راز ہی - وہ ہمیشہ بنیہ مضامین میں اس بات کی کوشش کرتے ہیں کہ جو اپنے دل میں ہو وہی دوسرے کے دل میں پیدا ہو جائے تاکہ دل سے نکلے اور دل میں بیٹھے - اور موزوں و مناسب الفاظ حقیقی اور نیچرل جذبات کی پوری تصویر کھینچنے میں کامیاب ثابت ہوں - اب ہم ان مضامین کو مختلف عنوانات کے تحت میں درج کرتے ہیں -

۱- دربارِ یزید
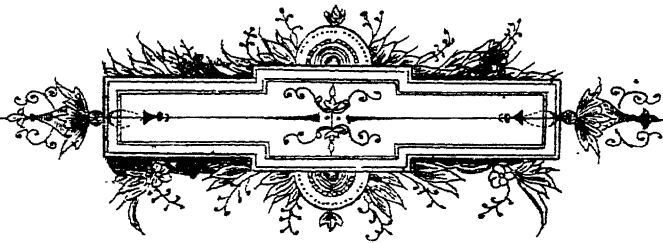
آمد ہے اہلبیتِؑ پیمبرؐ کی شام میں
گیسو کھلے ہوئے ہیں عزائے امام میں
سر پیٹتی ہیں فاطمہؑ دارالسلام میں
زینبؑ یہ نوحہ کرتی ہے دربارِ عام میں
لوگو! خبر کرو مرے نانا رسولؐ کو
بلوے میں شمر لایا ہے بنتِ بتولؑ کو

نانا! تری نواسی کے سر پر ردا نہیں
امت خوشی سے دیکھ رہی ہے، حیا نہیں
تیرا حسینؑ مرگیا، سوگ و عزا نہیں
عابدؑ غریب مرتا ہے تپ میں دوا نہیں
غیرت سے کانپ کے سجّادؑ ڈرتا ہے
اب داخلہ یزید کی محفل میں ہوتا ہے!

زینبؑ تڑپ کے اونٹ پہ کرتی تھی یہ بیاں
دربار میں طلب ہوئے سادات ناگہاں
اونٹوں سے اُترے، بندھ گئی شانوں میں ریسماں
اُس وقت اہلِ شہر تھے سب مجتمع وہاں
سامانِ جشنِ عام تھا، دربارِ عام تھا
اور ننگے سر حسینؑ کا کنبہ تمام تھا

مطرب ترانہ سنج تھے، رقّاص شادماں
پڑھتے تھے تہنیت کے قصیدے قصیدہ خواں
حاضر وکیلِ روم و حبش باشکوہ وشاں
ہاتوں پہ نذرِ فتح لیے خورد اور کلاں
نوحہ یہ تھا ملائکۂ مشرقین کا
قدرت خدا کی جشن ہی قتلِ حسینؑ کا!!!

دربارِ عید گاہ تھا وہ دن تھا روزِ عید
قتلِ حسینؑ تجکو مبارک ہو اے یزید
کس خرمی سے کہتے تھے یہ شامیِ پلید
سیدانیاں ہلاک ہوں عابدؑ بھی ہو شہید
چھپ کر اٹھا تھا شب کو جنازہ بتولؑ کا
ہے آج سب کے سامنے کنبہ رسولؐ کا

حیراں کھڑے تھے سب حرمِ شاہِ مشرقین
مہرِ سکوت لب پہ نہ شکوہ نہ شور و شین
زینبؑ نے دیکھا تخت پہ ناگہ سرِ حسینؑ
بیساختہ تڑپ کے یہ کرنے لگی وہ بین
ہی ہی نہ موت آئی مجھے راہِ شام میں
بھیا سلام کرتی ہوں دربارِ عام میں

لکھا ہی دستِ بنتِ علیؑ تھا بندھا ہوا
اور پاس ہی رسن میں سکینہؑ کا تھا گلا
زینبؑ نے یہ بیاں جو سرِ شاہ سے کیا
دیکھا سکینہؑ پیاسی نے بھی سر اٹھا اٹھا
چشمِ ادب سے باپ کے سر پر نگاہ کی
ہاتوں سے تو بلائیں لیں اور منہ سے آہ کی

چلائی ہائے بابا کٹا کب تمہارا سر؟
سب مجھسے کہتے تھے، ہی سفر میں ترا پدر
ہی ہی جب ہی لعینوں نے لوٹا ہمارا گھر
ہی ہی جب ہی طمانچے مجھے مارے بے خطر
سچ ہے کہ باپ والی کو سب پیار کرتے ہیں
یوں ہم سے بے پدر کو گرفتار کرتے ہیں

یہ سن کے بد دماغ ہوا حاکمِ لعیں
بولا کہ قیدی روتے ہیں کیا شمر یاں نہیں
کہتا ہوا یہ شمر گیا تخت کے قریں
کیا حکم ہے غلام تو موجود ہے یہیں
جو کہہ انہیں سزا دوں مجھے کیا دریغ ہی

حاضر یہ تازیانہ - یہ خنجر - یہ تیغ ہے

درباریوں کا قلب یہ سنتے ہی ہل گیا
ہم جانتے تھے ہے انہیں مظلوموں کی خطا
انگلی دبا کے دانتوں میں ہر ایک نے کہا
پر اب کھلا کہ بے سبب ان سب پہ ہی جفا

رونے کا ضبط صاحبِ ماتم سے ہوئیگا؟
جسکا کوئی مرے گا وہ کیونکر نہ روئے گا!!

حاضر جو شہر کے تھے قاصدِ عقیل
انجیل خواں محبِّ خدا خاصۂ جلیل
تھا اک فرنگی اُن میں شہِ روم کا وکیل
حاکم سے وہ عقیل ہوا صرفِ قال و قیل

بتلا کہ گم جو اس مرے اے امیر ہیں
یہ سر ہے کسکا اور یہ کہاں کے اسیر ہیں؟

جاتا ہوں شاہِ روم کی خدمت میں پانسے جب
پر آج ماجرا نظر آتا ہے یہ عجب
وہ مجھ سے پوچھتا ہے وقائع یہاں کے تب
امیدوار ہوں کہ مفصّل سنا تو سب

مسکن تھا اس قتیل کا کس سرزمین پر
تھا اور دین پر کہ محمدؐ کے دین پر

زنجیر پہنے کانپتا ہے جو یہ ناتواں
یہ ننھی لڑکی جسکے گلے میں ہے ریسماں
کیا نام اس مریض کا ہے جلد کر بیاں
اسکا تو ہے وہ سن کہ ہو کافر بھی مہرباں

رانڈوں سے انتقام تو لیتا ہی حیف ہے!
آزار ننھے بچّوں کو دیتا ہے حیف ہے!

یہ وہ معاملہ ہے کہ بس ہوش جاتا ہے
جو چوبِ بید اس کے لبوں پر لگاتا ہے
کیا حرفِ بد تجھے یہ کٹا سر سناتا ہے
کوئی بھی ہاتھ مردے کے سر پر اٹھاتا ہے

اسکا گناہ تو مجھے حیران کر گیا
باقی قصاص رہ گیا اور سر اُتر گیا

مذہب پہ اس سے جنگ ہوئی یا کہ ملک پر؟ | کیا منحرف تھا قبلے سے لوٹا جو اسکا گھر؟
کیا تارک الصلوٰۃ تھا کاٹا جو اسکا سر؟ | زینبؑ سے ضبط ہو نہ سکا بولی پیٹ کر

حق پر موا ہے، فرقۂ باطل سے پوچھ لے
سجدے میں سر کو کاٹا ہے قاتل سے پوچھ لے

یہ سُنکے اور کانپ کے فرنگی کے دست و پا | کہنے لگا یزید سے تو نے نہ کچھ کہا
پوچھے جو شاہِ روم کروں اُس سے عرض کیا | یہ کسکا سر ہے؟ نام بتا اور نسب بتا

بولا شقی بلند نہ کر شور و شین کو
کہدیجیو یزید نے مارا حسینؑ کو

اُسنے کہا، جو سیدِ بطحا ہی وہ حسینؑ؟ | ماں جس کی فخر مریم و حوّا ہی وہ حسینؑ؟
تیرے رسولؐ کا جو نواسا ہی وہ حسینؑ؟ | مشکل کشا علیؑ کا جو بیٹا ہے وہ حسینؑ؟

جسپر نبیؐ نے اپنے پسر کو فدا کیا؟
خالق نے جس کو بچہ آہو عطا کیا؟

حاکم نے سر ہلا کے کہا ہاں وہی حسینؑ | منہ پیٹ کر فرنگی پکارا بشور و شین
غارت کرے شتاب تجھے ربِ مشرقین | اے خاک تیرے جین پہ کھویا علیؑ کا چین

اے اہل شام کیوں یہی مذہب تمہارا ہے
نانا کا کلمہ پڑھ کے نواسے کو مارا ہے!!

شبیرؑ و مصطفےٰؐ کی قرابت تو ہی عیاں | کل اک جناب فاطمہؑ ہیں اُنکے درمیاں

اس اصل+ پر جدا کیا سر اُن کا، الاماں!! ہر کل کی بات زندہ تھے پیغمبرِ زماں

مرقد میں داغ اُنکے کفن کو لگا نہیں
اور آج سر پہ آلِ نبیؐ کے ردا نہیں!!

اب نوحے کا ہنگام ہے رقت کی گھڑی ہے
شہ مر گئے زینبؑ پہ قیامت کی گھڑی ہے
دربار میں اب آمدِ عترت کی گھڑی ہے
حیدرؑ کے محبو! یہ عدالت کی گھڑی ہے

جائز ہے حرم مجلسِ میخوار میں جائیں
عابدؑ لیے ماں بہنوں کو دربار میں جائیں

دربار بھی ظالم کا ہے عادل کا نہیں ہے
اندیشہ عدو کو حق و باطل کا نہیں ہے
وقت اس سے زیادہ کوئی مشکل کا نہیں ہے
کچھ بس حرمِ بیکس و بیدل کا نہیں ہے

منظور ہے یہ، طوق تو گردن میں پڑے ہوں
سب کرسیوں پہ بیٹھے ہوں سادات کھڑے ہوں

یہ سنکے سکینہؑ نے کہا ماں سے میں قرباں
دربار میں کس لئے ہے طلب آپ کی اس آن؟
کیا بیٹھا ہے انصاف پہ اس شہر کا سلطاں
گریہ ہے، تو بی بی نہ حزیں ہوں نہ ہراساں

نے خون کیا ہمنے کسی کا، نہ خطا کی
چل کر سرِ دربار دُہائی دو خدا کی

پہلے کہو حاکم سے کہ حیدرؑ کے حرم ہیں
زُوّار پیمبرؐ کے ہیں، حجّاج حرم ہیں
دسویں سے محرّم کی گرفتارِ الم ہیں
سر ننگے ہیں ہم، بیمار دنکے سرتن سے قلم ہیں

+ اصل یعنی حسب و نسب یعنی باوجود ایسے عالیشان حسب و نسب و خاندانی اقتدار کے انکا سر جدا کر لیا

دے داد ہماری کہ عزیزوں سے چھُٹے ہیں
کعبے کے مسافر تری سرحد میں لُٹے ہیں

زینبؑ علی اکبرؑ کا کہیں واقعہ سارا
تم کہیو کہ برقع مرا ظالم نے اُتارا
یوں نیزہ لگا، یوں جگر اُن کا ہوا پارا
نالش میں کروں گی کہ طمانچہ مجھے مارا

گر پوچھے گا وہ، کیا تری مرضی ہے بتا دے
میں ہاتوں کو جوڑونگی کہ بابا سے ملا دے

تو شہر کا حاکم ہے تجھے ہوئیگا معلوم
نے بھوک سے مضطر ہوں نہ ہوں پیاس سے مغموم
عاشور سے روپوش ہوئے ہیں شہ مظلوم
غم یہ ہے کہ بابا کی زیارت سے ہوں محروم

غم باپ کا رُلواتا ہے چپ ہو نہیں سکتی
دہشت سے طمانچوں کی مگر رو نہیں سکتی

ماں نے کہا ایسا تو مقدر نہیں اپنا
اس شہر میں مُنہ لائقِ چادر نہیں اپنا
پرُساں کوئی جز خالقِ اکبر نہیں اپنا
دشمن کوئی حاکم کی برابر نہیں اپنا

کہنے سے اسی کے ہوا گھر صاف ہمارا
اللہ کے آگے ہے اب انصاف ہمارا

بانوؑ و سکینہؑ میں یہ تھی درد کی گفتار
ناگاہ اُدھر ہند محل میں ہوئی بیدار
رسّی لیے ہاتوں میں غضبناک تھے کفّار
ہاتوں کو کلیجے پہ دھرے آنکھوں نے خونبار

اُسوقت جسے ہند کا عالم نظر آیا
ماتم کا مرقع اُسے برہم نظر آیا

لے لیکے بلائیں یہ کنیز ایک پکاری
کچھ آپ کو اسوقت تردّد ہے میں واری

باہر تو بڑا جشن ہی خیرات ہی جاری ۔ فرمائیں جلوس آپ بھی نذریں لیں ہماری

مجرے کی رعیت کو بھی تاکید ہوئی ہے
اس فتح کی حاکم کو بڑی عید ہوئی ہے

وہ بولی کہ میں جشن نہیں کرنے کی زنہار ۔ لے جاؤ ہٹاؤ یہ ہر اک خلعتِ زرتار
مسند بھی الٹ دو مجھے اب کچھ نہیں درکار ۔ کیوں سوئی میں اسوقت پناہ اے مرے غفار

گرتے ہوئے کعبے کے ستوں خواب میں دیکھے
قرآں کے ورق غرق بخوں خواب میں دیکھے

ویرانے میں اک گنجِ شہیداں نظر آیا ۔ خورشیدِ فلک خون میں غلطاں نظر آیا
اک غول لیے خنجرِ بُرّاں نظر آیا ۔ سب حادثوں کے بعد یہ ساماں نظر آیا

نیزے پہ جگر کاٹ کے رکھا ہی نبیؐ کا
اور رُخ ہے مرے گھر کی طرف فوجِ شقی کا

سب نے کہا بس آپ ہیں اس خواب سے مضطر ۔ مدت ہوئی بی بی کہ جناں میں ہیں پیمبرؐ
توبہ کہاں احمدؐ کا کلیجہ کہاں خنجر!! ۔ وہ بولی وفات اُن کی تو مشہور ہی گھر گھر

ہی ہی مجھے دھڑکا ہے حسینؑ ابن علیؑ کا
یہ پھول نبیؐ کا، یہ کلیجہ ہے نبیؐ کا

اس کلمۂ حق سے ہوئی ہر قلب پہ تاثیر ۔ پر ہند کی تسکین میں کھولے لبِ تقریر
اک نے کہا زینبؑ کو عریضہ کرو تحریر ۔ لکھ بھیجیں گی وہ خیریتِ حضرت شبیرؑ

چلّائی اجل پُرزے ہوئے تنکے زمیں پر
تلوار کا خط کھنچ گیا حلقِ شہِ دیں پر

اک نے کہا یہ مشورہ میں نے تو نہ مانا
اللہ کو دیکھا نہیں پر عقل سے جانا
جو کُل کا پیمبر ہے، وہ شبیرؑ کا نانا
حاکم کلمہ پڑھتا ہے اور سارا زمانا
امّت کا نہ ہاتھ اُٹھے گا سیّد پہ بلا لوں
اس بات پہ کہیے تو میں قرآں اُٹھا لوں

اب چل کے قدم رنجہ کرو بام پہ بی بی
فرماؤ نظر تہنیتِ عام پہ بی بی
غش قیدیوں کو آتا ہے ہر گام پہ بی بی
کھانا دو انہیں فاطمہؑ کے نام پہ بی بی
چھُڑوا دو انہیں نامِ حسینؑ ابنِ علیؑ پر
آئے گی نہ پھر کوئی بلا سبطِ نبیؐ پر

یا فاطمہؑ کہتی ہوئی وہ بام پر آئی
مسند وہیں غرفے میں کنیزوں نے بچھائی
ناگاہ اُٹھا شور کہ اللہ دُہائی
ہے ہے کہا اور ہند نے یہ بات سُنائی
واللہ لگی چوٹ مرے قلبِ حزیں پر
یہ نالہ و شیون ہے فلک پر کہ زمیں پر؟

چلمن کو اُٹھا کر یہ کنیز ایک پکاری
رسّی سے اسیروں کے گلے بندھتے ہیں واری
چھِل چھِل کے رگیں سینے تلک خوں ہے جاری
دم گھُٹتا ہے تو کرتے ہیں گھبرا کے وہ زاری
عریاں بدن و فاقہ کش و تشنہ جگر ہیں
کچھ عورتیں کچھ بچّے ہیں کچھ مردوں کے سر ہیں

خولی نے جو نیزہ درِ حاکم پہ جھُکایا
پر تو سرِ شبیرؑ نے ہر سمت گرایا
دل ہند کا اُس نور کے شعلے نے جلایا
جھُک جھُک کے رُخ اپنا طرفِ نیزہ پھرایا
منہ پیٹ کے سر خم کیا تسلیم کی خاطر

مسند پہ کھڑی ہو گئی تعظیم کی خاطر

چلائی کہ یہ کس بندۂ غفار کا سر ہے — اک نے کہا محبوسوں کے سردار کا سر ہے
بولی کوئی، حاکم کے گنہگار کا سر ہے — یہ کھانے لگی قسمیں کہ دیندار کا سر ہے
ہوتی نہیں یہ صاحبِ تقصیر کی صورت
بالکل ہے مرے حضرتِ شبیرؑ کی صورت

یہ کہتی تھی اور سینے میں ہلتا تھا کوئی دل — واں آلِ نبیؐ بزمِ شقی میں ہوئے داخل
اللہ رے جلالِ حرمِ سیدِ عادل — خود بند ہوا نغمۂ تنبور و جلاجل
مطرب ہوئے تسلیم بکف، پھینک کے دف کو
رقاص کھڑے ہو گئے قبلے کی طرف کو

اب لکھتے ہیں یوں راقمِ مجموعۂ ماتم — تھی ایک زنِ ہاشمیہ ہند کی محرم
فریاد جو زینبؑ کی محل میں گئی پیہم — مُنہ پیٹتی سر ننگے نکل آئی وہ پُرغم
انبوہ میں کچھ کہہ نہ سکی آلِ نبیؐ سے
دل پکڑے ہوئے پھر گئی دربارِ شقی سے

جاتے ہی گری روبروے ہند وہ مغموم — چلائی عجب رتبہ کے ہیں قیدیِ مظلوم
ہے ہے ہوئیں دو بی بیاں اس شان کی معلوم — گویا مری شہزادیاں ہیں زینبؑ و کلثومؑ
قیدی ہیں کہ گلدستہ ہیں وابستہ رسن سے
سادات کی خوشبو چلی آتی ہے بدن سے

یوں پھول دمِ صبح مہکتے نہیں دیکھے — ایسے مہ و خورشید چمکتے نہیں دیکھے
بچے کہیں بن پانی بلکتے نہیں دیکھے — دل ننھے سے اس طرح دھڑکتے نہیں دیکھے

داخل اُنھیں اسوقت خرابے میں کیا ہے
گھر چھین کے تقدیر نے زندان دیا ہے

نزدیک رہا جب کہ درِ حاکمِ گمراہ
استادہ تھی اک خادمۂ ہندؔ سرِ راہ

باندھے گئے رسی میں غزالانِ حرم آہ
دوڑی گئی اور جاکے کیا ہندؔ کو آگاہ

لو پھر چلے ہر کوچہ و بازار میں قیدی
کوٹھے پہ چلو جاتے ہیں دربار میں قیدی

کوٹھے پہ تو وہ جا نہ سکی حال تھا تغیر
ساتھ اُس کے ہوئی حاکمِ خونخوار کی ہمشیر

آہستہ چلی جانبِ درِ ششدر و دلگیر
پہنے ہوئے بھائی کی طرح خلعتِ توقیر

تھا مقنع زر خواہرِ بے پیر کے سر پر
کپڑا نہ تھا شبیرؑ کی ہمشیر کے سر پر!

دو کرسیاں لے آئیں کنیزیں وہاں فوراً
دربار کا سب حال ہوا ہندؔ پہ روشن

اور پردۂ در باندھ دیا چھوڑ کے چلمن
اک بی بی نظر آئی جھکائے ہوئے گردن

چلّائی کہ فریاد رسولؐ عربی کی
یہ تو مری سیدانی نواسی ہے نبیؐ کی!!

تھرّا گئی حاکم کی بہن اُس کے سخن پر
بولی، مرا بھائی ہے شریعت کے چلن پر

ہاتھ اپنا رکھا ہندؔ خوش الحان کے دہن پر
وہ ظلم کرے گا یہ بھلا شہ کی بہن پر

شک ہی تمھیں یہ خواہرِ شبیرؑ نہ ہوگی
ایسی تو مرے بھائی سے تقصیر نہ ہوگی

فہمیدہ ہو تم خود نہیں سمجھانے کے قابل
دربار میں زینبؑ ہے بھلا آنے کے قابل!
یہ بات نہیں آپ کے فرمانے کے قابل
رسّی جگرِ فاطمہؑ کے شانے کے قابل!!
سر ننگے یہ ہمشیرِ امامِ مدنی ہے
ہے ہے نہ کہو بے ادبی بدشگنی ہے

اتنے میں کھلا تخت پہ واں طشتِ طلائی
یاں ہند کو چلمن سے تجلّی نظر آئی
ہر سو سرِ شبیرؑ نے کی جلوہ نمائی
ہر چوب شقی نے جو لبِ شہ پہ لگائی
کرسی سے گری ہندِ حزیں منہ کو چھپا کر
سر پیٹتی باہر گئی چادر کو گرا کر

لرزے امرا، کانپ گیا حاکمِ اکفر
درباریوں کو حکم دیا تخت سے اٹھ کر
پردے سے یہ نکلی وہ ہوا جامے سے باہر
ہاں ڈھانپ لو رومالوں سے چہروں کو سراسر
رسوا ہوا اقلیم میں اب نام ہمارا
ناموس نکل آیا سرِ عام ہمارا

بانوئے حزیں سہم کے عابدؑ کو پکاری
زینبؑ پہ عجب قہر کا غصّہ ہوا طاری
منہ پھیر لو تم بھی یہاں ہند آتی ہے داری
چلّائی اب انصاف ترے ہاتھ ہے ناری
بنتِ شہِ مرداں ہوں نہ مرنے سے ڈروں گی
اس وقت تو قائل تجھے مجمع میں کروں گی

بے پردگیِ ہند سے تو اتنا ہی مضطر
محتاجِ ردا پھرتی ہوں جس دن سے میں در در
سر کھلنے سے بانوؑ کے تڑپتے ہیں پیمبرؐ
امّاں مری جنّت میں نہیں اوڑھتی چادر
چلّاتا ہے تو ہند کی صورت کو نہ دیکھو

فرماتے ہیں حیدرؑ مری عترت کو نہ دیکھو

۲۔ زندان شام کی وحشت و ویرانی۔ اہلبیتؑ کی مصیبت، عزیزوں کی یاد

جب قیدیوں کو راہ میں ماہِ صفر ہوا
اور شام میں ورود بوقتِ سحر ہوا

ماہِ صفر کی پہلی کو آخر سفر ہوا
ہر جا قلق اسیروں پہ افزود تر ہوا

دربار میں جو چار گھڑی تک کھڑے رہے
زنداں میں آکے غش کئی ساعت پڑے رہے

راوی نے حالِ خانۂ زنداں ہے یوں لکھا
وحشت میں مثلِ قبر اور آفت میں کربلا

آئی جو شب اسیروں کو صدمہ سوا ہوا
نے فرش تھا نہ سایہ نہ پانی تھا نے غذا

شمعوں کی روشنی نہ چراغوں کی روشنی
بس ماتمِ حسینؑ کے داغوں کی روشنی

ماں کو سوادِ شب نظر آیا جو بر ملا
اصغرؑ کو قید خانے میں دل ڈھونڈنے لگا

بے اختیار دوڑی سوے در وہ ننگے پا
زینبؑ لپٹ کے بولی کہ بھابی یہ کیا کیا

زنداں سے اسیر کہیں جانے پاتے ہیں
وہ بولی کیا کروں علی اصغرؑ بلاتے ہیں

اسوقت یاد آتی ہے اصغرؑ کی واردات
میدان سونا لاشے پہ لاشا اندھیری رات

جنگل میں جاگا ہوگا جو معصومِ نیکذات
پہلو میں ڈھونڈھا ہوئیگا مجکو اٹھا کے ہات

جانے دو مجکو جانے دو اب جان جاتی ہے
اصغرؑ کے رونے کی مجھے آواز آتی ہے

مسلمؑ کی بیوہ روکے لگی کرنے التماس
اصغرؑ تو قتل کرمیں ہے اپنے پدر کے پاس

بی بی ہمارے درد و قلق پر کرو قیاس
رکھتی ہوں چار داغ جگر پر میں بجواس

دو بیٹے قتل گاہ میں ہیں تن پہ سر نہیں
دو آئے تھے جو کوفے میں اُن کی خبر نہیں

والی کی لاش ہے درِ کوفہ میں بے کفن
روئے کو اُن کی لاش پہ لنے ماں ہے نہ بہن
کبرٰا پکاری سب سے سوا ہے مرا محن
سنگنے کی جا بندھی ہے مرے ہاتھ میں رسن

لوگو کبھی یہ ظلم ہوا ہے زمانے میں
میرے سوا دُلہن ہے کوئی قید خانے میں

سب وارثوں کی یاد میں کرتی تھیں کلام
ورد زباں سکینہؑ کو تھا شاہِ دیں کا نام
کہتی تھی ڈھونڈتی ہوئی آئی ہیں تا بشام
لیکن نظر نہ بیٹی کو آئے کہیں امام

حیراں ہوں اب وہ الفتِ شبیرؑ کیا ہوئی
ایسی بھلا سکینہؑ سے تقصیر کیا ہوئی

حضرت سکینہؑ کی دردناک حالت کا نقشہ

جب داغِ بے کسی نہ سکینہؑ اُٹھا سکی
اور سوزِ دل نہ خوف کے مارے سُنا سکی
کھائے طمانچے شمر کے جب تک کہ کھا سکی
سن کم تھا دُکھ بہت تھے نہ برداشت لا سکی

روئی تو ظالموں نے جفا بے شمار کی
آخر یہ جبر دیکھ کے موت اختیار کی

گر آہ کی تو شمر پکارا خموش ہو
اور چپ ہوئی تو بے پدری نے کہا کہ رو
گر شدتِ عطش میں پکاری کہ پانی دو
گریاد کر کے رہ گئی بابا کی پیاس کو

سوئی جو آنسو پونچھ کے چشمِ پُر آب سے

ہی ہی حسینؑ کہہ کے وہ اُٹھ بیٹھی خواب سے

دل میں سما گیا تھا جو شمرِ لعیں کا ڈر
سوتے میں بھی پکارتی تھی چونک چونک کر
فریاد چھینتا ہے گہر شمرِ بد گہر
اماں بچاؤ آتا ہے درّہ لیے عمر

زینبؑ پھوپی دُہائی کلیجہ دھڑکتا ہے
سجادؑ بھائی دیکھو وہ خولی گھُڑکتا ہے

فاقوں سے رفتہ رفتہ یہ لاغر بدن ہوا
اکثر بدن سے خوں بھرا کُرتہ اُتر پڑا
آواز بند ضعف سے، منہ پیاس سے کھُلا
تھا پوست برگِ گُل کی طرح چہرے سے جُدا

جاری تھے آنسو آنکھوں سے اور خوں کان سے
پیدا تھا شورِ ہائے حسیناؑ زبان سے

بن فرش سوتے سوتے جمی پیرہن میں گرد
رہنے لگا تڑپتے تڑپتے بدن میں درد
دل غم سے جلتے جلتے ہوا زندگی سے سرد
تھا فاقہ کرتے کرتے بدن خشک چہرہ زرد

چلّا کے رونا شمر کی دہشت سے چھُٹ گیا
یاں تک گلا بندھا کہ دم آخر کو گھُٹ گیا

جب پیاس لگتی روکے چچا کو پکارتی
دُکھتے جو کان شاہِ ہُدا کو پکارتی
آتا نہ جب کوئی تو خدا کو پکارتی
جینے سے تنگ آکے قضا کو پکارتی

کہتی تھی نے چچا نہ امامِ اُمم رہے
رُلوانے کو عدو رہے رونے کو ہم رہے

باپ کی یاد میں حضرت سکینہؑ کے نالے

چوتھا برس آغاز، یہ ہی سِن کی صغیری
بچپن کی یتیمی ہے لڑکپن کی اسیری

تھی جسکے بزرگوں کو دو عالم کی امیری
اُسکو نہ امیری ہے نہ سامانِ فقیری
سر کو در و دیوار سے ٹکراتی ہے کیا کیا
پہلی جو اسیری ہے تو گھبراتی ہے کیا کیا

ہر شب درِ زنداں پہ وہ شبیرؑ کی شیدا
چلاتی ہے رو کے ہے کوئی رحمدل ایسا
جاکر مرے بابا کو یہ پیغام دے میرا
زنداں سے سکینہؑ کو نہیں چھوڑتے اعدا
بیداد سکینہؑ پہ ہے تم داد کو پہونچو
مارے ہیں طمانچے مری فریاد کو پہونچو

یا سبطِ نبیؐ بیٹی کو زنداں سے چھڑاؤ
کانوں پہ ورم آگیا ہے دیکھ تو جاؤ
ماں پاس نہیں سوتی ہوں تم پاس سُلاؤ
کُرتا ہے بھرا خون سے اب آکے دُھلاؤ
پالا ہی ہمیں تم نے بڑے ناز و نعم سے
اب اتنا جگر سخت کیا آپ نے ہم سے
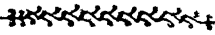
۳۔ شہرِ شام کی زینت، ہندہ کی سیر، خود بخود دل کی پریشانی

ہر گھر سے نمودار زمانے کی خوشی تھی
زنداں میں سادات کے جلنے کی خوشی تھی
مفلس کو بھی اک شمع جلانے کی خوشی تھی
زہراؑ کے چراغوں کے بُجھانے کی خوشی تھی
اس جشن کی تاکید تھی سب خلقِ خدا پر
اور قید تھی رونے کی اسیرانِ بلا پر

بازار میں بھی شہر میں بھی جشن عیاں تھا
حاکم کے ہر اک شہر میں عشرت کا سماں تھا
پر ہند کے ایوان پہ جنّت کا گماں تھا
خاتونِ جہاں کی وہ کنیز کا مکاں تھا

آرائشِ ایوان جو اُسے مدِّ نظر تھی
شبیرؑ کے گھر لُٹنے کی اب تک نہ خبر تھی

ناگاہ خواصوں نے کہا لیکے بلائیں — کچھ عرض کریں ہم جو اماں جان کی پائیں
وہ بولی کہو عرض یہ کی دیکے دعائیں — بی بی کا محافہ درِ دولت پہ لگائیں

گلگشتِ بہارِ گل و ریحاں کی یہ شب ہے
قرباں ہوں ہم سرو چراغاں کی یہ شب ہے

وہ کہنے لگی خیر جو ہو شہر میں ساماں — ہاں چلتی ہوں موجود سواری ہو ابھی آں
چلّائی محلدار ابھی لائی میں قرباں — ہر کارے گئے چار طرف سُن کے یہ فرماں

موجود محافہ بھی ہوا تختِ رواں بھی
ڈنکا بھی ہوا دار بھی نوبت بھی نشاں بھی

اک ہودجِ زرّیں میں وہ خوش خوش ہوئی اسوار — باجے بھی سلامی کے بجے ہر طرف اکبار
غل پڑ گیا اسوار ہوئی ہندِ خوش اطوار — زنداں میں گھبرانے لگی زینبؑ ناچار

فضّہ سے کہا دیکھ تو آمد ہے کدھر کو؟
اللہ کرے آئے سواری نہ ادھر کو!!

القصہ کہ ناقہ ادھر آیا اُدھر آیا — پر ہند نے کچھ لطف سواری کا نہ پایا
آئینوں نے بالکل اُسے حیران بنایا — دل کو مع امیدِ چراغوں نے جلایا

بستی میں اُسے صاف تباہی نظر آئی
ہر شمع کے شعلے میں سیاہی نظر آئی

بیٹھی تھیں خواصیں جو سر آداب سے نیوائے — اُس نے کہا ناحق مجھے تم لوگ یہاں لائے

ہے ہے مجھے ہول آتے ہیں، جلدی کوئی بتلائے
کس شہر کا وارث ہوا، کس ملک سے سر آئے

بستی میں طبیعت مری گھبراتی ہے لوگو
دنیا مجھے ویران نظر آتی ہے لوگو

ڈھونڈو تو، کہ باشندۂ یثرب کوئی یاں ہے؟
پوچھ آؤ کہ اُس شہر میں تو امن و اماں ہے؟
ان پیر و جواں میں نجفی کوئی جواں ہے؟
اب دُرِّ نجف فاطمہؑ کا لال کہاں ہے؟

دم رکتا ہے اب حال مرا غیر ہے لوگو
دریافت کرو مکّہ میں تو خیر ہے لوگو؟

کس قوم کی بندی یہاں آئی ہے کھلے سر
گویا کہ ہوا ہے گذرِ آلِ پیمبرؐ
ہر کوچہ ہے سادات کی خوشبو سے معطّر
آباد نہ سمجھو اسے، ویراں ہے یہ کشور

اس خوں کی کوئی دن کو سزا ملتی ہے لوگو
دیکھو مری آنکھوں سے زمیں ہلتی ہے لوگو!!

بازار سے ناقے کی مہار اُس نے پھرائی
واں ہائے حسیناؑ کی صدا کان میں آئی
مسجد کی طرف حُبِّ حرم کھینچ کے لائی
ٹھہرا کے سواری کہا، اللہ دوہائی

سیدانیاں تھرّائیں نقیبوں کی صدا سے
یہ غش ہوئی سیدانیوں کی آہ و بکا سے

بے ساختہ چلائیں کنیزانِ خوش اعمال
گھبرا کے کوئی جھلنے لگی چہرے پہ رومال
کیا ہو گیا ان کو ارے کھلواؤ کوئی فال
سہلانے لگی تلوے کوئی مضطر و بیحال

اسپند کیا ایک نے رخسارِ نکو پر
اک نادِ علیؑ پڑھنے لگی مصحفِ رو پر

بکھرا کے کوئی بال نجف کو یہ پکاری
اے میرے جناب شہ مرداں ترے واری
للہ بچانا کہ محب ہے یہ تمہاری
مولا! تمہیں سنتے ہو برے وقت ہماری
گھبرائی ہوئی سوے محل جاتی تھی کوئی
شیشہ لیے زمزم کا چلی آتی تھی کوئی

غش سے جو کھلی آنکھ کیا اس نے اشارا
خاموش رہو صاحبو سننے دو خدارا
پھر کان لگائے سوئے زنداں جو قضارا
ہیہات یہ فریاد سنی اس نے دوبارا
زنداں میں تو ہے حسینا کی صدا ہے
دروازے پہ وا قرۃ العینا کی صدا ہے

دل میں کہا دو بی بیوں کا شور بپا ہے
زنداں میں ماتم ہی جدا، در پہ جدا ہے
ہاتف نے ندا دی کہ دو عالم میں عزا ہے
بیرون خرابہ سر شاہ شہدا ہے
زنداں میں ہمشیر ہے دروازے پہ ماں ہے
وہ نوحہ ہی زینبؑ کا یہ زہراؑ کی فغاں ہے

یہ سنتے ہی پرزے کیا سب خلعت زرتار
پھینکا کہیں تاج اور کہیں موتیوں کے ہار
چلائی مرے ہاتوں کو باندھو پئے غفار
زہراؑ کی گنہگار ہوں زینبؑ کی گنہگار
اس بےخبری پر کوئی کاٹو مرے سر کو
زنداں میں زینبؑ تھی میں آئی نہ خبر کو!!

دنیا کے نہ پردے پہ رکھے اب مجھے اللہ
زینبؑ ہوئی بے پردہ میں پردہ میں رہی آہ
زنداں میں ہو ہائے غضب بانوے ذیجاہ
ایوان میں میں جشن کا سامان کروں واہ!!
آکر نہ گرد حرم پاک میں مل جاؤں

غارت ہو ئیں، اللہ کرے خاک میں مل جاؤں

میں کہتی تھی کیا ہے سبب اس عیش و خوشی کا
سنتی تھی کہ جنگل میں جلا خیمہ کسی کا
لو سوگ تھا اُمّت میں نبیؐ فرزندِ نبیؐ کا!!
وہ گھر تھا مری فاطمہؑ کا میرے علیؑ کا

جل جائے گھر آقا کا تأسف نہ کروں میں!!
بجلی جو گرے مجھ پہ تو اب اُف نہ کروں میں

اک مرتبہ قدموں پہ گریں لونڈیاں ساری
تم لونڈی ہو زہراؑ کی وہ بی بی ہیں تمہاری
چلّائیں کہ یہ کیا کلمے منہ سے ہیں جاری
چاہو تو قسم لو، یہ خوشامد نہیں واری

ہم آپ کے آداب سے خاموش ہیں بی بی
تقصیر معاف، آپ ابھی بیہوش ہیں بی بی

فہمیدہ ہو تم خود نہیں سمجھانے کے قابل
تو بہ رسن ان بی بیوں کے شانے کے قابل
کونین کی شہزادیاں ویرانے کے قابل
یہ بات نہیں آپ کے فرمانے کے قابل

زندان میں ناموسِ رسولِؐ مدنی ہے!!
ہے ہے نہ یہ ارشاد کرو بد سخنی ہے

کیا منہ ہے جو کوئی آنکھ اُٹھائے شہِ دیں پر
ٹکڑے کیا نانا نے قمر چرخ مہیں پر
حکم اُن کا ہے لوح و قلم و عرش بریں پر
اور باپ نے کاٹے پرِ جبرئیلؑ زمیں پر

مغرب سے پھرا شمس اشارے سے علیؑ کے
اندھیرے ہی پھر جائیں جو پیارے سے علیؑ کے
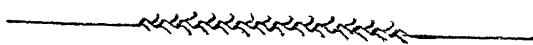
خلعت کوئی دربار سے پہنے ہوئے آتا | اک نذر لیے ہاتھوں پہ دوڑا ہوا جاتا
ڈیوڑھی سے محل کی کوئی محمل کو لگاتا | ناموس کو اپنے کوئی واں دھوم سے لاتا

سب خانہ نشیں، پردہ نشیں، گوشہ نشیں تھے
بلوے میں کھلے سر حرمِ قبلۂ دیں تھے

پر ہند کا توفیقِ خدا سے تھا عجب حال | مسند پہ وہ بیٹھی تھی رکھے آنکھوں پہ رومال
تھا آنسوؤں کا تار بندھا اور کھلے بال | تہلیل ہوئی جاتی تھی گھڑیوں وہ خوش اقبال

نے نذر وہ لیتی تھی نہ تسلیم کسی کی
حاشا نہ مدارات نہ تعظیم کسی کی

جس دم کسی عورت کی اترتی تھی سواری | منہ پھیر کے دروازلیے، وہ کرتی تھی زاری
سکتے میں کھڑی تھیں امرازادیاں ساری | کہتی تھیں کہ یہ جشن ہے یا تعزیہ داری

ہم نذر کو آئے ہیں کہ پُرسے کو کسی کے!
کھلتے نہیں یہ رازِ جنابِ احدی کے!!

نذروں پہ نظر ہی نہیں فرماتی ہیں بی بی | بیساختہ اشک آنکھوں میں بھر لاتی ہیں بی بی
کچھ سوچ کے ہر بار لرز جاتی ہیں بی بی | یوں روتی ہیں جو ہم کو بھی رلواتی ہیں بی بی

دولت ہے ریاست ہے حکومت ہے حشم ہے
حیرت ہے الٰہی نہیں کس بات کا غم ہے!

تب ہند پکاری کہ مجھے خود نہیں معلوم | آنکھیں کیسے روتی ہیں میں ہوں کس لیے مغموم
سکتا ہے مجھے، شہر میں اس جشن کی ہے دھوم | دل کڑھتا ہے جس کے لیے ہے کون وہ مظلوم

کھلتا نہیں کچھ آہ، یہ کیا مجھکو ہوا ہے

کیوں بال بکھرے ہیں مرا کون موا ہے

در پر تو مرے جشن کی نوبت ہی سحر سے
رونے کی صدا کان میں آتی ہے کدھر سے؟
دل ٹکڑے ہوا جاتا ہے کیوں دردِ جگر سے
کیا ہے کہ گری پڑتی ہے چادر مرے سر سے

ہوں سوگ میں اور علم نہیں کس کی عزا ہے
کھلتا نہیں کیوں آنسوؤں کا تار بندھا ہے

جن قیدیوں کے آنے کی اسوقت خبر ہے
دریافت ہے کچھ تم کو کہ اُن کا کہاں گھر ہے؟
سُنتی ہوں کہ سب قافلہ کھولے ہوئے سر ہے
اور طوق کے ہالے میں کوئی رشکِ قمر ہے

کیا قوم ہے ان لوگوں کی کیا ملت و دیں ہے
کاٹا گیا سر جس کا وہ سیّد تو نہیں ہے؟

وہ بولیں کہ ہم کہنے میں شرماتے ہیں بی بی
کوچوں میں منادی کھڑے چلاتے ہیں بی بی
مکّے کے مدینے کے اسیر آتے ہیں بی بی
ہے ہے یہ بنی فاطمہؑ کہلاتے ہیں بی بی

کہتے ہیں کہ سر کاٹا ہے جس حق کے ولی کا
حاجی تھا وہ کعبے کا مجاور تھا نبیؐ کا

---

۴ - ہند حالتِ اضطراب میں یزید سے امام حسینؑ کے حالات دریافت کرتی ہے دونوں کے سوال و جواب

یہ حال رفتہ رفتہ کہیں ہند نے سُنا
بیساختہ وہ کانپ گئی اور یہ کہا
اللہ خیر کیجیو، یہ کیا غضب ہوا
ہے ہے حسینؑ پر یورشِ لشکرِ جفا!!

زہراؑ کے خاندان میں تو اک حسینؑ ہے

یہ اور ہے کہ فاطمہؑ کا نورِ عین ہے؟

شاید اُدھر بھی جمع ہیں فوجیں برائے جنگ — جو خوف سے یزید کا یاں اُڑ رہا ہے رنگ
ہر دم کے مشورے سے ہے فرصت کا وقت تنگ — ہے خرّمی کبھی تو کبھی فکرِ نام و ننگ
دیکھوں یہ فوج لاتی ہے سر کس شہید کا
دیکھوں کسے رُلاتا ہے ہنسنا یزید کا

آقا مرا حسینؑ ہے معصوم و بیگناہ — نے اُسکو حرصِ دولت و زر ہے نہ حبِ جاہ
پھر کس حسینؑ سے یہ زمانہ پھرا ہے آہ؟ — جانِ نبیؐ کی جان کو اللہ کی پناہ
مشکل کشا ہی اپنے پسر کی مدد کرے
خالق گھڑی گھڑی کی بلا اُسکی رد کرے

بیچارہ فاقہ کش ہے کچھ اہلِ دول نہیں — دو دن کے بعد آج غذا ہے توکل نہیں
غیر از دعائے خیر کچھ اُس کا عمل نہیں — حاکم کے بندوبست میں اُس سے خلل نہیں
ابتک قصاص بھائی کا اپنے لیا نہیں
دعویٰ کسی سے خونِ حسنؑ کا کیا نہیں

سب اُسکے ہیں عدو وہ کسی کا عدو نہیں — خُلقِ محمدیؐ ہے تکبر کی خو نہیں
امّت کا عیب پوش ہے وہ عیب جو نہیں — نقارہ و علم کی اُسے آرزو نہیں
ناحق کا اُس سے بغض ہے سارے جہان کو
حیدرؑ کی ضامنی مرے آقا کی جان کو

اُسوقت اک کنیز نے یہ ہند سے کہا — سُنتی ہوں یہ حسینؑ بھی سیّد ہے قوم کا
لو اب سُنا یہ تم نے لڑائی کا ماجرا — میں سُن رہی ہوں کب سے یہ تیاریِ وغا

ذی الحج سے جمع ظالم خونریز ہوتے ہیں
خنجر کئی مہینے سے یاں تیز ہوتے ہیں

آگاہ حالِ کوفہ سے بی بی نہیں ہیں آہ
مارا اسی حسینؑ کے بھائی کو بے گناہ
واں کشتۂ خوں پڑا ہوا، اللہ کی پناہ!
چلائی ہند سچ ہے؟ وہ بولی خدا گواہ

مشہور کب سے ہے یہ خبر خاص و عام میں
سر بھی لٹک رہا ہے درِ ملکِ شام میں

لونڈی سے ہند نے کہا رو کر دہائی ہے
وہ فاطمہؑ کا بیٹا ہے زینبؑ کا بھائی ہے؟
اب کہہ یہ کس حسینؑ کے گھر کی صفائی ہے
وہ بولی یہ خبر نہیں تحقیق پائی ہے

زینبؑ کا ہے وہ بھائی کہ ابنِ بتولؑ ہے
پر سنتی ہوں مجاورِ قبرِ رسولؑ ہے

اندیشہ اس خبر سے ہوا ہند کو کمال
شب کو یزید آیا تو دیکھا یہ اسکا حال
کھانا حرام ہو گیا خونِ جگر حلال
پوچھا کہ کیوں تو روتی ہے بولی وہ خوشخصال

کیا میرا رونا حشر تو اُسوقت ہوئیگا
جب مصطفےٰؐ نواسے کے لاشے پہ روئیگا

بولا وہ کاذبِ ازلی صادقوں کے طور
کیا وجہ میں جو آلِ نبیؐ پر کرونگا جور
الزام پیچھے دیجیو پہلے یہ سن بغور
یہ تو حسینؑ اور ہے اور وہ حسینؑ اور

وہ نورِ چشمِ فاطمہؑ ہے اور یہ غیر ہے
میں اُس سے شر کرونگا بھلا تجکو خیر ہے

قتلِ حسینؑ کا میں کروں قصد بھی اگر
امت کا ہاتھ اُٹھے گا نبیؐ کے نواسے پر؟

جسکو سوارِ دوش کرے سید البشرؐ | کوئی بشر چڑھائے گا نیزے پہ اُسکا سر

ایمان چھوڑ دے گا کوئی میرے زور سے
سر ننگے مصطفےؐ کو نکالیگا گور سے

تیرے ہی کیا نبی ہیں محمدؐ مرے نہیں | ہے وہ حسینؑ میرے پیمبر کا جانشیں
نانا کا اُسکے پڑھتے ہیں کلمہ سب اہلِ دیں | میں قتل اُسے کرونگا تجھے آگیا یقیں

کیا تو ہی فاطمہؑ کی بڑی دوستدار ہے
میرا تو ملک و مال سب اُس پہ نثار ہے

---

۵ - ہند زندانِ شام کو جاتی ہے۔ اُسکے درد و قلق کی تصویر، لونڈیوں کی گفتگو

بالائے بام بیٹھی تھی جو ہند بیقرار | بولیں کنیزیں اُس کے حضور آکے ایکبار
وہ قیدی آئے بی بی کو جن کا تھا انتظار | پر ہیں کمال درد رسیدہ وہ سوگوار

بچوں کو اپنے جبکہ وہ ناشاد روتے ہیں
اس شہر کے بھی صاحبِ اولاد روتے ہیں

یہ ذکر تھا کہ شور اُٹھا وا مصیبتاہ | زیرِ محل گذر ہوا اہلِ حرم کا آہ
اونٹوں کے گرد خلق، پس و پیش سب سپاہ | بے اختیار ہند نے چلمن سے کی نگاہ

دیکھی جو بندی آلِ رسالت پناہ کی
دے ٹپکا سر دریچے پہ اور منہ سے آہ کی

کنیزیں اسیروں کا حال دیکھ کر کہتی ہیں

رکھ کر جبیں پہ ہاتھ یہ کی ایک نے فغاں | ہے ہے لہو اسیروں کے ماتھے سے ہے رواں

کوئی پچھاڑیں کھا کے یہ کرنے لگی بیاں — ہے ہے سبھوں کے ماتھے پہ ہیں زخمِ سناں !!

پہلے پہل جو پردے سے باہر یہ آئے ہیں
کیسے حیا سے بالوں میں منہ کو چھپائے ہیں

بولی کوئی کہ بچوں پہ تو کیجیے نگاہ — کیا سہمے سہمے لپٹے ہیں ماں سے یہ رشکِ ماہ
یہ مکھڑے پیارے پیارے، بدن گورے گورے آہ — سونلا گئے ہیں دھوپ سے اللہ کی پناہ

کپڑا نہیں نصیب نہ آب و غذا نصیب
ہے ہے یہ حادثہ یہ سن و سال یا نصیب !!

بیہوش ہند ہوگئی سُن کر یہ ماجرا — واں بزمِ عام میں گئے ناموسِ مصطفاؐ
حاکم سے لے کے جائزہ زنداں نہیں دیا — اور خود محل میں آیا تو یہ ہند نے کہا

ان قیدیوں کو دیکھ کے میں ہول کھاتی ہوں
دے حکم اک گھڑی کو میں زنداں میں جاتی ہوں

خواب اپنا کہہ کے رونے لگی وہ شکستہ حال — سب بولے خیریت ہے نہ کچھ کیجیے ملال
یہ خواب تو یزید کی باتوں کا ہے خیال — چلائی وہ کہ خیر سے ہے گر علیؑ کا لال

کون اُٹھ گیا جہاں سے کہ غم ہے زمانے کو
دل میرا کھینچتا ہے مجھے قید خانے کو

وحشت پکارتی ہے نکل گھر سے ننگے پا — الفت کسی کی کہتی ہے جینے سے ہاتھ اُٹھا
ہاتوں کو شوقِ جامہ دری ہے جدا جدا — مدِ نظر ہے آنکھوں کو طوفان جابجا

کہتا ہے کوئی کان میں کیا بے نصیب ہے

تو دُور ہے نبیؐ کی نواسی قریب ہے

ماتم یہ کِسکا مجکو رُلاتا ہے یا علیؑ
آنکھوں سے کچھ نظر نہیں آتا ہے یا علیؑ
سینے میں دل کو کون دُکھاتا ہے یا علیؑ
زندان کو کوئی لیے جاتا ہے یا علیؑ
گر پوچھتی ہوں کس سے ملاقات ہوئیگی
کہتا ہے دل زیارتِ سادات ہوئیگی

یوں قصر سے رواں ہوئی وہ شہ کی خیر خواہ
پہلو میں بیٹی غرقِ جواہر بزیب و جاہ
جیسے قلق میں آنکھ سے آنسو دہن سے آہ
اور ہمقدم جلو میں کنیزانِ رشکِ ماہ
خلعت سبھوں کا سرخ بصد زیب و جاہ تھا
پر دودِ دل سے ہند کا جامہ سیاہ تھا

ہیہات قید خانے کے در پر وہ آئی کب
بڑھ کر درود ناموں پہ بولی کہ ہے غضب
پیارونکے نام لیکے حرم پیٹتے تھے جب
نامِ خدا علیؑ کے عزیزونکے ہیں لقب
یا تو یہ سوگوار، محبِ بتولؑ ہیں
یا خود یہ اہلبیتِ جنابِ رسولؐ ہیں

بند

خالی تھا وہ گھر چین سے مثلِ دلِ نادار
عقرب کے کہیں چھید تھے، ہر در کہیں غار
تھا سقف کے ہلنے سے عیاں زلزلہ ہر بار
ہر کونے میں یہ ڈر تھا کہ اب گرتی ہے دیوار
سونے کا ٹھکانا تھا نہ سامانِ خورش تھا
در پر زنِ حاکم کی کنیزوں کا یورش تھا

اک لیکے خبر بیویونکی دوڑی ہوئی جاتی
اک ہانپتی حاکم کے محل سے ادھر آتی

گن گن کے کوئی مُردوں کے سر اشک بہاتی
اک جھانک کے دیوار کے روزن سے سناتی
ہم یہ نہیں کہتے ہیں کہ خاموش رہو تم
رونے میں مگر ہائے حسینؑا نہ کہو تم

اس نام سے ہول آتے ہیں بی بی کو ہماری
یہ سنتے ہی زینبؑ پہ قیامت ہوئی طاری
دروازے پہ سر ننگے کھڑی کرتی ہیں زاری
عابدؑ سے لرز کر کہا کچھ سنتے ہو واری
دیکھے گی ضرور آ کے ہند آلِ نبیؐ کو
کیوں سب کُنبے کے وارث تو چھپا لیگا پھوپی کو

پردے کے لیے بھائی کو لاؤنگی کہاں سے
ہے ہے کدھر اس وقت نکل جاؤں یہاں سے
دیوار گرے سر پہ میں اُٹھ جاؤں جہاں سے
یہ کیا کیا تقدیر نے مجھ تشنہ دہاں سے
پردے کے لیے ہائے نہ شبیرؑ کو چھوڑا
بھائی کو قضا لے گئی ہمشیر کو چھوڑا

ناگاہ بڑھا اور بکو کی ہوئی اک دھوم
رونے لگے سادات دہلنے لگے معصوم
دیواروں پہ مشعل کا اوجالا ہوا معلوم
رو کر کہا زینبؑ نے کہ یہ بھی مرا مقسوم
تب ہند ملی آہ نبی زادی سے چھٹ کر
سیدانیاں بندی میں جب آئیں یہاں لُٹ کر

ہر گام لہو ہند بہاتی ہوئی آئی
رستے میں دُر و لعل لُٹاتی ہوئی آئی
دل عرش کا نالوں سے ہلاتی ہوئی آئی
نذرِ شہِ دیں پانی پلاتی ہوئی آئی
خیرات ادھر دی اور اُدھر حق سے دعا کی
ہو خیر الٰہی پسرِ شیرِ خدا کی

دیکھا درِ زنداں پہ جو سر شہ کا دوبارا
لوگو بے مجھے بے موت اسی سنگ نے ہی مارا
رو کر کیا انگشتِ شہادت سے اشارا
دربانوں سے فرمایا کہ در کھولو خدارا

سنتے ہی یہ آواز مشوش ہوئی زینبؑ
یاں قفل کھلا اور وہاں غش ہوئی زینبؑ

۶- ہند کی آمد کا جاہ و جلال، ملازموں کی خوشامدانہ تقریر۔

درِ زنداں پہ ہوا اتنے میں انبوہ کمال
قیدیو اُٹھو دعا دے کے کرو استقبال
بولے درباں کہ بڑھے دولت و عمر و اقبال
زنِ حاکم کا ہی زنداں میں نزولِ اجلال

تم کھلے سر ہو حضور اب تمہیں چادر دینگی
رحمدل ہیں ابھی زنداں سے رہا کر دینگی

عریاں ہونگی تو خلعت ابھی پہنا دینگی
عذر حاکم نہ کریگا جو یہ سمجھا دینگی
صبح کو بیڑیاں بھی پاؤں کی کٹوا دینگی
نام جس شہر کا لوگی وہیں پہونچا دینگی

قصرِ شاہی سے جو تشریف یہاں لائی ہیں
پرورش کرنے کو تم سب کی حضو آئی ہیں

درِ زنداں پہ قدم ہند نے رکھا ناگاہ
لونڈیاں آگے بڑھیں کہتی ہوئیں پیش نگاہ
اور باہر سے نقیبوں نے کہا بسم اللہ
پیچھے دامن لیے ہاتوں میں خواصیں ہمراہ

سر پہ رکھے کوئی کرسیِ زبرجد آئی
کوئی بغلوں میں لیے تکیہ و مسند آئی

زنِ حاکم کی یہ حشمت یہ لباسِ پُر زر
اور بانوے حسینؑ ابنِ علیؑ ننگے سر!

نہ مادر آئن نہ مدینہ نہ پدر رہے نہ شوہر
دونوں سرکاریں لُٹیں، رہنے کو پایا یہ گھر

خون اکبرؑ کا لگائے ہوئے پیشانی پر
روتی تھی اپنی پریشانی و حیرانی پر

---

۷ - ہند اپنی بیٹی کو قید خانے میں بھیجکر اہلِ حرم سے اندر آنے کی اجازت طلب کرتی ہے
دخترِ یزید کے تجمل اور جناب سکینہؑ کی خستہ حالی کا مقابلہ۔

بیٹی سے اپنی کہنے لگی وہ ادب شناس
شاید یہ میرے آنے سے ہوں اور بےحواس
واجب ہے ان اسیروں کا مجھ پر لحاظ و پاس
جا دست بستہ کر مری جانب سے التماس

نکلی ہے گھر سے سُنکے صدا شور و شین کی
حاضر ہے یاں سلام کو لونڈی حسینؑ کی

زنداں میں بنتِ ہند گئی پہنے رختِ زر
چلّا رہی تھی نامِ پدر رہے کے بے پدر
در سے لگی کھڑی تھی سکینہؑ برہنہ سر
دیکھا جو اُسکو رہ گئی خاموش سہم کر

حسرت سے اُسکے خلعتِ زرریز نگاہ کی
اپنے پھٹے لباس کو دیکھا اور آہ کی

اُس کی نظر تھی زخم پہ کانوں کے دمبدم
زینبؑ پکاری جیتے ہیں یہ دیکھنے کو ہم
گہنا یہ اُس کا دیکھتی تھی سر سے تا قدم
اے چرخ کچھ بھی ہے تجھے انصاف، ہے ستم

بچپن میں کسکو رنج ہے اور کسکو چین ہے
وہ دخترِ یزید، یہ بنتِ حسینؑ ہے!!

پہنے ہے کون خلعتِ زر، ننگے سر ہے کون
نازاں پدر پہ کون ہے اور بے پدر ہے کون

قصر و محل ہے کسکے لیے دربدر ہی کون
خوشدل ہی کون اور شکستہ جگر ہی کون
سرخی خوشی کی چہرے سے کسکے نمود ہی
منہ پھول سا طمانچوں سے کسکا کبود ہی

حشمت سے بنتِ ہند کا آنا نہ بھولے گا
شرماکے اسکا آنکھ جھکانا نہ بھولے گا
کرتا اُلٹ کے منہ کا چھپانا نہ بھولے گا
یہ انقلاب، اور یہ زمانا نہ بھولے گا
محتاجی لباس ہی، اور قحطِ آب ہے
بن باپ کی سکینہؑ کا بچپن خراب ہے

ناگہ جھکی سلام کو بنتِ امیرِ شام
اور بولی، اپنی اماں کا ہم لائے ہیں پیام
زہراؑ کی لونڈیوں میں ہے مشہور جسکا نام
مشتاق ہیں جمالِ مبارک کی، والسلام
در پہ کھڑی ہیں، حکم کا بس انتظار ہے
بیوہ نے سر جھکا کے کہا، اختیار ہے

---

۸ - آمدِ ہند کی خبر سُنکر اہلبیتؑ کا اضطراب، پریشانی اور ندامت کی تصویر۔

یہ کہکے پیادہ چلی زندانِ ستم کو
چھوڑا ہیں ڈنکے کو سواری کو حشم کو
دربان وہاں ہنس کے پکارے یہ حرم کو
لو اب تو بھلا رو ؤ شہنشاہِ امم کو
بدخواب ہوئی غصے میں گھر سے نکل آئی
یہ ہند نہیں آئی، تمہاری اجل آئی

دل بچوں کا ننھا سا اُچھلنے لگا اُس آن
قالب میں سکینہؑ کے تو باقی نہ رہی جان
جلد آنسوؤں کو پونچھ کے یہ بولی وہ نادان
اماں یہاں کون آتا ہے کیا کہتے ہیں دربان؟

ناحق بھی غریبوں پہ خفا ہوتے ہیں اماں
ہم تو نہیں چلاتے کہ یہاں روتے ہیں اماں

ناحق مجھے جو چاہے وہ دے رونیکا الزام
لو دیکھ لو آنکھیں کہیں آنسو کا نہیں نام
گو لیٹتی ہوں موند کے آنکھوں کو میں ناکام
پر درد سے کانوں کے نہ ہے نیند نہ آرام
میں طعنوں سے ڈرتی ہوں قضا سے نہیں ڈرتی
یانکی ہے وہ خلقت کہ خدا سے نہیں ڈرتی

اب قتل کی اعدا نے یہ تدبیر نکالی
کچھ اور نہ تھا، رونے کی تقصیر نکالی
خونریزیِ سادات پہ شمشیر نکالی
تقصیر نئی اور نئی تعزیر نکالی
اب بھی نہیں گردوں کے طبق پھٹتے ہیں لوگو
اس شہر میں رونے پہ گلے کٹتے ہیں لوگو

بھیا کی غریبی پہ میں تھراتی ہوں اماں
بیمار کے سر کٹنے کا غم کھاتی ہوں اماں
اب تو نہ میں روتی ہوں نہ چلاتی ہوں اماں
بخشیں مری تقصیر میں سو جاتی ہوں اماں
گر غصہ کرے ہند کہ روتی ہے سکینہ
تم کہیو سرِ شام سے سوتی ہے سکینہ

ان باتوں سے دہشت کا جو ہوا اہلِ حرم کو
چلائے علمدار کو اور شاہِ امم کو
حلقے میں لیا عابدِ محبوسِ الم کو
کبرا نے دھرا زانو پہ بھائی کے قدم کو
بانو نے لیا گود میں سجادِ حزیں کو
بیمار کی گردن پہ رکھا اپنی جبیں کو

یہ حال تھا ناموسِ پیمبر کا ابھی آہ
جو مشعلوں کی روشنی در پر ہوئی ناگاہ

اور شور ہوا اے حرمِ سیّدِ ذیجاہ
آگاہ ہو، آگاہ ہو، آگاہ ہو، آگاہ

آداب سے مجرے کو چلو باندھ کے صف کو
آمد زنِ حاکم کی ہے زنداں کی طرف کو

ہوش اُڑ گئے زینبؑ کے پکاری میں کروں کیا
لو آتی ہے یاں ہند چھپوں جا کے میں کس جا
پہلے مرے بھائی سے بھی عقد اسکا ہوا تھا
یہ ہند وہی ہے جو مجھے کرتی تھی مجرا

میں خاک نشیں آج ہوں وہ تخت نشیں ہے
منہ کس سے چھپاؤں کہ ردا بھی تو نہیں ہے

مطلع ثانی

جب ہند کی آمد ہوئی زندانِ ستم میں
بیوؤں کو غمِ تازہ ہوا قید کے غم میں
زینبؑ نے کہا یادِ شہنشاہِ امم میں
جلد آؤ بہن مرتی ہے بھیّا کوئی دم میں

وارث کوئی جز ذاتِ خدا سر پہ نہیں ہے
ہند آتی ہے ملنے کو ردا سر پہ نہیں ہے

یہ ذکر تھا جو ہند وہاں آئی پہ بیہوش
عابدؑ سے کہا بانوؑ نے زاری کی خاموش
اک اک کے پسِ پشت ہوا شرم سے روپوش
بچے تو یہ سمجھے کہ ہوئی پیاس فراموش

منہ ڈھانپ لیے خوف سے کرتوں کو الٹ کر
اور سانس نہ لی بیوؤں کے سینے سے لپٹ کر

قید خانے میں تلاطم ہے کہ ہند آتی ہے
دخترِ فاطمہؑ غیرت سے موئی جاتی ہے
روح قالب میں وہ زنداں میں گھبراتی ہے
بدحواسی سے ہر اک بار یہ چلاتی ہے

آسماں دور ہے زمیں سخت کدھر جاؤں میں

بی بیو ل کے دعا مانگو کہ مرجاؤں میں

آمدِ ہند کا غل عترتِ شبیرؑ میں ہی
دخترِ فاطمہؑ روپوشی کی تدبیر میں ہی
شورِ ماتم حرمِ صاحبِ تطہیر میں ہے
کہتی ہی جاؤں کہاں پاؤں تو زنجیر میں ہے

کس غضب کی یہ خجالت ہی دہائی لوگو
ہند آپہونچی مجھے موت نہ آئی لوگو

جا کے دربانوں کو قسمیں دو کہ بہرِ سبحاں
رات کا وقت ہی بچے ہیں ہمارے ناداں
کوئی کھلوائے نہ تم کھولیو قفلِ زنداں
گر نکل جائینگے تو ہم انہیں ڈھونڈینگے کہاں

حاکمِ شام کا کل تم پہ عتاب آئے گا
اور ہمارا تو گلا پہلے ہی بندھ جائے گا

کیا کروں کیا نہ کروں جلد بتاؤ لوگو
اوٹ کر کے ہو کھڑے مجکو چھپاؤ لوگو
صدقہ اکبرؑ کا حقارت سے بچاؤ لوگو
یا کسی کونے میں لیجا کے بٹھاؤ لوگو

سر کھلے ہوں کسی حجرے میں مجھے بند کرو
یہ بھی ممکن نہ ہو تو خاک کا پیوند کرو

اُسنے پہچان کے گر کچھ کیا لطف و احساں
بی بی کچھ خیر ہے زینبؑ کہاں زنداں کہاں
لونڈیاں ہند کی گھبرا کے کرینگی یہ بیاں
باپ تو عقدہ کشا بیٹی اسیرِ زنداں

بے ردائی ہی تباہی ہی پریشانی ہے
توبہ توبہ یہ نبیؐ زادی ہی سیدانی ہے!!

کس طرح ہند کے آنے سے نہ گھبراؤں میں
کوئی دیوار جو شق ہو تو سما جاؤں میں
بنتِ حیدرؑ ہوں نہ کیوں قید میں شرماؤں میں
سیدھی ماں جائے کے مقتل کو چلی جاؤں میں

کربلا میں نہ یہ ذلت ہی نہ رسوائی ہے
بے کفن میں ہوں تو بیگور مرا بھائی ہے

لیکے لاشے کی بلائیں کہوں حالِ زنداں
تھا یہی خوف کہ گھبرا کے کریگی وہ بیاں

ہندواں آئی ہی بھیا میں چلی آئی یہاں
اے پیمبرؐ کی نواسی تو اسیروں میں کہاں!

قابلِ طوق ہوئی لائق زنجیر ہوئی
کیا گنہ تجھ سے ہوا کونسی تقصیر ہوئی

سب ستم دیکھے یہ اندوہ اُٹھائے نہ گئے
قید میں نام بزرگوں کے بتائے نہ گئے

ہند کو خاک بھرے بال دکھائے نہ گئے
دربدر پھرنے کے احوال سُنائے نہ گئے

ملتی کیا ہند سے میں خاک عزا تھی سر پر
نہ تو تم تھے مرے سر پر نہ ردا تھی سر پر

کربلا کا جو سُنا نام سکینہؑ نے آہ
اچھی میری پھوپی اماں مجھے لینا ہمراہ

یک بیک ہو کے کھڑی کہنے لگی بسم اللہ
وہاں ملیگی مجھے سب ظالم کے طمانچوں سے پناہ

ضبط اب رونے کا زنہار نہوگا مجھ سے
ننگے سر روز کا دربار نہوگا مجھ سے

آہ بھر کر کہا زینبؑ نے میں تیرے قرباں
طوق گردن میں ہی اور پاؤں میں زنجیرِ گراں

کربلا شاہِ شہیداں کی کہاں اور میں کہاں
میں ہوں زندان کے قابل مرے قابل زنداں

بیٹھو صدقے گئی بیٹھو میں کدھر جاؤنگی
بیڑیاں پہنے کسی دن یہیں مرجاؤنگی

میں ہوں بیجو مرے کہنے پہ نہ جاؤ واری
آنے جانے کا کہیں ذکر نہ لاؤ واری
پھوپی کہہ کہہ کے نہ اب شور مچاؤ واری
ہند آتی ہی مری گود میں آؤ واری

غیر ملنے کو جو آتا ہی تو چپ رہتے ہیں
پھوپی کو ایسی جگہ کنبہ موئی کہتے ہیں

ماں کو وہ پوچھے تو آوارہ وطن بتلانا
نام خواہر کا فقط رانڈ بہن بتلانا
بھائی کو قیدیِ زنجیر و رسن بتلانا
باپ کو سیّدِ بیگور و کفن بتلانا

دیکھو غیرت سے میں ہو جاؤنگی پانی پانی
ہند کے آگے نہ تم مانگیو جانی پانی

۹ - دخترِ یزید اور حضرت سکینہؑ کی طفلانہ گفتگو۔

زینب تو بیاں کرتی تھی یہ ہند سے ذکر
واں پاس سکینہؑ کے گئی ہند کی دختر
بولی کہ بہن آتا ہے رونا مجھے تم پر
کرتا ہے پھٹا سی نہیں دیتیں تمہیں مادر

ہم غیروں کے دل پر ترے نالوں کا اثر ہے
اللہ! تری ماں کا بھی کیا سخت جگر ہی!!

بہنیا مری ماں تو مجھے کرتی ہی بہت پیار
پوشاک بھی اک دن میں بدلتی ہی کئی بار
ماں تیری عجب ہی جو ہی اس دکھ کی روادار
کنگھی بھی ترے بالوں میں کرتی نہیں زنہار

صورت تو ہی واللہ بہت آپ کی پیاری
تم ماں کی بہت پیاری ہو یا باپ کی پیاری

تب اک نفسِ سرد سکینہؑ نے بھرا آہ
فرمایا میں کیا حال سے اپنے کروں آگاہ

تم ماں کی ہو پیاری تو مبارک کرے اللہ — ہم دُکھ میں ہیں کیا چاہیے ہم کو حشم و جاہ

تم خلعتِ زر پہنو کہ آرام ہے تم کو
کُرتا جو پھٹا ہے مرا کیا کام ہے تم کو

ماں باپ کو اپنے تو کبھی ہم بھی تھے پیارے — بابا بھی برادر بھی چچا بھی تھے ہمارے
سارے یہ مرے چاہنے والے گئے مارے — تم خوش ہو کہ ماں باپ سلامت ہیں تمہارے

راحت سے ہمیں کام نہ سونے سے غرض ہے
زنداں کے گرفتاروں کو رونے سے غرض ہے

کُرتا ہی نہیں چاک جگر بھی ہے مرا چاک — گھر لُٹ گیا، اسباب جلا، چھن گئی پوشاک
بابا نہیں جو گرد مرے منہ سے کرے پاک — ماں اپنے ہی غم میں ہے مری غور کرے خاک

تم ہم سے نہ بولو کہ دل افگار ہیں بی بی
ہم سب ترے بابا کے گنہگار ہیں بی بی

دل ہند کی بیٹی کا اُمنڈ آیا یہ سُن کر — اور باندھ کے ہاتوں کو کہا چل تو مرے گھر
پوشاک پنہاؤں میں، ضیافت کروں خواہر — وہ بولی، یہی گھر ہی ہمارے لیے بہتر

زنداں میں رہنے دے مجھے یادِ پدر میں
کیا جاؤں پھٹے کُرتے سے بہنیا ترے گھر میں
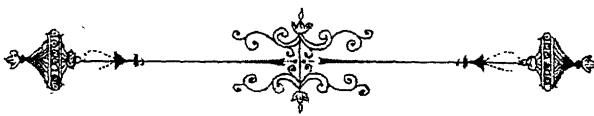
۱۰- بند حضرت سجادؑ کے حالات دریافت کرتی ہے۔

لونڈیاں تھیں زنِ حاکم کے جلو میں جو رواں
لاغر و خستہ تن و فاقہ کش و تشنہ دہاں
دیکھتی کیا ہیں کہ اک شخص ہے آہن میں نہاں
منہ پہ سیلی کے نشاں پشت پہ دُرّوں کے نشاں

ساقِ پا فاقے سے زنجیر میں تھرّاتی ہے
استخوانوں سے لرزنے کی صدا آتی ہے

سب نے مل کر طرفِ ہندیہ کی نوحہ گری
کیوں مسلسل کیا، ہے یہ تو عدم کا سفری
دیکھیے شام کے زنداں میں چراغِ سحری
یادِ حق کی ہے خبر خلق سے ہے بیخبری

کس نے دم بند کیا طوقِ جفا سے اسکا
سلسلہ ملتا نہ ہو شیرِ خدا سے اسکا

خشکیٔ لب سے عیاں ہے کہ بہت ہی پیاس
نہ بچھونا ہے نہ تکیہ نہ عمامہ نہ لباس
تپ سے بیہوش ہے پر شکرِ خدا کا ہے حواس
سر کو زانو پہ جھکائے ہوئے بیٹھا ہے اُداس

لنگرِ طوق سے سیدھا نہیں ہو سکتا ہے
نہ تو سو سکتا ہے بیمار نہ رو سکتا ہے

سورۂ نور جو پڑھنا ہو تو چہرہ دیکھو
شجرِ طور کے بدلے قدِ زیبا دیکھو
لیلۃ القدر ہے کاکل سے ہویدا، دیکھو
یدِ بیضا کے عوض آبلۂ پا دیکھو

کیوں نہ یاں صلِّ علیٰ منہ سے ہمارے نکلے
صدقے ان پاؤں کے جن سے یہ ستارے نکلے

ہتکڑی میں ہے یہ پتلی سی کلائی روشن
دیکھنا بی بی گلے میں ہے یہ طوقِ آہن
یا ہلالِ شبِ اوّل کے ہے چوگرد گہن
یا کہ ہالے میں ہے خورشیدِ فلک جلوہ فگن

بی بی قربان ترے اس کی رہائی کر دے
ہاتھ ہم باندھتے ہیں عقدہ کشائی کر دے

ہند نے دیکھ کے رانڈوں کی طرف دی یہ صدا — خاک پر دُرِّ نجف ہائے پڑا ہے کس کا
کس کا یوسفؑ ہے یہ زنداں میں گرفتارِ بلا — کیسی بقید رہو تم، قدر نہیں اس کی ذرا

کام آخر ہوا، اک دم میں یہ دم توڑتا ہے
ایسے بیماروں کو تنہا بھی کوئی چھوڑتا ہے

گرد عابدؑ کے پھری پھر وہ بحالِ تغییر — رکھ دیا پاؤں پہ سر اپنا اُٹھا کر زنجیر
بولے وہ کون؟ یہ چلائی کنیزِ شبیرؑ — السّلام اے رسن و طوق و سلاسل کے اسیر

ہے وصیت کا محل مرنے پہ تیار ہے تو
کچھ کفن کے لیے رکھتا ہے کہ نادار ہے تو

غم نہ کھا گور و کفن میں تجھے دونگی واللہ — ننگے سر تیرے جنازے کے چلونگی ہمراہ
مرنے والے ترا کیا نام ہے کیسا ہے تباہ — بولے مولا ابھی چالیس برس جینا ہے آہ

نام بیکس بھی ہے، قیدی بھی ہے، نادار بھی ہے
حال یہ ہے کہ اسیری بھی ہے، آزار بھی ہے

ہند نے پوچھا مرض کیا ہے، کہا بے پدری — رو کے وہ بولی دوا کیا ہے، کہا نوحہ گری
گھر جو دریافت کیا کہنے لگے دربدری — بولی لیتا ہے خبر کون، کہا بے خبری

آہ کرنے کا سبب پوچھا تو شرمانے لگے
تازیانوں کے نشاں پشت پہ دکھلانے لگے

بولی وہ کون سے عصیاں پہ ملی یہ تعزیر — رو کے فرمایا گنہ کچھ بھی نہ تھا بے تقصیر

اُسنے منہ پھیر لیا اور کہا ہو کب سے اسیر
بولے دسویں تھی محرّم کی جو پہنی زنجیر
کچھ کفن کے لیے ہمراہ نہیں لایا ہوں
باپ کو چھوڑ کے بیگور چلا آیا ہوں

سُنکے عابدؑ کے کلام اُسنے خوصولنے کہا
صاف کعبہ کے فصیحوں کا ہے لہجہ بخدا
مِل گیا حیدرِ کرّار کی باتوں کا مزا
اب چلو رانڈوں سے پوچھیں نہ ہنیں دو ایذا
پاس بیبوں کے جو وہ صاحبِ حشمت آئی
آلِ خاتونِ قیامت میں قیامت آئی

ہوش اُسکے گئے آتے ہی زنداں میں اکبار
دیکھا کہ چراغ سحری ہے کوئی بیمار
ہر چند اندھیرے میں نظر آنا ہے دشوار
پر اُسکے بدن کی ہیں رگیں صاف نمودار
لے سکتا ہی کروٹ نہ اُٹھا سکتا ہی سر کو
دم توڑتا ہی بند کیے دیدۂ تر کو

سوجے ہوے پاؤں ہیں تو زنجیر ہی بھاری
شانوں کی رسن خون سے آلودہ ہے ساری
ناگاہ کنیز ایک قریب آکے پکاری
یوسفؑ میں جسے کہتی تھی وہ ہی یہی واری
اس سے خبرِ حضرتِ شبیرؑ ہی پوچھو
اور شوق سے پھر خواب کی تعبیر ہی پوچھو

ماتھے پہ دھرے ہاتھ جھکی ہندِ خوش ایماں
کہنے لگی مڑ کر طرفِ عابدؑ ذیشاں
آداب بجا لاتی ہوں اے یوسفِ زنداں
حضرت نے کہا خیر ہی اے ششدر و حیراں
آداب مرا کیا کہ حقیر اور حزیں ہوں

ہوں سوگ نشیں کنبے کا اور خاک نشیں ہوں

یوسف مجھے کس واسطے تو کہتی ہے ہر بار — وہ مصر کے حاکم تھے میں ہوں بیکس و ناچار
تب ہند یہ بولی قسمِ حیدرِ کرار — چہرے سے ترے جاہ و جلالت ہے نمودار

شوکت میں جلالت میں اسیری میں بلا میں
اس عہد کے یوسف ہو تمہیں خلقِ خدا میں

نام آیا مصیبت کا تو عابد ہوئے گریاں — فرمایا یہ درجہ تو ہے یوسف سے فراواں
گھر سے گئے یوسف تو ہوئے مصر کے سلطاں — ہم نکلے وطن سے تو بھرا گھر ہوا ویراں

یوسف نے زمانے میں یہ محشر نہیں دیکھا
ماں بہنوں کو بلوے میں کھلے سر نہیں دیکھا

یوسف کا فقط باپ کی فرقت میں کٹا دل — اور بعد جدائی کے ہوا وصل بھی حاصل
پر ہاتھ رکھے میرے جگر پر کوئی عادل — اٹھارہ عزیز آنکھوں کے آگے ہوئے بسمل

ہم گھر میں رہے اور سفر کر گئے بابا
ملنے کی بھی امید نہیں، مر گئے بابا

یوسف نے لہو باپ کا منہ پر نہ ملا تھا — دل پیاس سے تن دھوپ سے کب انکا جلا تھا
یوں طوق میں اور رسّی میں اُن کا نہ گلا تھا — یعقوب کا فرزند نہ کانٹوں پہ چلا تھا

درّے نہ لگے تھے تنِ یوسف پہ جفا کے
یہ تو کہا اور رونے لگے پشت دکھا کے

آنکھوں کو ملا ہند نے درّوں کے نشاں پر — پر کان کھڑے اُسکے ہوئے طرزِ بیاں پر
کی عرض، تصدق میں لبِ لعل فشاں پر — قربان فصیحانِ عرب تیری زباں پر

بالکل پسرِ فاطمہؑ زہرا کا بیاں ہے
گویا ترے منہ میں شہِ والا کی زباں ہے

تم فاطمہؑ کے پیارے کے پیارے تو نہیں ہو؟
مکّے کے مدینے کے ستارے تو نہیں ہو؟

بی بی کہو شہزادے ہمارے تو نہیں ہو؟
کیوں، بانوؑ کے تم راج دُلارے تو نہیں ہو؟

آنکھوں کے تلے پھرتی ہے سجادؑ کی صورت
تم ہو حسنؑ پاک کے داماد کی صورت
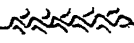
۱۱- ہند زندانِ شام میں پہونچکر ایک ایک سے امام حسینؑ کے حالات اور اہلحرم کی کیفیت دریافت کرتی ہے۔ اُسکے اور اہلِ حرم کے سوال و جواب

دربانوں سے یہ کہہ کے ہوئی داخلِ زنداں
جس طرح خفی اور جلی معنیِ قرآں

یوں اُسکو اسیروں میں ملی زینبؑ نالاں
یا جیسے عیاں اور نہاں حکمتِ یزداں

گلدستۂ سادات میں پیدا بھی نہاں بھی
جسطرح سے بو پھولوں میں مخفی بھی عیاں بھی

دیکھا جو بغور اُن کو تو چلّائی وہ رو رو
زینبؑ مری آنکھوں کے تلے پھرتی ہے لوگو

یہ کون ہے زنداں میں؟ خدا خیر کرے لو!
جھک کر کہا زینبؑ سے کہ مشتاق ہوں بولو

یہ عرش زمیں پر ہے کہ تم خاک نشیں ہو
سلمانؓ و ابوذرؓ کی خوزادی تو نہیں ہو؟

ہمسائے کو ہمسایہ بہت ہوتا ہے پیارا
اب ہائے حسیناؑ جو وظیفہ ہے تمہارا

یاں آپ ہیں زنداں میں، اُدھر گھر ہے ہمارا
یہ کون ہے تم لوگوں کا بتلاؤ خدارا

میں صاحب انصاف ہوں مجھ سے نہ ڈرو تم
چاہو تو مرے گھر میں قدم رنجہ کرو تم

آنکھوں پہ مرے، سر پہ مرے، پاؤں تمہارے
یہ بچے جو تھرا رہے ہیں خوف کے مارے
حاکم مرا سرتن سے اُتارے تو اُتارے
کس شمع کے یہ شعلے ہیں؟ کس برج کے تارے

دھڑکوں میں یہاں ننھا سا دل انکا پھٹے گا
شب خیر سے گذریگی تو کل دن نہ کٹے گا

وہ بولی کہ ہمسائگی شاہ و گدا کیا
شیروں کو اجل کھا گئی بچوں کی قضا کیا
جب غیر کے بس میں ہوئے ایذا کا گلا کیا
فرزند جواں مر گئے تو ہم نے کیا کیا

نے فرش کے قابل ہیں نہ ایوان کے قابل
رہنے دے کہ ہم ہیں اسی زندان کے قابل

ان حالوں سے تو قصر میں لیجائے گی مجکو
کیا کہتی ہے، واللہ حیا آئے گی مجکو
مسند پہ کھلے بالوں سے بٹھلائے گی مجکو
مانے گا نہ جی لاکھ تو سمجھائے گی مجکو

یاں خاک اُڑاتی ہوں وہاں ہات ملونگی
زندان میں تقدیر کو کیا چھوڑ چلونگی

شبیرؑ ہیں حلال مہمات کے پیارے
وارث نہیں کوئی، یہی وارث ہیں ہمارے
اُن کو نہ پکارے تو کوئی کسکو پکارے
بیووں کے وسیلے ہیں یتیموں کے سہارے

یثرب کے سوا اور عزیز اُنکے کہاں ہیں
محکوم ہم اُنکے یہ امامِ دوجہاں ہیں

ہاں کہیے تو کس طرح ہے اُس شہر کا والی
یارب، کبھی زہراؑ کا بھرا گھر نہو خالی
شبیرؑ، امامِ دوجہاں سیدِ عالی
آسودہ ہیں مولا کے اہالی و موالی؟

آزار تو کوئی نہیں پہونچاتا ہے بی بی؟
اُنکے درِ دولت پہ ولید آتا ہے بی بی؟

اب کون اذاں دیتا ہے مسجد میں نبیؐ کی
بخشی ہے خدا نے اُسے آواز علیؑ کی
یاں دھوم ہے ہمشکلِ رسولؐ عربی کی
اللہ کو مقبول اذاں ہوگی اُسی کی

اکبرؑ پہ عجب لطفِ قدیرِ ازلی ہے
ہمشکلِ نبیؐ ہے تو ہم آوازِ علیؑ ہے

فرمائیے جاگیر کھُلی خیبر کی
موقوف ہوئی فاقہ کشی آلِ عبا کی
آیا فدک اب ملک میں شاہِ شہدا کی
ہمشیر تو اچھی ہے شہِ ارض و سما کی

شادی مرے آگے ہوئی تھی فضلِ خدا سے
اب نامِ خدا کتنے ہیں حیدرؑ کے نواسے؟

زینبؑ نے کہا یاد تو ہے حال یہ سارا
جب حج کے لیے قافلہ نکلا تھا ہمارا
پرسُن تو خلاصہ کہ نہیں طول کا یارا
تھا خیر سے بی بی اسداللہ کا پیارا

مجرائی بھی آسودہ تھے اور شاہِ زمن بھی
اُس روز تو بھائی بھی سلامت تھا بہن بھی

اُس سے تو یہ فرمایا پہ جی میں کہا رو کر
اک دفعہ جھکیں لونڈیاں سجدے کو برابر
بھائی کا گلا کٹ گیا جیتی رہی خواہر!
اور ہندسے کی عرض کہ آیا تمہیں باور؟

لو زیب دہِ تختِ امامت ہے خوزادہ

بی بی کو مبارک ہو سلامت ہی خوزادہ

خوش ہو کے وہ زینبؑ کے قریں آ کو بھی آئی
اور بولی کہ لو تم کو مبارک ہو رہائی
تم نے مرے مولا کی خبر مجکو سُنائی
مرتی تھی میں ہولوں سے مری جان بچائی

نائب تمہیں اپنا پے سادات کرونگی
اور ساتھ میں کچھ ہدیہ و سوغات کرونگی

کل تم جو مع الخیر ہو یثرب کو روانا
پہلے مرے آقا ہی کی سرکار میں جانا
ایک ایک کو سب نذر کا اسباب دکھانا
مُنہ چوم کے اصغرؑ کو علی بند پہنانا

الفت ہی برابر مجھے سادات عرب کی
لینا مری جانب سے بلائیں وہاں سب کی

نعلین پہ زینبؑ کے جُھکا دیجیو سر کو
دینا مرا پیغام یہ اُس نیک سیر کو
لونڈی تمہیں یاد آئی، نہ زہراؑ کے پسر کو
تم سے یہ توقع نہ تھی مجھ خستہ جگر کو

لونڈی نے تمہیں واسطہ شبیرؑ کا لکھا
تم خط نہ لکھو، یہ مری تقدیر کا لکھا

گو نامہ و پیغام ہے دستور جہاں کا
مطلب تھا مگر اس میں یہ مجھ سوختہ جاں کا
ہوتا ہے معلوم تمہیں حال یہاں کا
بدخواہ زمانہ ہے شہنشاہِ زماں کا

ہر لحظہ بلا رد ہو حسینؑ ابن علیؑ کی
آقا کو مرے ضامنی اللہ و نبیؐ کی

کچھ سوچ کے پھر لونڈیوں کو واں سے ہٹایا
اور جُھکے سے یہ دخترِ زہراؑ کو سُنایا
زینبؑ سے یہ کہنا کہ بُرا وقت اب آیا
اللہ رکھے شیعوں پہ شبیرؑ کا سایا

کان اُسکے بھرے لوگوں نے شہر کی طرف سے
حاکم کو عداوت ہوئی زہراؑ کے خلف سے

مدت سے وہ بتجویز میں ہے مکر و دغا کی
کو عاشقِ زار آپ ہیں شاہِ شہدا کی
لکھا ہی ولید اُس کو خبر شاہِ ہدا کی
پر تم کو میں دیتی ہوں قسم خیر نسا کی

مشتاق ہیں کے خط کوفے سے آئیں کہ یمن سے
جانے نہ کہیں دیکھیو بھائی کو وطن سے

یہ ذکر تھا کہ ہند چلی آئی یک بیک
پہونچی درود پڑھتی ہوئی وہ حرم تلک
زخمِ جگر پہ بیبیوں کے چھڑکا گیا نمک
دیکھا زمیں پہ عرش کہیں، اور کہیں فلک

قدرت سے کے آفتاب چمکتے نظر پڑے
باغِ نبیؐ کے پھول مہکتے نظر پڑے

رو کر پکاری، سینہ فگارو مرا سلام
زندان کی زمین کے تارو مرا سلام
ماتم نشینو، تعزیہ دارو مرا سلام
اے خاکسارو، عرش وقارو مرا سلام

ہیں سُن رہی ہوں در پہ کھڑی سب کے بین کو
روتا تھا تم میں کون جنابِ حسینؑ کو؟

ہے کونسی وہ کوکھ جلی بے نصیب ماں
شرما کے اک دُلہن بھی تو کرتی تھی کچھ بیاں
جو کہہ رہی تھی ہائے علی اکبرؑ جواں
یہ کون پوچھتا تھا کہ اصغرؑ گیا کہاں

تم اپنے پیاروں کے لیے بیچین ہوتے ہو
یا حضرتِ علیؑ کے عزیزوں کو روتے ہو؟

سب تو رہے خموش پہ زینبؑ نے یہ کہا
اے بی بی بیچ واسوں سے تو پوچھتی ہو کیا
کب ہوش رونے پیٹنے میں رہتے ہیں بجا
کیا جانے ہم نے کیا کہا، اور تو نے کیا سُنا
شبّیرؑ کو، نہ اکبرؑ و اصغرؑ کو روتے ہیں
اے بی بی ہم تو اپنے مقدّر کو روتے ہیں

کی عرض اُسنے دل ہی مرا اضطراب میں
ملنے ابھی رسولؐ کو دیکھا ہی خواب میں
جلوہ ہی اُنکے نور کا بالکل جناب میں
کیا ہیں جناب آلِ رسالتمآبؐ ہیں؟
زینبؑ ہو ٹھیک ٹھیک سکونت وقار میں
دولت سرا حضور کا ہے کس دیار میں؟

زینبؑ پکاری خیر ہی، زینبؑ بھلا کہاں
بلوے میں ہائے آلِ رسولؐ خدا کہاں
گھر اپنا قید خانہ ہی، دولت سرا کہاں
نادار ہیں، محل کہاں فرش و ردا کہاں
ہم چھٹ گئے وطن سے، وطن ہمسے چھٹ گیا
بہنیا! غریب خانہ بھی غربت میں لٹ گیا

سارے شرف دیئے ہمیں، قربانِ کبریا
ہمسایہ ہم کو صاحبِ معراج کا کیا
ہر صبح دیکھتے تھے رُخ شاہِ انبیا
اب تو فلک نے خاک میں ہم کو ملا دیا
کب عادلوں کے دور میں ایسے حقیر تھے
شیرِ خداؑ کے عہد میں ہم بھی امیر تھے

جب ہم کو یاد اپنے گلُ اندام آتے ہیں
مرتے نہیں پہ موت کے پیغام آتے ہیں
لب پر علیؑ کے لاڈلوں کے نام آتے ہیں
مشکل کے وقت سب کے یہی کام آتے ہیں
ہر وقت اِک چھُری سی کلیجے پہ چلتی ہے

حیرت ہے جان کیوں نہیں تن سے نکلتی ہے

زینبؑ کی سرگذشت پہ پیٹی وہ اپنا سر
ان حادثوں میں منہ سے نکل آتا ہے جگر
کھائی قسم کہ صبر ہی بس ختم آپ پر
ایوبؑ سے بھی صبر نہ ہوتا یہ الحذر

اتنا سنا ہے گھر پہ امام امم نہیں
ان قدموں کی قسم کہ مرے دم میں دم نہیں

گھر ہے بزیر سایۂ دیوارِ اہلبیتؑ
اتنا ہی کہدو، زندہ ہے سردارِ اہلبیتؑ
معلوم پھر تمہیں نہیں اخبارِ اہلبیتؑ
شبیرؑ ابنِ فاطمہؑ سالارِ اہلبیتؑ

شاہ نجف کے خرد و کلاں سب ہیں خیر سے
ہمشکل آپ کی مری زینبؑ ہیں خیر سے

پڑھتی ہوں کلمہ احمدِ ثانی کا ہر گھڑی
ہر لحظہ پیشِ چشم وہ تصویر ہے کھڑی
اکبرؑ ہے نام عمر بھی اکبرؑ کی ہو بڑی
اٹھارہویں برس کی گرہ اس برس پڑی

شہرت تو ملک ملک ہے اُنکے جمال کی
ٹھہری ہے بات بھی کہیں بانوؑ کے لال کی؟

اس بات پر تڑپ گئی بانوئے خوشخصال
زینبؑ کی فغاں میں ہوئی پال کہ نہال
رو کر پکاری ہائے جوانمرگ میرے لال
بولی سکینہؑ دیکھ کے سب کا تباہ حال

یارب بخیر خاتمہ ہو اس بیان کا
کیوں اماں ذکر ہے یہ مرے بھائی جان کا

بانوؑ نے ہاتھ رکھدیا منہ پر کہ چپ رہو
چلائی ہند بی بی تمہیں منہ سے کچھ کہو
عزت کا ہے خیال تو خاموش ڈکھ سنو
زہراؑ سے حشر میں کہیں لونڈی خجل نہو

عابدؑ کی ماں ہو زوجۂ شاہِ دو کون ہو؟
صدقہ جوانیِ علی اکبرؑ کا کون ہو؟

دل کو سنبھال کر کہا زینبؑ نے آہ آہ
کیا مر گئے حسینؑ جو بانوؑ ہوئی تباہ
بدخواہ تو امام کی ہے یا کہ خیرخواہ
ہوتا ہے قید یوں کہیں ناموسِ بادشاہ

ایسا غضب بھی ہونے لگا کیا زمانے میں
ہمصورتِ رسولؐ کی ماں قید خانے میں!!

فضہؑ کو بھی تبا کبھی دیکھا ہے ننگے سر؟
شرما کے پھر یہ کہنے لگی ہندِ خوش سیر
اس عہد میں رسولؐ کی ہو آل دربدر!!
بی بی میں کیا کروں کہ پھٹا جاتا ہے جگر

گذرا ہے کچھ تو فاطمہؑ کے نازنین پر
بارش لہو کی ہو گئی دن سے زمین پر

تم کہتی ہو کہ خیر سے ہے آلِ مصطفاؐ
آنکھوں پہ اس کنیز کے فرمانا آپ کا
اللہ اُن کی عمر کرے خضر سے سوا
قول آپ کا میں رد کروں توبہ مجال کیا

میں کب یہ چاہتی ہوں کہ زینبؑ کو چین ہو
بی بی! خدا یونہیں کرے زندہ حسینؑ ہو

میں جان و دل سے جانِ پیمبرؐ پہ ہوں فدا
بدخواہِ ابنِ شیرِ خدا ہوں گی میں بھلا؟
لونڈی پہ آئے زینبؑ و کلثومؑ کی بلا
دنیا میں اُس گھڑی کو مجھے موت دے خدا

گو فال بد نکالنا منہ سے زبون ہے
پر کس طرح چھپے گا یہ سیّد کا خون ہے

قائل کریں حضور کہ پھر وجہ کیا ہوئی
کیوں ذوالفقار قبضے سے شہ کے جدا ہوئی[1]

[1] ہند لوٹ کے اسباب میں ذوالفقار جناب امیرؑ لینے گئی دیکھ آئی تھی ۱۲

بیہوش بنتِ حضرتِ مشکل کشا ہوئی
اور پشتِ قید خانہ سے پیدا صدا ہوئی

اے ہند اہلبیتؑ سے شبیرؑ چھٹ گیا
بچہ مرا شہید ہوا کنبہ لٹ گیا

یہ نوحہ تھا جو ہند قریب آ گئی ناگاہ
پہلو میں تڑپ کر یہ پکارا دل آگاہ
دیکھا کبھی زینبؑ کو کبھی سوئے سرِ شاہ
یہ بنتِ یداللہؑ ہے وہ ابنِ یداللہؑ

سر ننگے ہے یہ صاحبِ معراج کا کنبہ
یا ہے یہ کسی بیکس و محتاج کا کنبہ

پھر جوڑ کے ہاتوں کو یہ بولی وہ خوش اعمال
لونڈی ہے کوئی ساتھ کہ میں پوچھوں گی احوال
کیوں اے شرفا زادیو تم سب تو ہو بیحال
رو کر کہا زینبؑ نے کہ اے صاحبِ اقبال

مقدور کہاں لونڈیوں کا ہم غربا ہیں
بدتر ہیں کنیزوں سے، فقیروں سے سوا ہیں

زینبؑ پہ نظر فضہ نے کی سر کو پھرا کے
خود ہند سے فرمانے لگی سر کو جھکا کے
زینبؑ نے اُسے منع کیا آنکھ دکھا کے
محتاج ہوئے تھے کبھی سادات، خدا کے

کچھ خیر ہے بی بی تجھے لے نام خدا کا
شاہد ہے خدا کنبہ ہے شاہِ شہدا کا

حیرت سے وہ چلائی کہ شاہِ شہدا کون؟
کچھ سوچ کے پوچھا کہ یہ ہے فاطمہ کا کون؟
یہ نام سنا آج شہِ کرب و بلا کون؟
میں واری گئی آپ کی ہیں خیر نسا کون؟

بیٹی کوئی زہرا کی ہے ان میں کہ بہو ہے

بالکل کسی بی بی میں مری بی بی کی خو ہے

صاحب ابھی ہوش اتنا ہی محجوب سرپا کو
پہچانتی ہوں دختر حیدرؑ کی صدا کو

بھولی ہوں نہ زینبؑ کو نہیں خیر نسا کو
رکھ سکتا ہی پردے میں کوئی نور خدا کو

لونڈی ہی اُنکی خوار نمک خوار انہیں کی
صورت یہ انہیں کی ہے یہ گفتار انہیں کی

زہراؑ کا گھرانا مجھے کیا بھول گیا ہی
فرش اُن کا بچھانا مجھے کیا بھول گیا ہی

تسلیم کو جانا مجھے کیا بھول گیا ہی
نعلین اُٹھانا مجھے کیا بھول گیا ہی

زہراؑ کی طرح خاص قدیر ازلی ہو
سو میں کہوں لاکھوں میں تمہیں بنت علیؑ ہو

زینبؑ نے فغاں کی کہ یہ اصرار غضب ہے
سیدانی کے قابل یہ قلق ہی یہ تعب ہے

تو بیبی زینبؑ کا لحاظ اور ادب ہے
زینبؑ اگر آئی یہاں یہ قدرت رب ہے

اُن کی یہ لیاقت ہی کہ دربار میں آئیں
سر کھولے ہوئے شام کے بازار میں آئیں

زینبؑ ہے وہ زینبؑ کہ ہی تو جنکی نمکخوار
اکبرؑ سا پسر قاسمؑ و عباسؑ جلودار

زینبؑ ہے وہ زینبؑ کہ بڑی جنکی ہی سرکار
زینبؑ وہ ہی جو مسند زہراؑ کی ہی مختار

یہ پیاروں موئی کا ہیکو ہونے لگی زینبؑ
یہ کہتے ہی منہ پھیر کے رونے لگی زینبؑ

اُس دم سر شہ طشت میں تڑپا کئی باری
اے ہند یہی خواہر بیکس ہے ہماری

آنکھوں سے لہو منہ سے یہ کلمہ ہوا جاری
ٹُرکر یہ پکاری میں اس آدار کے واری

ہے ہے پسرِ فاطمہؑ زہراؑ کا یہ سر ہے!
لونڈی کو نہ تھا علم کہ آقا کا یہ سر ہے!!

۱۲- حضرت سجادؑ اور حضرتِ زینبؑ اپنا حال بہت چھپاتی ہیں۔ مگر آخر ضبط نہیں ہوتا۔

یہ سنتے ہی غش آگیا زینبؑ کو قضارا
چلائے کہ خاموش ہو اے ہند خدارا
سجادؑ بھی تڑپے نہ رہا ضبط کا یارا
حاکم نے ترے حاکمِ کونین کو مارا

زہراؑ کو قلق تیسرے بیٹے کا دیا ہے
شوہر نے ترے ماں کو مری بیوہ کیا ہے

ہے ہے کسے زینبؑ نہ نکلنے دے وطن سے
یثرب بھی چھٹا گھر بھی چھٹا شاہِ زمن سے
بھائی تو جدا ہو گیا مقتل میں بہن سے
سر کی بھی جدائی ہوئی بابا کے بدن سے

زینبؑ نہ وطن میں ہے نہ شبیرؑ وطن میں
سر ننگے یہ زنداں میں وہ بیگور ہے رن میں

پہلے سے نہ لکھ بھیجے یہ اخبار غضب کے
شعبان میں مہماں تھے حرم کعبۂ رب کے
یثرب سے پدر نکلے مہینے میں رجب کے
عاشور کو جنگل میں گلے کٹ گئے سب کے

عرصہ ہوا اے ہند شہادت کو پدر کی
چالیسواں بابا کا ہے بستم کو صفر کی

جس دم یہ پیام ہند نے زینبؑ کو یہ دیا
آنکھوں سے خونِ دل کو بہا کر وہ بے نوا
پھر تو نہ ضبط دخترِ زہراؑ سے ہو سکا
بولی میں کس حسینؑ کو سنغام دوں ترا

بیٹا ہے جو کہ فاتحِ بدر و حنین کا
لایا ہے شمر کاٹ کے سر اُس حسینؑ کا

اے ہند باغِ فاطمہؑ زہرا خزاں ہوا
سجّادؑ ہے یہ بیڑیاں پہنے ہوئے پڑا
اکبرؑ بھی مر گیا علی اصغرؑ بھی مر گیا
ہے خواہرِ حسینؑ کو تیرا پیام کیا

بھائی کی لاش چھوڑ کے جنگل میں آئی ہوں
زینبؑ میں ہی وہ فاطمہؑ زہرا کی جائی ہوں

تو جانتی ہے شب کو ہوئی دفن فاطمہؑ
پرسا حسینؑ کا نہ کسی نے مجھے دیا
انبوہ میں پھری میں کھلے سر برہنہ پا
امت نے مصطفیٰؐ کی اُتاری مری ردا

ایذا دی ظالموں نے شہِ کائنات کو
باندھا رسن سے دخترِ زہراؑ کے ہات کو

---

۱۳ - امام حسینؑ اور اہلِ حرم کے صحیح صحیح حالات معلوم ہو جانے پر ہند کی بیقراری ۔ آہ و زاری اور بین جگر خراش ۔

تب پہلوئے زینبؑ میں وہ گر کر یہ پکاری
چلائی کنیزوں کو دمِ نالہ و زاری
ہے ہے مری مخدومہ کونین کی پیاری
لو لُٹ گئی اب پانچویں سرکار ہماری

سر پیٹو، مرے بال پریشاں کرو لوگو
زینبؑ یہی نکلی، مجھے قرباں کرو لوگو

شانوں میں رسن پاؤں میں زنجیر کو دیکھو
اس عصر میں سیدانی کی توقیر کو دیکھو
چھلتا ہے گلا طوق گلوگیر کو دیکھو
زندان کو اور خواہرِ شبیرؑ کو دیکھو

مجرا کرو، خاطر کرو، عزت کرو لوگو
آؤ مری بی بی کی زیارت کرو لوگو

چلائیں کنیزیں کہ سعادت ہے ہماری
سچ کہتی ہو بی بی - یہی بی بی ہیں تمہاری؟
کھاؤ تو قسم پنجتنؑ پاک کی واری
یہ حضرتِ زینبؑ ہیں یداللہؑ کی پیاری

نانا کو اسی بی بی کے معراج ہوئی ہے
ہی ہی نہ کہو یہ تو کوئی پیاروں موئی ہے

بخشی تھی قطار اونٹوں کی حیدرؑ نے گدا کو
اس عہد میں بیٹی ہوئی محتاج ردا کو!
کیا بھول گئے لوگ پیمبرؐ کو خدا کو
پہچانیے خوب ان کی شباہت کو صدا کو

ہودج میں نہ محمل میں نہ ایوان میں دیکھا
کونین کی شہزادی کو زندان میں دیکھا!!

اُس دم سرِ شہ طشت میں تڑپا کئی باری
آنکھوں سے لہو، منہ سے یہ کلمہ ہوا جاری
اے ہند یہی خواہرِ بیکس ہے ہماری
بڑھ کر وہ پکاری میں اس آواز کے واری

ہی ہی پسرِ فاطمہؑ زہرا کا یہ سر ہے!
لونڈی کو نہ تھا علم کہ آقا کا یہ سر ہے

حیران تھی میں کون شہِ کرب و بلا ہے
اب سمجھی لقب یہ مرے سیدؑ کو ملا ہے
ہی ہی مرے مولا تو ہی شاہِ شہداؑ ہے
مذبوحِ قفا ہے، تو ہی مسلوبِ رداؑ ہے

آدابِ پیمبرؐ نہ کیا ہائے شقی نے
اس طشت کی خاطر تجھے پالا تھا نبیؐ نے

ایوبؑ ترے صبر و شکیبائی کے صدقے
عیسیٰؑ مرے عیسیٰ کی مسیحائی کے صدقے
یوسفؑ تری زیبائی و رعنائی کے صدقے
یحییٰؑ تری مظلومی و تنہائی کے صدقے

لونڈی تری اعجاز نمائی کے تصدق
کونین تری وعدہ وفائی کے تصدق

حضرت مرے گھر قتل کے میدان سے آئے
لکھا تھا جو کچھ ویسے ہی سامان سے آئے
سر ننگے حرم کوفہ کے زندان سے آئے
اے صادق الاقرار نئی شان سے آئے

یثرب میں چڑھے دوشِ رسولؐ دوجہاں پر
اس شہر کے کوچوں میں پھرے نوکِ سناں پر

آقا کہو لشکر کو کہاں چھوڑ کے آئے؟
عباسؑ کے رخسارِ منور نہ دکھائے
قاسمؑ کو نہ لائے علی اکبرؑ کو نہ لائے
اصغرؑ نہیں لونڈی کسے جھولے میں جھلائے

آواز یہ دی سر نے کہ تنہا نہیں ہم ہیں
سب پیاروں کے سر نیزوں کی نوکوں پہ علم ہیں
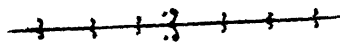
۱۴۔ حضرت سکینہؑ کی زندانِ شام میں وفات اور ماں کے دلخراش نالے۔

جب گُل ہوا چراغِ حرم قیدِ شام میں
دیکھے ستم یزید کے دربارِ عام میں
یعنی سکینہؑ مر گئی یادِ امام میں
شہ کے سلام کو گئی دار السلام میں

دنیا میں دادرس نہ ملا دادخواہ کو
جاکر نشاں طمانچوں کے دکھلائے شاہ کو

غل پڑ گیا حسینؑ کی عاشق نے کی قضا
بانوؑ نے نبض دیکھی تو پایا نہ دم ذرا

چلاّئی صدقے جاؤں مجھے دے چلیں دُعا ۔ اپنی کہی نہ میری سُنی ہائے کیا کیا

اصغرؑ کو کچھ پیام بھی ہیں نے دیا نہیں
تم چل بسیں اور امّاں نے رخصت کیا نہیں

بابا کی پیاری، امّاں کی پیاری، زباں کو کھول ۔ شربت میں لائی اے مری پیاسی دہاں کو کھول
ماں رو رہی ہے دیدۂ گوہر فشاں کو کھول ۔ مہماں بندھے گلے سے نہ جا ریسماں کو کھول

دادی کریہنگی بی بی کی زلفیں سنوار دوں
لو اُٹھو یہ پھٹا ہوا کرتہ اُتار دوں

اصغرؑ کی بھولی باتیں سُناؤ نثار ماں ۔ اکبرؑ کا ذکر کرکے رولاؤ نثار ماں
سیلی کا نیل ماں کو دکھاؤ نثار ماں ۔ بابا کو جاکے در پہ بُلاؤ نثار ماں

ماتم کے غلغلے ہیں شہ رونے کے جوش ہیں
بی بی جواب خموش ہیں تو سب خموش ہیں

منہ ڈھانپنے کا وقت ہے پچھلا پہر ہوا ۔ بابا کو تیرے روتی ہوں اُٹھ ساتھ دے مرا
کُرتے سے منہ کو ڈھانپ کے پہلو میں بیٹھ جا ۔ امّاں کی بیٹی امّاں کو آواز تو سُنا

ماتم سرا یہ گھر تھا ترے بین کرنے سے
زندان سونا ہو گیا بی بی کے مرنے سے

یاں کس کے پاس رہتیں شہ کربلا نہیں ۔ بی بی کے ناز اُٹھانے کی خاطر چچا نہیں
نادار ماں ہے پانی نہیں اور غذا نہیں ۔ پر اب کفن کیواسطے بے بے ردا نہیں

امّاں کے پاس رہنے کی ایذا اُٹھا چکیں
بی بی طمانچے کھا چکیں گردن بندھا چکیں

جب خانۂ زنداں میں سکینہؑ نے قضا کی — ولہ — دیکھا سرِ شبیرؑ کو اور جان فدا کی
رو کر کہا بانوؑ نے کہ فریاد خدا کی — کیا خوب مرے درد کی قسمت نے دوا کی

مقتل میں تو اکبرؑ سے اور اصغرؑ سے چھٹی میں
زنداں میں اس لاڈلی دختر سے چھٹی میں

اسوقت نظر آتی ہے دنیا مجھے ویراں — اب موت جو آجائے تو نکلے مرا ارماں
سب لوگ کہیں بیٹی یہ مادر ہوئی قرباں — ہیں رن میں حسینؑ اکبرؑ و اصغرؑ کے نگہباں

فرزند تو ہیں شاہِ مدینہ کی برابر
بانوؑ کی بنے قبر سکینہؑ کی برابر

پھر بولی سکینہؑ کی وہ میت سے لپٹ کر — ہے ہے یہ تری موت یہ ناداری مادر
بانوؑ تو ہے محتاج کفن دے تمہیں کیونکر — نے غسل کو پانی ہے نہ تابوت میسّر

پوچھے کوئی یہ درد اسیروں کے جگر سے
ہم رو نہیں سکتے ہیں تمہیں شمر کے ڈر سے

لو شمر گھر کتا ہے تمہیں اے مری پیاری — اب ڈر کے لپٹتی نہیں چھاتی سے ہماری
دربار میں پھر مجکو لیے جاتے ہیں ناری — تم باندھ کے ہاتوں کو سفارش کردواری

اصغرؑ کو میں اب روتی ہوں سمجھاؤ سکینہ
دربار میں بانوؑ کی عوض جاؤ سکینہ

اب ہم سے نہیں پوچھتیں کب آئینگے بابا — اب ذکر نہیں کرتیں کہ کب چھوڑینگے اعدا
اب ماں سے نہیں کہتیں کہ دم گھٹتا ہے میرا — اب یادِ وطن ہے نہ غمِ فرقتِ صغراؑ

اب کانوں کا دکھ درد سناتیں نہیں ہم کو

اب نیل طمانچوں کے دکھاتیں نہیں ہم کو

عباسؑ کی تم کو میں قسم دیتی ہوں پیاری!
لینا مری جانب سے بلائیں کئی باری
اصغرؑ سے ملاقات ہو جس وقت تمہاری
اور کہیو کہ دائی سے خطا کیا ہوئی واری

ظاہر میں اگر شکل کو دکھلا نہیں سکتے
کیا خواب میں بھی گھٹنوؤں تم آ نہیں سکتے

جب داغِ بیکسی نہ سکینہؑ اٹھا سکی
کھائے طمانچے شمر کے جبتک کہ کھا سکی
اور سوزِ دل نہ خوف کے مارے سُنا سکی
سِن کم تھا دُکھ بہت تھے نہ برداشت لا سکی

روئی تو ظالموں نے جفا بے شمار کی
آخر یہ جبر دیکھ کے موت اختیار کی

گر آہ کی تو شمر پکارا خموش ہو
گر شدّتِ عطش میں پکاری کہ پانی دو
اور چپ ہوئی تو بے پدری نے کہا کہ رو
گر یاد کر کے رہ گئی بابا کی پیاس کو

سوئی جو آنسو پونچھ کے چشمِ پُر آب سے
ہی ہی حسینؑ کہہ کے وہ اُٹھ بیٹھی خواب سے

دل میں سما گیا تھا جو شمرِ لعیں کا ڈر
فریاد، چھینتا ہے گُہر شمرِ بد گُہر
سوتے میں بھی پکارتی تھی چونک چونک کر
امّاں بچاؤ درہ لیے آتا ہے عمر

زینبؑ پھوپی دوہائی کلیجہ دھڑکتا ہے
سجادؑ بھائی دیکھو یہ خولی گھُرکتا ہے

بے فرش سوتے سوتے جمی پیرہن میں گرد
رہنے لگا تڑپتے تڑپتے بدن میں درد

دل غم سے جلتے جلتے ہوا زندگی سے سرد
تھا فاقہ کرتے کرتے بدن خشک چہرہ زرد
چلّا کے رونا شمر کی دہشت سے چھٹ گیا
یاں تک گلا بندھا کہ دم آخر کو گھٹ گیا

جب پیاس لگتی رو کے چچا کو پکارتی
دُکھتے جو کان شاہِ ہدا کو پکارتی
آتا نہ جب کوئی تو خدا کو پکارتی
جینے سے تنگ آکے قضا کو پکارتی
کہتی تھی لے چچا نہ امامِ امم رہے
رُلوانے کو عدو ہے رونے کو ہم رہے

---

۱۵ - اہلِ حرم کا قید سے چھوٹ کر حضرت سکینہؑ کی قبر پر رخصت کے واسطے آنا۔

جب قبرِ سکینہؑ پہ حرم آئے سوم کو
مرقد پہ گلِ لختِ جگر لائے سوم کو
یوں گردِ لحد بیٹھ کے چلّائے سوم کو
سامانِ سوم بھی نہ ہوا ہائے سوم کو
نادم ہیں تری روح سے ہم آج سکینہؑ
اے سورۂ الحمد کی محتاج سکینہؑ

بی بی ترا حق ہم سے ادا ہو نہیں سکتا
اس قبر پہ سامانِ عزا ہو نہیں سکتا
نیت میں جو ہے شوقِ بکا ہو نہیں سکتا
کچھ فاتحہ خوانی کے سوا ہو نہیں سکتا
مظلومی کا مرنا ہے غریبی کا سوم ہے
ہاں بہنیں تہیدست ہیں بی بی کا سوم ہے

اے فاطمہؑ کی پوتی شہِ تشنہ کی جائی
کنبہ کی تری موت نے کی عقدہ کشائی
بازو بھی رسن سے کھلے اور لوٹ بھی پائی
ہاتھ آیا سرِ بادشہِ کرب و بلائی

حاکم نے دیا زیور و اسباب حرم کو
اک تم نہ ملیں اور تو سب کچھ ملا ہم کو

کس نحس گھڑی کان سے اُترے تھے یہ گوہر
پھر تم کو پہننا نہ ہوا ان کا میسر
ہی ہی تمہیں کب لایا تھا زنداں میں مقدّر
جو مُردہ ہی زنداں سے نکلا ترا باہر

کُنبے سے چھُٹی جب، تو چُھٹی قیدِ محن سے
دم نکلا بدن سے تو گلا نکلا رسن سے

اس نوحہ سے بانوؑ کو رہی تاب نہ اصلا
بالینِ لحد گر پڑی اور بولی وہ دُکھیا
ماں آئی ہے آواز دے اے عاشقِ بابا
یہ تیسرا دن ہے کہ نہیں بی بی کو دیکھا

کچھ حال کہو اپنا کہ دل میرا حزیں ہے
صدقے گئی اب درد تو کانوں میں نہیں ہے؟

ہی پیشِ نظر بی بی کا ہر چیز پہ ہٹنا
وہ بلوے میں منہ پھیر کے کُرتے کا اُلٹنا
وہ شمر سے ڈرنا وہ گلے میرے لپٹنا
بڑھنا وہ غم و رنج کا اور عمر کا گھٹنا

مرنے تلک آواز یہ آیا کی دہن سے
فریاد کہ چھلتا ہے گلا میرا رسن سے

تجکو قسمِ مرگِ شبابِ علی اکبرؑ
دل کو تری فرقت میں تسلّی نہیں دم بھر
نیند آگئی بن ماں کے تمہیں قبر میں کیونکر
ہے ہے نہ سُلایا مجھے پہلو میں برابر

حضرت کی جُدائی کا بڑا رنج و قلق تھا
بابا ہی کا حق تم پہ تھا مادر کا نہ حق تھا

ہی ہی کسے اب لیکے مدینہ کو میں جاؤں
ہی ہی کسے اب ناقہ پہ پہلو میں بٹھاؤں

ہی ہی کسے اب جاکے میں صغرا سے ملاؤں
ہی ہی کسے اب سرِ شہِ والا کا دکھاؤں

سجادؑ کو صحت کی دعائیں نہیں دیتیں
واری! سرِ سرور کی بلائیں نہیں لیتیں

سر ننگے پھری ہائے غضب میں سرِ بازار
استادہ رہی روبروے تختِ ستمگار
زنداں سے گئی بیڑیاں پہنے ہوئے دربار
یہ حال مرا دیکھ کے تم ہوگئیں بیزار

دیکھے جو حقارت سے بندھے ہات ہمارے
غصے ہوئیں بی بی نہ رہیں سات ہمارے

لو میں ہی گنہگار سہی منہ سے تو بولو
پہلو میں مرے بیٹھ کے پھر باپ کو رو لو
جاتی ہوں مدینے کو بغلگیر تو ہو لو
ہے آخری دیدار مرا آنکھوں کو کھولو

کس طرح لحد میں تمھیں اب چین پڑا ہے
سب قافلہ لوٹا ہوا ملنے کو کھڑا ہے

مناظرِ قدرت[۱]
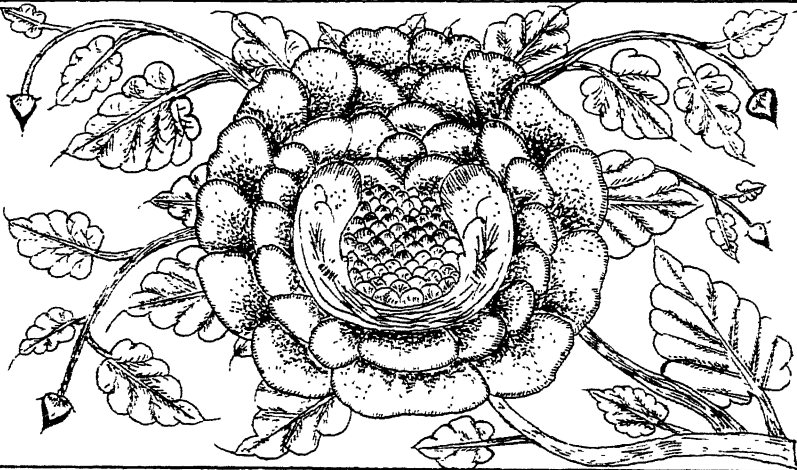
صبح کا سماں

بوے بہشت آئی تھی بادِ نسیم سے	گویا جہاں میں آئی تھی باغِ نعیم سے
عنبر کی بو خجل تھی گلوں کی شمیم سے	شبنم کے دُر خوش آب تھے دُرِّ یتیم سے

ایسی ہوا موافقِ گلزار ہو گئی
جو تندرست نرگسِ بیمار ہو گئی

تازہ کیا نسیمِ سحر نے چمن کا رنگ	لالہ مٹا رہا تھا عقیقِ یمن کا رنگ
تھا یاسمن کے پھولوں میں دُرِّ عدن کا رنگ	غنچہ کی بُو سے اُڑتا تھا مشکِ ختن کا رنگ

کھِل کھِل کے پھول نافوں کی صوت مہکتے تھے
ذکرِ خدا میں مرغِ خوش الحاں چہکتے تھے

۱؎ ہم نے بیان کیا ہی کہ مرزا صاحب کے کلام میں ہر رنگ کا جلوہ موجود ہی چنانچہ ہر عنوان کے متعلق ہم نے اُن کا صاف اور شستہ کلام انتخاب کیا ہی جیسا کہ میر انیس کا رنگ ہی۔ لیکن صبح وغیرہ مناظرِ قدرت کے بیان میں اُنھوں نے اپنے طرزِ خاص کو چھوڑ کر سلاست اور روانی پر توجہ نہیں کی۔ اسلیے ہمنے اُنکے طرزِ خاص کا کلام ہی منتخب کر لیا ہے تاکہ کوئی عنوان خالی نہ رہے۔

یہاں پر اسقدر بیان کر دینا ضروری ہی کہ مناظرِ قدرت کا سماں دکھانے میں جیسے میر انیس کے کلام میں صاف۔ شستہ۔ اور بیساختہ اشعار پائے جاتے ہیں، مرزا دبیر کے ہاں نہیں ملتے۔ اسلیے کہہ سکتے ہیں کہ مناظرِ قدرت کی تصویر کھینچنے میں میر انیس لاجواب شاعر ہیں۔ ۱۲

گلگونۂ شفق جو ملا حورِ صبح نے
گرمی دکھائی روشنیِ طورِ صبح نے
اسپند مشکِ شب کو کیا نورِ صبح نے
ٹھنڈے چراغ کر دیئے کافورِ صبح نے

لیلائے شب کے حسن کی دولت جو لٹ گئی
افشاں جبیں سے انجمِ درخشاں کی چھٹ گئی

پیدا ہوا سپیدۂ طلعت نشانِ صبح
باندھا عمامہ نور کا، پہنا کتانِ صبح
سلطانِ صبح نے کیا قصدِ اذانِ صبح
چرخِ چہارمی پہ گیا خطبہ خوانِ صبح

رخ سب کے سوئے قبلۂ امید ہو گئے
سرگرمِ سجدہ عیسیٰ و خورشید ہو گئے

آیا عروج پر شہِ گیتی ستانِ مہر
لی روز نے پناہ بزیرِ نشانِ مہر
پرچم کشا ہوا علمِ زر فشانِ مہر
اور لشکرِ شعاع نے تانی سنانِ مہر

نیزہ کرن کا دیدۂ گردوں میں ڈالکر
مغرب میں پھینکی رات کی پتلی نکالکر

ذرّوں میں نورِ مہر در آیا قمر قمر
بڑھ کر نقیبِ نور پکارا سحر سحر
لوٹا سحر نے معدنِ شبنم گہر گہر
فرمان نجوم و بدر کو پہونچا بدر بدر

برقع جو اٹھ گیا تھا رخِ آفتاب کا
پردہ تھا فاش صبحِ ملمع نقاب کا
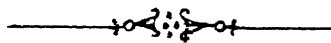
خورشید آسماں نے جو الٹا نقاب کو
معدوم کر کے چشمِ خلائق سے خواب کو
بے نور کر دیا ورقِ ماہتاب کو
دکھلا دیا سحر نے رخِ بے حجاب کو

پرتو پڑا جو روشنیِ آفتاب کا
دریا میں قمقمہ ہوا روشن حباب کا

جاروب لیکے خطِ شعاعی کی آفتاب
میداں کو جھاڑنے نکل آیا بصد شتاب
یعنی کہ ہوں میں خاکِ درِ ابنِ بوتراب
خدمت اس آستانِ مبارک کی ہے ثواب
از بس کہ روزِ قتلِ شہِ نامدار تھا
موجِ نسیمِ صبح کو بھی اضطرار تھا

ہنگامِ صبح عابدِ شب زندہ دارِ ماہ
چلنے لگا لپیٹ کے سجادۂ سیاہ
دن آیا مہر کی جو لیے ساتھ سجدہ گاہ
تسبیحِ اختراں ہوئی پنہاں دمِ پگاہ
بیٹھے ہوئے تھے سبطِ نبیؐ جانماز پر
جھکتے تھے بار بار زمینِ نیاز پر

مرنے پہ مستعد تھے عزیزانِ باوقار
لکھا ہی رخ پہ رنگِ شہادت کی تھی بہار
ہاتوں میں سبحہ، مستعدِ ذکرِ کردگار
آتی تھی فاطمہؑ کی یہ آواز بار بار
اب روشنی تمام ہے ہر اک چراغ کی
یہ آخری بہار ہے زہراؑ کے باغ کی

خورشید نے برہم جو کیا دفترِ انجم
سالارِ قمر لے کے چلا لشکرِ انجم
ذرّوں کو تجلّی نے کیا ہمسرِ انجم
زائل صدفِ شب سے ہوئے گوہرِ انجم
انگشتریِ صبح کا خورشید نگیں تھا
کیا خوب نگیں تھا کہ جہاں زیرِ نگیں تھا

منشیِ سحر، مہر سے لیکر قلمِ زر
فردِ سیہ شب کو کیا خارجِ دفتر
لکھنے لگا معزولی و منصوبیِ لشکر
منصوب ہوا عاملِ روز اپنی جگہ پر

چہرہ نہ رہا دفترِ انجم میں کسی کا
پروانہ چراغوں کو ملا برطرفی کا

اوراقِ فلک خطِ شعاعی سے محشّا
تھی سورۂ واللیل کی تفسیر ہر اک جا
اطباقِ زمیں غیرتِ اوراقِ مطلّا
معنیٔ جعل الشمس ضیاءً کے ہویدا

دنیا میں نہ ظلمت شبِ یلدا کی رہی تھی
پر ایک سیاہی رخِ اعدا کی رہی تھی

جب سرنگوں ہوا علمِ کہکشانِ شب
تیرِ شہاب سے ہوئی خالی کمانِ شب
خورشید کے نشاں نے مٹایا نشانِ شب
تا نی نہ پھر شعاعِ قمر نے سنانِ شب

آئی جو صبح زیورِ جنگی سنوار کے
شب نے زرہ ستاروں کی رکھدی اتار کے

شمشیرِ مشرقی جو چڑھی چرخ پر شتاب
تھا بسکہ گرم خنجرِ بیضائے آفتاب
پھر تیغِ مغربی نے دکھائی نہ آب و تاب
باقی رہا نہ چشمۂ نیلوفری میں آب

محتاج ماہتاب ہوا آب و تاب کا
باغِ جہاں میں پھول کھلا آفتاب کا

نکلا جو صیدِ شب کو خدیوِ جہانِ صبح
سلطانِ شرق دوش پہ رکھے نشانِ صبح
ناوک شعاعِ مہر تھی، گردوں کمانِ صبح
شبدیز ابلق فلکی زیرِ رانِ صبح

عالم تھا محو، عالمِ نیّر فروز کا
تارِ شعاع، دام تھا عنقائے روز کا

پیدا شعاعِ مہر کی مقراض جب ہوئی
اور قطع زلفِ لیلیٰ زُہرہ لقب ہوئی
پنہاں درازیِ پرِ طاؤسِ شب ہوئی
مجنوں صفت قبائے سحر چاک سب ہوئی

فکرِ رفو تھی چرخِ ہنر مند کے لیے
دن چار ٹکڑے ہو گیا پیوند کے لیے

نکلا افق سے عابدِ روشن ضمیرِ صبح
کھولا سپیدی نے جو مصلّائے پیرِ صبح
محرابِ آسماں ہوئی جلوہ پذیرِ صبح
پھر سجدہ گاہ بن گیا مہرِ منیرِ صبح

کرتے تھے سب غروب کا سجدہ وَدُود کو
سیّارے ہفت عضو بنے تھے سجود کو

یوسفؑ غریقِ چاہِ سیہ ناگہاں ہوا
یونسؑ دہانِ ماہیِ شب سے عیاں ہوا
یعنی غروبِ ماہِ تجلّی نشاں ہوا
یعنی طلوع نیّرِ مشرق ستاں ہوا

فرعونِ شب سے معرکہ آرا تھا آفتاب
دن تھا کلیم اور یدِ بیضا تھا آفتاب

سایہ جہاں جہاں تھا وہاں نور ہو گیا
گویا کہ زنگ آئینے سے دُور ہو گیا
پھر مشکِ شب جہان سے کافور ہو گیا
باطل رسالۂ شبِ دیجور ہو گیا

کیا پختہ روشنائی تھی قدرت کے خامے میں
مضموں تھا آفتاب کا ذرّوں کے نامے میں

کیا روسفید فوجِ خدا ہے حضورِ صبح
رخ سے طلوع مہر، جبیں سے ظہورِ صبح
آئی ہی اُنکے عقدِ عبادت میں حورِ صبح
اک سمت اُن کا نور ہی اک سمت نورِ صبح

سر سجدے میں، بدن ہیں قعود و قیام میں
کیا صبح کی بہار ہے فوجِ امام میں

پایا ہی روزگار نے انسے سراغِ صبح
روشن ہی انکے نور سے ایسا دماغِ صبح
خوشبو سے ان گلوں کی مہکتا ہی باغِ صبح
خورشید جھلملاتا ہے مثلِ چراغِ صبح

یہ حکمراں ہیں مشتری و ماہتاب پر
سکہ پڑا ہے اشرفیِ آفتاب پر
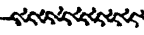
رات کا سماں

مغرب سے نمایاں ہوئی جسدم شبِ عاشور
دل خلق کا کرنے لگی برہم شبِ عاشور
کچھ صبحِ قیامت سے نہ تھی کم شبِ عاشور
زینبؑ کو ہوئی جامۂ ماتم شبِ عاشور

ظلمت کی ردا اسلیے ہر سمت پڑی تھی
سر کھولے ہوئے فاطمہؑ مقتل میں کھڑی تھی

جسوقت پڑا سکۂ شب سیمِ قمر پر
مریخ کا خنجر جو چلا ترکِ سحر پر
پھر کوئی نہ راغب ہوا خورشید کے زر پر
بن بن کے شفق خون چڑھا چرخ کے سر پر

کیواں علم۔ ایوان فلک۔ او چاند نگیں تھا
آفاق سلیماں کی طرح زیرِ نگیں تھا

شب تھی کہ سیہ بختیِ کفار ہر اک سو
چشمِ سیہ قہر تھی، یا ظلم کا گیسو

کجرو صفتِ نقشِ نگیں تھے جو وہ بدخو
آخر کو ہوئے شب کی سیاہی سے سیہ رو

روشن ہے سیہ کار وہ سب فوجِ جفا تھی
معدوم ہوئے نام سیاہی جو سوا تھی

صد حیف کیا عدل زمانے نے فراموش
شبیرؑ کے اطفال تھے یاں پیاس سے بیہوش
دریا تو دیا ظالموں کو بہرِ خور و نوش
دریائے رواں دامنِ شب سے ہوا روپوش

پیاسے تھے جو اطفال شہِ تشنہ گلو کے
تھی غم کی گرہ دل میں حبابِ لبِ جو کے

مشتاقِ نمازِ ابنِ علیؑ خیمے سے آیا
تسبیح ستاروں کی فلک نذر کو لایا
مہتاب نے سجادۂ مہتاب[1] بچھایا
مولا نے بھی ایک ایک نمازی کو بلایا

فرمایا غنیمت ہے جو کچھ طاعتِ رب ہو
لاشے پہ نماز اپنے خدا جانیے کب ہو

وہ شب کا اندھیرا وہ بیاباں کی سیاہی
آباد وہ گھر، اور وہ اکبار تباہی
گرمی کی وہ پیاس اور وہ پانی کی مناہی
یہ حادثہ اور آلِ نبیؐ، شانِ الٰہی!

اگر فرش پہ سو جاتے تھے روتے ہوئے بچے
پھر پیاس سے چونک اُٹھتے تھے سوتے ہوئے بچے

سن سن کی صدا آتی تھی میدانِ بلا سے
اور خیمے میں بجھنا وہ چراغوں کا ہوا سے
غش ہوتے تھے اطفال درندوں کی صدا سے
پوچھے کوئی اس حادثہ کو آلِ عبا سے

اک ہاتھ سے ماں لیتی تھی صغراؑ کی بلائیں
اک ہاتھ رکھے سینے پہ دیتی تھی دعائیں

[1] چاندنی ۱۲

گرمی کا سماں

تنہا کھڑے ہیں رن میں امامِ فلک جناب
گرمی دکھا رہا ہے قیامت کی آفتاب
بے آگ مرغِ قبلہ نما ہوتے ہیں کباب
خطِ غبار سے ہے لپی ابریِ سحاب
چھالا ہے آفتاب کا گردونکے پاؤں میں
خود چھپ رہی ہے دھوپ درختونکی چھاؤں میں

مٹی خراب چرخ پہ ہے برجِ آب کی
رنگت ہے برجِ حوت میں ماہی کباب کی
دریا میں آنکھ بیٹھ گئی ہے حباب کی
حدّت ہے موج موج میں تیرِ شہاب کی
فوّارے کو نہ حوض میں گرمی سے کل پڑی
پانی کی بھی زبان دہن سے نکل پڑی

آتش بدل بھنور ہیں تو موجیں ہیں شعلہ وش
آتے ہیں مچھلیوں کو حرارت سے غش پہ غش
سوزِ جگر سے مردمِ آبی ہیں نالہ کش
نوحہ ہے تین روز کے پیاسوں کا العطش
نزدیک ہے کہ زہد کو بے آبرو کریں
تر دامنی سے شہروں میں زاہد وضو کریں

اکثر منجموں نے لکھا ہے یہ ہمدگر
جس سال نامِ شہ پہ پڑا قرعۂ سفر
تھی اُس برس یہ شدّتِ گرما کہ الحذر
مثلِ چنار آگ سے جلتا تھا ہر شجر
جائے غبار ریگ سے شعلے بلند تھے
مجمرِ زمین گرم تھی ذرّے سپند تھے

مثلِ تنور گرم تھا پانی میں ہر حباب
ہوتی تھیں سیخِ موج پہ مرغابیاں کباب
گلخن صدف تھے، دانۂ بریاں دُرِ خوش آب
آتش سے اپنی لعلِ بدخشاں تھا آب آب

یہ دھوپ تھی کہ دانے کا بچنا محال تھا
دانہ بچا بھی جلنے سے تو خال خال تھا
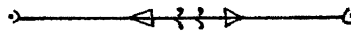
نایاب ہیں مرغانِ ہوا صورتِ عنقا
بیٹھے ہیں سراسیمہ چرندے لبِ دریا
بالائے فلک ایک پرندہ نہیں پیدا
پر اوجِ امامت کا ہما رن میں ہے تنہا
کیا قہر ہے سایہ نہیں اور دھوپ کڑی ہے
کیا ظلم ہے پانی نہیں اور پیاس بڑی ہے

سرسام فلک کو ہوا ہے گرم ہوا سے
شب ہو تو ملے شیر کو اک کفِ پا سے
کافورِ قمر اُڑ گیا ہے دارِ شفا سے
گرمی یہ ہے اور عابدؑ بیمار ہیں پیاسے
بالائے زمیں دھوپ کی زردی سی عیاں ہے
گردوں کو ہے سرسام زمیں کو یرقاں ہے

مانندِ چنار آگ سے ہر نخل ہے روشن
خرمن کے لیے شعلہ ہے ہر دانۂ خرمن
اس دھوپ میں ہے خاک پہ سادات کا گلشن
ہفتاد و دو تن کشتہ ہیں اور زندہ ہے اک تن
چہروں پہ سپر روکے ستمگار کھڑے ہیں
اکبرؑ سیران کی تھے سو مقتول پڑے ہیں
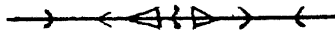
لکھا ہے عجب فصل میں یثرب سے چلے شاہ
یہ دھوپ کی شدت تھی کہ العظمۃ للہ
ان روزوں میں چلتا تھا مسافر نہ کوئی راہ
پرواز سے تھا مرغِ تصور کو بھی اکراہ
لو چلتی تھی ایسی کہ جلے جاتے تھے ذرّے

اسپند کی مانند نظر آتے تھے ذرّے

تپتی تھی زمیں آہنِ حدّاد کی تمثال | شہبازِ نگہ کھول نہ سکتا تھا پر و بال
خرمن میں ہر اک دانہ سیہ تھا صفتِ خال | بے رنگِ شفق منہ فلکِ سبز کا تھا لال

اس فصل کی حدّت اگر آجائے بیاں میں
اغلب ہے کہ چھالے پڑیں خامے کی زباں میں

گیسو دکھا رہے تھے تباہی حواس کی | ولہ | کانٹے زباں کے تولتے تھے قدر پیاس کی
نبضیں چھٹیں شرر کی سقر کانپنے لگے | ولہ | شعلے زباں نکال کے خود ہانپنے لگے
کیا دھوپ ہے کیا تابشِ خورشیدِ فلک ہے | ولہ | سایہ اسی گرمی سے سیہ آج تلک ہے
سایے کی تجسس میں بشر پھرتے ہیں ششدر | ولہ | سایہ پسِ دیوار و شجر بیٹھا ہے چھپ کر
سب لیتے پناہ اپنے ہی سایہ میں مقرّر | | پر دھوپ نے سایہ ہی جلا ڈالا سراسر

ع - گرمی کی یہ حد تھی کہ ہوا ہانپ رہی تھی -

منظر

یعنی سین

اس کی تعریف ہم مؤلف کے الفاظ ہی میں بیان کیے دیتے ہیں۔ کسی خاص واقعہ یا کسی خاص حالت کی تصویر کھینچنا جسکو انگریزی میں سین کہتے ہیں، واقعہ نگاری کی ایک قسم ہی۔ عام واقعہ نگاری اور سین میں یہ فرق ہی کہ واقعہ نگاری میں ہر واقعہ انفرادی حیثیت رکھتا ہی، بخلاف اسکے سین اُس کیفیت کا نام ہی جو متعدد واقعات یا واقعہ کی متعدد جزئیات کے مجموعہ سے پیدا ہوتی ہی۔ مثلاً اس شعر میں ؎

لُوں چلتی ہی خاک اُڑتی ہی، ہی ظہر کا ہنگام　　تنہا یہ چلی آتی ہی اُمڈی سپہ شام

لوں کا چلنا، خاک کا اُڑنا، ظہر کا وقت ہونا۔ فوجوں کا اُمنڈنا۔ ہر چیز کو الگ الگ لیا جائے تو واقعہ ہی، اور ان سب کو مجموعی حیثیت سے دیکھا جائے تو سین ہی۔ اب ہم مرزا صاحب کے کلام سے چند مثالیں ذیل میں درج کرتے ہیں۔

مثال ۱۔ نزع کی حالت۔

حضرت علی اکبرؑ نزع کی حالت میں ہیں۔ امام حسینؑ انکے سرہانے موجود ہیں اُسوقت کی حالت

غیر حالت ہوئی اتنے میں علی اکبرؑ کی　　اک نگہ یاس کی سوئے پدر و مادر کی

منکا ڈھلنے لگا، اور تکیے سے گردن کی ‌ ‌ سینے پر منہ سے انگوٹھی گری پیغمبر کی

مُردنی چھا گئی رخسارۂ نورانی پر
موت کا آیا عرق چاند سی پیشانی پر

ولہ

یٰسین پڑھ کے حمدِ الٰہی بیان کی ‌ ‌ لو لگ گئی خدا سے پھری لو جو کان کی
آسان موت کر گئے ہر نوجوان کی ‌ ‌ بن بیاہے دوستوں پہ فدا اپنی جان کی

منکا خدا کی یاد میں تکیے پہ ڈھل گیا
تھرّا کے یا علیؑ کہا اور دم نکل گیا

حضرت عباسؑ کی حالتِ نزع

یہ کہتے تھے جو نزع کی حالت ہوئی طاری ‌ ‌ گردن جو ڈھلی بھائی کو دیکھا کئی باری
تن کانپا۔ ہلیں انگلیاں بھی پاؤں کی ساری ‌ ‌ اشک آنکھوں سے اور کلمہ زباں سے ہوا جاری

جھپکی نہ پلک بھی کہ قضا کر گئے عباسؑ
آنکھیں سوئے مولا رہیں اور مر گئے عباسؑ

یہ کہہ کے تبسم کیا پھر لب نہ ہلایا ‌ ‌ سینے میں رکی سانس، جبیں پر عرق آیا
آنکھوں کی سیاہی کو سفیدی نے چھپایا ‌ ‌ منکا جو ڈھلا سر قدمِ شہ پہ جھکایا

غش ہو گئے شبیرؑ قضا کر گئے عباسؑ
تھرّا کے بدن رہ گیا اور مر گئے عباسؑ

حضرت اصغرؑ کی حالتِ نزع

کیا سِن تھا تیر کھاتے ہی بچہ بلک گیا
تڑپا جو شہ کے ہاتھوں پہ قیامت سرک گیا
سوکھے گلے میں خون بھرا دم اٹک گیا
ٹوپی گری زمین پہ منکا ڈھلک گیا

ننھی کلائیوں میں تشنج سے بل پڑے
ہچکی جو آئی منہ سے انگوٹھے نکل پڑے
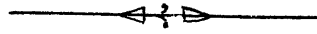
جونہیں معصوم کی گردن پہ لگا تیرِ جفا
منہ سے دودھ اور لہو ڈالکے تڑپا بچہ
ڈر گیا، سہم گیا، شہ کے گلے سے لپٹا
منہ پہ منہ رکھدیا شبیرؑ کے اور کچھ نہ کہا

نہ تو گردش ہوئی آنکھوں کو نہ منہ زرد ہوا
بازو اک بار ہلا ننھا سا اور سرد ہوا
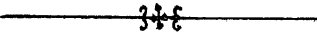
پیاس کی شدت سے حضرت سکینہؑ کی بیہوشی اور نازک حالت کی تصویر

آگے جو بڑھے آپ نظر آئی قیامت
وہ پھول سی رنگت ہے نہ وہ چاند سی صورت
دیکھے نہ چچا کوئی بھتیجی کی یہ حالت
بند آنکھیں ہیں یا سوتی ہے ماں باپ کی قسمت

قطرے عرقِ ضعف کے بالائے جبیں ہیں
بل کھائے ہوئے ہاتھ کہیں پاؤں کہیں ہیں

مثال ۲-

گرمی کی شدت میں لوگوں کی حالت

دو دو قدم پہ ہوتے ہیں اطفال بے حواس
یوں قافلہ ہے گردِ علمدارِ حق شناس
اک پانی پانی کہتا ہے اور ایک پیاس پیاس
جس طرح پیاسے حشر میں کوثر کے آس پاس
عباسؑ شانِ ساقیِ کوثر دکھاتے ہیں
اک دم میں ساری فوج کو پانی پلاتے ہیں

فرماتے ہیں حسینؑ غضب کی تپش ہے ہائے
کہتے ہیں خیر خواہ نہ وہ دن خدا دکھائے
کیا ہو جو ایسی دھوپ میں پانی نہ ہاتھ آئے!
مولا جواب دیتے ہیں اللہ ہی بچائے
پانی جو ہے تو منزلوں میں پیتے جاؤ گے
آتا ہے اک مقام کہ قطرہ نہ پاؤ گے

اب یوں کتب میں منزلِ آخر کا ہے بیاں
منزل دراز، رات سیہ، راہ بے نشاں
زہراؑ کا چاند اوّلِ شب کو ہوا رواں
جنگل مہیب، خارِ مغیلاں یہاں وہاں
تن غازیوں کے کانٹوں سے افگار ہو گئے
آلودہ خار سے گُلِ بے خار ہو گئے

سنبل صفت قبا ہوئی ہر گُل کی تار تار
زینبؑ حسینؑ کے لیے ہو کے بیقرار
پلکوں کی طرح بھر گئے چشمِ زرہ میں خار
کہتی تھی، ڈھال روک لو مُنہ پر، بہن نثار
کانٹے غضب ہیں باگ اُٹھائے ہوئے چلو
اکبرؑ کو بھی سپر میں چھُپائے ہوئے چلو

مثال ۳

صغیر السن بچہ نزع کی حالت میں

بانوؑ کے شیر خوار کو ہفتم سے پیاس ہے
نے دودھ ہے، نہ پانی کے ملنے کی آس ہے
بچے کی نبض دیکھ کے ماں بدحواس ہے
پھرتی ہے آس پاس یہ جینے سے یاس ہے

کہتی ہے، کیا کروں میں دہائی حسینؑ کی
پتلی پھری ہے آج مرے نورِ عین کی

فریاد یا علیؑ میں کدھر جاؤں یا علیؑ
کس طرح انکے سانس کو ٹھہراؤں یا علیؑ
ان داغوں کو کہاں سے جگر لاؤں یا علیؑ
پانی کا قحط ہے میں کہاں پاؤں یا علیؑ

پچھلے کو آنکھ کھولی تھی، اب کھولتے نہیں
روتے نہیں، ہمکتے نہیں، بولتے نہیں

اب کس کی بامراد بڑھاؤنگی ہنسلیاں
تیور بدل بدل کے پھراتے ہیں پتلیاں
ہے ہے کرخت ہو گئیں یہ نرم انگلیاں
لے لیکے الٹے سانس گراتے ہیں بجلیاں

باقی حواس پیاس سے معصوم کے نہیں
منہ میں انگوٹھے لیتے ہیں اور چوستے نہیں

رونا نہ جانتے تھے سدا مسکراتے تھے
گودی سے میری جھومیں جب لپٹ جاتے تھے
پھیلا کے ہاتھ، گود میں یہ سب کی آتے تھے
جاتی تھی میں جدھر یہ ادھر منہ پھراتے تھے

کسکی نظر لگی، کہ میں نظروں سے گر گئی
وہ چاہ پیار اب نہ رہا، آنکھ پھر گئی

ہر دم سکینہ سامنے بھائی کے آتی ہے
ہاتوں میں لیکے انکے کھلونے دکھاتی ہے

سہلا کے ننھے تلوے یہ وہ کہہ سناتی ہے
من جاؤ بھائی جان سکینہ مناتی ہے

کڑھتی ہیں اماں، آنکھ بھی تم کھولتے نہیں
اللہ، ہم پکارتے ہیں بولتے نہیں

غصّے سے آنکھ بند ہے، یا تشنگی سے آہ
بے آپ کے پیا نہیں پانی، خدا گواہ
خالق کی تم پہ مہر، علیؑ کی تمہیں پناہ
صدقے گئی، پھر اور ہوا مجھ سے کیا گناہ

تیروں سے مشک چھد گئی مجھ بےحواس کی
پیاسی بہن سے لیلو قسم اپنی پیاس کی

سرننگے گرد جھولے کے سب کنبہ ہے بہم
تکیہ پہ سر ڈھلا ہوا رکھتے ہیں دمبدم
پھیلائے ہیں سمٹے ہوئے پاؤں کو حرم
چھاتی پہ ہاتھ رکھ کے کبھی دیکھتے ہیں دم

قرآن کی ہوا کبھی گھبرا کے دیتے ہیں
بانو کو دیکھتے ہیں تو منہ پھیر لیتے ہیں

آخر کہا یہ سب نے بلاؤ امام کو
اس بے زباں کا حال سناؤ امام کو
لاؤ خدا کے واسطے لاؤ امام کو
نیلی رگیں گلے کی دکھاؤ امام کو

اکبرؑ کی لاش لے گئے ہیں قتلگاہ میں
کوئی پکار لو وہ ابھی ہونگے راہ میں

دوسرے موقع پر فرماتے ہیں ؎

سن سن کے یہ تھے سبطِ نبیؐ اشک بہاتے
گہ دودھ بھری باچھوں پہ لب اپنے جھکاتے
اس مردے کو حضرت کبھی چھاتی سے لگاتے
ڈھلکی ہوئی گردن کبھی ہاتھوں سے اٹھاتے

لو بھر گئی تھی کان کی، منکا بھی ڈھلا تھا

الفت سے مگر منہ سوئے شاہِ شہدا تھا

جب بند ہوئیں نرگسی آنکھیں بھی قضارا
مقتل کی طرف دیکھ کے حضرت نے پکارا
موقوف ہوا باپ کے چہرہ کا نظارا
لو اے علی اکبرؑ علی اصغرؑ بھی سدھارا

گردن میں وہ چھوٹے سے تو ہاتھ اُسکے پڑے تھے
شہ گود میں مُردہ لیے حیران کھڑے تھے

پہونچا کے لاشِ اکبرِ عالی وقار کو
ہچکی لگی تھی پیاس سے اُس گلعذار کو
لائے حسینؑ ہا تو ں پہ اک شیرخوار کو
مُنہ کھولے دیکھتا تھا شہِ نامدار کو

ہلتے تھے ہونٹ بات سمجھ میں نہ آتی تھی
تالو لپک رہا تھا، زباں اینٹھی جاتی تھی

بس وہ کہ رحم کھائے ہر اک گبر اور یہود
ہونٹوں پہ رنگِ غنچۂ سوسن کا تھا نمود
وہ منہ گلاب سا کہ بڑے ہیں جسپہ سب درود
اور گورے گورے ہاتو نکی تھیں سب رگیں کبود

گھبرا کے سانس لیتے تھے آنکھیں پھراتے تھے
یہ ضعف تھا انگوٹھے بھی چوسے نہ جاتے تھے

مثال ۴۔

فوجوں کی آمد اور جنگ کی طیّاری

تھا لشکرِ شاہِ شہدا میں تو یہ ساماں
پتھر پہ رگڑتا تھا کوئی خنجرِ برّاں
آمادۂ پیکار تھی واں فوج بدایماں
خوش ہو کے بجھاتا تھا کوئی زہر میں پیکاں

گھیرے ہوئے دریا کو وہ سب فوجِ جفا تھی
تیاری قتلِ پسرِ شیرِ خدا تھی

للکار کے کہتے تھے وہ ظالم کہ ہے کیا دیر
کہتا تھا کوئی لشکرِ شبیرؑ کو لو گھیر
گو پیاس سے بیتاب ہیں اور جینے سے ہیں سیر
پر آئے نہ دریا کے کنارے پہ کوئی شیر

پانی خلفِ ساقیِ کوثر کو نہ دینا
اکبرؑ کا تو کیا ذکر ہے اصغرؑ کو نہ دینا

تھی نوفلِ ملعوں کی یہ ایک ایک سے گفتار
کاٹوں گا میں ہی شانۂ عباسؑ علمدار
ازرق نے کہا مجھ سا نہیں کوئی ستمگار
حلقوم پہ قاسمؑ کے چلیگی مری تلوار

تڑپے گا یہاں لاشۂ نوشاہ کفن کو
گھونگٹ میں دلہن روئیگی فرزندِ حسنؑ کو

اور شمرِ ستمگار کی تھی سب سے یہ تقریر
تم سب سے زیادہ مجھے ہاتھ آئیگی جاگیر
خونِ شہِ بیکس کی ہے پیاسی مری شمشیر
یہ خنجرِ خونخوار ہے اور گردنِ شبیرؑ

دل آتشِ اندوہ سے حیدرؑ کا جلے گا
خنجر مرا زہراؑ کے کلیجے پہ چلے گا

ولہ

ناگہ عمر کے قصد پہ قرنائے کی فغاں
بیداد کی گواہی کو ہر سو اٹھے نشاں
چلائے ہاتھ مل کے جلاجل کہ الاماں
نقارے سینے پیٹتے آگے ہوئے رواں

دی بوق نے ندا کہ دمِ شور و شین ہے
زہراؑ سے کہدو نوبتِ قتلِ حسینؑ ہے

خیمے میں دخترانِ علیؑ ہول کھاتی تھیں
پردہ اُٹھا کے وارثوں کو دیکھ جاتی تھیں
بہرِ دعا مصلّے برابر بچھاتی تھیں
گہ عالمِ ہراس میں زیور بڑھاتی تھیں

باجوں کے غل سے بچّوں کو دہشت جو ہوتی تھی
اصغرؑ کے دل پہ ہات رکھے بانو روتی تھی

زینبؑ زمیں پہ لوٹ کے کرتی تھی یہ کلام
ہے ہے بچے گا کاہے کو بھائی مرا امام
فوجوں کا یاں سے تا درِ کوفہ ہے اژدحام
قاصد بلاؤ، نامہ لکھو، اور یہ دو پیام

گھیرا ہے سب نے فاطمہؑ کے نورِ عین کو
آؤ مدینے والو، بچا لو حسینؑ کو

دیتی تھی یہ ندا کبھی، امّاں دُہائی ہے
بی بی! ترے قمر پہ گھٹا غم کی چھائی ہے
کہتی تھی گاہ، نرغے میں زینبؑ کا بھائی ہے
بابا مدد کرو کہ بلا سر پہ آئی ہے

گاہے پکارتی تھی رسالت مآب کو
نانا گہن لگا ہے ترے آفتاب کو

مثال ۵-

سفر کی طیاری

خط کوفہ سے آئے جو امامِ مدنی کو
پیغامِ اجل تھے وہ شہنشاہِ غنی کو
منظور کیا شہ نے غمِ بے وطنی کو
ناکامی و مظلومی و تشنہ دہنی کو

کہتے تھے مبارک ہمیں ایسا یہ سفر ہو
شاہِ شہدا، فاطمہؑ زہرا کا پسر ہو

اس کوچ میں اللہ بنائے مرے سب کام
انجامِ سفر بخششِ امّت کا ہو انجام
جمعیّتِ دل کا ہو سبب گردشِ ایّام
یوں گھر کو لٹاؤں کہ رہے حشر تلک نام
حاصل ہو وہ رتبہ جو کسی کو نہ ملا ہو
مرنے پہ لقب خلق میں شاہِ شہدا ہو

حسرت تھی کہ پہلوئے نبیؐ قبر کی جا ہو
اب دفن بھی ہوں یا کہ نہوں دیکھیے کیا ہو
قسمت میں یہ لکھا ہی کہ جب اپنی قضا ہو
سر دفن جدا ہو، تو بدن دفن جُدا ہو
کھینچونگا پس از قتل بھی ایذائے سفر کو
بالائے سناں ہوئیگی گردش مرے سر کو

پھر خط لیے داخل ہوئے گھر میں شہِ ذیجاہ
مضمون سے اُسکے کیا ایک ایک کو آگاہ
فرمایا کہ درپیش ہی کوفہ کی مجھے راہ
آب و خورش اُٹھا ہے مدینے سے مرا آہ
آئینگے زیارت کو بشر چار طرف کے
اک شہر بساؤنگا میں نزدیک نجف کے

پھر زینبؑ بیکس کو یہ رو رو کے پکارے
کیا کیا نہیں اس بھائی پہ احسان تمھارے
اب ساتھ چلو رونے کو لاشے پہ ہمارے
اسباب کے صندوق فراہم کرو سارے
ہم پر تو نہیں تازہ مصیبت یہ پڑی ہی
پر ساتھ ہی بچوں کا یہ تشویش بڑی ہی

بانوؓ سے یہ فرمایا کہ اے بانوے خوشذات
اولاد نہ پیاری ہو تو تم میرے چلو سات
اکبار اسیر اور تمھیں ہونا ہے ہیہات
شیریں سے بھی ہوئیگی اسیری میں ملاقات
سوغات میں کچھ اور تو کیا دیگی وہ تم کو

ہاں دیکھ کے سر ننگے ردا دے گی وہ تم کو

پھر جھولے میں صغرؑ سے کہا اے مرے نادان
رکھوا دو کسی اونٹ پہ جھولے کو مری جان

تم اپنے سفر کا نہیں کچھ کرتے ہو ساماں
ماں باپ کے گھر میں چھ مہینے کے ہو مہماں

گہوارے میں لیٹے ہوئے کیا ہنستے ہو گھر میں
اب چوسیو تم چل کے انگوٹھوں کو سفر میں

حضرت سے کہا مادرِ عباسؑ نے اس دم
جیسے گئے اب ، ویسے گئے بعدِ محرم

واری گئی گر قصد ہے کوفے کا مصمم
دیکھو تو میں واری کہ ہے کیا گرمی کا عالم

رخصت کرو قاسمؑ کو نہ ہمشکل نبیؐ کو
صدقے گئی تم بھیجدو عباسؑ علیؑ کو

امّ سلمہؓ بھی یہی رو رو کے پکاری
ضربت سرِ حیدرؑ پہ لگی تھی وہیں کاری

کوفے میں تو جانا ہی مناسب نہیں واری
آخر وہی کوفہ ہے وہی خلق ہے ساری

بن جائیگا سب کام یہیں حق کی مدد سے
صدقے گئی تم جاؤ نہ نانا کی لحد سے

امّ سلمہؓ سے یہ کہا شاہ نے رو کر
پر آپ کو معلوم یہ ہوئیگا مقرر

مانوں بسر و چشم کہا آپ کا مادر
محضر پہ مرے خون کے ہے مُہرِ پیمبرؐ

ابتک تو دعا دیتا تھا بیٹھا ہوا گھر میں
اب جاتا ہوں بخشانے کو امت کے سفر میں

یہ کہہ کے برآمد ہوئے گھر سے شہِ ابرار
تھرائے رواقِ نبوی کے در و دیوار

نقارہ بجا کوچ کا شبیرؑ کے اکبار
غل تھا کہ چلا لختِ دلِ حیدرِ کرار

زہراؑ و پیمبرؐ نے تو دنیا سے قضا کی
نوبت ہے یہ اب خاتمۂ آلِ عبا کی

رخصت کے لیے آتے تھے سب شہ کے سکّاں
پروانہ صفت ہوتے تھے شبّیر پہ قرباں
سب پنجۂ فرقت سے کیے چاک گریباں
فرماتے تھے شہ دیکھ کے ماتم کا وہ ساماں
اُسدن بھی یونہیں روئینگے سب رنج و محن میں
جب لُٹکے مرا قافلہ آئے گا وطن میں

پھر ہمسفروں سے یہ کہا شہ نے بتکرار
میں جبر کسی دوست پہ کرتا نہیں زنہار
دشمن کی بھی ایذا کا نہیں میں تو روادار
جو چاہے چلے ساتھ جو چاہے کرے انکار
اکبرؑ کو مرے لطفِ جوانی نہ ملے گا
یارو یہ سفر وہ ہے کہ پانی نہ ملے گا

وہ ساتھ چلے میرے جسے ہونا ہو برباد
بن بیٹوں کے ہو جائینگے واں صاحبِ اولاد
وہ ساتھ چلے میرے جو جنگل میں ہو آباد
وہ قصد کرے جسکو وطن کی نہ رہے یاد
محتاج ہوں بیکس ہوں نہ دولت ہے نہ زر ہے
اے دوستو تسلیم و رضا کا یہ سفر ہے

دنیا کا جو خواہاں ہو کرے ہم سے کنارا
عقبیٰ کا جو طالب ہو وہ دے ساتھ ہمارا
وہ آئے جسے رنج و مصیبت ہو گوارا
اب ایسی شہادت نہیں ملنے کی دوبارا
اس راہ سے نزدیک بہت باغِ ارم ہے
ہر ایک قدم باغِ جناں زیرِ قدم ہے

بعضوں نے تو یہ سُنکے کنارا کیا ہیہات
جو مرد تھے ابنِ شہِ مرداں کے چلے ساتھ

منزل کو روانہ ہوئے سب اشترِ سادات — مرکب پہ ہوا جلوہ نما سیّدِ خوش ذات

دیکھا نظرِ یاس سے پھر روضۂ جد کو
اور دُور سے مجرا کیا نانا کی لحد کو

ناگہ درازیِ چرخ نے دستِ جفا کیا — شیرازۂ ریاضِ رسالت کو وا کیا
زیر و زبر مخمّسِ آلِ عبا کیا — یعنی گھر اہلبیتؑ کا ماتم سرا کیا

غیر از حسینؑ سب سوئے دارالبقا گئے
شبّیرؑ بھی بلا و مصیبت میں آ گئے

جس دم وطن سے بے وطن آلِ عبا ہوئے — اور مبتلا بلا میں شہِ کربلا ہوئے
گویا یہ سوئے مرقدِ خیرالوریٰ ہوئے — لے قبر تجھ سے تیرے مجاور جدا ہوئے

ہر منزل و مقام پہ غازی ملول تھے
گرمی تھی، لو تھی، اور پیمبرؐ کے پھول تھے

اک روز چین سے نہ مدینے میں رہنے پائے — گرمی میں ننھے بچّے لیے کربلا میں آئے
عاشور کو تو ظلم نئے چرخ نے دکھائے — نو لاکھ نے یورش کیا ستّر دو تن پہ ہائے

پیاسوں کی روحیں تن سے تڑپ کر نکلتی تھیں
تیغیں گلوں پہ، برچھیاں سینوں پہ چلتی تھیں

وہ گرد وہ غبار، وہ شاہِ فلک جناب — وہ فوج کا گھن، وہ پیمبرؐ کا آفتاب
وہ صرصرِ خزاں، وہ چراغِ ابوتراب — وہ دھوپ اور وہ تیغوں کا سایہ وہ قحطِ آب

کاکل جواں کی گرد سے آلودہ ہوتی تھی

رو رو کے روح فاطمۂ اشک دھوتی تھی

مطلع

اے مومنو حسینؑ سے مقتل قریب ہے
شہرِ مدینہ دُور ہے جنگل قریب ہے
آخر ہے عمر منزلِ اوّل قریب ہے
زہراؑ کا چاند چھپتا ہے بادل قریب ہے

لینے کیواسطے ملک الموت آتے ہیں
شبّیرؑ اپنے پاؤں سے مقتل کو جاتے ہیں

اتنے میں صبحِ منزلِ آخر عیاں ہوئی
لیکن یہ صبح سبطِ نبیؐ کو کہاں ہوئی
جس جا سواری رُک کے شہؑ آگے رواں ہوئی
حیراں سپاہِ خسروِ کون و مکاں ہوئی

چھ گھوڑے بدلے دوشِ نبیؐ کے سوار نے
لیکن قدم بڑھایا نہ اک راہوار نے

وہ رخش جس سے ہوش صبا کے اُڑا کریں
گر اک اشارہ خامسِ آلِ عبا کریں
طے راہِ شش جہت کو وہ شش بادپا کریں
پڑجائیں بیڑیاں جو قضا کی تو کیا کریں

حیرت سے گھوڑے توسنِ تصویر بن گئے
نعلوں کے حلقے پاؤں کی زنجیر بن گئے

عبّاسؑ کو پکارے نہ آگے قدم بڑھاؤ
منزل یہی ہے چھاونی پردیسیوں کی چھاؤ
ہمشکلِ مصطفےٰؐ کو ندا دی بڑھے نہ جاؤ
بیٹا قنا تیں گھیر دو سر اپنے بھی سب لگاؤ

غرّے کو تو ہوا ہے ہمارا سفر تمام
دسویں کو ہوگا فاطمۂ زہراؑ کا گھر تمام

نقّارہ نوبتی نے بجایا مقام کا
یعنی یہاں سے کوچ ہے دارالسلام کا
خیمہ بپا ہوا جو شہِ خاص و عام کا
بھیجا فلک نے دُور سے تحفہ سلام کا

کھولا یہ پردہ خیمۂ شہ نے جہان پر
اک عرش ہی زمین پر اک آسمان پر

مثال ۶۔

گرمی اور گرمی کی شدت میں زن و مرد اور بچوں کی حالت

کعبے سے جب عراق کو فوجِ خدا چلی
شبیرؑ کی رکاب میں خیر النساؑ چلی
آلِ رسولؐ پاک سوئے کربلا چلی
مقتل سے پیشوائی کی خاطر قضا چلی

خورشید کی تپش سے مسافر ملول تھے
جنگل کی لو تھی اور پیمبرؐ کے پھول تھے

اس فصل میں تباہ نبیؐ کا سفینہ تھا
کن آفتوں میں حکمتِ حق کا خزینہ تھا
آوارہ کوہ و دشت میں شاہِ مدینہ تھا
عابدؑ کو تپ تھی، زرد جمالِ سکینہؑ تھا

اصغرؑ کا حال گرمی سے تغیر ہوتا تھا
اور خشک شیر بانوئے شبیرؑ ہوتا تھا

تھا فرطِ محبت سے یہ عباسؑ کا احوال
گھبرا کے ہلاتے تھے کبھی شاہ کو رومال
تھے پہلوئے حضرت میں بہت مضطرب الحال
سایہ کے لیے منہ پہ کبھی روکتے تھے ڈھال

رو کر کبھی کہتے مرے آقا کو بچانا
اس دھوپ سے یا رب گلِ زہراؑ کو بچانا

شورِ واعطشا
خیمہ میں بچوں کی حالت

اور خیمہ میں تھا غلغلۂ تشنہ دہانی … سب واعطشا کہتے تھے با اشک فشانی
پانی کے نہ ملنے سے جگر ہوتا تھا پانی … بے جان ہوئے جاتے تھے شبیرؑ کے جانی

سیدانیوں کے نازوں کے پالے ہوئے بچے
تھے غش میں زباں منہ سے نکالے ہوئے بچے

اک سمت کو بیہوش تھا عباسؑ کا دلبر … اک جا تھی تڑپتی شہِ مظلوم کی دختر
تھا غش میں کہیں باقرِؑ معصوم زمیں پر … دم توڑتا تھا ایک طرف جھولے میں اصغرؑ

پیاسوں کی فغاں سن کے جو پاس آتے تھے شبیرؑ
دیکھا جو نہ جاتا تھا تو پھر جاتے تھے شبیرؑ

غش پیاس سے دو بار سکینہؑ کو جب آیا … گھبرا کے علمدار کو میداں سے بلایا
وہ آئے تو لب خشک دکھا کر یہ سنایا … فریاد چچا پیاس نے ہے مجکو ستایا

سچ کہیئے مجھے آپ کے کہنے کا یقیں ہے
میں پیاسی ہوں کچھ تم کو قلق ہے کہ نہیں ہے

سب کنبہ میں مشہور تمہاری ہوں میں پیاری … پر حیف ہے گر تم بھی خبر لو نہ ہماری
ماں باپ کی کہلاکے میں دکھ درد کی ماری … بن باپ کے بچوں کی طرح کرتی ہوں زاری

شبیرؑ پدر جسکا ہو اور تم سا چچا ہو
افسوس وہ بچپن میں گرفتارِ بلا ہو

میدان کربلا کی ہولناکی کا سین

بیتابی و بیخوابی و ناکامی و ایذا ، … وہ شدتِ غم اور وہ کفار کا بلوا ،

کالی تو وہ شب اور خطرناک وہ صحرا	وہ بولنا شیروں کا وہ بچوں کا دہلنا

مثال ۷۔

لڑائی کی طیاری

کہتا ہے تول کر کوئی شمشیرِ آبدار	اے تو سہی کہ چھین لیں میدانِ کارزار
کہتا ہے کوئی بڑھ کے یہ اکبرؑ سے بار بار	کبتک کریں امام کے آنے کا انتظار

مثلِ امام آپ بھی مالک ہمارے ہیں
مشتاقِ اذن تابعِ فرماں تمہارے ہیں

کہتا ہے کوئی چوم کے عباسؑ کے قدم	مصروف ہیں جو شاہ عبادت میں کیا ہے غم
رن کی طرف حضور بڑھیں لیکے اب علم	دیکھیں تو آپ کرتے ہیں کیا کام آج ہم

لاکھوں کا ایک حملے میں منہ پھیر دیتے ہیں
کس طرح اپنے طبل و علم چھین لیتے ہیں

اک نے کہا یہ بڑھ کے مناسب تو ہے حضور	بڑھیے تو اک قدم کہ گھٹے فوج کا غرور
کہتا ہے ہاتھ جوڑ کے یہ کوئی ذی شعور	کافی ہے حکم آپ کا بڑھنا نہیں ضرور

حضرت کا نام لیکے جو حملہ کرے غلام
مُردوں سے رن تو روح سے دوزخ بھرے غلام

زیرِ علم عزیزوں کے گلدستہ کی بہار	طوبیٰ کے سایہ میں چمنِ خلد آشکار
بو باس وہ کہ عطرِ جناں جس پہ ہو نثار	دل کھل رہے ہیں شوقِ شہادت سے غنچہ وار

کوئی تھا سبز پوش، کوئی سرخ پوش تھا
مرنے کی آرزو تھی، شجاعت کا جوش تھا

عباسؑ جھومتے تھے لیے دوش پر علم
قاسمؑ یہ کہہ رہے تھے کہ آلیں شہِ امم
اکبرؑ نگاہ کرتے تھے خیمے پہ دمبدم
پہلے سبھوں سے آج رضا رن کی لینگے ہم
مسلم کے لال کہتے تھے فرصت نہ دینگے ہم
اس فوج سے قصاصِ پدر آج لینگے ہم

اور اک طرف کو حضرتِ زینبؑ کے لالہ فام
دیکھیں کہاں تلک یہ غرورِ سپاہِ شام
قہر و غضب سے کرتے تھے آپس میں یہ کلام
ہو ئینگے کب محل سے برآمد شہِ انام
باگیں اُٹھاؤ گھوڑوں کی، تیغیں سنبھال لو
جب تک امام آئیں انھیں دیکھ بھال لو

سب نو عروسِ شوقِ شہادت سے ہمکنار
حوروں کا اشتیاق، شہادت کا انتظار
دنیا سے بیخبر، رہِ عقبیٰ سے ہوشیار
گہ مدحِ پنجتنؑ، تو کبھی ذکرِ کردگار
تسبیح کا یہ ورد تھا اُن کی صفات میں
سر رشتۂ عبادتِ خالق ہے ہات میں

کہتا تھا کوئی ذوقِ شہادت میں جھوم کر
میداں میں اسپہ روکیں گے ہم خنجر و تبر
اپنے تو ہات میں ہے کفِ دست کی سپر
ہاتو نکے بعد ہونگے سپر سینہ و جگر
مظلوم کے رفیق ہیں غربت سے کام ہے
جرات سے کام کیا ہے شہادت سے کام ہے

بولا کوئی دلیر یہ گردن ہلا ہلا
تیر۔ و کمان۔ و ترکش۔ و تیغ و سپر ہی کیا
ہوش و حواس چاہیے لڑنے میں ہو بجا
یہ قصد ہے جو ہو مددِ شاہِ لافتا
ہم تو سلاحِ جنگ نہ تن پر سنواریں گے
تیغیں اُنھیں کی چھینیں گے اور اُنکو ماریں گے

کہتا تھا تیغ تول کے اک صاحبِ یقیں
یہ فوج شام کی نہیں یا آج ہم نہیں
کہتے تھے دل بڑھانے کو انصارِ شاہِ دیں
مردوں کی بس یہ بات ہے واللہ آفریں
نیت تو ہے بخیر اب انجام نیک ہو
پھر موت زندگی ہے اگر نام نیک ہو

عمّامہ رکھے ہاتوں یہ کرتا تھا اک دُعا
یارب! تصدّق آلِ پیمبر کی پیاس کا
یہ صبر دے کہ لب نہ کریں پیاس کا گلا
ہمّت وہ بخش سر شہِ دیں پر کریں فدا
ہم ہوں رکابِ شاہ ہو جنّت کی سیر ہو
دنیا بخیر ہو چکی عُقبیٰ بخیر ہو

بولا کوئی حق اپنی طرف ہے تو کیا ہے غم
یہ فوج ہے یہ تیغ ہے یہ رن ہے اور ہم
گر ہو گئے شہید ہوئے داخلِ ارم
زندہ رہے تو یاورِ شاہنشہِ امم
لپٹے ہیں دامنِ شہِ عالی نہاد سے
دامن بھرے ہوئے ہیں ہمارے مراد سے

بڑھ کر کیا نقیب نے یہ فوج سے خطاب
ہشیار غازیو کہ برآمد ہوئے جناب
جسکا جہاں مقام ہو حاضر ہو واں شتاب
سُمِ ذوالجناح کے کوئی چومے کوئی رکاب
صحبت ہے مغتنم یہ شہِ مشرقین کی

اب روز حشر ہوگے جلو میں حسینؑ کی

صف بستہ اس طرح تھے جوانانِ سرخ فام — سبحہ میں جیسے دانے برابر رہیں تمام
یوں تھے رجوع شاہ کی جانب وہ نیکنام — دانوں کی بازگشت ہو جیسے سوئے امام

ذکرِ خدا سے عشق تھا اور حق کے نام سے
تھا کام اُن کو اوّل و آخر امام سے
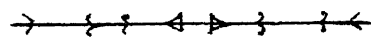
مثال ۸-

بیکسی اور تنہائی

جب کربلا میں دفترِ ایماں اُلٹ گیا — یعنی جنابِ فاطمہؑ کا باغ کٹ گیا
سینہ بصورتِ ورقِ صبح پھٹ گیا — اک دم کی زندگی سے بھی دل شہ کا ہٹ گیا

خاموش ہے وہ مصحفِ ناطق کھڑا ہوا
اور خاک پر ہر ایک ورق ہے پڑا ہوا

بے سایہ دھوپ میں ہے شہنشاہِ بحر و بر — سایہ شجر کا دور تک آتا نہیں نظر
ہے ریت مثلِ اخگرِ سوزاں زمین پر — تالاب اور جھیل پہ بیٹھے ہیں جانور
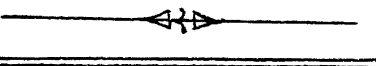
زہراؑ کے آفتاب پہ آفت کا وقت ہے
خورشیدِ شرعِ دیں پہ قیامت کا وقت ہے

ہیں تشنگی کے صدمے سے شبیرؑ بے قرار — سوکھی زباں پھیر لیتے ہیں ہونٹوں پہ بار بار
زخمِ بدن سے چھوٹ رہی ہے لہو کی دھار — کہتا ہے مُڑ کے جانبِ قبلہ وہ ذی وقار

جو رنج تیری راہ میں ہو مجھکو چین ہے

تو خالقِ قدیر ہے بندہ حسینؑ ہے

اب کوئی دم کا خلق میں مہماں ہے حسینؑ — کاٹے گا شمر سر کو تو آئے گا مجکو چین
لیکن یہ عرض کرتا ہوں تجھ سے بشور و شین — جب قتل ہوئے فاطمہؑ زہرا کا نورِ عین

اُمّت کو بخشنا نبیِ خافقین کی
اور کیجیو قبول شہادت حسینؑ کی

مطلع ثانی

برہم جو رن میں دفترِ فوجِ خدا ہوا — اور بیکسی میں فرد امامِ ھُدا ہوا
نورِ نگہہ جُدا ہوا، بازو جُدا ہوا — شش ماہہ تک بھی راہِ خدا میں فدا ہوا

تدبیر فوج میں ہوئی قتل امام کی
پیاسے پہ دوپہر میں گھٹا چھائی شام کی

مانندِ آفتاب ہے یہ آشکار آہ — وہ فصل حار اور وہ نصف النہار آہ
لوٹی خزاں نے باغِ نبیؐ کی بہار آہ — بے کس ہوا امامِ غریب الدیار آہ

پیاسوں کے سوکھے حلق پہ تلواریں چل گئیں
روحیں تڑپ تڑپ کے بدن سے نکل گئیں

بیجاں ہوئے جو رن میں مددگارِ پنجتنؑ — کوثر پہ تشنہ لب گئے انصارِ پنجتنؑ
تاراج دفعتاً ہوا گلزارِ پنجتنؑ — اک دوپہر میں لُٹ گئی سرکارِ پنجتنؑ

تدبیر فوج میں ہوئی قتل امام کی
پیاسے پہ دوپہر میں گھٹا چھائی شام کی

وہ پیاس کا عروج وہ خورشید کا زوال — بے چتر و سایہ دھوپ میں تھا نورِ ذوالجلال
سینے میں داغ پیار ونکے دل کو غم و ملال — خالق سے عرض کرتے تھے یوں شاہِ خوش خصال

ابنِ بتولؑ سبطِ رسالت پناہ ہوں
یارب گواہ رہیو کہ میں بے گناہ ہوں

واقف ہے تو کہ تارکِ دنیا ہوں اے کریم
مہماں ہوں اور نہر پہ پیاسا ہوں اے کریم

بچپن سے بہرِ ذبح مہیا ہوں اے کریم
قاتل ہیں چار لاکھ میں تنہا ہوں اے کریم

شوقِ وصال میں مرا دل سب سے سیر ہے
ہیں مستعد ہوں وقتِ شہادت میں دیر ہے

سب فوج قتل ہو گئی اک میں جیا تو کیا
پہلے تو پانی بند کیا اب دیا تو کیا

اب ظالموں نے رحم بھی مجھ پر کیا تو کیا
کنبہ ترس کے مر گیا میں نے پیا تو کیا

بیچارگی کے وقت تو ہی چارہ ساز ہے
بندہ نیاز مند ہے تو بے نیاز ہے

سب نورِ چشم سامنے آنکھوں کے مر گئے
قاسمؑ کو ماں پکار رہی ہے کدھر گئے

عباسؑ خاتمہ مرے لشکر کا کر گئے
اکبرؑ بھی نامراد جہاں سے گذر گئے

شش ماہہ سو رہا ہے مرا قتل گاہ میں
اچھی کمائی تھی کہ لٹی تیری راہ میں

اکبرؑ کا سینہ نیزۂ کیں سے ہوا فگار
بازو کٹا کے مر گئے عباسؑ نامدار

بے شیر کے گلے سے ہوا تیرِ ظلم پار
پامال سبزہ ساں ہوا شبیرؑ کا گلعذار

مہماں ہو کے رنج ہی کھایا حسینؑ نے
پانی نہ ماں کے مہر کا پایا حسینؑ نے

در پیش اب قیامتِ کبریٰ ہے الاماں
نرغے میں ابنِ فاطمۂ زہرا ہے الاماں
سیراب ہیں وہ لوگ یہ پیاسا ہی الاماں
قاتل ہیں چار لاکھ یہ تنہا ہے الاماں
سب کے گلے کٹے، نہ پسر نے سپاہ ہے
باقی فقط رسولؐ کی اک بوسہ گاہ ہے

مطلع

گہوارۂ اجل میں جب اصغر بھی سو چکا
اور باپ اُسکے ننھے سے لاشے پہ رو چکا
شہ بولے سب کا خاتمہ بالخیر ہو چکا
اکبرؑ کو کھو چکا علی اصغر کو کھو چکا
صف بستہ کس کے قتل پہ اب اہلِ شام ہیں
اب جنگ بھی تمام ہے، ہم بھی تمام ہیں

مجھ سے ارادہ جنگ کا ہی دُور از قیاس
انساں لڑے تو اُس سے کہ جسمیں ہو کچھ حواس
اب فوج پاس ہے نہ علمدار میرے پاس
اسکے علاوہ بھوک ہے اور تین دن کی پیاس
فرزند کوئی قتل حضورِ نظر نہ ہو
وہ بے خبر ہوں سر جو کٹے، کچھ خبر نہ ہو

اب کس لیے فرات کو گھیرے ہے سپاہ
عباسؑ کو سکینہؑ نے کیا مشک دی ہے آہ
اب نہر علقمہ کی عبث روکتے ہیں راہ
سقّہ مرا تو قتل ہوا پیاسا بے گناہ
کیوں تیغیں تیز کرتے ہیں شرم و حیا نہیں
کہدو کہ اب ادھر کوئی پیاسا رہا نہیں

قائل ہو تم بھی دل میں کہ میں بے قصور ہوں
روشن ہے سب پہ چشمِ پیمبرؐ کا نور ہوں
جو رنج ہے وہ کہہ نہیں سکتا، غیور ہوں
اسکا تو پاس کرتے کہ شر سے دُور ہوں
پانی بھی بند، ظلم و جفا کا وفور بھی

آخر مرا گناہ بھی، کوئی قصور بھی

دریا کو تم نے چھین لیا، میں نے کچھ کہا
پانی دکھا دکھا کے پیا، میں نے کچھ کہا
داغِ اکبرؑ جواں کا دیا، میں نے کچھ کہا
اب بے زباں کو قتل کیا، میں نے کچھ کہا

صابر ہوں، بردبار ہوں، میں کینہ ور نہیں
یارو مرے مزاج میں واللہ شر نہیں

سب متفق ستانے پہ اس بے خطا کے ہیں
آیا نہیں ہم آیۂ محکم خدا کے ہیں
جانے دو یہ بھی بندے تو ربِ ہدا کے ہیں
جاروب کش تو روضۂ خیر الوریٰ کے ہیں

ڈرتے ہو قہرِ حق سے نہ آہِ بتولؑ سے
اللہ! ایسے پھر گئے آلِ رسولؐ سے

جب ہوئی ظہر تلک قتل سپاہِ شبیرؑ
تھی فقط روحِ علیؑ پشت و پناہِ شبیرؑ
غیرِ اصغرؑ نہ رہا نورِ نگاہِ شبیرؑ
حق سے کہتے تھے کہ تو رہیو گواہِ شبیرؑ

سر فدا کر کے شریکِ شہدا ہوتا ہوں
آج میں تیری امانت سے ادا ہوتا ہوں

ظہر تک سب رفقا شاہ کے مقتول ہوئے
یک قلم صرفِ خزاں فاطمہؑ کے پھول ہوئے
تھے وہ مقبولِ خدا اور بھی مقبول ہوئے
رو بقبلہ شہِ دیں شکر میں مشغول ہوئے

رو کے کہتے تھے کہ اکبرؑ نہیں عباسؑ نہیں
اب امانت کوئی خالق کی مرے پاس نہیں

اب نہ قاسمؑ مرا جیتا ہے نہ اکبرؑ باقی
نہ علمدار سلامت ہے نہ لشکر باقی

بھانجے ہیں نہ بھتیجے نہ برادر باقی   اب فقط سر مرا باقی ہے اور اصغرؑ باقی

قتل اصغرؑ ہو، مرا سر بھی جدا ہو جائے
اس امانت سے بھی شبیرؑ ادا ہو جائے

یا خدا تجھ پہ میں صدقے مرا لشکر بھی نثار   دل فدا۔ جان فدا۔ روح فدا۔ سر بھی نثار
علی اکبرؑ بھی نثار۔ اور علی اصغرؑ بھی نثار   تجھ پہ باقرؑ بھی فدا۔ عابدِ مضطر بھی نثار

میں نے جو کچھ ترے دربار سے پایا مولا
سب تری راہ میں خوش ہو کے لٹایا مولا

وہ کلیجے پہ دھرے ہاتھ پڑے ہیں اکبرؑ   ہے وہ عباسؑ دلاور وہ حسنؑ کا دلبر
ایک اک پیارے کو قربان کیا گن گن کر   کی امانت میں خیانت نہ ذرا اے داور

تو نے دولت جو تھی مجھ خاک نشیں کو سونپی
وہ امانت ترے بندے نے زمیں کو سونپی

تو شہنشاہ شہنشاہوں کا ہے بارِ خدا   ہیں برابر تری درگاہ میں سب شاہ و گدا
خاطرِ عاشقِ جانباز ہے البتہ جدا   اے خوشا حال کہ مجھ سے ہو ترا عشق ادا

حلق پر تیغ رہے، سینے پہ جلاد رہے
لب پہ ہو نام ترا دل میں تری یاد رہے

درِ دنداں مرے نانا نے تجھے نذر دیا   لے گئیں نذر کو پہلوئے شکستہ زہراؑ
سرخرو ہے ترے دربار میں بابا میرا   دل کے ٹکڑے مرے بھائی نے کیے تجھ پہ فدا

آج شبیرؑ بھی اُن سب کے مقابل ہو جائے
سر مرا اگر تری سرکار کے قابل ہو جائے

بندہ پرور! میں ہوں اک عبدِ غریب احقر
منزلِ ملکِ عدم میں تو مرا ہو رہبر
بیکس و بے وطن و بے پدر و بے مادر
نہ تو اس راہ سے آگاہ نہ منزل کی خبر

شوق بھی، رعب بھی مجکو تری درگاہ کا ہے
سامنا بندۂ ناچیز کو اللہ کا ہے

تین دن تڑپا ہی یاں پیاس کی شدت سے حسینؑ
ڈر نہ جائے ملک الموت کی ہیبت سے حسینؑ
اب ہو سیراب ترے قلزمِ رحمت سے حسینؑ
یا خدا کانپتا ہی قبر کی وحشت سے حسینؑ

آجتک ساتھ رہا بیٹے کا اور بھائی کا
سخت اندیشہ ہے اب قبر کی تنہائی کا

یاں تو یہ عاشق و معشوق میں ہوتے تھے کلام
ہوئی تشویش لگے دیکھنے مُڑ مُڑ کے امام
ہائے اصغرؑ کا ہوا شور جو ما بین خیام
دیکھا سر پیٹ کے چلّاتی ہے بانُوئے ناکام

ساتھ یہ ننھا مسافر بھی مرا چھوڑتا ہے
آؤ صاحب، مرا بچہ یہاں دم توڑتا ہے

جھومتے گھوڑے پہ شبیرؑ چلے خون میں تر
پہونچے دروازے پہ خیمے کے تو ٹھہرے سرور
کبھی جھکتے تھے ادہر اور کبھی جھکتے تھے اُدہر
تھام لے کون عناں گھوڑے سے اُتریں کیونکر

شاہ یہ پیاسے تھے زینبؑ کو پکارا نہ گیا
بیٹھ کر گھوڑے سے راکب کو اُتارا نہ گیا

آیا دروازے پہ ناموس امامِ خوش خو
لیگئی جھولے پہ ہاتھ اُن کا پکڑ کر بانوؑ
ہاتوں ہاتھ ابنِ یداللہؑ کو اُتارا رو رو
حال اصغرؑ کا دکھا کر کہا، آقا دیکھو

مٹھیاں باندھنا آنکھوں کا بدلنا دیکھو

سانس اکھڑی ہوئی اور منکے کا ڈھلنا دیکھو

جب اصغرِ بے شیر گئے نہر لبن کو — اور لوٹ چکی موت پیمبرؐ کے چمن کو
تعجیلِ شہادت کی ہوئی شاہِ زمن کو — کوئی نہ رہا، رو چکے ہفتاد و دو تن کو
سرکار کی رونق تھی، نہ دربار تھا باقی
لٹنے کو حرم مرنے کو سردار تھا باقی

فرماتے تھے ہاتوں پہ لیے لاشۂ اصغرؑ — مقبول ہوا بارِ خدا ہدیۂ احقر
کس منہ سے ترا شکر کروں اے مرے داور — تونے مرے اصغرؑ کو دیا رتبۂ اکبرؑ
جاں اس نے مرے شیعوں کے بچوں پہ فدا کی
شش ماہے پہ بالکل ہے یہ تائید خدا کی

لشکر دیا کنبہ دیا گھر بھی دیا تونے — سردار بھی تونے کیا سر بھی دیا تونے
ہمشکلِ پیمبرؐ سا پسر بھی دیا تونے — یہ حوصلہ یہ دل یہ جگر بھی دیا تونے
کیا فخر جو پیاروں کو رہِ حق میں دیا ہے
تیری ہی عنایت کو فدا تجھ پہ کیا ہے

مجھ میں تھی یہ قدرت کہ بھرے گھر کو لٹاؤں — بازو ہو جدا ہات نہ امت پہ اٹھاؤں
واں قتل ہوا اکبرؑ، ادھر اصغرؑ کو میں لاؤں — تڑپے یہ مرے ہاتوں پہ میں لب نہ ہلاؤں
یوں لیِ خوش کوئی ہنگامِ تباہی نہیں ہوتا
بندے سے یہ بے فضلِ الٰہی نہیں ہوتا

نادار ہوں میں حال مرا تجھ پہ ہے حالی — دربار ہے برتر، تری سرکار ہے عالی

دامن مرا خالی ہے مرے ہاتھ ہیں خالی
اب شرم ترے ہاتھ ہے اے خلق کے والی

کانپیں جو قدم ہاتھ پکڑ لیجیو میرا
ہدیہ کے لیے ہاتھ میں سر دیجیو میرا

اُمت نے بھلایا ہے مجھے، تو نہ بھلانا
سب چھوڑ کے تنہا، ہوئے منزل کو رَوانا
تو پاک ہے دنیا سے مجھے پاک اُٹھانا
یا بارِ خدا قبر کی وحشت سے بچانا

جب گورِ غریباں کا اندھیرا نظر آئے
ہر سمت کو جلوہ مجھے تیرا نظر آئے

نے گھر کی مجھے یاد ہے نے حبِّ وطن ہے
نے قبر کی ہے فکر نہ پروائے کفن ہے
ہر خار تری منزلِ الفت کا چمن ہے
محتاج تری خلعتِ رحمت کا بدن ہے

مرضی ہو تو بے نام و نشاں ہو کے مروں میں
عابدؑ کو بھی باقرؑ کو بھی قربان کروں میں

یارب اب مجھے راحت ہے، نہ زخموں کو شفا ہو
رگ رگ سے رواں خون ہو، ہر بند جدا ہو
جو عضو ہیں بے درد اُنہیں درد عطا ہو
جو آرزوئے دل ہے وہ پامالِ فنا ہو

مظلومی کے مرنے میں بہت اجر و جزا ہے
پانی نہ ملے تیغ کے نیچے تو مزا ہے

ایوبؑ نے دیکھے جو قلم زوجہ کے گیسو
جب گیسوئے سادات کھلیں اور بندھیں بازو
کیسا وہ پریشان ہوئے جانتا ہے تو
زندہ ہوں کہ مُردہ نہ مجھے غم ہو سرِ مو

ذلت کا مجھے رنج نہ عزت کی خوشی ہے
ہر حال میں بس تیری اطاعت کی خوشی ہے

گن لے یہی سب فوجِ حسینؑ ابنِ علیؑ ہے
یہ اکبرؑ و اصغرؑ ہیں، وہ عباسؑ جری ہے
کچھ میں نے امانت میں خیانت نہیں کی ہے
تنہائی میں دل تیری حمایت سے قوی ہے

قاسمؑ نہ محمدؑ نہ مرا عونؑ تھا یارب
یہ سب ترے بندے تھے مرا کون تھا یارب

غربت کا داغ یوسفِ کنعاں سے پوچھیے
لشکر کے قتل ہونے کو سلطاں سے پوچھیے
سامانِ یاس بے سر و ساماں سے پوچھیے
یہ سب ملال شاہِ شہیداں سے پوچھیے

غربت کا خاتمہ ہے شہِ مشرقین پر
مظلومیت برستی ہے نامِ حسینؑ پر

سب پر عیاں ہے بے سر و سامانیِ حسینؑ
فاقے میں آبِ تیغ، یہ مہمانیِ حسینؑ
وہ مرگِ اقربا وہ پریشانیِ حسینؑ
وہ روزنِ خدنگ وہ پیشانیِ حسینؑ

رونے کی جا ہے حال شہِ مشرقین کا
ستّر دو تن کا داغ اور اک دل حسینؑ کا

نکلے تھے کس گھڑی کہ وطن پھر نہ جانے پائے
فرزندِ نوجواں کی نہ شادی رچانے پائے
صغراؑ تھی منتظر نہ اُسے بھی بُلانے پائے
دولہ بنا نا کیسا نہ تربت بنانے پائے

ایسا کسی نبی کا نواسا نہیں ہوا
مہمان ذبح نہر پہ پیاسا نہیں ہوا

گرتی تھی لاش لاش پہ کس کس کا داغ اٹھائیں
بیٹی کی لیں خبر کہ بہن کو گلے لگائیں
میداں سے لاشے لائیں کہ پُرسے کو گھر میں جائیں
اکبرؑ کے غم میں روئیں کہ اصغرؑ کو دفن کر آئیں

جسپر تباہی ایسی پڑے آہ کیا کرے
صابر حسینؑ سا ہو تو شکرِ خدا کرے

مثال ۹۔

فوج کا داخلہ اور طیاری جنگ

ناگاہ اُٹھے خوابِ ضلالت سے ستمگار
سرداروں کو بُلوا کے پکارا یہ جفا کار
چونکا عمرِ سعد کہ فتنہ ہوا بیدار
درپیش ہے شیرانِ عرب سے مجھے پیکار
نولاکھ کو ایک ایک سے کب تابِ وغا ہے
بندے ہیں ادھر، اُن کی طرف آج خدا ہے

مشہور ہے ہر شہر میں شمشیرِ دو پیکر
طفلی میں یہ تھی طاقتِ دامادِ پیمبرؐ
یہ تحفۂ باری ہے سوئے حیدرؑ صفدر
دو اُنگلیوں سے چاک کیا کلّۂ اژدر
سُنتے ہیں کہ غل نعرۂ تکبیر کے اُٹھے
جھولے سے جو اُٹھّے تو اُسے چیر کے اُٹھّے

جنگِ جمل و بدر و اُحد کر گئے یہ سر
خندق میں جو لی میان سے شمشیرِ دو پیکر
صفّین و سلاسل کی صفیں ہوگئیں ابتر
جبریلؑ نے روکا تو قلم کر دیئے شہپر
پرزے حسد و کبر کے بھی پھاڑ کے نکلے
خیبر سے جو نکلے تو علم گاڑ کے نکلے

شاہِ شہدا بھی ہیں اُسی شاہ کے دلدار
ابنِ حسنؑ و اکبرؑ و عباسؑ علمدار
طاقت وہی بازو میں، وہی ہاتھ میں تلوار
اُس فوج میں یہ تین بہادر ہیں نمودار

کچھ رشتے میں ہیں، اور کچھ اصحاب نبیؐ کے
بیٹے ہیں، بھتیجے ہیں، نواسے ہیں علیؑ کے

جب مار لیا ان کو تو انعام ملیں گے
جاگیر ہے کیا مال، بڑے کام ملیں گے
جام مئے عشرت سحر و شام ملیں گے
اس فتح سے سب کو بہت آرام ملیں گے

مارو گے اگر آج تم ان ناموروں کو
بھر دو نگا زرِ سرخ سے سب کی سپروں کو
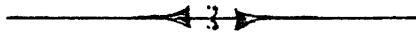
مثال ۱۰ ۔ حضرت عباسؑ نہر سے مشک بھر چکے ہیں اور واپس آنا چاہتے ہیں، دشمن یہ دیکھ کر ہر طرف سے ٹوٹ پڑتے ہیں ۔ حضرت عباسؑ اس کشمکش میں ہیں کہ آپ کو بچائیں یا مشک کو سنبھالیں ۔ اُس وقت کی مضطربانہ کوشش کی تصویر

مشکیزہ بھرا نہر سے سقائے حرم نے
خود پانی نہ ہرگز پیا اُس بحرِ کرم نے
کاندھے پہ رکھا بازوئے سلطانِ امم نے
گھاٹوں پہ پرے باندھ لیے فوجِ ستم نے

غل تھا کہ مزا مشک کے بھرنے کا دکھا دو
دریا ہی میں سر کاٹ لو اور لاش بہا دو

بیتاب ہوئے پیاسوں کی اُلفت میں علمدار
اے امتیو! واسطۂ احمدِ مختار
ناچار سماجت سے یہ کرنے لگے گفتار
سر لو مرا، پر خیمے میں ہو آنے دو اک بار

زینبؑ لیے گودی میں سکینہؑ کو کھڑی ہے
پانی میں پلا آؤں اُسے پیاس بڑی ہے

میں کیا کہوں دریا سے علمدار کا آنا
گھوڑے کو کبھی روکنا، اور گاہ بڑھانا

جب تیرِ ستم کھانا تو رو کر یہ سُنانا | یا حیدرؑ کرّار مری مشک بچانا

ایک ایک قدم تھا یہ قلق جانِ حزیں پر
اب مشک چھدی اور گرا پانی زمیں پر

دھیے سے کماندار جو بائیں طرف آتے | مشکیزہ کو یہ داہنے کاندھے پہ لگاتے
ظالم جو اُدھر تیر لگاتے ہوئے جاتے | یہ مشک کو اس دوش سے اُس دوش پہ لاتے

مشکیزہ کا حافظ شہِ مرداں کا جگر تھا
سینے کے تلے تھا تو کبھی زیرِ سپر تھا

مثال ۱۱-

پردہ کا اہتمام

آوازِ دور باش کا ناگاہ غل اُٹھا | اور خیموں میں اُترنے لگی آلِ مصطفٰےؐ
ڈیوڑھی سے پر کجاوۂ زینبؑ جہاں رکا | خود اہتمام کرنے لگے شاہِ کربلا

روکی قنات اکبرؑ و قاسمؑ نے آن کر
عباسؑ گرد پھرنے لگے نیزہ تان کر

فرّاش عصا اُٹھا کے بڑھے جانب یسار | داہنی طرف نقیب گئے باندھ کر قطار
آ آ کے در پہ لونڈیاں چلّائیں بار بار | آئے اُدھر سے اب نہ کوئی جائے ہوشیار

آوازِ غیر سُن کے وہ اندیشہ کرتی ہیں
آہستہ بولو دخترِ زہراؑ اُترتی ہیں

عفّت کے جتنے مرتبے خیر النساؑ نے پائے | وہ ماں کے بعد دخترِ مشکل کشا نے پائے

ہاں ہاں مسافرو، نہ کوئی غل مچانے پائے
ناقے پہ بیٹھ کر نہ ادھر کوئی آنے پائے

حسنِ ادب یہی ہے کہ حق کو پسند ہو
وہ بیٹھ جائے جسکا کہ قامت بلند ہو
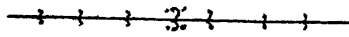
مثال ۱۲- عونؑ و محمدؑ میدانِ جنگ میں لڑ رہے ہیں، سیدانیاں دروازہ پر بدحواس کھڑی ہیں، حضرت زینبؑ فضہؓ سے پوچھتی ہیں کہ میرے بچے کیا کر رہے ہیں؟ وہ جواب دیتی ہیں ے

زینبؑ نے درِ خیمہ سے یاں ان کو جو دیکھا
پایا نہ کہیں بیٹوں کو چلائی وہ دکھیا
فضہؓ سے کہا بچے مرے قید ہوئے کیا
وہ بولی کہ کچھ سنتی ہو؟ کیا کہتے ہیں اعدا

لشکر کی صفیں چیر کے دو روز کے پیاسے
دریا پہ گئے ساقیِ کوثر کے نواسے

زینبؑ نے کہا کیوں گئے، دریا سے غرض کیا
پی لینگے جو پانی تو غضب اور بھی ہوگا
بھائی ہے مرا تین شب و روز کا پیاسا
فضہؓ انھیں آواز دے، یہ امر ہے بیجا

اک بوند بھی پانی کی اگر پی تو ستم ہے
اک دھار نہ میں دودھ کی بخشوں گی قسم ہے

لو ایسے ابھی سے ہوئے خودسر مرے جانی
یاں دودھ نہ اصغرؑ کو ملے وہ پئیں پانی
یاد اُن کو رہی اپنی فقط تشنہ دہانی
ماموں کی انہیں بھول گئی خشک زبانی

بے صبر مرے بیٹوں کو سب خلق کہے گی
پانی جو پیا آبرو اُن کی نہ رہے گی

کہدو کہ پیا پانی تو اب گھر میں نہ آنا
اب سر بھی مرے بھائی کی خاطر نہ کٹانا
اب شکل بھی مجکو نہ دکھانا نہ دکھانا
راحت کے عوض تم سے یہ صدمہ تھا اُٹھانا
مرجاؤ گے تو گو دہیں لاشوں کو نہ لونگی
ماموں تمھیں رد ئینگے تو میں رونے نہ دونگی

مثال ۱۴۳- حضرت امام حسین علیہ السلام کا میدانِ کربلا میں داخلہ۔ رفقا کی شان و شوکت اور نوجوانوں کی سیر و تفریح۔

اب لکھتا ہوں آوارگی آہوئے زہرا
ہمراہ تھے ننھے پسر، اور موسم گرما
کعبہ سے ہوا کوچ جو آہوئے حرم کا
وہ دہوپ کہ جس میں ہوں سیہ آہوئے صحرا
اشک آنکھوں سے جاری، تو عرق عضو بدن سے
کس دُھوپ میں نکلے تھے حسینؑ اپنے وطن سے

کہتے تھے کہ اب کاہیکو دیکھیں گے کسی کو
آتی تھی صدا ماں کی حسینؑ ابنِ علیؑ کو
صغراؑ کو مدینہ کو نہ قبرِ نبوی کو
امت کو بھی اے لال ستانا تھا تجھی کو
بابا کو ترے خلد کے گلشن سے نکالا
یثرب سے تجھے اور مجھے مدفن سے نکالا

القصہ اُسی دھوپ میں کی قطع جو سرِ راہ
لکھا ہی یہ راوی نے کہ منزل تھی اخیر آہ
اور پہونچے قریں دشتِ بلا کے شہِ ذیجاہ
منزل پہ نہ پہونچے تھے کہ شب ہوگئی ناگاہ
تاریکیِ شب نے جو چھپایا تھا قمر کو
معلوم نہ تھا قافلہ جاتا ہے کدھر کو

وہ صبح سے پردیسیوں کا دھوپ میں آنا
وہ رات کا وقت اور وہ منزل کا نہ پانا
گھوڑوں کا شبِ تار میں وہ ٹھوکریں کھانا
اور سبطِ نبیؐ کا یہ غریبی سے سنانا
اس رستہ میں بارِ گراں دوش پہ سر ہے
اے قبر بتا مرقدِ شبیرؑ کدھر ہے

واں بچوں نے محمل میں جدا دھوم مچائی
اس رات کی دہشت سے سکینہؑ کو تپ آئی
رستہ نہ شتربانوں کو دیتا تھا دکھائی
سب بی بیاں کہتی تھیں دہائی ہے دوہائی
مادر کے گلے سے نہ جدا ہوتے تھے بچے
ماں نادِ علیؑ پڑھتی تھی اور روتے تھے بچے

تاریکیِ شب وہ تھی کہ العظمۃ للہ
گم ہو گیا خود چرخ پہ مشعل کو لیے ماہ
تھا روزِ ابد طول سے اس رات کے کوتاہ
رستہ میں اندھیرا تھا مثالِ دلِ گمراہ
آتی تھی نظر ایک کی صورت نہ کسی کو
رستہ نہ ملا قافلۂ آلِ نبیؐ کو

شہ بولے حرم اتریں کہ رستہ نہیں ملتا
جاؤنگا خدا صبح کو لے جائے گا جس جا
یہ سن کے پیادہ ہوئی سب عترتِ مولا
ناگہ سحر منزلِ آخر ہوئی پیدا
سجادہ بچھا، ہونے لگا شورِ اذاں کا
سر جھک گیا سجدے میں امامِ دوجہاں کا

پڑھ پڑھ کے نمازِ سحری مونس و غمخوار
چلنے کو کمر باندھ کے فوراً ہوئے تیار
حضرت نے وظیفہ میں اشارہ کیا اک بار
پردیسیو ہے خیر تو کیوں رکتے ہو رہوار
پوچھو تو زمینداروں سے، یہ کونسی جا ہے

اگر ہو یہی منزل تو غرض کوچ سے کیا ہے

باندھیں لگامیں غازیوں نے نیزے گاڑ کر
اور فرش زین پوش کیے گرد جھاڑ کر
جنگل بسایا چرخ نے بستی اُجاڑ کر
بولے علیؑ کفن کا گریبان پھاڑ کر

جنگل میں اہلبیتِ رسالت کا گھر ہوا
آخر مرے حسینؑ کا پہلا سفر ہوا

وہ وقتِ صبح اور وہ بیاباں کی ہوا
وہ چھاونی حسینؑ کے لشکر کی جابجا
وہ مرکبوں کے بولنے کی چار سو صدا
وہ خیمہ۔ وہ سراچہ۔ وہ بے چوبہ خوشنما

اُڑنا پھریروں کا، وہ لچکنا نشان کا
وہ ابر ڈھال کا، وہ مہِ نو کمان کا

بستر پہ کوئی آیا کوئی سیر کو گیا
کوئی سپر کو زیرِ بغل رکھ کے سو گیا
مصروف اک تلاوتِ قرآں میں ہو گیا
آکر فرات پر کوئی مُنہ ہاتھ دھو گیا

عبّاسؑ سبز پوش کھڑے تھے فرات پر
جس طرح خضر چشمۂ آبِ حیات پر

کہتے تھے دل شگفتہ یہاں غنچہ وار ہے
آبِ رواں ادھر تو اُدھر سبزہ زار ہے
گر بیچ میں ہو قبر مری بھر بہار ہے
دریا میں شور تھا یہی تیرا مزار ہے

صحرا میں لوحِ قبر شہِ نیک ذات ہے
عبّاسؑ آبرو مری اب تیرے ہات ہے

مدّاحِ کربلا تھے رفیقانِ شاہِ دیں
کہتے تھے کیا لطیف ہے واللہ نہیں

مطلق ملال قطعِ مسافت کا اب نہیں ۔ آبِ و ہوا ہے کوثر و فردوس کی یہیں
صحرا ہے یا کہ قدرتِ ربِّ غفور ہے
ہر خار باغِ خلد ہے، ہر ذرہ حور ہے
آفتاب ۱۲
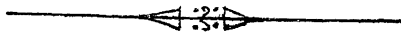
برپا ہوئے جب خیمۂ سرور لبِ دریا ۔ اُترے حرمِ ساقیِ کوثر لبِ دریا
پھرنے لگے عباسؑ دلاور لبِ دریا ۔ مُنہ دھونے لگے بیٹھ کے اکبرؑ لبِ دریا
شہ نے کہا دریا تو بہت ہم سے قریں ہے
پانی مگر اس نہر کا قسمت میں نہیں ہے

منزل سے جو آئے تھے رفیقِ شہِ ابرار ۔ سونلائے گئے تھے گرمیِ خورشید سے رخسار
دامن سے ہوا دیتے تھے چہرہ کو ہر اک بار ۔ پھر پھر کے لبِ نہر یہی کرتے تھے گفتار
میدان ہے سبزہ ہے ترائی ہے ہوا ہے
خیمہ تو بہت خوب جگہ آج ہوا ہے

اللہ کرے یاں تو کوئی روز ہو رہنا ۔ گھر بھول گیا ہم کو، یہ کیا خوب ہے صحرا
کہتے تھے حبیبؑ ابنِ مظاہر یہ کیا کیا ۔ کیا جانیے حضرت کا ارادہ ہے کہاں کا
دو روز مقام اُن کو یہاں مدِّ نظر ہے
اس دشت سے بھی کوچ کی دسویں کو خبر ہے

اصحابِ وفادار تو کرتے تھے یہ گفتار ۔ دریا پہ گڑا تھا علمِ سیدِ ابرار
پوشاک بدلتا تھا کوئی شاہ کا غمخوار ۔ کوئی تو سپر کھولتا تھا اور کوئی تلوار
مشکیزوں میں بھر بھر کے کوئی لاتا تھا پانی

دریا میں کوئی گھوڑوں کو پلواتا تھا پانی

دیگر

آواز ارکبوا جو ملائک سُناتے ہیں
تعقیب کی دعائیں مگر پڑھتے جاتے ہیں
غازی نماز پڑھ کے مصلّےٰ اُٹھاتے ہیں
بہرِ سلام خیمۂ مولا کو آتے ہیں
در پر دھرے جبینوں کو سب خوشخصال ہیں
اک آسماں ہے اور بہتّر ہلال ہیں

دیکھو خشوع کو تو ہے لرزاں بدن تمام
واقف نہیں ریا سے کہ کس شے کا ہے یہ نام
پوچھو رجوع قلب تو دل ہے بسوئے امام
جسکو نماز کہتے ہیں وہ یہ ہے والسّلام
روشن ہے ان کا اوجِ عبادت جہان پر
سجّادے ہیں زمیں پہ نماز آسمان پر

ہے دست بوس ایک کی شمشیر آبدار
کوئی خیالِ حورِ شہادت سے ہمکنار
دُرِّ نجف کا سبحہ کسی کے گلے کا ہار
کوثر پہ آنکھ ایک جری کی پیالہ وار
کہتے ہیں راہِ حق میں شرف کی کمی نہیں
اس راہ میں جو خاک نہ ہو آدمی نہیں

سمجھے ہیں نامرادیِ دنیا کو یہ مراد
ہر عضو میں ہے دل کی طرح سے خدا کی یاد
غم ان کے دل میں شادی، دل ان کا غم میں شاد
قرآن پڑھنا ختم ہے ان پر دمِ جہاد
بازوئے جنگ مثلِ ترازو تُلے ہوئے
خود رحلِ زیں پہ گود میں قرآں کُھلے ہوئے

مثال ۱۴۷ - تمام رفقا کی شہادت کے بعد حضرت امام حسینؑ کی بیکسی اور دشمنوں کا نرغہ۔

تھا اک تو ضعیفی کے سبب ضعف سراپا — کمزوری و ناطاقتی و سستیِ اعضا
اور اُس پہ عزیزوں کا غم اور داغِ احبّا — اور تین شب و روز کی وہ پیاس کا صدمہ
عاشور کو دیکھی یہ جفا فوجِ شقی کی
جو غم سے ہوئی ریش سفید ابنِ علیؑ کی

آنکھوں کی بصارت غمِ اکبرؑ سے ہوئی کم — اور پشت و کمر ماتمِ عباسؑ سے کی خم
جنبش نہ زباں کو تھی یہ تھا پیاس کا عالم — اور زرد تھا صدموں سے رُخِ سیدِ عالم
جو زورِ بدن آگے تھا فرق اُس میں بڑا تھا
اک فرق مگر یادِ خدا میں نہ پڑا تھا

بیدست لبِ نہر ہیں عباسِؑ دلاور — ریتی میں ہے صد پارہ تنِ قاسمِؑ مضطر
بے گور و کفن خاک پہ زینبؑ کے ہیں دلبر — لپٹا ہوا سوتا ہے برادر سے برادر
زخمی جگر اکبرؑ کا ہے لب پیاس سے وا ہیں
گویا کہ پیمبرؐ بھی شریکِ شہدا ہیں

تھے دامنِ شبیرؑ میں سونے کے جو گوہر — گردوں نے اُڑھائی ہے اُنہیں خاک کی چادر
ہے ریگِ بیابانِ بلا لاشوں کا بستر — نے غسل نہ کافور نہ ہے قبر میسّر
پر ایک مزار اصغرِؑ ناداں کا بنا ہے
پھل تیر کا بالائے لحد پھول کی جا ہے

اُمڈی ہے گھٹا ظلم کی یا چھائے ہیں بے پیر — لب مثلِ صدف کھولے ہیں زخمِ تنِ شبّیرؑ

باراں کے بھی قطروں سے برستے ہیں سو اتیر — بجلی کی عوض گرتی ہے برقِ دمِ شمشیر

بدلی ہے ہوا صرصرِ بیداد چلی ہے
اس مینھ کا سزاوار حسینؑ ابنِ علیؑ ہے

جز رحمتِ حق اور کوئی شہ کے نہیں پاس — ہر سمت سے دل سیر ہر اک سے کہ بے آس
سو طرح کی تشویش ہے، سو طرح کے وسواس — ہر چار طرف دیکھ کے کہتے ہیں بصد یاس

محشر میں دکھانا ہے تمھیں منہ مرے جد کو
اے مومنو بیکس ہے حسینؑ آؤ مدد کو

ہے کوئی مسلماں کہ ہمیں جانے پیاسا — اس دھوپ میں پانی ہمیں پلوائے ذرا سا
ہے کوئی، سمجھ کر مجھے احمدؐ کا نواسا — دے اکبرؑ مہرو کی جدائی میں دلاسا

پوچھیں مرا دکھ، ایسے بھی یاں صاحبِ دیں ہیں
ہم بے کس و تنہا ہیں گنہگار نہیں ہیں

حضرت کے قریب آکے کہتے ہیں یہ جلاد — مظلوم حسینؑ آپ عبث کرتے ہیں فریاد
گھر اپنے عزیزوں کے تو تم کر چکے برباد — نادان ہے کوئی جو کرے آپ کی امداد

جو آکے مددگارِ شہنشاہِ امم ہو
پہلے سرِ شبیرؑ سے سر اُس کا قلم ہو

کیوں آپ ہیں غیروں سے طلبگارِ حمایت — ہے آپ میں تو فاطمہؑ کے شیر کی طاقت
قبضے میں ہے تیغِ کمرِ شاہِ ولایت — موقوف ہے کس دن کے لیے زورِ امامت

چرچا ہے یداللہؑ کی خیبر شکنی کا
کیا زور نہیں آپ میں شمشیر زنی کا

فرماتے ہیں شبیرؑ کہ ہاں سچ ہے یہ گفتار
تھی شہرۂ آفاق مرے باپ کی تلوار
کاٹے ہیں مگر شیرِ خدا نے سرِ کفار
تم لوگوں کو نانا کی رسالت کا ہے اقرار
احمدؐ کا پسر ہو کے تمہیں تنگ کروں میں
تم اپنے ہو پھر اپنوں سے کیا جنگ کروں میں

یہ بات سن کے اور ہوئے تیغ زن دلیر
آکر قریب سب نے لیا شاہِ دیں کو گھیر
دل ابنِ فاطمہؑ کا ہوا زندگی سے سیر
نیزوں میں آگیا اسدِ کبریا کا شیر
چھاتی تمام ظلم کے تیروں سے چھن گئی
جنگل میں کیا نبیؐ کے نواسے پہ بن گئی

کوئی رفیق تھا دمِ مشکل نہ غمگسار
لاشوں کو چشمِ یاس سے تکتے تھے بار بار
لوٹے تھے اک غریب پہ لاکھوں ستم شعار
ہر سمت تھا یہ شور کہ لو تشنہ لب کو مار
دشمن ہر اک تھا فاطمہؑ کے نورِ عین کا
غیر از خدا نہ دوست تھا کوئی حسینؑ کا

وہ دھوپ وہ عطش وہ جراحت وہ قحطِ آب
دل ناریوں کے ظلم سے سینہ میں تھا کباب
نیزوں سے دیتے تھے جو تکاں تن کو شیخ و شاب
ہل چل میں ہر قدم سے نکل جاتی تھی رکاب
رو رو کے شیرِ حق کا کبھی نام لیتے تھے
چھٹتی تھی گر لگام کبھی تھام لیتے تھے

گردن غشی میں پشت کی جانب ہوئی جو خم
گھوڑے کی سمت راست جھکے سرورِ امم
نیزے جو پڑ گئے کئی سینہ پہ یک قلم
دم میں اکھڑ گیا جگرِ فاطمہؑ کا دم

جھٹکا بدن میں دے کے ستمگر جو ہٹ گئے
گردن سے دوالجناح کی حضرت لپٹ گئے

نیزہ کا پشت پر جو کیا پھر کسی نے وار
سنبھلا گیا فرس پہ نہ پھر آہ زینہار
سیدھے ہوئے تڑپ کے حسینؑ جگر فگار
سوئے زمیں جھکے کبھی، گہ جانبِ یسار

غش نے زمیں کی سمت جو ڈالا حسینؑ کو
روح الامیں نے آکے سنبھالا حسینؑ کو

جب قتل ہوئی تشنہ دہاں فوجِ حسینیؑ
پوچھا جو کسی نے، ہی کہاں فوجِ حسینیؑ
اور ہو گئی کوثر پہ رواں فوجِ حسینیؑ
شہ بولے گئی سوئے جناں فوجِ حسینیؑ

دنیا سے کیا کوچ رفیقانِ وطن نے
چھوڑا تنِ تنہا مجھے ہفتاد و دو تن نے

سب مر گئے میرے لیے، میں جیتا ہوں ہیہات
لشکر تو مرا کٹ گیا، باقی رہے سادات
ساتھ آئے مدینے سے، یہاں چھوڑ دیا ساتھ
لوٹیں گے مرے قتل کے بعد اُنکو بھی بدذات

زینبؑ پہ بھی گو قید کا اک تازہ تعب ہے
پر ظلم سکینہؑ پہ طمانچوں کا غضب ہے

عباسؑ کا پھر نام لیا اور یہ پکارے
ہشیار کہ اُسکو نہ طمانچہ کوئی مارے
لو بھائی سکینہؑ تو حوالے ہی تمہارے
اکبرؑ کے تصوّر میں کہا اے مرے پیارے

گر چاہو کہ ممنون کرو شیرِ خدا کو

آفت میں بچا لیجیو زینبؑ کی ردا کو

یہ کہتے تھے اور گھوڑے پہ غش ہوتے تھے بار بار
مظلوم کو گھیرے ہوئے تھے لاکھ ستمگار
تیغوں کے تلے تھا جگرِ احمدِ مختار
اک جسم پہ تیر و تبر و نیزہ کے تھے وار

چلاتے تھے در پر حرمِ شاہ دوہائی
سیّد پہ یہ بیداد ہے اللہ دوہائی

وہ تیروں کی بوچھار وہ تیغوں کا چمکنا
اور شہ کا غریبی سے وہ جلاّد کو تکنا
وہ سینہ میں پیکاں کی نوکوں کا کھٹکنا
وہ چہرہ پہ عمّامہ کا کٹ کٹ کے لٹکنا

گہ ہوش میں تھے اور کبھی غش ہوتے تھے شبّیرؑ
خود اپنی مصیبت پہ کھڑے روتے تھے شبّیرؑ

مومنو بیکس و بے یار ہے مظلوم حسینؑ
سخت آفت میں گرفتار ہے مظلوم حسینؑ
کیا سراسیمہ و ناچار ہے مظلوم حسینؑ
دل شکستہ جگر افگار ہے مظلوم حسینؑ

نیزے کاری ہیں لگے زخم پہ شمشیروں کے
نیزو نکے زخم میں پیوستہ ہیں پھل تیروں کے

تن سے گر کھینچتے ہیں ایک بھی پیکاں شبّیرؑ
اتنے عرصہ میں لگاتے ہیں عدو سینکڑوں تیر
کھا کے تیروں کو اگر کرتے ہیں قصدِ تکبیر
پاس سے نیزہ لگاتے ہیں وہیں بے پیر

ایک پیکان جو سینہ سے گذر جاتا ہے
خون کے روکنے کو دوسرا تیر آتا ہے

کیا رحیمی ہے کہ غصہ نہیں آتا ہے ذرا
کیا کریمی ہے کہ سر کرتے ہیں اُمّت پہ فدا

کیا تحمل ہے کہ ہر زخم پہ ہے شکرِ خدا
کیا شجاعت ہی کہ لاکھوں میں کھڑے ہیں تنہا

تیر بھی نیزے بھی سینہ پہ لیے جاتے ہیں
پر دعا نانا کی اُمت کو دیئے جاتے ہیں

دل کا یہ حال ہے پژمردہ ہوا جاتا ہے
ایک دریا ہی کہ زخموں سے بہا جاتا ہے
ایک دم میں جو کئی بار غش آجاتا ہے
کوئی برچھی کوئی تلوار لگا جاتا ہے

نیزہ ایک ایک جگر میں جو قریبِ دل ہی
سانس کی آمد و شد سینہ میں کیا مشکل ہی

قتل کی اپنے خبر دیتے ہیں شاہِ خوش خو
کبھی کہتے ہیں کہ اب چرخ سے برسیگا لہو
اب کوئی آن میں کھولے گی مری ماں گیسو
اب کوئی دم میں کٹے گا کسی سیّد کا گلو

کسی پیاسے کے سر و تن میں جُدائی ہوگی
اب کوئی آن میں فصیل پہ لڑائی ہوگی

اب کوئی دم میں لٹے گا کسی مظلوم کا گھر
کسی بیکس کی بہن ہوئیگی اب ننگے سر
حیف صد حیف کہ بن باپ کی ہوگی دختر
شمر کے ہاتھ سے کھائیگی طمانچے منہ پر

قتل کے بعد کٹیں گے کسی ناچار کے ہات
بے گنہ آج بندھیں گے کسی بیمار کے ہات

اشقیا کہتے تھے کیا فکر ہے اس کی ہم کو
تمہیں سیّد تمہیں بیکس ہوا امامِ خوشخو!
ظلم گذرے گا یہ سب تم پہ کہا ہے جو جو
گر بلا آئے تو آئے، جو قیامت ہو تو ہو

آپ گر ذبح تہِ تیغِ جفا ہوئیں گے
فاطمہؑ روئے گی کچھ ہم تو نہیں روئیں گے

مطلب اس کہنے سے یہ ہے کہ نہ سر ہوئے قلم
سو یہ امید نہ تم ہم سے رکھو حق کی قسم
رو رہے ہیں کہ پلا دے کوئی پانی اس دم
تشنۂ خوں ہیں بھلا دینگے تمہیں پانی ہم

آپ صابر ہیں تو پھر خوف ہی کیا مرنے کا
روئیے آپ کوئی رحم نہیں کرنے کا

شہ نے فرمایا خدا سے ڈرو کیا کہتے ہو آہ
اپنے دل پر تو بھلا ہاتھ رکھو تم للہ
حاشا للہ کہ پانی کی نہیں ہے مجھے چاہ
یوں ہی مہمان کو پردیس میں کرتے ہیں تباہ

یہ تو سمجھو کوئی ناحق بھی بھلا روتا ہے
ٹکڑے اکبرؑ کی جدائی سے جگر ہوتا ہے

جسکا مرتا ہی پسر سب اُسے سمجھاتے ہیں
مبتلا دُکھ میں جو ہو اُسپہ ترس کھاتے ہیں
یا کہ اس طرح سے ایذا اُسے پہونچاتے ہیں
یا کہ پانی کے لیے بھی اُسے ترساتے ہیں

یہ گلہ تم سے نہیں پانی دیا یا نہ دیا
حیف اکبرؑ کا بھی تم نے مجھے پُرسا نہ دیا

سامنے احمدؐ مرسل کے اگر میں مرتا
نہ مسلماں ۔ نہ نبی زادہ ۔ نہ مہماں اپنا
کیا مرے نانا کو تم دیتے نہ پُرسا میرا
نہ مسافر مجھے تم سمجھے نہ سیّد جانا

گھر سے بُلوا کے مجھے ذبح کے قابل سمجھے
تم سے محشر میں مرا خالقِ عادل سمجھے

کس کو دنیا میں نہیں ہے مرے رتبہ کی خبر
آتے تھے میری عیادت کے لیے پیغمبرؐ
عہدِ طفلی میں مجھے عارضہ ہوتا تھا اگر
میری صحت کے لیے رکھتے تھے روزے اکثر

میں تو اُمّت پہ فدا کرتا ہوں سر کو اپنے

مجھ پہ صدقے کیا نانا نے پسر کو اپنے

مثال ۱۵ - شب عاشور مدینہ میں حضرت صغرا کا دل یکایک بیقرار ہو گیا اور چونکہ وہی رات امام حسینؑ کی شبِ شہادت تھی اور اہلبیتؑ کو درد انگیز مصیبت کا سامنا تھا اس لیے ان واقعات نے جناب صغراؑ کے دل میں ایک خاص اثر پیدا کر دیا اُسوقت اُنکے اضطراب اور انتشار کی تصویر

ناگاہ مدینے میں قیامت کی شب آئی
صغرا کے لیے سخت ہلاکت کی شب آئی
گذرا جو نواں روز شہادت کی شب آئی
نانی کو پکاری یہ کس آفت کی شب آئی

بے نور ستارے بھی ہیں اور چرخِ بریں بھی
لے لو در و دیوار بھی ہلتے ہیں زمیں بھی

للہ نواسی کے کلیجے کو سنبھالو
اس رات سے میں ڈرتی ہوں چھاتی سے لگا لو
عباسؑ چچا جان کی ماں کو بھی بلا لو
قرآن مرے پڑھنے کا ہاتوں پہ اٹھا لو

مر جاؤنگی اس شب کے اندھیرے سے دہل کر
روضے پہ نبیؐ کے رہو اس رات کو چل کر

کیا جانے مسافر مرے اسوقت کہاں ہیں؟
پانی بھی ملا ہی اُنھیں یا تشنہ دہاں ہیں
اُترے ہیں کہیں یا اس اندھیرے میں رواں ہیں
اللہ غریبوں کا نگہباں وہ جہاں ہیں

روشن رہیں دنیا میں چراغ آلِ عبا کے

لہ یہ بند الفاظ کی فصاحت۔ بندش کی صفائی اور زبان کی روانی کے لحاظ سے عنوان فصاحت میں صفحہ ۵۲ پر بھی درج کیے گئے ہیں۔ یہاں خوبیِ مضمون و معنی کی مناسبت سے لکھے گئے۔

دل میرا اُلجھا جاتا ہے جھونکوں سے ہوا کے

کیوں آج پرندے نہیں لیتے ہیں بسیرا
ان طائروں کے اُڑنے سے ہوش اُڑا ہے میرا
کیا انکے سلیمانؑ کو دشمن نے ہے گھیرا
دیکھیں ہمیں دکھلاتا ہے کیا کل یہ اندھیرا

بالکل غضب و قہر الٰہی کی ہے آمد
کیا جانیے کس گھر یہ تباہی کی ہے آمد

مثال ۱۶ - اہلبیتؑ کے لُٹے ہوئے قافلہ کا مدینہ میں داخلہ

ان روزوں میں جس درجہ ہو ماتم تو بجا ہے
کونین کی شہزادیوں پر ظلم و جفا ہے
سر حضرتِ شبیرؑ کی بہنوں کا کھُلا ہے
اور طوقِ گرانبار میں عابدؑ کا گلا ہے

رستہ میں ٹھہرنے بھی نہیں پاتے ہیں عابدؑ
پہنے ہوئے زنجیر چلے جاتے ہیں عابدؑ

اس حال کی میں کھینچتا ہوں مومنو تصویر
یثرب میں ہے یوں داخلہ عترتِ شبیرؑ
ہمراہ نہیں کوئی مگر عابدِ دلگیر
منہ اہلِ مدینہ کا ہے فق حال ہے تغیر

سر ننگے وہ سب قافلۂ آلِ نبیؐ ہے
فریاد میں مانند جرس روحِ علیؑ ہے

نکلا تھا مدینے سے جو ابنِ شہِ مرداں
تھے ہودج و محمل میں حرم شاہ کے پنہاں
اب آئے ہیں سب آلِ نبیؐ باسرِ عریاں
جانے کی تو وہ شان تھی اور آنے کی یہ شاں

یہ قافلہ کیوں بیکس و ناچار نہ ہووے
شبیرؑ سا جب قافلہ سالار نہ ہووے

انبوہِ خلائق سے مدینہ میں ہے محشر
ہے چاک گریباں کوئی اور کوئی کھُلے سر
در پر کوئی روتا ہے کوئی بام کے اوپر
گھبرائے ہوئے پھرتے ہیں سب شہر کے باہر

امّ سلمہؓ خاک پہ بیہوش پڑی ہے
دروازہ پہ صغراؑ بھی عصا تھامے کھڑی ہے

ہر ایک نے صغراؑ سے چھپایا ہے یہ احوال
کہتی ہے کہ اے لوگو کہو مجھ سے تو یہ حال
ایک ایک کا منہ تکتی ہے وہ صاحبِ اقبال
کون آتا ہے کھولے ہیں جو سب بیبیوں نے بال

گھر کس کا لٹا قتل ہوا کون یہ رن میں
جو خاک سی اُڑتی ہے ہر اک سمت وطن میں

جب اُسنے سنی مادرِ مظلوم کی زاری
اے والدۂ ماجدہ تسلیم ہماری
دوڑی گئی محمل کے قریب اور یہ پکاری
اصغرؑ کو دکھا دو ہمیں ٹھہراؤ سواری

کہدو کہ تمنا ترے ملنے کی بڑی ہے
بیمار بہن ہاتوں کو پھیلائے کھڑی ہے

صغراؑ تو ابھی کرتی تھی یہ درد کی گفتار
سب اُس کی طرف دیکھ کے چلائے یہ اکبار
ناگہ نظر آیا شہِ مظلوم کا رہوار
گھوڑے ترے قربان کہاں ہے ترا اسوار

ہیہات یہ تیروں سے چھنا جامہ ہے کس کا
یہ غرق بخوں زین یہ عمّامہ ہے کس کا

ناگاہ صدا زینبؑ بیکس کی یہ آئی
لوٹی گئی پردیس میں زہراؑ کی کمائی
اے اہلِ وطن احمدِ مرسل کی دُہائی
بھائی سے چھڑا کر مجھے تقدیر ہے لائی

فریاد کہ بیوارثی ہو آئی ہے زینبؑ

شبیرؑ سے ماں جائے کو کھو آئی ہے زینبؑ

میں وہ ہوں کہ اکبرؑ سا پسر جسکا موا ہے
میں وہ ہوں کہ پردیس میں گھر جسکا لٹا ہے
میں وہ ہوں کہ پردیس میں سر جسکا کھلا ہے
میں وہ ہوں کہ رسی میں بندھا جسکا گلا ہے

بے جرم و خطا مورد تعزیر ہوئی ہوں
بازاروں میں اور شہروں میں تشہیر ہوئی ہوں

جب مدینے میں شہیدونکے عزادار آئے
ننگے سر بال کھلے مضطر و ناچار آئے
ہو کے بیکس حرمِ احمدِؐ مختار آئے
غل ہوا پھر کے وطن میں شہِ ابرار آئے

مژدہ اے اہلِ وطن سیدِ کونین آیا
قبر میں فاطمہؑ کی روح کو اب چین آیا

جب سے کوفہ کو سدھارے تھے شہِ جنّ و بشر
ہر گلی کوچہ میں آتی تھی اداسی سی نظر
اب یہ سب کوچے ہیں عباسؑ ہیں اور ہیں اکبرؑ
گھٹنوؤں گھٹنوؤں گلیوں میں پھرینگے اصغرؑ

گو مدینہ میں ہر اک سمت کو ناشادی ہے
پھر کوئی دن میں وہی رونق و آبادی ہے

پر یہ حیرت ہی بڑی دل کو ہمارے ہے بخدا
آج تو روزِ خوشی ہے کہ پھرے شاہِ ہدا
گنبدِ قبرِ نبیؐ کس لیے ہے کانپ رہا
قبر سے فاطمہؑ کے رونے کی آتی ہے صدا

بے سبب قبرِ حسنؑ بھی نہیں تھرائی ہے
کچھ نہ کچھ سبطِ پیمبر پہ بلا آئی ہے

اتنے میں شہر مدینہ میں اٹھا شیون و شین
ہائے آقا کوئی کہتا تھا کوئی ہائے حسینؑ

اک طرف کانپتی تھی تربتِ رسول الثقلین
اک طرف گور میں تھی فاطمۂ زہرا بیچین

خود بخود خاک پہ عمامے وہاں گرتے تھے
لوگ سب شہر کے گھبرائے ہوئے پھرتے تھے

مومنو حالتِ جانکاہ سنو اُس کی ذرا
لُٹکے پردیس سے آیا ہے یہ کُنبہ جس کا

جسکا مظلوم پدر تشنہ دہن قتل ہوا
کون وہ دخترِ شبیرؑ جنابِ صغراؑ

شاہ کی حسرتِ دیدار نہ کم ہوتی تھی
آنکھیں کھولے ہوئے بابا کی طرف روتی تھی

شدتِ ضعف سے تھا سانس کا لینا مشکل
نہ قضا آتی تھی نے ہوتی تھی صحت حاصل

دردِ سر۔ شدتِ اعضاشکنی۔ سوزشِ دل
دل تڑپتا تھا سدا صورتِ مرغِ بسمل

شدتِ تپ میں وہ بستر پہ پڑی سوتی تھی
بیٹھی بالین پہ امِ سلمہؓ روتی تھی

واقعہ نگاری

لائق مؤلف نے واقعہ نگاری کی جو تعریف لکھی ہے وہ درست اور صحیح ہے۔ لیکن ایک مقام پر لکھتے ہیں کہ "اردو شاعروں نے جو مثنویاں لکھیں وہ مورّخانہ نہیں بلکہ عاشقانہ تھیں، اسلیے اصلی واقعات کے اظہار کی چنداں ضرورت پیش نہیں آئی"۔ اس عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ عشقیہ مضامین میں اصلی واقعات نہیں ہوتے اسلیے اُردو مثنوی گویوں کو اُن کے اظہار کی چنداں ضرورت پیش نہیں آئی۔ حالانکہ جیسے اصلی واقعات تاریخی مضامین میں پیش آتے ہیں اُسی قسم کے واقعات عشقیہ مضامین میں بھی پیدا ہو سکتے ہیں۔

مثلاً احباب کی جدائی۔ معرکہ آرائی۔ فتح و شکست۔ سفر و حضر۔ بیماری و موت قید و بند۔ صدماتِ مفارقت۔ یاس و نا امیدی۔ جدائی اور انتظار۔ وقت اور موسم کا سماں۔ باغ یا جنگل یا پہاڑ کی فضا۔ عیش و عشرت کے جلسوں کا سماں وغیرہ وغیرہ پس جو قادر الکلام شاعر ہیں اُنھوں نے عشقیہ مضامین میں بھی اُن کو ظاہر کر کے واقعہ نگاری کا حق ادا کر دیا ہے۔ خود مؤلف لکھتے ہیں کہ "میر حسن نے اپنی مثنوی میں اکثر واقعات کا سماں دکھانا چاہا ہے" حالانکہ وہ بھی عشقیہ مثنوی ہے۔

میر صاحب نے واقعہ نگاری میں جو کمال حاصل کیا ہی اُسکو ہم دل وجان سے تسلیم کرتے ہیں۔ فی الحقیقت بقول مولف وہ فطرت اور معاشرتِ انسانی کے بہت بڑے راز داں ہیں اسلیے دقیق سے دقیق اور چھوٹے سے چھوٹا نکتہ بھی اُنکی نظر سے بچ نہیں سکتا۔ جو مثالیں میر انیس صاحب مرحوم کے کلام سے اُنھوں نے لکھی ہیں بہت خوب اور لاجواب ہیں، اُن کے دیکھنے کے بعد ناظرین مرزا دبیر صاحب کے کلام سے بھی واقعہ نگاری کے متعلق ذیل کی مثالیں ملاحظہ فرمائیں۔

مثلاً حضرت امام حسینؑ کی شہادت کے وقت جناب زینبؑ اُن سے ملنے کو خیمہ سے نکلی ہیں تو جیسا کہ شرفا کی عورتوں کی حالت ایسی پریشانی میں ہوا کرتی ہی کہ قدم لڑکھڑاتے ہیں۔ زمین نظر نہیں آتی۔ ہجوم تفکّرات میں خیال کہیں ہوتا ہی آنکھیں کسی طرف ہوتی ہیں۔ قدم جلد اُٹھاتی ہیں تو گر پڑتی ہیں آہستہ چلتی ہیں تو مطلب کے فوت ہو جانے کا ڈر ہی۔ ان تمام مضطربانہ حالتوں کو جو ہمیشہ ایسے موقعوں پر واقع ہوا کرتی ہیں اس طرح ادا کیا ہی۔

دھڑکا یہ ہی کہ ذبح نہو جائیں شاہِ دیں	چلتی ہیں جلد، اور زمیں سوجھتی نہیں
واں لڑکھڑائیں، اور یہاں منھ کے بَل گریں	آنکھیں کہیں، خیال کہیں، اور دل کہیں

اسی مضمون کو دوسرے مرثیہ میں لکھا ہی کہ اضطراب میں اہلِ حرم خیمہ سے باہر نکل آئے ہیں۔ عصمت وعفّت کا تقاضا قدم بڑھانے سے مانع ہوتا ہی لیکن جذبِ محبت پھر بڑھنے کی تاکید کرتا ہی۔ اس موقع پر نیچرل حالت کی تصویر اور واقعہ کی اصلی صورت کھینچنے کے لیے یہ ضرور ہی کہ اس کشمکش کے موقع پر جو اضطرابی حالت پیش آسکتی ہی وہ دکھائی جائے چنانچہ اُس کی تصویر ان الفاظ میں کھینچی ہی ؎

سر پر فلک گرا تھا پہ اُٹھتے نہ تھے قدم	منہ فق، حواس باختہ، گردن حیا سے خم

یا مثلاً جب حضرت سکینہؑ نے پانی ملنے کی دعا کی ہے اور سب بچوں کو آمین کہنے کے واسطے بلا لیا ہے۔ تو حضرت بانوؑ جناب اصغرؑ کی طرف سے جو صرف چھ مہینے کے بچّے تھے، دعا و مناجات کی رسوم ادا کرتی ہیں۔ الفاظ نے واقعہ کی تصویر کھینچ دی ہے ؎

بانوؑ نے سنی جب یہ سکینہؑ کی مناجات	پھیلا دیئے اصغرؑ کے بھی قبلہ کی طرف ہات
کہنے لگی، اے کُل کے برآرندۂ حاجات	صدقے ترے، سُن لے مرے معصوم کی بھی بات

بے شیر مناجات میں ہے ہاتھ اُٹھا کے
پانی یہ طلب کرتا ہے ہونٹوں کو ہلا کے

یا مثلاً جب شمر نے یزید سے حضرت قاسمؑ کی لڑائی اور اُن کی شمشیر شرربار کی شعلہ فشانی کا تذکرہ کیا تو یکایک معرکۂ جنگ کا ہولناک سماں اُس کی نگاہوں کے سامنے چھا گیا۔ ایسے موقعوں پر قاعدہ ہے کہ انسان جب کسی واقعے سے بے حد مرعوب اور خوف زدہ ہو جاتا ہے تو ایسی بہکی ہوئی اور بے سروپا باتیں کرنے لگتا ہے جو خلافِ عقل اور خلافِ عادت ہوتی ہیں۔ چنانچہ اس بدحواسانہ حالت کو اس طرح ادا کیا ہے۔ ؎

اک دم میں لاکھ بار بروئے زمیں گری	کیوں اے یزید، یاں تو وہ بجلی نہیں گری!

یا مثلاً جب ہندہ یکایک قید خانے میں داخل ہوئی تو دربانوں نے اہلِ حرم سے کہا کہ تمہاری آہ وزاری سے بادشاہ کی بیوی کے خوابِ راحت میں خلل آیا اب وہ خفا ہو کر قید خانہ میں آتی ہے کہ تم سب کو قتل کر ڈالے اُسوقت اہلِ حرم خصوصاً چھوٹے

بچّوں کی پریشانی اور بدحواسی کو اس طرح بیان کیا ہے۔

یہ ذکر تھا جو ہند وہاں آئی یہ بیہوش	عابدؑ سے کہا بانوئے واری گئی خاموش
اک اک کے پسِ پشت ہوا شرم سے روپوش	بچے تو یہ سمجھے کہ ہوئی پیاس فراموش

منہ ڈھانپ لیے خوف سے کرتوں کو اُلٹ کر
اور سانس نہ لی بیبیوں کے سینوں سے لپٹ کر

ان اشعار میں جہانتک کہ الفاظ مساعدت کرسکتے تھے۔ ندامت۔ پریشانی اور گھبراہٹ کی تصویر اُتار دی گئی ہے۔ اس مصرع میں۔ ع۔ بچے تو یہ سمجھے کہ ہوئی پیاس فراموش۔ منتہائے تشویش کی تصویر جن لفظوں میں کھینچی ہے اُسکا لطف اربابِ ذوق خود جان سکتے ہیں۔

یا مثلاً جب حضرت علی اکبرؑ پیدا ہوئے اور جنابِ زینبؑ اُن کو حضرت امام حسینؑ کی خدمت میں لائیں تو اُنھوں نے علی اکبرؑ کی طرف سے جو صرف چند روز کے تھے آداب و سلام کے معمولات ادا کرائے ہیں۔ اس موقع پر مستورات کا دستور ہے کہ بچے کا ہات اُس کی پیشانی پر رکھ کر کہتی ہیں کہ دیکھو یہ تمہیں سلام کرتے ہیں۔ اس حالت کو بعینہٖ ادا کیا ہے۔

اکبرؑ کو بر میں لے کے مثالِ دل و جگر	خوش خوش گئی حضورِ شہِ دیں وہ خوش سیر
ہاتھ اُسکا اپنے ہاتھ سے رکھ کر جبین پر	بولی نگاہ روبروئے شاہِ بحر و بر

ننھا سا ہاتھ چاند سے ماتھے پہ دھرتے ہیں
ہمشکلِ مصطفےٰؐ تمہیں تسلیم کرتے ہیں

یا مثلاً جب جناب عبد اللہ ابن جعفرؓ نے امام حسینؑ کو صلاح دی کہ اہلِ حرم

کو ہمراہ نہ لیجائیں تو اُن کی بیوی حضرت زینبؑ نے اظہارِ خفگی فرمایا کہ اگر تم اپنے بیٹوں کی محبت کے خیال سے ایسا کہتے ہو تو میں اُن کو تمہارے پاس چھوڑ جاؤنگی لیکن میں بھائی کا ساتھ نہیں چھوڑ سکتی۔ بیٹوں نے یہ سُنا تو خیال ہوا کہ کہیں حضرت ہم کو چھوڑ نہ جائیں۔ چنانچہ اُنھوں نے اپنے خیالات کا اس طرح اظہار کیا ہے

یہ سُنتے ہی زینبؑ کے پسر آنکھ بچا کر		شبیرؑ کے پہلو میں کھڑے ہو گئے آکر

یا مثلاً جب حضرت علی اکبر لڑتے لڑتے تھک گئے اور تین دن کی پیاس میں تشنگی نے غلبہ کیا تو اس خیال سے کہ دریا کا نظارہ شاید جلتے ہوئے قلب و جگر کو کچھ تسکین دے، نہر کو دیکھتے ہیں۔ اس حالت کو اس طرح ادا کیا ہے

کوسوں کہیں نظر نہ پڑا سایۂ شجر،		دریا کو دیکھنے لگے اُٹھ اُٹھ کے زین پر

یا مثلاً جب حضرت سکینہؑ کو شدتِ عطش سے غش آگیا ہے تو اسوقت اُن کی نازک حالت کی تصویر کھینچی ہے

قطرے عرق ضعف کے بالائے جبیں ہیں		بل کھائے ہوئے ہاتھ کہیں پاؤں کہیں ہیں

یا مثلاً جب محب اہلبیتؑ ابنِ عفیف کی گرفتاری کیواسطے فوج ننگی تلواریں ہاتھ میں لیے ہوئے گھر میں گھس آئی ہے تو اُن کی کمسن لڑکی کی بدحواسی اور منت و زاری کے موقع پر لکھتے ہیں۔

ننھے سے ہاتھ جوڑے ہوئے سب کو تکتی تھی		سکتہ تھا مارے خوف کے کچھ کہہ نہ سکتی تھی

امام حسینؑ رسول اللہؐ کے پاس کھڑے ہوئے لباسِ عید رنگوا رہے ہیں اسوقت اُن کی حالت لکھی ہے

پیشِ نبیؐ تھا طشت میں حلہ پڑا ہوا		کاندھے پہ ہاتھ رکھ کے نواسا کھڑا ہوا

یا مثلاً جب تشنہ لب بچوں نے سُنا کہ حضرت عباسؑ نہر سے پانی بھر کر خیمے کی طرف آتے ہیں تو اُنکے اضطراب اور عجلت کو اس طرح ادا کرتے ہیں ؎

ہاتھوں میں کٹورے لیے سادات کے پیارے	ڈیوڑھی پہ کھڑے کرتے تھے دریا کے نظارے

یا مثلاً جب حارث حضرت مسلمؑ کے صاحبزادوں کی تلاش کے بعد گھر میں تھکا ماندہ واپس آیا ہے تو اُس کے غصّے اور غضب کو اس طرح ظاہر کیا ہے ؎

فرش پر رکھ کے قدم، سر سے پٹک دی دستار	ڈھال پھینکی کہیں جھنجلا کے کسی جا تلوار

جب وہ صاحبزادوں کو اپنے گھر میں ڈھونڈتا ہوا اُس حجرہ میں پہونچ گیا جہاں وہ موجود تھے تو صاحبزادوں کی پریشانی۔ خوف و اضطراب کی تصویر اس طرح کھینچتے ہیں ؎

تیغ چمکانے لگا بچوں کے سر پر وہ لئیم	اُٹھ کے تعظیم کی مظلوموں نے جُھک کر تسلیم
خوف سے بند تھے منہ، بات نہ کی جاتی تھی	
استخوانوں سے لرزنے کی صدا آتی تھی	

یا مثلاً امام حسینؑ کی شہادت کے وقت خیمہ میں بچوں کی خراب حالت ظاہر کی ہے۔ ؎

کچھ گود میں، کچھ خاکِ پا دان پڑے ہیں	کچھ اُنگلیاں پکڑے ہوئے بیوؤں کی کھڑے ہیں

یا مثلاً جب امام حسینؑ جناب علی اکبرؑ کی لاش کو دیکھ کر بیساختہ گھوڑے سے کودے ہیں تو اُنکے اضطراب کو اس طرح بیان کیا ہے ؎

دستور ہے سواروں کا جس دم اُترتے ہیں	پہلے جُدا رکاب سے وہ پاؤں کرتے ہیں
حضرت نے پاؤں بھی نہ نکالے رکاب سے	

لاشے پہ جست کرکے گرے اضطراب سے

اب ہم ہر قسم کی واقعہ نگاری کی چند مثالیں درج کرتے ہیں۔

۱۔ حضرت امام حسینؑ کا کربلا میں داخلہ، دشمنوں کی روک ٹوک، رفقائے امام کی برہمی امام علیہ السّلام کی صلح پسندی اور درگذر وغیرہ وغیرہ۔

اب خامۂ نقّاشِ غمِ حضرتِ شبّیرؑ — یوں کھینچتا ہے شاہ کے احوال کی تصویر
جب بادیۂ کرب و بلا پر شہِ دلگیر — پہونچے مع فوج و حرمِ صاحبِ تطہیر
بجنے لگے نقّارے نزولِ شہِ دیں کے
رُتبے تھے سوا تختِ سلیماں سے زمیں کے

کیا شانِ ورودِ شہِ دیں کا کہوں انداز — حشمت تھی خداداد تجمّل تھا خدا ساز
آگے تھے سواری کے نقیبانِ خوش آواز — اور زیبِ چپ و راست رفیقانِ سرافراز
تھا فوجِ حسینیؑ سے عیاں اوجِ حسینیؑ
قربان جلال و حشمِ فوجِ حسینیؑ

گھیرے ہوئے تھے خرد و کلاں شاہ کو سارے — ہوں گردِ قمر چھوٹے بڑے جیسے ستارے
کملائے ہوئے پھول سے رُخ دھوپ کے مارے — حسرت سے، محبت سے، رُخِ شہ کے نظارے
کس حسن سے سب گردِ شہِ جن و بشر تھے
شہ غیرتِ خورشید تھے وہ رشکِ قمر تھے

خورشیدِ علم کا تھا ہر ایک شہر میں شہرہ — ہو جس کے مقابل نہ کبھی مہر کا مہرہ
جوزا کی طرح نور علم کا تھا جو دُہرہ — خورشید تھا رایت پہ فدا پنجہ پہ زُہرہ

عاشق تھا علمدار جو سلطانِ امم کا
شقہ سرِ شبیرؑ پہ کھولا تھا علم کا

جب زیب دہِ منزلِ اوّل ہوئے شبیرؑ
ہاتف نے کہا واردِ مقتل ہوئے شبیرؑ
گھوڑا نہ چلا آگے تو بیدل ہوئے شبیرؑ
امت کے جو عقدے تھے وہ سب حل ہوئے شبیرؑ

عاشور کو اقلیمِ شہادت ہو مبارک
اور حشر کو امت کی شفاعت ہو مبارک

غرّہ تھا محرم کا جو وارد ہوئے مولا
کیوں اے مرے پردیسیو خوش آیا یہ صحرا
ٹھہرا کے سواری کو رفیقوں سے یہ پوچھا
برپا یہاں سب خیمے ہوں وہ بولے کہ اچھا

پر کتنے دنوں قصدِ قیام اے شہِ دیں ہے
شہ نے کہا تا حشر مقام اپنا یہیں ہے

وہ بولے جہاں تم چلو ہیں ساتھ تمہارے
پھر کود پڑے گھوڑوں سے اور زین اُتارے
مولا! یہ غلام آپ کے بے عذر ہیں سارے
خیمے بھی بپا ہو گئے دریا کے کنارے

وہ خیمہ تھا یا عرشِ معظم تھا زمیں پر
تھا اوجِ زمیں خیمۂ افلاک بریں پر

یہ ذکر تھا باہم کہ ہوئی شام نمایاں
تھے خیمے میں سب اہلِ حرم ششدر و حیراں
اور بیٹھ گئے خیمے کے دروازے پہ درباں
کرسی پہ مکیں متصلِ درِ شہِ ذیشاں

سلطانِ دو عالم کو جو تشویش بڑی تھی
زینبؑ عقبِ پردۂ دروازہ کھڑی تھی

ناگاہ سوئے خیمہ ہوئی آمدِ اعدا
ہر سمت تھی آوازِ دف و نوبت و قرنا

آواز دی زینبؑ نے کہ یا سیدِ والا   حضرت کی سلامی کی یہ نوبت ہے اُدھر کیا

یہ لوگ ہیں پردیسیوں کے لینے کو آئے
پیغامِ ضیافت ہیں تمھیں دینے کو آئے

شہ بولے قضا آئے گی لینے کو ہمارے   اور بھائی سے فرمایا یہ کیوں آتے ہیں پیارے
عباسؑ گئے پاس، تو اعدا یہ پکارے   دریا کے کنارے سے کرو خیمے کنارے

نہر اپنے عمل میں ہے، کہ ملکِ شہِ دیں ہے؟
کیوں قبضہ کیا شہ نے، یہ کوثر تو نہیں ہے

عباسؑ نے فرمایا کہ یہ تم نے کہا کیا   یہ کون مروت ہے، بھلا خُلق یہ کیسا
واللہ کہ ہے مہر میں زہراؑ کے یہ دریا   اسپر بھی کسی نے یہاں پانی نہیں روکا

شر کرنا بشر سے نہیں زیبا ہے بشر کو
ہم لوگ اِدھر اُترے ہیں، تم اُترو اُدھر کو

ہم نہر کے مختار نہیں، لو تمھیں مختار   مشکیزے بھی ساتھ آئے ہیں پانی نہیں درکار
مہمان کو ہے آب و غذا دینا سزاوار   اور تم نہیں دریا پہ بھی رہنے کے روادار

پردیسیوں سے خُلق کرو دھیان کدھر ہے
اصغرؑ چھ مہینے کا ہے اور پہلا سفر ہے

اعدا نے کہا صاف، یہ ہم کو نہیں منظور   لُٹ جائیگا ورنہ ابھی خیمے کو کرو دور
عباسؑ نے فرمایا کہ کثرت پہ ہو مغرور   ایسا تو کسی کا میں نہیں دیکھتا مقدور

لُوٹو تو بھلا خیمہ حسینؑ ابنِ علیؑ کا
دیکھو تو نشاں بھی نہیں رکھتا ہوں کسی کا

منزل کے اُٹھے دھوپ میں پردیسی ہیں آتے
لازم تھا تمہیں آنکے مُنہ بات دکھلاتے
مہمان سمجھ کر ہمیں دعوت بھی کھلاتے
سوا اسکے عوض خیمے جو دریا سے اُٹھاتے
کل صبح کو خیمہ بھی اُٹھا لینگے یہاں سے
تکلیف مگر ہوئیگی اب نقلِ مکاں سے

سیدانیاں طاعت میں ہیں او سوتے ہیں اطفال
بیمار بھتیجہ مرا بستر پہ ہے بے حال
وہ بولے یہ اظہار فقط عذر پہ ہے دال
ہم خیمہ و مسند کو کرینگے ابھی پامال
یہ کہہ کے کیا نیزوں کو خم اہلِ جفا نے
شمشیرِ علم کی خلفِ شیرِ خدا نے

یہ دیکھ کے کرسی سے اُٹھے سبطِ پیمبرؐ
چلّائے کہ ہاں ہاں مرے غازی مرے صفدر
بھائی! مری مظلومی و غربت پہ نظر کر
دکھلا تو مرے صبر کی تلوار کے جوہر
کیا ہوگا جو تو آج نہ اُمّت سے لڑیگا
کچھ فرق نہ حیدرؑ کی شجاعت میں پڑیگا

بھائی یہی نہ ہم کو ستاتے ہیں ستائیں
خیمہ کو اُٹھاتے ہیں اُٹھانے دو اُٹھائیں
اب آپ نہ برہم ہوں تحمّل کریں آئیں
زینبؑ ہے کھڑی ڈیوڑھی پہ لینے کو بلائیں
سُن سُن کے یہ غل غش ہوئی جاتی ہے سکینہؑ
لو آؤ بھی جانے دو بُلاتی ہے سکینہؑ

میں صابر و مظلوم ہوں تم غازی و صفدر
میں صبر میں ایوبؑ ہوں تم زور میں حیدرؑ
وہ آپ کا جوہر ہے یہ شبیرؑ کا جوہر
خیمہ کے اُٹھانے سے تو یہ غم ہے برادر
اُس دم تو جگر آپ کا صدمہ سے ہلیگا

جب ساتویں تاریخ سے پانی نہ ملیگا

عباسؑ پھرے کانپتے پیشِ شہِ والا — کی عرض وہی خوب ہے جو مرضیِ آقا
ہی کام ہمیں آپ سے، دریا سے غرض کیا — پر آپکے فدوی کا بھی دعویٰ نہیں بیجا
یہ آپنے بھی میں نے بھی حیدرؑ سے سُنا ہی
دریا کی ترائی تو مرے دفن کی جا ہی

شہ نے کہا بیشک یہی ہی آپ کا مدفن — اے بھائی مگر جیتے ہی جی یا پسِ مُردن
تم دوست خدا کے ہو، کرو خاطرِ دشمن — لو خیمہ اُٹھاؤ کہ حرم کرتے ہیں شیون
اُٹھنے لگا خیمہ تو حرم بولے یہ کیا ہے
زہراؑ کی ندا آئی کہ پہلی یہ جفا ہے

سوتے ہوئے بچوں کو تو فضہؑ نے جگایا — اور بانوؑ نے گہوارے سے اصغرؑ کو اُٹھایا
پر مسندِ شبیرؑ کو جس وقت بڑھایا — وسواس سے دل حضرتِ زینبؑ کا بھر آیا
جو پوچھتا تھا دیکھ کے اسبابِ حرم کو
کہتی تھی کہ یہاں نہ کیا ٹھہرنے ہم کو

ریتی پہ کیا شہ نے بپا خیمۂ پُرنور — درپیش رہے ایسے ہی غم تا شبِ عاشور
آئی شبِ عاشور تو مولا ہوئے مسرور — کہتے تھے کہ ہو جائینگے کل سارے قلق دُور
خیمہ میں رفیقوں کے بھی اک جشن بپا تھا
سامانِ قضا، شوقِ وغا، ذکرِ خدا تھا

سن کر شہِ مرداں کے نواسوں کی یہ گفتار — تحسین اُنھیں کرتی تھی زینبؑ جگر افگار

ناگاہ خبر لائے یہ حضرت کے خبردار — خیمہ کی طرف آتے ہیں کوفہ کے کچھ اسوار
یہ حکم ہی اُن کو پسرِ سعدِ لعیں کا
خیمہ لبِ دریا سے اُٹھا دو شہِ دیں کا

گھبرا گئے سُن کر یہ خبر سرورِ دلگیر — عباسؑ سے فرمایا کہ اے بازوئے شبیرؑ
ہاں جا کے ہو تم سدِّ رہِ لشکرِ بے پیر — پر میری طرح کیجیو مظلومی سے تقریر
امت کا مرے نانا کی دل تنگ نہ کرنا
دیتا ہوں سکینہؑ کی قسم جنگ نہ کرنا

یہ سُنکے چلے خیمہ سے عباسؑ علمدار — دیکھا تو سوئے خیمہ بڑھے آتے ہیں کفار
عباسؑ نے للکار کے فرمایا کہ ہشیار — یاں آنا مناسب نہیں چل جائیگی تلوار
کچھ پاس بھی تم لوگوں کو ہے آلِ نبیؐ کا
اب آگے تو خیمہ ہے حسینؑ ابنِ علیؑ کا

جبریلؑ بھی بے حکم کبھی یاں نہیں آیا — سر تن سے قلم پاؤ گے گر پاؤں بڑھایا
غصّے میں جو عباسؑ علمدار کو پایا — ڈر ڈر کے یہ اُس لشکرِ روبہ نے سُنایا
تم نے پسرِ سعد سے بھی پوچھ لیا ہے
یاں حکم اُترنے کا تمھیں کس نے دیا ہے ؟

عباسؑ نے فرمایا یہ تقریر ہے بے جا — کیسا پسرِ سعد ہمیں اُس سے غرض کیا
آقا ہیں ہمارے پسرِ فاطمہ زہراؑ — فرمانے سے اُنکے یہاں خیمہ کیا برپا
دریا کا تو کوثر سے کہیں مرتبہ کم ہے
کوثر پسرِ فاطمہؑ کے زیرِ قدم ہے

وہ بولے، نہیں یہ پسرِ سعد کو منظور
خیمہ پسرِ فاطمہؑ کا نہر سے ہو دور
عباسؑ نے فرمایا کہ کیا اسکا ہی مقدور
شاید کہ وہ کچھ فوج کی کثرت پہ ہے مغرور
یہ دل میں نہ سمجھے اسد اللہ نہیں ہی
ہمسا بھی دلاور کوئی واللہ نہیں ہی

کیا سمجھا ہے شبیرؑ کو وہ بیکس و بے یار
اب بھی شہِ بیکس کے بہتر ہیں مددگار
مہمانوں سے کرتے ہیں اسی طرح کی گفتار؟
وہ بات کرو جس سے رضامند ہو غفار
واللہ کہ اک میرے برادر کا ستانا
زہراؑ کا ستانا ہی پیمبرؐ کا ستانا

تم ہو کے مسلمان یہ باتیں نہ سناؤ
ہو جاؤ جو کافر تو شہِ دیں کو ستاؤ
منظور جہنم ہو تو زہراؑ کو رلاؤ
ہم ابنِ علیؑ ہیں ہمیں غصہ میں نہ لاؤ
ارشاد سے شہ کے ہے یہ گفتار ہماری
کونین میں مشہور ہے تلوار ہماری

وہ بولے کہ یہ عذر نہ مانیں گے تمہارے
یہ کہہ کے بڑھے خیمہ کو نامرد وہ سارے
عباسؑ نے کی تیغ علم غصہ کے مارے
اصحاب یہ جا کر درِ خیمہ پہ پکارے
جلد آئیے یا شاہ خیامِ نبوی سے
اب نوبتِ شمشیر ہی عباسؑ علیؑ سے

شہ جلد برآمد ہوئے خیمہ سے بصد یاس
بھائی کو پکارے، کہ یہ کیا کرتے ہو عباسؑ
امت مرے نانا کی ہی نانا کا کرو پاس
عباسؑ نے کی عرض حسینؑ آئے جو نہیں پاس
کچھ آپ نے تقریر سنی فوجِ لعیں کی؟

دریا پہ مناہی ہے خیامِ شہِ دیں کی!!

شہ بولے اسی بات پہ غصّے ہو برادر
تلوار کرو میان میں ہے صبر ہی بہتر
یہ غصّہ ہے تو ہوگی شہادت مری کیونکر
یہ ظلم ہی کیا، ظلم تو اب ہوئینگے مجھ پر

کاٹیں گے جو باغی چمنِ شیرِ خدا کو
تم زندہ نہ چھوڑوگے کسی اہلِ جفا کو

گر یہ نہیں دریا پہ اُترنے کے روادار
ریتی پہ کرو خیمے، عبث کرتے ہو تکرار
قسمت میں تو پانی نہیں اے مونس و غمخوار
گر نہر ہوئی پاس تو کیا تم کو سروکار

میں دلشکنی امّتِ جد کی نہ کروں گا
گر ان کی خوشی یہ ہے تو پیاسا ہی مروں گا

۲- حضرت عبّاسؑ کا میدان میں جانا اور شمر کا منصب وغیرہ کی ترغیب دینا

حضرتِ عبّاسؑ نے برہم ہو کر جواب سخت دیا دشمنوں نے خبر اڑا دی کہ عبّاسؑ ادھر آ گئے اہلبیتؑ اور خاصکر حضرت عبّاسؑ کی بیوی پر اُسوقت جو اثر ہوا اور جو باتیں ہوئیں اُن کو کس خوبی سے ادا کیا ہے۔

عبّاسؑ تو یاں شمر سے کرتے تھے یہ گفتار
اور فوج میں غل تھا کہ ملا ہم سے علمدار
لو ٹوٹ گئی اب کمرِ سیّدِ ابرار
اے لشکریو لوٹ پہ خیمہ کی ہو تیّار

زینبؑ کی ردا چھین لو شبّیرؑ کے آگے
پھر قتل کرو بھائی کو ہمشیر کے آگے

یاں متصلِ خیمہ کھڑے تھے شہِ ابرار
عبّاسؑ کے فرزند کو فرما رہے تھے پیار

یہ غل جو اُٹھا لشکرِ کفّار سے اک بار | پوچھا علی اکبرؑ سے یہ کیا شور ہے دلدار؟

معذور بصارت سے ہم اے نورِ نظر ہیں
تم اپنے چچا جان کو دیکھو تو کدھر ہیں

اکبرؑ نے یہ کی عرض بصد اشک فشانی[1] | نرغہ میں کھڑا ہے اسد اللہ کا جانی
ہے بے ادبی گر میں کہوں اپنی زبانی | آپس میں یہ کہتے ہیں مگر ظلم کے بانی

بیعت بھی ہم اب لینگے شہنشاہِ امم سے
عباسؑ دلاور سا جواں مل گیا ہم سے

پردے[2] سے لگی سُنتی تھی زینبؑ یہی گفتار | اکبرؑ کو پکاری کہ یہ کیا کہتے ہو دلدار!!
بُہتان ہے، تہمت ہے، غلط کہتے ہیں کفار | ایسا نہیں، عباسؑ تو ایسا نہیں زنہار

کیا مکر و فریب آتے ہیں اس فوجِ لعیں کو
عباسؑ سے کرتے ہیں یہ بدظن شہِ دیں کو

حضرت کو سُنا کر تو یہ کہتے ہیں ستمگار | عباسؑ سے واں اور ہی کچھ ہوتی ہے گفتار
منظور ہے آپس کا نفاق اُن کو سو دشوار | سردار نہ ایسا ہے، نہ ایسا ہے علمدار

اک جان دو قالب ہیں یہ افضالِ خدا سے
یہ اُن سے پھرینگے، نہ وہ شاہِ شہدا سے

[1] اس بلاغت کو دیکھو کہ حضرت علی اکبرؑ اس جھوٹی خبر کو کس قدر پس و پیش کے بعد زبان پر لائے یعنی میں تو اپنی زبان سے اس خبر کو بیان کرنا بھی بے ادبی سمجھتا ہوں ۔ مگر دشمن ایسا ایسا کہہ رہے ہیں ۱۲

[2] کیسی بلاغت ہے۔ عورتوں کے استقلال پر نظر کرو، حضرت زینبؑ کس استقلال اور یقین کے ساتھ بیان کر رہی ہیں کہ ہرگز ایسا نہیں ہو سکتا۔ تینوں بندوں میں حضرت زینبؑ کے کلام سے اس خبر کا یقین کرنا تو الگ رہا کسی فقرہ سے ایک خفیف سا شبہ بھی پایا نہیں جاتا ۱۲

شہ نے کہا خاموش ہو بنتِ اسدُاللہ
کیا تم نہیں عباسؑ کی باتوں سے ہو آگاہ
جو کہنا ہو آہستہ کہو غل نہ کرو آہ
گر کان تک اُسکے یہ خبر پہونچے گی ناگاہ
پانی بھی ملے گا تو نہ پھر آئیگا عباسؑ
غیرت سے گلا کاٹ کے مرجائیگا عباسؑ

یہ کہہ کے گیا خیمے میں لختِ دلِ زہراؑ
ہے غرقِ عرق زوجۂ عباسؑ سراپا
دیکھا کہ ہے واں بیبیوں میں بھی یہی چرچا
فرزند کھڑا روتا ہے اُسکو نہیں پروا
بے ہوش بدن کا ہے نہ کچھ سر کی خبر ہے
وہ سب سے جُدا بیٹھی ہے اور زانو پہ سر ہے

بالائے زمیں بیٹھ گئے سیدِ ابرار
شکوہ کوئی عباسؑ کا کیجو نہ خبردار
تھیں جمع جو سب بیبیاں کی اُنسے یہ گفتار
عباسؑ مرا اور مری جاں کا ہے مختار
مجھ سے نہ بُرائی مرا محبوب کرے گا
جو حق میں کریگا وہ مرے خوب کرے گا

زینبؑ سے کہا روتی ہو کیا آؤ مرے پاس
مانگو یہ دعا اے بہن اسوقت بصد یاس
عباسؑ کی جانب سے ہمیں کچھ نہیں وسواس
میں روؤں نہ عباسؑ کو روئے مجھے عباسؑ
آباد ہو وہ اور سفرِ خلد کروں میں
عباسِؑ دلاور کی بلا لیکے مروں میں

۱؎ یہ بھی عجیب بلاغت ہے کہ حضرت امام حسینؑ کو جناب عباسؑ کی وفاداری اور سچی محبت کا اسقدر یقین واثق ہے کہ وہ چاہتے ہیں کہ عباسؑ اُنکے بعد زندہ رہیں تاکہ اہلِ بیت علیہم السلام کے حافظ و معین ہوں اور اُن کو دشمنانِ دین کے ظلم وستم سے بچاتے رہیں۔

عباسؑ تو ہی رحم دل اور صاحبِ اولاد — وہ ہونے نہ دیگا مرے ناموس کو برباد
عابدؑ پہ کرینگے جو ستم یہ ستم ایجاد — عباسؑ سے دیکھی نہ جائیگی وہ بیداد
غیروں کو یتیموں پہ ترس آتا ہے زینبؑ
عباسؑ تو بھائی مرا کہلاتا ہے زینبؑ

یہ سنتے ہی[1] دل زوجۂ عباسؑ کا تڑپا — شرمائی ہوئی شہ کے قریب آئی وہ دکھیا
اور بولی کہ اے وارثِ ذریتِ زہرؑا — یہ حرف نہ تم اپنی زبان سے کہو آقا
والی مرا قربانِ امامِ دو جہاں ہو
فرزند مرا آپ کے سائے میں جواں ہو

خاطر سے علمدار کی کہتی نہیں یہ بات — فرماؤ تو فرزند کے سر پر میں رکھوں ہات
وارث مرا بچپن سے شہِ پاک کے ہے سات — حضرت کی غلامی ہے اُسے فخر و مباہات
والی مرا تم سے نہیں پھرنے کا بلا لوں
اس بات پہ جیسی کہو سوگند میں کھالوں

پھر جا کے درِ خیمہ پہ رو کر یہ پکاری — غیرت سے موئی جاتی ہے لونڈی یہ تمہاری
صاحب مرے ٹھہرائی ہے کیوں تمنے سواری — پھر پیاس سے غش ہو گئی شبیرؑ کی پیاری
یہ شمرِ لعیں قاتلِ شاہِ شہدا ہے
صدقے گئی دشمن سے بھلا مشورہ کیا ہے

[1] زوجۂ حضرت عباسؑ کی زبان سے دونوں بندوں پر نظر کرو۔ وہ کس استقلال اور یقین کے ساتھ کہہ رہی ہیں کہ میرا والی ہرگز آپ سے پھر نہیں سکتا۔ اُنکے کلام کے ایک ایک فقرہ سے پایا جاتا ہے کہ اُن کو اپنے شوہر کی وفاداری اور خلوصِ عقیدت کا ایسا پختہ اور مستحکم یقین ہے کہ کسی فقرہ سے بطور فرضِ محال بھی کسی قسم کے شک و شبہ کا شائبہ نہیں پایا جاتا۔

یہ شمر وہ ہے جس سے ید اللہ تھے بیزار
شبیرؑ کے سینے پہ یہی ہوئے گا اسوار
نفریں اسے کرتے تھے سدا احمدِ مختار
زہراؑ کے کلیجے پہ یہی پھیرے گا تلوار

خونِ شہِ مظلوم کا پیاسا یہ لعیں ہے
تم بات کرو اس سے غضب ہے کہ نہیں ہے

نے ہم کوئی اسکے ہیں نہ یہ کوئی ہمارا
جز سبطِ نبیؐ کون ہے دنیا میں تمہارا
ہم کو ہے وہ پیارا جسے شبیرؑ ہے پیارا
ہے بعدِ خدا ہم کو شہِ دیں کا سہارا

پہلے تو دعا کرتی تھی تم پھر کے گھر آؤ
پر اب یہ تمنا ہے کہ کٹوا کے سر آؤ

۳- شمر دربارِ یزید میں داخل ہوتا ہے یزید اُس سے شہدائے کربلا کی شجاعت وغیرہ کے حالات دریافت کرتا ہے۔ شمر ایک ایک چیز کی تفصیل بیان کرتا ہے۔ ؎

القصہ انجمن میں حرم بے نقاب آئے
بزمِ شراب و رقص میں عصمت مآب آئے
پر کانپتے ہوئے صفتِ آفتاب آئے
نذرِ یزید کے لیے سب شیخ و شاب آئے

تھا شمر کو خیال جو حاکم کے چین کا
زینبؑ کے آگے نذر دیا سر حسینؑ کا

بولا یزید دیکھ کے سر کی شکوہ و شاں
شہزور تھا سپاہِ حسینیؑ کا ہر جواں
سید کا سر یہی ہے؟ کہا شمر نے کہ ہاں
اطفالِ شیر خوار بھی تھے شیر سیگیاں

رن میں انگوٹھے چوستے جھولے سے آتے ہیں

پیکاں گلے پہ کھاتے ہیں اور مسکراتے ہیں

بولا وہ مسکرا کے کہ ابتک سنا نہیں
شیرِ خدا کا زور تجھے یاد کیا نہیں!
اُس نے کہا مبالغہ اس میں ذرا نہیں
اژدر کو گاہوارہ میں چیرا تھا یا نہیں؟

کیا سن تھا، کے برس کے جناب امیرؑ تھے
کُل دو مہینے کے شہِ گردوں سریر تھے

اُس نے کہا ارے وہ امامِ انام ہیں
دریا دلی میں شک نہیں گو تشنہ کام ہیں
اس نے کہا کہ یہ بھی عزیزِ امام ہیں
سر دفترِ شکوہ و جلال انکے نام ہیں

بالکل چُنے ہوئے شرفائے مدینہ تھے
سر حلقۂ نامداروں میں مثلِ نگینہ تھے

بولا ادب سے جوڑ کے پھر ہاتھ وہ شریر
یہ قیدیوں کے ساتھ ہی جس کی دُلھن اسیر
قاسمؑ کی حرب و ضرب کا سُن حال اے امیر
مہر اس سے بخشوا لیا اور والدہ سے شیر

مہندی لگائے خون میں سب لال ہوگئے
سہرا بندھا تھا سر پہ کہ پامال ہوگئے

تصویر اُن کی آنکھ کے آگے ہی اس گھڑی
گرمایا باد پا تو ہوا ڈر کے گر پڑی
وہ قہر کی نگہ وہ رگِ ہاشمی کھڑی
یہ خوف یاد ہی کہ ہرن بھولے چوکڑی

ٹھہرا نہ آسمان بھی اُتنی زمین پر
رہوار تھا ہوا پہ سوار اُسکا زین پر

چمکا کے راہوار کو چمکارنے لگے
تا کا دل اُور تیرِ نگہ مارنے لگے
آوازِ قہر سے ہمیں للکارنے لگے
جو منچلے ادھر تھے وہ جی ہارنے لگے

تیغِ حسنؑ بوجہِ حسن لی نیام سے
لشکر میں آئے مثلِ علیؑ دھوم دھام سے

پھر تو خدا خدا تھا سبھوں کی زبان پر
تکبیر سُن کے ہاتھ دھرے ہمنے کان پر
قبضہ تھا ایک تیغ کا سارے جہان پر
اک برق تھی کہ کوند گئی ہر مکان پر

اک دم میں لاکھ بار بروے زمیں گری
کیوں اے امیرؔ یاں تو وہ بجلی نہیں گری؟

بھالا سنبھالا جس نے وہ تھرا کے گر پڑا
کھینچی کمان جس نے وہ چلا کے گر پڑا
ٹوکا جو ہوشیار کو غش کھا کے گر پڑا
روکا جو بھاگتے کو تو گھبرا کے گر پڑا

چل پھر سے بادپا کے ہوا تھک کے گر پڑی
تلوار یہ چلی کہ قضا تھک کے گر پڑی

بولا یزید یاں تو مرے ہوش جاتے ہیں
جو ایسے شیر ہوتے ہیں کم چوٹ کھاتے ہیں
اُس نے کہا بجا ہے یوں ہی سُنتے آتے ہیں
خاوند کے نصیب سے ہم فتح پاتے ہیں

غالب نہ اُس پہ کوئی کسی چال سے ہوا
بسمل فقط امیر کے اقبال سے ہوا

اُس نے کہا کہ ہاں مجھے بتلا تو کیا ہوا
بولا کہ غلبہ پیاس کا وقتِ وغا ہوا
سائل چچا سے مڑ کے وہ یوسف لقا ہوا
مڑنا تھا بس کہ شیث بڑھا یاں چھپا ہوا

برچھی غضب کی سینہ پہ موقع سے چل گئی
لے کر انی کلیجے کو باہر نکل گئی

بسمل کیے تھے اُس نے بہادر کئی جواں
چلایا ابنِ سعد سواروں کو نا گہاں

ہاں بسملوں کے خون کے ہیں مدعی کہاں
نامِ حسنؑ مٹا ہی یہ لاشے کا ہی نشاں

ہاں غازیو! سمندوں کی باگوں کو تھام لو
لاشے کو پائمال کرو انتقام لو

نکلا زبانِ شمر لعیں سے جو یہ سخن
ماں سے کہا سکینہؑ نے ہی ہی مری بہن
بیووں میں تڑپی ایک ضعیفہ اور اک دلہن
کھلوا دو ایک دم کو مرے ہاتھوں سے رسن

اسدم سنبھال لوں میں جگر اماں جانی کا
بی بی! بیان ہے یہ مرے دولہ بھائی کا

سن لو، جگر پہ نیزے کے کھانے کا ذکر ہی
لاشہ پہ بابا جان کے آنے کا ذکر ہی
دنیا سے دولہ بھائی کے جانے کا ذکر ہی
جو ذکر ہی بہن کے رُلانے کا ذکر ہی

حاکم کو کاش آئے حیا اس بیان سے
دولہ کے دفن کرنے کو کہدے زبان سے

حاکم پکارا خیر سُنا آگے کیا ہوا
سر پر علیؑ کا سبز پھریرا کھلا ہوا
بولا ورود حضرتِ عباسؑ کا ہوا
کوثر کا رخ کیے ہوئے، سقہ بنا ہوا

اک حملے میں وہ نہر پہ تھا سب کنارے تھے
رو کر سکینہؑ بولی وہ عمو ہمارے تھے

سُنتے ہی ذکرِ حملۂ عباسؑ اُس گھڑی
بیساختہ امیروں کی صف ہوگئی کھڑی
درباریوں کو شیر کی آمد نظر پڑی
بولا یہ شمر اُن سے بھی قسمت فقط لڑی

یاں نام سن کے رعب سے سب تھرتھراتے ہیں
اُنکے جگر سراہیے جو لڑکے آتے ہیں

حاکم نے سوئے شمر اشارہ کیا کہ ہاں
بدر و حنین و خیبر و صفین و نہرواں
وہ ملتمس ہوا کہ خلاصہ کروں بیاں
ہیں ان کی جنگ میں بھی یہی معرکے عیاں
یکتا ہیں یہ علیؑ کی طرح سے خدائی میں
مہر و وفا میں، خُلق و کرم میں، لڑائی میں

ہر حال میں مطیعِ امامِ عرب رہے
دریا میں بھی حسینؑ کے کیا کیا ادب رہے
جو گرد خیمہ کے یہ شہادت کی شب رہے
مجکو ترے نمک کی قسم تشنہ لب رہے
دم بھر نہ چھوڑتے تھے شہِ نیک ذات کو
بنتے تھے سایہ دن کو تو پروانہ رات کو

اکبرؑ کا پھر بیان کیا اُس نے برملا
زینبؑ نے لاکھ ضبط کیا پر نہ بس چلا
بولا یہ نوجوان تھا سب گھر کا لاڈلا
منہ سے نکل گیا مری گودی کا تھا پلا
اُس نے کہا درست ہی برچھی جو کھائی تھی
لاشہ پہ پیٹنے کو یہی بی بی آئی تھی

پہونچا کے لاشِ اکبرؑ عالی وقار کو
ہچکی لگی تھی پیاس سے اُس گلعذار کو
لائے حسینؑ ہاتھوں پہ اک شیرخوار کو
مُنہ کھولے دیکھتا تھا شہِ نامدار کو
ملتے تھے ہونٹھ بات سمجھ میں نہ آتی تھی
تالو لپک رہا تھا زباں اینٹھی جاتی تھی

سن وہ کہ رحم کھائے ہر اک گبر اور یہود
ہونٹوں سے رنگ غنچۂ سوسن کا تھا نمود
مُنہ وہ گلاب سا کہ پڑھیں جس پہ سب درود
اور گورے گورے ہاتھوں کی تھیں سب رگیں کبود
گھبرا کے سانس لیتے تھے آنکھیں پھراتے تھے

یہ ضعف تھا انگوٹھے بھی چوستے نہ جاتے تھے

آخر بیان بچے کا نام و نسب کیا
اُسکے لیے حسینؑ نے پانی طلب کیا
آگے نہ پوچھو حرملہ نے کیا غضب کیا
تیرِ جفا سے قتل اُسے تشنہ لب کیا
گردن پہ تیر لگتے ہی معصوم ڈر گیا
ہمکا پدر سے ملنے کو بس اُور مر گیا

زانو پہ ہاتھ مار کے یہ بولا وہ شریر
بچے کا کیا قصور تھا مارا جو اُس کو تیر
اُس نے کہا خوشی کے لیے تیری آئے اسیر
حاضر ہی سر بھی باچھوں میں اب تک بھرا ہے شیر
بولا یزید عذر و سماجت کروں گا میں
لا بے خطا کے سر کی زیارت کرونگا میں

ننھا سا سر اُٹھا کے جو لایا وہ ناگہاں
بانو نے لیکے سر کی بلائیں یہ کی فغاں
حاکم بھی کم سنی پہ تمہاری ہے مہرباں
چُپکے نہ رہیو وقتِ سفارش ہی واری ماں
کھولو زبان ننھی سی پیارے اگر کھلے
حاکم ردا اُڑھا مری دائی ہی سر کھلے

دیکھا بہت یزید نے شش ماہے کا جمال
وہ بھولی بھولی شکل وہ بکھرے جھنڈولے بال
آنکھوں کو ڈبڈبا کے کیا شمر سے مقال
پھولوں کے ساتھ ہوگئیں کلیاں بھی پائمال
میرے تو ہوش دیکھ کے یہ سر بجا نہیں
بتلا کبھی کڑھا تھا ترا دل بھی یا نہیں

۴۔ فوج آراستہ ہو رہی ہی اور علم لاکر رکھا گیا ہی۔ عونؑ و محمدؑ جو امام علیہ السلام

کے بھانجے اور حضرت زینبؑ کے صاحبزادے ہیں علم کے استحقاق کے دعویدار ہیں لیکن حضرت زینبؑ اُن کو سمجھاتی ہیں کہ امام علیہ السّلام سے اس منصب کی درخواست نہ کریں۔ حضرت امام حسینؑ جناب عبّاسؑ کو علم دیتے ہیں شمر حضرت زینبؑ کے صاحبزادوں کو بہکاتا ہے۔ اور وہ اُس کو جواب سخت دیتے ہیں۔ ۵

اب دیکھیے کسے یہ حسینیؑ علم ملے ‏ ‏ ‏ کس خضرِ تشنہ لب کو یہ ابرِ کرم ملے
پردیس میں قبالۂ باغِ ارم ملے ‏ ‏ ‏ لکھنے کو فردِ بخششِ امّت قلم سے ملے
کس کا یہ حق ہے معرکۂ کارزار میں
اک پاؤں سے کھڑا ہے علم انتظار میں

فوجِ خدا میں بھی ہیں طلبگار جابجا ‏ ‏ ‏ سرگوشیاں ہیں گوشوں میں ہر بار جابجا
یوسفؑ ہے ایک اور خریدار جابجا ‏ ‏ ‏ مشتاق ہیں عزیز اور انصار جابجا
اک عہدۂ جلیل یہ ہے مشرقین میں
دیکھیں کسے نصیب ہو عہدِ حسینؑ میں

ہر چند سب پہ شاق ہے امید و انتظار ‏ ‏ ‏ پر تابعِ رضائے حسینیؑ ہیں جاں نثار
زینبؑ کے یادگارِ علم کے ہیں ورثہ دار ‏ ‏ ‏ لیکن بڑا یہ کہتا ہے چھوٹے سے بار بار
بھائی علم کو آنکھ اُٹھا کر نہ دیکھیو
حضرت کو اور علم کو برابر نہ دیکھیو

فضّہ کو حکم دیتی ہیں زینبؑ کہ ڈھونڈ جا ‏ ‏ ‏ طالب کہیں علم کے نہ ہوں میرے دلربا
دادا ہے جعفرؑ اُن کا تو نانا ہے مرتضیٰ ‏ ‏ ‏ کہیو رضا حسینؑ کی منصب سے ہے سوا

آقا کے جو شرف ہیں وہ معلوم ہیں تمھیں
مانگا علم تو دو دہ نہ بخشو نگی میں تمھیں

کس دن کیواسطے طلبِ رایتِ ظفر
یہ دوپہر رولائے گی زینبؑ کو عمر بھر
واری بہت جیو گے جواب تم تو دوپہر
دنیا سے آج فوجِ حسینیؑ کا ہے سفر

گھر سے تمھیں حسینؑ کے صدقہ کو لائی ہوں
میں بے نشان ہونے کو یثرب سے آئی ہوں

پھر سارے ناصرانِ شہِ کربلا بڑھے
مشتاقِ منصبِ علمِ مصطفا بڑھے
پڑھنے کو سب عبارتِ حکمِ خدا بڑھے
لیکن نہ بازوے شہِ گلگوں قبا بڑھے

دونوں قدم زمینِ ادب میں گڑھے رہے
سر خم کیے کھڑے تھے جہاں واں کھڑے رہے

شبیرؑ نے لیا علمِ شافعِ امم
فرمایا تم کو شرم تھی سو آپ آئے ہم
عباسؑ کی طرف کو بڑھے خود کئی قدم
لو بھائی لو خدا نے تمھیں کو دیا علم

حمزہؑ کی ارث پائی ہمیں نذر دیجیے
ہاتھوں پہ رکھ کے سر وہ پکارے کہ لیجیے

پھر نذر دے کے عونؑ و محمدؑ ملک حشم
تھی فکر یہ کہ فدیۂ اوّل ہوئے نہ ہم
اک گوشہ میں کھڑے تھے کئی گردنوں کو خم
ہوتے ہیں آگے فوج کے سب حاملِ علم

سبقت نصیبِ حضرتِ عباسؑ ہو گئی
تھی آس پہلے مرنے کی اب یاس ہو گئی

جاسوس نے عمر کے جو دیکھا یہ ماجرا
جا کر کہا عمر سے، خداوند کچھ سُنا؟

بولا وہ کیا، کہا کہ مبارک کرے خدا
واں تفرقہ سپاہِ حسینی میں پڑ گیا
منصب جو اپنے جد کا نہ پایا خفا ہوئے
جعفرؓ کے پوتے فوجِ خدا سے جُدا ہوئے

گردن اُٹھا کے کہنے لگا شمرِ بد شعور
ہاں سچ تو ہی کھڑے ہیں الگ سب سے غیور
اُس نے کہا کہ اُن کا ملا لینا ہی ضرور
تجھ کو ہی جوڑ توڑ کا اپنے بہت غرور
ہاں ہدیۂ یزید کو زینبؑ کے لال لا
دو لختِ دل حسینؑ کے دل سے نکال لا

سینے پہ ہاتھ رکھ کے پکارا وہ بدشیم
یہ بھی ہے کوئی کام، ابھی لائے اُن کو ہم
اچھے سے اچھے اُسنے چنے جلد دو علم
پٹکوں میں جنکے نصب جواہر تھے ایک قلم
دو کشتیاں تھیں، ایک میں تو سر جام تھے
اور ایک میں چُنے ہوئے میوے تمام تھے

خم ہو کے نیم قد یہ کیا شمر نے کلام
اے وارثانِ حیدرؑ و جعفرؓ مر اسلام
یہ آن بان مان گئے رستمانِ شام
واللہ آج تم پہ ہے جرأت کا اختتام
یہ بانکپن نظر میں کھپا، جی میں گڑ گیا
سکّہ دلوں میں آپ کی عزّت کا پڑ گیا

حیراں ہیں سب یہ آپ کے ماموں نے کیا کیا
تم کو نہ حاملِ علمِ مصطفےٰ کیا
منصب تمہارا بھائی کو اپنے عطا کیا
لشکر سے اُنکے آپ اُٹھ آئے بجا کیا
سمجھیں نہ جب بزرگ تو خُردوں کو چارہ کیا
الفت خدا کی دین ہے اس میں اجارہ کیا

یہ سُن کے آپ میں نہ محمدؑ رہے نہ عونؑ ‏— دو عرش کانپنے یا تہ و بالا ہوئے دو کون
غصے سے سرخ ہو گیا یاقوتِ رخ کا لون ‏— شیرِ خداؑ کے شیر جو بھپریں سنبھالے کون
تن تن کے صاف سینوں کی ڈھالیں سنبھال لیں
آدھی سروہیاں کمروں سے نکال لیں

نعرہ کیا علیؑ کے نواسوں نے یک بیک ‏— بس بس زیادہ منہ سے نہ اب اہیات بک
چُپ نابکار چُپ، سرک او بے ادب سرک ‏— تیرے فریب و مکر سے اب کانپ اُٹھے فلک
بہکا اُنھیں خدا کو جو پہچانتے نہ ہوں
ظالم یہ اُن سے کہہ جو تجھے جانتے نہوں

اُن کو علم ملا تو ہمیں کو ملا علم ‏— خاطر ہماری ایسی ہی اُن سے کہیں جو ہم
ادنیٰ کو بخشدیں علمِ خسروِ امم ‏— پر ہم تو خوش ہیں اب کہ شرف دو ہوئے بہم
سردار ایک ماموں، علمدار دوسرا
ہم سا بھی ہے جہاں میں نمودار دوسرا

کلثومؑ یاں کھڑی تھیں پسِ پردہ بیقرار ‏— اُن سے کہا دلیروں نے یہ ہو کے شرمسار
یوں تو ہر ایک وقت ہی بندہ قصوروار ‏— پر اس گھڑی قصور نہیں اپنا زینہار
اماں کے دل میں شک جو پڑا ہو نکال دو
دونوں کو اُنکے پاؤں پہ لیجا کے ڈال دو

۵- حضرت زینبؑ کو جب یہ حال معلوم ہو گیا کہ اُنکے صاحبزادوں نے شمر سے بات چیت کی تو وہ برہم ہوئیں کہ شمر سے کیوں کلام کیا اُسوقت

کی گفتگو اور حضرت زینبؑ کی آزردگی ۔

دوڑی وفورِ طیش سے خود زینبؑ حزیں | فرمایا میں تو آئی کو تھی ننگے سر وہیں
کیا مشورہ تھا شمر سے؟ وہ بولے کچھ نہیں | فرمایا خوب! لوگوں میں چرچا ہے پھر یونہیں

شمرِ لعیں نے صلح جو ٹھیرائی ہوئیگی
مرضی تمہاری تھوڑی بہت پائی ہوئیگی

مالک سے اپنے پوچھ لیا تھا، جواب دو | زینبؑ نے تم کو اذن دیا تھا جواب دو
اکبرؑ سے اسکا ذکر کیا تھا جواب دو | اس دن کو میرا دودھ پیا تھا؟ جواب دو

اب سوچ ہے نجات جو دنیا سے پاؤنگی
جنّت میں فاطمہؑ کو میں کیا منہ دکھاؤنگی

ہی ہی مجھے تو اور ہی وسواس اب ہوا | شاید علم نہ ملنے کا تم کو تعب ہوا
عبّاسؑ کو ملا جو علم، کیا غضب ہوا | گذرا جو ناگوار، خلافِ ادب ہوا

آئے کوئی بلا نہ پدر کی کمائی پر
قربان تم ہوئے مرے عبّاسؑ بھائی پر

قدرت خدا کی، اپنے بزرگوں سے آن بان | تم کو بھی اب ہوئی یہ لیاقت خدا کی شان
منہ پر حضور کہتے ہو اور چھوٹے ماموں جان | اور بیٹھے پیچھے ہائے غضب ہمسری کا دھیان

دونوں جہاں میں موردِ الزام کر دیا
تم نے ہمارے دودھ کو بدنام کر دیا

قبلہ کو ہاتھ اُٹھا کے پکارے وہ مہ لقا | امّاں بربِّ کعبہ کہ خادم ہیں بے خطا
سُن لیجیے حضور تو پھر ہو جیسے خفا | جن کو حضور پالیں گی وہ ہونگے بیوفا

چاروں ملک جو مالکِ تقدیر سے پھریں
ہم دونوں بھائی حضرتِ شبیرؑ سے پھریں

قرآں پہ ہاتھ رکھنے کو موجود ہیں غلام
اکبرؑ سے پوچھ لیجیے نہ، اے فلک مقام
قرآں ہمارا کیا ہے سرِ اقدسِ امام
کھل جائے جھوٹ سچ کی حقیقت ابھی تمام

خدمت علم کی سیفِ خدا نے جو پائی تھی
پہلے تو اُن کو نذر ہمیں نے دکھائی تھی

منہ سوکھتا ہے کہتے ہوئے چھوٹے ماموں جان
ہم خاکِ پا ہیں اُنسے بھلا ہمسری کا دھیان
غربت میں اُن کی جان کو اللہ کی امان
اُسنے نہ ضد نہ ہٹ ہے ہمیں ورنہ آن بان

وہ باپ کی جگہ ہیں، بجائے امام ہیں
وہ نائبِ حسینؑ ہم اُن کے غلام ہیں

شمرِ زباں دراز پہ تھا اختیار کیا
کاذب کے قول و فعل کا ہی اعتبار کیا
کچھ یاد بھی نہیں کہ بکا نابکار کیا
ہم تو وہی ہیں آپ کو پھر اضطرار کیا

ایسے دیئے جواب کہ نقشہ بگڑ گیا
جیتا زمیں میں صورتِ قاروں وہ گڑ گیا

زینبؑ پکاری میں تو ہوئی سب میں سرنگوں
اک تیغ سے بہائیگا یہ پنجتنؑ کا خوں
ہے ہے ہر ایک رنج سے ہے رنج یہ فزوں
سر کھولوں شیرِ حق کو پکاروں دُہائی دوں

الفت جو تھی حسینؑ علیہ الصّلوٰت کی
کیوں تم نے میرے بھائی کے قاتل سے بات کی

۶ - جناب حرؑ شہادت پا چکے ہیں حضرت زینبؑ اپنے بیٹوں کو اُن کی مثال دیکر شہادت کی ترغیب دیتی ہیں، اُن کی فہمائش آزردگی اور دیگر واقعات

پھر عونؑ و محمدؑ کو قریب اپنے بُلایا
سردارِ دو عالم کے عوض سر جو کٹایا
اور لاش ہراوُل کی دکھا کر یہ سنایا
دیکھو یہ شرف حرِّ وفادار نے پایا

اس موت میں جینے کا مزہ مل گیا حرؑ کو
شبیرؑ کے ملنے سے خدا مل گیا حرؑ کو

پہچانو تو پیارو، یہ فرشتہ ہے کہ حرؑ ہے؟
رُخ مہر سے اللہ کی رشکِ مہ نور ہے
یہ وہی بہادر ہے کہ غلطاں کوئی دُر ہے
شبیرؑ کا بندہ ہوا دوزخ سے بھی حُر ہے

کیا خوب دمِ جنگ نصیب آ سکا لڑا ہے
یہ مُردہ ہے یا چودھویں کا چاند پڑا ہے

کیا تختۂ تن پر چمنِ زخم کھلے ہیں
نے پیاس کے شکوے ہیں نہ فاقوں کے گلے ہیں
کیا خدمتِ شبیرؑ کے پھل اُسکو ملے ہیں
اب آٹھ بہشت اُس کی شہادت کے صلے ہیں

جو مرد ہیں، وہ نام پہ سر دیتے ہیں پیارو
سر دیتے ہیں اور تاجِ شرف لیتے ہیں پیارو

اور ہائے پسر کی جو صدا آتی ہے واری
بیٹوں نے کہا پرورش آقا کی ہے ساری
ماں حرؑ کی نہیں روتی ہے نانی یہ تمہاری
دنیا میں خدا رکھے یہ فیض اُنکا ہے جاری

سردار ہیں حور و ملک و جن و بشر کے
بندے ہیں پہ مختار ہیں اللہ کے گھر کے

زینبؑ نے کہا شرط ہے خدمت بھی بجا لاؤ
ہاتھ آتی ہے بے جہد یہ دولت بھی بلا لو

کی حُرؑ نے غلامی بھی رفاقت بھی بلا لوں
ایسوں ہی کو ملتی ہے یہ عزت بھی بلا لوں

گو عام ہے بخشش پسرِ شیرِ خدا کی
پر حُرؑ نے وفا کی تو شہِ دیں نے عطا کی

میں صبح سے سمجھاتی ہوں تم کو نہیں کچھ دھیاں
یہ موت کا بازار ہے یہ قتل کا میداں
منہ دیکھتے تم رہ گئے حُرؑ ہو گیا بیجاں
کوشش کرو دیکھو نہیں پھر ہوگے پشیماں

سب جنسِ شہادت کے لیے لُٹتے ہیں پیارو
تیغوں پہ خریدار گرے پڑتے ہیں پیارو

کس دن کے لیے سیکھا ہے نیزوں کا ہلانا
کیا بھول گئے تیر کا تودے پہ لگانا؟
گر آج ہی بھالا کسی شامی پہ نہ تانا
ماموں کے حریفوں کو کرو آج نشانا

جو رنگ لگاتے تھے ہر اک روز وطن میں
اک دو کو بھی جو رنگ نہ تم نے کیا رن میں

کیوں پوچھوں میں اکبرؑ کو بُلا کر یہ کیا ہے
بابا کو تمہارے لکھوں کیا قہر کی جا ہے
شاگردوں کو اپنے ہی تعلیم کیا ہے
صاحب کے پسر جیتے ہیں حُرؑ قتل ہوا ہے

اولاد سے گر چرخ یونہیں شاد کریگا
کاہے کو کوئی خواہشِ اولاد کریگا

دکھلاؤ ہنر نیزے کے اس دم تو بجا ہے
شہ قدر شناس اور یہ میدانِ وغا ہے
اب تیر کا پلہ نہ دکھایا تو خطا ہے
اک دم میں یہاں خاتمۂ آلِ عبا ہے

اب نیزہ ہے اور سینۂ اکبرؑ ہے دوہائی
اب تیر ہے اور گردنِ اصغرؑ ہے دوہائی

یہ سُن کے لگے کہنے وہ غیرت سے لرز کر
کب آپ کے ارشاد سے فدوی ہوئے باہر
بس والدہ صاحب کہ چھُری چلتی ہے دلبر
کب ماموں نے فرمایا کہ صدقے نہ کیا سر

آقا جو رضا دیں تو وفا اپنی دکھا دیں
تیغوں سے گلے برچھیوں سے سینے ملا دیں

غصّے نہ ہو سر تیغوں سے کٹواتے ہیں امّاں
دنیا سے پُرارمان چلے جاتے ہیں امّاں
لو قبضۂ حیدرؑ کی قسم کھاتے ہیں امّاں
میدان سے دولھا ابھی بن آتے ہیں امّاں

حضرت نہ خفا ہوں نہ خفا ہوں نہ خفا ہوں
لو دودھ نہ تم بخشیو گر ہم نہ فدا ہوں

تلوار کی موت اپنے بزرگوں کا ہے جوہر
رن مردوں کی جاگیر ہے اور خانۂ زیں گھر
مرتے ہوئے پی لیتے ہیں آبِ دمِ خنجر
تیغوں کی چمک چھانوں ہے اور دھوپ ہے بستر

دل اپنا کفن اور جنازے سے غنی ہے
تابوتِ رواں گھوڑے ہیں جوشن کفنی ہے

زخمی ہو جو سر، نانا کا ورثہ ہے سراسر
دنداں ہوں شکستہ، تو ملے ارثِ پیمبرؐ
گر شانے کٹیں، ہاتھ لگے رتبۂ جعفرؑ
ہو چاک جو سینہ، تو دلِ حمزہؑ میں ہو گھر

کیوں امّاں ہم ایسے ہیں کہ جو موت سے ڈر جائیں
جب کھیتے گلے نیچوں سے کاٹ کے مر جائیں

ماموں تو بھلا قبلہ و کعبہ ہیں ہمارے
بچّوں کی عوض ہم کو کوئی جان سے مارے
اُنکے تو غلاموں سے ہمیں سر نہیں پیارے
سُنکر کہا زینبؑ نے میں قربان تمہارے

اللہ ہو خوش تم سے مجھے خوش کیا تم نے

جو جو مرے دل میں تھا وہ سب کہہ دیا تم نے

۷۔ حضرت علی اکبرؑ میدانِ جنگ میں جانے کے لیے پھوپی اور ماں سے اجازت طلب کرتے ہیں اُن دونوں کا اضطراب اور سوال و جواب

تیاریِ گلگشتِ جناں کرتے ہیں اکبرؑ
امّت پہ تصدقِ دل و جاں کرتے ہیں اکبرؑ
باغ اپنی جوانی کا خزاں کرتے ہیں اکبرؑ
ماں باپ کی غربت پہ فغاں کرتے ہیں اکبرؑ
بانوؑ کے کلیجے میں ہے ناسور ابھی سے
آنکھیں شہِ بیکس کی ہیں بے نور ابھی سے

بادل کی طرح رن میں عدو چھائے ہوئے ہیں
اس وقت حرم خیمہ میں گھبرائے ہوئے ہیں
مولا سرِ تسلیم کو نہوڑائے ہوئے ہیں
ہمشکلِ نبیؐ بہرِ وداع آئے ہوئے ہیں
عبّاسؑ کے ماتم کو تو موقوف کیا ہے
اس چاند کو ہالے کی طرح گھیر لیا ہے

برہم ہیں یہ ماتم کی صفیں دیکھ کے ہر سو
سر ننگے جو کنبہ ہے تو بل کھاتے ہیں گیسو
خالی ہے جو خیمہ تو بھرے آتے ہیں آنسو
عبّاسؑ سا مہ رو ہے نہ قاسمؑ سا ہے گلرو
حیراں ہیں کہ دربارِ پدر ہو گیا خالی!
رن بھر گیا گھر والوں سے گھر ہو گیا خالی

منّت ہے کنیزوں کی کہ اے بانوؑ کے گلفام
یہ کہتے ہیں مظلوموں کو آرام سے کیا کام
کیوں فرش بچھا دیں؟ کوئی دم کیجیے آرام
مٹتا ہے جنابِ علیؑ و فاطمہؑ کا نام
نیند آج کی کھو دینگے تو آرام ملے گا

اب قبر میں سوئینگے تو آرام ملے گا

اکبرؑ کی ہر ایک بات پہ تھرّاتی ہی بانوؑ
ماتھے پہ شکن دیکھ کے غش کھاتی ہی بانوؑ
کچھ سوچنے لگتے ہیں تو گھبراتی ہی، بانوؑ
تکتے ہیں جو رن کو تو موئی جاتی ہی بانوؑ

اک ہاتھ کلیجے پہ دھرے ایک جبیں پر
آنکھوں کو جھکائے ہوئے بیٹھی ہی زمیں پر

اکبرؑ کی گذارش ہی کہ منگوائیں سواری
ہاں کہتی ہی لو کیوں نہ رضا دونگی میں واری
پوری ہوئیں جو جو کہ مرادیں تھیں ہماری
گھر بھر گیا بچّوں سے دُلہن دیکھی تمہاری

کیا دیکھ کے دل خوش مرا ہوتا ہی بلالوں
پہلو میں دُلہن گود میں پوتا ہے بلالوں

پالا تھا اسی دن کے لیے تو، کہ جُدا ہو
آنکھوں کی نہ عینک ہو نہ پیری کی عصا ہو
ہم ڈہونڈیں دُلہن، اور تمہیں شوقِ قضا ہو
کچھ بات سمجھ کر کرو ناحق نہ خفا ہو،

ہاں کرتی ہوں واری نہ نہیں کرتی ہوں واری
نازک ہی مزاج آپ کا میں ڈرتی ہوں واری

کافی ہی تری چاہ جو پانی نہ ملے گا
دل باغ ہی گر داغ جوانی نہ ملے گا
ڈہونڈونگی تو کیا کیا مجھے جانی نہ ملے گا
پر احمدِؐ ثانی! ترا ثانی نہ ملے گا

انصاف نہ دو ہاتھ سے ہم شکلِ نبیؐ ہو
دیکھو کہیں مجھ سے نہ کوئی بے ادبی ہو

اکبرؑ نے یہ کی عرض کہ خادم کا ادب کیا
بستے بھی ہیں لٹتے بھی ہیں گھر اسکا عجب کیا
ہم تو ہیں پُر ارمانِ ازل، عیش و طرب کیا
فرمائیے دنیا میں شجر پھلتے ہیں سب کیا

کیا آپ نے تقدیر کو پھرتے نہیں دیکھا
بجلی کو کسی باغ پہ گرتے نہیں دیکھا

کچھ بانوئے بے کس کو جواب اسکا آیا
فرزند کا منہ دیکھ کے سر اپنا جھکایا
دروازہ پہ گھوڑا علی اکبرؑ نے منگایا
آداب بجالا کے پسر نے یہ سنایا

کپڑے بھی بدلواؤ نہ تکلیف اگر ہو
لیکن نہ ابھی حضرتِ زینبؑ کو خبر ہو

وہ بولی یہ مشکل ہے یہ دشوار ہے واری!
بچپن سے وہی رکھتی ہیں پوشاک تمہاری
اتنے میں وہاں آکے سکینہؑ یہ پکاری
وہ سن بھی چکیں آئی ہے ڈیوڑھی پہ سواری

غش آگیا ہے ہوش میں آلیں تو وہ آئیں
سب جاکے کلیجے کو سنبھالیں تو وہ آئیں

بولے علی اکبرؑ تمہیں کہہ آئیں پھوپی سے
بیزار ہوئی ہونگی وہ ہمشکلِ نبیؐ سے
بتلاؤ تو کیا جاکے کہا بنتِ علیؑ سے؟
وہ بولی کہ بھیا مجھے تم پیارے ہو جی سے

کہہ آئی میں اُنسے کہ کہیں جاتے ہیں بھائی
اماں کو بڑی دیر سے رُلواتے ہیں بھائی

ناگاہ نمودار ہوئیں زینبِؑ غمناک
چہرے پہ ملے خاک گریباں کیے چاک
اک خادمہ بغلوں میں لیے بقچۂ پوشاک
تن کانپتا تھا سرخ تھا غصّہ سے رُخِ پاک

کہتے تھے حرم غیظ میں یہ بنتِ علیؑ ہے
یا فاطمہؑ ہنگامۂ محشر میں چلی ہے

اکبرؑ کے سُنانے کو یہ کہتی تھی زباں سے
اے عونؑ و محمدؑ تمہیں لاؤں میں کہاں سے

جو کام کیا پوچھ کے مجھ سوختہ جاں سے ۔۔۔ اب قدر ہوئی پیاروں کی جب چھٹ گئے ماں سے

کیا جانکے دم بھرتی تھی ہمشکل نبیؐ کا
سب کہنے کی باتیں ہیں نہیں کوئی کسی کا

بانوؑ نے کہا کان میں اکبرؑ کے خبردار ۔۔۔ جو چاہیں یہ فرمائیں نہ تم بولیو زنہار
اسوقت جلالِ شہِ مرداںؑ کے ہیں آثار ۔۔۔ واری میں رضا دینے کا کرجاؤنگی انکار

سیدانیاں بھی دیکھ کے آمد کو ڈری ہیں
خالی یہ لرزنا نہیں غصّے میں بھری ہیں

پاس آکے کہا زینبِ بیکس نے برقّت ۔۔۔ لو بھابی یہ ملبوس یہ اکبرؑ کی امانت
بچپن کے بھی کرتے ہیں جوانی کے بھی خلعت ۔۔۔ اللہ مبارک کرے اب تم کو یہ خدمت

تم والدہ ان کی ہو پدر سرورِ دیں ہیں
یہ آج کھلا ہم کوئی اکبرؑ کے نہیں ہیں

جو بات ہو سچ، اُسکا بُرا ماننا کیا ہے ۔۔۔ قابل مرے ہاتھوں کے یہ پوشاک بھلا ہے
میں نے ابھی بیٹوں کا لہو منہ پہ ملا ہے ۔۔۔ یہ پیرہنِ ثانیِ محبوبِ خدا ہے

کیوں ہات سے میرے تمہیں وسواس نہ آئے
اکبرؑ کو قسم دو کہ مرے پاس نہ آئے

وہ بولی کہ جو کہیے سزاوار ہے بانوؑ ۔۔۔ دائی ہی نہ مادر ہے نہ مختار ہے بانوؑ
اکبرؑ ہیں جوانمرگ عزادار ہے بانوؑ ۔۔۔ ہی ہی! عجب آفت میں گرفتار ہے بانوؑ

یہ تم نے نہ پوچھا کہ بنی کیا مرے جی پر
حضرت بھی خفا ہوتی ہوئی آئیں مجھی پر

پھر رونے لگی بیٹھ کے واں زینبؑ ناچار ہمشکلِ نبیؐ لپٹے یہ کہتے ہوئے اک بار
میری پھوپی امّاں مری مالک مری مختار میں تو ہوں غلام آپ کا کیوں آپ ہیں بیزار
ہم چاہتے ہیں تم ہمیں چاہو کہ نہ چاہو
اللہ! اب اک بات پہ بندے سے خفا ہو

ہٹ ہٹ کے وہ بولیں کہ نہ یہ ذکر نکالو دم رکتا ہے باہیں نہ گلے میں مرے ڈالو
ماں بیٹھی ہے وہ جاؤ گلے اسکو لگالو بانوؑ کی خوشامد کرو مرنے کی رضا لو
میں پیار نہیں کرتی میں قرباں نہیں ہوتی
جاؤ میں تمہاری پھوپی امّاں نہیں ہوتی

جیتی رہیں بھابی وہ ہیں مختار تمہاری میں کاہے کو ہونے لگی حقدار تمہاری
جاؤ نہ سواری تو ہے تیار تمہاری یوں مجھ سے نظر پھر گئی اک بار تمہاری
کس سے کہوں کیا خونِ جگر پیتی ہوں ہے ہے
دل پر تو چھری چل گئی اور جیتی ہوں ہے ہے

زینبؑ نے بہت آپ کو اکبرؑ سے چھڑایا اکبرؑ نے انہیں منت و زاری سے منایا
آنسو جو تھمے مطلبِ دل اپنا سنایا زینبؑ نے کہا لو وہی مذکور پھر آیا
میں سمجھی تھی ناشاد کو اب شاد کروگے
سچ مچ علی اکبرؑ مجھے برباد کروگے

میں تیغ سے کٹتے یہ گلا دیکھ سکونگی جو سن نہیں سکتی وہ بھلا دیکھ سکونگی
اس باغ پہ بارانِ بلا دیکھ سکونگی اس چاند سے مکھڑے کو ڈھلا دیکھ سکونگی
آنسو مرے پونچھے تھے تو رلوانے کی خاطر

کیوں لال! یہ منظور تھا بچھڑ جانے کی خاطر

اکبر نے کہا آپ کی الفت کے میں قرباں
اب چند قدم کیجیے تکلیف پھوپی جاں
اک غم کا مرقع تمھیں دکھلاؤں گا اس آں
پھر آپ قسم دیں گی کہ مر جاؤ پر ارماں
پوچھا وہ مرقع کہاں اے حق کے ولی ہے
کی عرض پسِ پشت خیامِ نبوی ہے

بڑھ کر علی اکبر نے قنات ایک اٹھائی
گردن جو وہاں آ کے زینب نے جھکائی
دیکھا کہ کمر پکڑے ہوئے روتے ہیں بھائی
بیساختہ چلائی کہ اللہ دہائی!
اس غم کے مرقع کے میں قربان یہی ہے؟
رو کر کہا اکبر نے پھوپی جان یہی ہے

للہ سرِ پاک کے نہوڑانے کو دیکھو
فاقے سے مرے باپ کے تھرانے کو دیکھو
تنہا یہاں رونے کے لیے آنے کو دیکھو
ویران شہیدوں کے جلو خانے کو دیکھو
جو دم ہے غنیمت ہے، کچھ اب حال نہیں ہے
روکا جو مجھے، فاطمہ کا لال نہیں ہے

پھر تو یہ پکاری وہ ید اللہ کی جائی
سیدانیو! دولہ کو سنوارو اجل آئی
پوشاک نئی ہاتھوں پہ رکھ کر کوئی لائی
معراج تنِ پاک پہ اُس جامہ نے پائی
پھاڑا علی اکبر نے گریبان قبا کا
اور نوحہ کیا ہائے چچا ہائے چچا کا

نکلا وہ مرادوں کا چمن ہونے کو تاراج
ارمان پکارے کہ ملے خاک میں ہم آج
پہونچا گئے در تک حرم صاحبِ معراج
دوڑا عقبِ خیمہ سے کونین کا سرتاج

حضرت نے جو پوچھا کہ فدا ہوتے ہو ہم پر
فرزند نے سر رکھدیا بابا کے قدم پر

پھر سوئے فلک دیکھ کے شہ نے یہ سنایا
ایسا سب مجھے اس امّتِ بیدیں نے ستایا
بندہ کو گواہی تری کافی ہے خدایا
نانا کی زیارت سے بھی اب ہاتھ اُٹھایا

سر کاٹا مرے قافلے والوں کا سفر میں
تصویر نبیؐ کی بھی نہ چھوڑی مرے گھر میں

اس شکل کا میں اور کوئی بیٹا نہیں رکھتا
بندہ، کوئی جز خالقِ یکتا نہیں رکھتا
پر تیرے حضور اس کی بھی پروا نہیں رکھتا
سب کچھ ہی عنایت سے تری کیا نہیں رکھتا

گر درد دیا ہی تو تحمّل بھی دیا ہے
مالک مرے جو تو نے کیا خوب کیا ہے

۸۔ عونؑ و محمدؑ زخمی ہو کر خیمہ میں آئے ہیں اور قریب مرگ ہیں حضرت زینبؑ یہ دردناک منظر دیکھکر بہت صبر کرتی ہیں، لیکن آخر کار ضبط نہیں ہو سکتا اور بین جگر خراش کرتی ہیں ۔

فضّہ یہ کہہ رہی تھی کلیجہ کو تھام تھام
کچھ سوچ کر ٹھہر گئے واں سیّدِ انام
شہ پہونچے لاش لے کے قریبِ درِ خیام
رو کر کیا یہ اکبرؑ و عبّاسؑ سے کلام

لے جاؤ ان کو تم مری خواہر کے سامنے
ہم جائینگے نہ زینبؑ مضطر کے سامنے

لاشوں کو لیکے خیمہ میں آئے وہ رشکِ ماہ
اہلِ حرم کا حال ہوا دیکھ کر تباہ

بنت علیؑ کی لاشوں پہ جس دم پڑی نگاہ
سجدہ میں جھک گئی جگرِ ضیغمِ الٰہ

بیٹوں نے ہاتھ اُٹھائے جو تسلیم کے لیے
دیکر دعا کھڑی ہوئیں تعظیم کے لیے

پھر پڑگئی جو اکبرؑ و عباسؑ پر نظر
دیکھا کہ دونوں روتے ہیں تھامے ہوئے جگر
چلائی اور تڑپنے لگی گر کے خاک پر
اکبر بتاؤ جلد برادر گئے کدھر

خیمہ میں جو پھوپی کی کمائی کو لائے ہو
مقتل میں کھو کے کیا مرے بھائی کو آئے ہو

لیجاؤ دونوں لاشیں مجھے اپنے کام کیا
مجکو کوئی عزیز نہیں بھائی کے سوا
مرجاؤنگی تڑپ کے میں اے ابنِ مرتضیٰؑ
بھائی جواب دو مجھے بھائی کو کیا کیا

کھویا کہاں نشانِ علیؑ و بتولؑ کو
عباسؑ! تم سے لونگی میں سبطِ رسولؐ کو

غش کھا کے پھر زمیں پہ گری بنتِ مرتضیٰؑ
کہرام اُٹھا یہ خیمہ میں زینبؑ کی قضا
گھبرا کے دوڑے خیمے کو مظلومِ کربلا
آئے جو صحنِ خیمہ میں دیکھا یہ ماجرا

لاشوں کے گرد بیویاں ہیں حلقہ کیے ہوئے
کلثومؑ گود میں ہے بہن کو لیے ہوئے

گھبرا کے پوچھا شاہ نے ہمشیر کیا ہوا
بیٹوں کی لاش دیکھ کے کیا غش ہے آگیا
غش میں سُنی جو شاہ کی زینبؑ نے یہ صدا
جان آگئی بدن میں پکاری کہ میں فدا

کچھ غم نہیں جو قتل ہر اک لال ہو گیا
دیکھا نہ تھا جو آپ کو یہ حال ہو گیا

شہ بولے اے بہن مری الفت یہ کب تلک — کی عرض ہاتھ جوڑ کے جیتی ہوں جب تلک
بولے، گلے لگایا نہ لاشوں کو اب تلک — تحسین کا سخن بھی نہ تم لائیں لب تلک
اُٹھو گلے لگاؤ کہ لڑ بھڑ کے آتے ہیں
ہم دیکھنے کو عابدِؑ مضطر کے جاتے ہیں

یہ کہہ کے پھر وہاں سے چلا حق کا وہ ولی — تھرّا کے اُٹھی بنتِ علیؑ کہہ کے یا علیؑ
آئی جو پاس لاشوں کے زہراؑ کی لاڈلی — وہ آہ کی کہ سب کے دلوں پہ چھُری چلی
پھر ہو سکا نہ ضبط دلِ پاش پاش سے
گر کر زمیں پہ لپٹی وہ دونوں کی لاش سے

شفقت سے بار بار گلے سے لگاتی تھی — لیتی تھی گہ بلائیں کبھی صدقے جاتی تھی
آنکھوں سے آنکھیں ملتی تھی آنسو بہاتی تھی — بوسے لبوں کے لیتی تھی اور رنج کھاتی تھی
کہتی تھی واہ پیارو بڑا کام کر چلے
ماموں پہ صدقے ہو کے مرا نام کر چلے

ایسا تمھیں نہ جانتی تھی بنتِ مرتضےؑ — جی بھر کے تم کو پیار نہ میں نے کبھی کیا
جب چاہا بے قصور بھی میں نے گھُڑک لیا — پیارو! خدا کے واسطے بخشو مری خطا
جنّت میں سامنا جو ہو امّاں بتولؑ کا
شکوہ نہ ان سے کیجیو مجھ دل ملول کا

پیارو! وہاں چلے ہو جہاں کا نشاں نہیں — رہبر نہیں، رفیق نہیں کارواں نہیں
بچے ہو، ساتھ باپ نہیں اور ماں نہیں — زخموں سے چور چور ہو تاب و تواں نہیں
منزل تلک غضب کی ہے تنہائی راہ میں

بھائی سے ہوشیار رہے بھائی راہ میں

پوچھے درِ بہشت پہ گر خازنِ جناں
تم کون ہو، کہاں سے ہوا ہے گذر یہاں
ہاں افصح العرب کے نواسو! نثار ماں
اُس دم کہیں نہ پیاس سے لکنت کرے زباں

کہنا کہ ہم شبیہ پیمبر کے بھائی ہیں
شبیر کے غلام ہیں، اور کربلائی ہیں

غش میں سُنا جو دونوں نے زینب کا یہ بیاں
گھبرا کے آنکھیں کھول کے بولے وہ نیم جاں
اے اماں جان، جاتے ہیں اب ہم سوئے جناں
حُرمت کا آپ کی رہے خالق نگاہباں

یہ کہہ کے منہ پھرائے تو چہرے بدل گئے
تسلیم کی اشاروں سے اور دم نکل گئے

زینب کو جو قسمت نے یہ سامان دکھایا
مادر ہی کا تو دل تھا وہ آخر کو بھر آیا
فرزندوں کے مُردوں کو کلیجہ سے لگایا
پھر دونوں کے لاشوں کو ہلا کر یہ سُنایا

وہ بات جو سمجھاتے تھے مجھ تشنہ دہن کو
ماموں سے بھی کہہ دو کہ نہ اب جائیں وہ رن کو

میں نے جو سُنا ہے یہ تم دونوں سدھارے
ہے ہے تمہیں کیا کیا نہ کہا غصہ کے مارے
بخشو مجھے اب پاؤں میں پڑتی ہوں تمہارے
تم ماموں کے پیارے ہو، تم اللہ کے پیارے

دانستہ تو کچھ ماں نے نہیں تم سے کہا تھا
پر کیا کروں قابو نہ مرا دل پہ رہا تھا

تم دونوں نے تو ہاتھ نہ پانی سے لگایا
اور حیف کہ دل کو مرے وسواس یہ آیا

اس بات پہ میں نے تمہیں گھر میں بُلایا | اور گود میں لاشوں کو نہ الفت سے اُٹھایا

خدمت میں قصور اَور نہیں ماں نے کیا ہے
گر ہے تو یہی پالنے والی کی خطا ہے

۹ ۔ شیریں کو خبر ہوئی کہ امام حسین علیہ السّلام مع تمام خاندان کے اُسکے گھر تشریف لاتے ہیں، وہ مہمانی کا سامان کرتی ہے۔ اُس کی ہمسایہ عورتیں اُس کی خوش قسمتی پر مبارکباد دیکر اہلِ حرم سے اپنا اشتیاقِ قدمبوسی ظاہر کرتی ہیں ۔ ؎

پہونچی قریب قلعۂ شیریں کے جب سپاہ | چلّائے در پہ جاکے یہ شیریں کے خیرخواہ
شیریں! مبارک، آیا مدینہ کا بادشاہ | شیریں پکاری سچ ہے؟ وہ بولے خداگواہ

بیرق نمود وہ مدنی قافلے کی ہے
گھر گھر خبر حُسینیوں کے داخلے کی ہے

سُنتے ہیں ہم رکاب میں ساری خدائی ہے | بہرِ جہاد نکلے تھے سو فتح پائی ہے
بندی بھی ایک فوجِ حسینی میں آئی ہے | زینبؑ تری خوزادی بھی تشریف لائی ہے

بازار ساتھ ہے شتروں پر خزانہ ہے
سامان سلطنت ہے بڑا کارخانہ ہے

شیریں اور اُسکے شوہر میں اس مسرت کے متعلق گفتگو ہوتی ہے۔ شیریں اُس سے خطاب کرکے کہتی ہے ۔ ؎

وہ بولی قابل اُنکے نہ کھانا ہے نے مکاں | فرش اُن کا عرش ہے تو غذا میوۂ جناں

لونڈی کو سرفراز کرینگے شہِ زماں ‏ ‏ سامان تھوڑا تھوڑا میں کرتی ہوں سب یہاں

جا پیشوائے خلق کی تو پیشوائی کو
لونڈی کے گھر میں آتے ہیں وعدہ وفائی کو

ہمسائیاں کھڑی ہوئیں ہر سو کہ ہم بھی آئیں
پلکوں سے گھر کو جھاڑیں، تو فرش آنکھوں سے بچھائیں

دن رات مانگتے تھے اسی روز کی دعائیں
صدقے کیا تھا، جو سر و سامان تھا وہ لائیں

پوچھو تو اغنیا سے، یہ دولت بھی پائی ہے؟
آئے حسینؑ اب ترے گھر میں خدائی ہے

آیا ہے جن کی شان میں قرآں وہ آتے ہیں
جنکے گدا ہیں قیصر و خاقاں وہ آتے ہیں

کعبہ کے ہیں جو قبلۂ ایماں وہ آتے ہیں
فطرس ہے جنکا بندۂ احساں وہ آتے ہیں

شیریں! خدا کے پیاروں کے پیارے حسینؑ ہیں
مالک ہمارے اور تمہارے حسینؑ ہیں

تم سے سفارشوں کے ہیں امیدوار ہم
دیکھیں تمہاری بی بی کے عز و وقار ہم

پائیں سلام حضرتِ زینبؑ کی بار ہم
ایراں کی شاہزادی ہے کیسی نثار ہم

ہمسایہ کے حقوق ادا آج کیجیو
ہم کو بُلا کے رتبۂ معراج دیجیو

اُس نے کہا میں سعی کو حاضر ہوں عذر کیا
ارماں امیرزادیوں کو کوفے میں رہا

پر میری بیبیوں کا چلن سب سے ہے جدا
مہماں کسی کے گھر نہ گئیں بنتِ مرتضےٰ[ع]

تم سب کا اشتیاقِ زیارت سناؤں گی
زینبؑ کا حکم ہوگا تو بیشک بلاؤں گی

پرہاتھ جوڑتی ہوں کہ تنہا ہی آئیو
پردہ نہ دخترانِ علیؑ کا بھلائیو
لڑکوں کو اپنے ساتھ خدارا نہ لائیو
مجکو عتابِ آلِ نبیؐ سے بچائیو

یارب ہنسی خوشی مرے سب میہماں رہیں!
میں دمبدم فدا رہوں، وہ مہرباں رہیں

بیت الحرم وہ گھر تھا کہ تھی آمدِ حرم
آئینوں سے حلب تھا تو گلدستوں سے ارم
ہر سنگِ فرش تھا حجرالاسودِ حرم
ہر شے قرینے سے تھی، زیادہ کہیں نہ کم

نظارۂ حسینؑ کے ارماں دکھا دیئے
پلکوں کی چلمن آنکھوں کے پردے لگا دیئے

مسند بچھائی بہرِ شہنشاہِ مشرقین
کیا جانتی تھی ہوگا یہاں ماتمِ حسینؑ
تکیے پر ہما کے لگائے بزیب و زین
سُن پایا تھا صغیر ہے بانوؑ کا نورِ عین

دالان میں درست کیا گاہوارے کو
بولی میں خود جھلاؤنگی بی بی کے پیارے کو

گھر کو بنا سنوار چکی جب وہ نیک نام
شربت صراحیوں میں بھرا دھو کے سارے جام
حُجرے میں پھر سلیقے سے کھانے چُنے تمام
ہی ہی نہ یہ خبر تھی کہ پیاسے موئے امام

میوے چُنے طباقوں میں اکبرؑ کے واسطے
کوزوں میں دودھ بھر دیا اصغرؑ کے واسطے
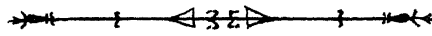
۱۰- حضرت شہربانوؑ کی اہلِ حرم سے رخصت

بے شمع کربلا میں جو قندیلِ دیں ہوئی
تاریک و تار بزمِ زمان و زمیں ہوئی

کعبے کی شکل فاطمہؑ ماتم نشیں ہوئی
بیتاب روحِ مرشدِ روح الامیں ہوئی

غل تھا ستونِ عرشِ امامت گرا دیا
یعنی چراغِ بزمِ نبوّت بجھا دیا

دنیا میں تو علامتِ محشر تھی آشکار
مقتل میں ذوالجناحِ شہِ دیں تھا بے سوار
پھرتا تھا گردِ لاشۂ شبیرؑ بار بار
جیسے پسر کی لاش پہ مادر ہو بے قرار

کہتا تھا اے حسینؑ کہاں تجھکو پاؤں میں
بے تیرے خیمہ گاہ میں کس طرح جاؤں میں

جب ذوالجناح نے یہ کیا نوحہ ایکبار
آئی صدا یہ لاش سے اے میرے راہوار
پہونچا چکا تو منزلِ مقصد پہ اپنا بار
خیمہ میں جا، کہ بانوؑ کو ہے تیرا انتظار

خدمت ادا کی راکبِ دوشِ رسولؐ کی
تجھ پر سوار ہوگی ہوا اب بتولؑ کی

یہ سُنکے خیمہ کو چلا اسپِ باوفا
زینبؑ کھڑی تھی منتظرِ شاہِ کربلا
ناگاہ خالی پشت وہ گھوڑا نظر پڑا
تیروں کے پھل ہیں زین میں پیوستہ جابجا

ہے تنگ تو کٹا ہوا اُس خوش خرام کا
اور خاک پر لٹکتا ہے تسمہ لگام کا

زینبؑ اُٹھا کے پردے کو چلّائی ایک بار
اے اسپِ بے سوار کہاں ہے ترا سوار
تو نے بھی بھوکے پیاسے سے کی دوری اختیار
سچ ہے نہیں غریبوں کا کوئی رفیق و یار

آیا نہ رحم کچھ تجھے آقا کے حال پر
کیا بیکسی کا وقت ہے زہراؑ کے لال پر!!!

ٹکرا کے سر کو خاک پہ بولا وہ راہوار
کیا پوچھتی ہو بیکسیِ شاہِ نامدار
میں بے سوار ہو گیا مارا گیا سوار
جب زخم کھائے نہصد و پنجاہ و یک ہزار

اُس دم تمہارے بھائی کو غش آیا زین پر
مجھ سے کہا کہ ٹیک دے گھٹنے زمین پر

زینبؑ نے پوچھا گھوڑے سے پھر کیا ہوا بتا
صدمہ یہ کرتے کرتے ہوا وامصیبتا!
اُس نے کہا کہ ظلم ہوا اور غضب ہوا
سب زخم شہ کے پھٹ گئے دریائے خوں بہا

اکبرؑ نہ تھے جو اُن کو بٹھاتے سنبھال کر
غش ہو گئے حسینؑ لہو مُنہ سے ڈال کر

اصغرؑ کی قبر ننھی سی شہ کے حضور ہے
حق میں مرے یہ حکمِ امامِ غیور ہے
اکبرؑ ہے پاس، لاشہ عباسؑ دُور ہے
لے گھوڑے پردہ داریِ بانوؑ ضرور ہے

کہلا کے بے سوار کسے منہ دکھاؤں میں
بانوؑ کو تم وداع کر دیا نسے جاؤں میں

یہ سُن کے پیٹنے لگیں سیدانیاں تمام
زینبؑ سے ہاتھ باندھ کے پھر یہ کیا کلام
اور الوداع کہنے لگی بانوئے امام
بچوں کی میرے رہنا نگہبان صبح و شام

بانوؑ کا کیا ہے، پالنے والی ہر دائی ہے
زینبؑ تمہارے بھائی کی یہ سب کمائی ہے

اوّل تو تین روز سے اُن پر ہے قحطِ آب
بچوں پہ میرے کیجیو الطاف بیحساب
اب ماں سے بھی بچھڑتے ہیں ہے ہے یہ دل کباب
صدقے گئی، یتیموں کی ہے پرورش ثواب

کچھ ساتھ لے چلی ہوں نہ کچھ ساتھ لائی تھی

دولت علیؑ کے گھر میں ہی میں نے پائی تھی

اکبرؑ کو آپ دیکھیے گھونگٹ میں روتی ہے
اک سمت کو سکینہؑ جدا جان کھوتی ہے
دولہ چھٹا پدر چھٹا بن ماں کی ہوئی ہے
یہ عاشقِ حسینؑ ہے زہراؑ کی پوتی ہے

اکبرؑ کی طرح آج سے پالو سکینہؑ کو
گودی میں میرے آگے بٹھالو سکینہؑ کو

پھر لیں بلائیں سر سے سکینہؑ کی تا بپا
ٹوپی پنہا کے زلفوں کو سلجھا کے یہ کہا
تھا آخری جو پیار، کیا پیار خوب سا
کڑھنا نہ میرے واسطے ہوتی ہوں میں جدا

اس سن میں حق نہ بیٹی کو ماں سے جدا کرے
تقدیر میں ہی ہو تو پھر کوئی کیا کرے

اپنی یتیم بیٹی کی غربت پہ میں نثار
زینبؑ کو سونپے جاتی ہوں تمکو میں بقرار
اس تیسرے برس ہوئی بابا کی سوگوار
محکوم ان کی رہیو خبردار، ہوشیار

ترجیح ان کے پیار کو ہے میرے پیار پر
سو مائیں صدقے زینبؑ عالی وقار پر

اب گوشِ دل سے واری نصیحت مری سنو
ایسا نہ ہو کہ طور یہ پھوپی سے ہی کرو
ہر ایک بات پر ہے تمہیں روٹھنے کی خو
رتبہ سمجھ کے کیجیو تم ان سے گفتگو

ہیں بنتِ یزدجرد، یہ زہراؑ کی پیاری ہیں
میں دائی تھی تمہاری یہ مالک تمہاری ہیں

اکبرؑ کو جب یہ روئیں تو پلہ چھڑائیو
ہٹ کرکے ہر گھڑی نہ پھوپی کو ستائیو
ننھے سے ہاتھ باندھیو قسمیں دلائیو
سو جائیو زمیں پہ جو بستر نہ پائیو

نصیحت حضرت سکینہ کو

جو چیز دیں، سلام اُنھیں کر کے لیجیو
فرمائش اس غریب پھوپی سے نہ کیجیو

اب کھیلیو نہ غیروں کے بچّوں میں بیٹھ کر
ہاں کھیلیو تو دخترِ مسلمؑ سے ہمدگر

سب میں حقیر ہوتے ہیں بن باپ کے پسر
یعنی ہو تم بھی بے پدر اور وہ بھی بے پدر

پر کھیل میں بھی فکر رہے شور و شین کی
ماتم چچا کا کیجیو مجلس حسینؑ کی

واری پھٹا ہوا ہے تمہارا لباسِ تن
کہنا کہ میں نہ پہنونگی بابا ہے بے کفن

کھا کر ترس اگر تمھیں دے کوئی پیرہن
غربت سے رہیو جو کہ بزرگوں کا ہی چلن

بازاروں میں جو سر ہو تمہارا کھُلا ہوا
مُنہ پر الٹ کے ڈالیو کُرتا پھٹا ہوا

یہ بات کہہ کے دل میں اُٹھا درد بیقیاس
پہناؤں اپنی بیٹی کو یہ آخری لباس

فضہّ سے بولی بقچہ اُٹھا لا تو میرے پاس
پھر کون اسے پنہائیگا یاں سب ہیں بےحواس

بچّوں کو دردِ بے پدری لا علاج ہے
بانوؑ کی لاڈلی پہ وہی وقت آج ہے

مرکب پہ پھر سوار ہوئی وہ بصد بکا
پہلو میں شہ کے سوتے ہیں ہمشکلِ مصطفےٰ

مقتل کو دیکھا دیدۂ حسرت سے اور کہا
جز داغ اَور میرے مقدّر میں کچھ نہ تھا

کیا ہم بھی ہر طرف سے پُر ارمان جاتے ہیں
اصغرؑ بھی گھُٹنیوں نہیں ملنے کو آتے ہیں

لو گو مرے صغیر کو لاؤ کروں میں پیار
جھاڑوں جھنڈولے بالوں کا سب گرد اور غبار

جنگل میں ڈر نہ جائے مرا طفلِ شیرخوار — اپنے پسر کی ننھی سی میت پہ میں نثار
اصغرؑ کی لاش چاہیے میرے کنار میں
زینبؑ پکاری سوتے ہیں وہ تو مزار میں

ذوالجناحِ شہِ دیں خیمہ میں جس دم آیا — محشرِ تازہ ہوا اہلِ حرم میں برپا
رو کے گھوڑے سے یہ کہتی تھی بنتِ زہراؑ — ذوالجناحِ شہِ مظلوم یہ کیا تو نے کیا
منہ رفاقت سے شہِ تشنہ کے موڑا تو نے
لاشہ تنہا مرے ماں جائے کا چھوڑا تو نے

کہا گھوڑے نے کہ اے خواہرِ شاہِ شہدا — آپ سے میں نے نہیں لاش کو تنہا چھوڑا
بلکہ خنجر بھی مرے آگے نہیں شہ پہ چلا — دے کے اسباب مجھے ایک جگہ بھیجا تھا
وہ تو ارشادِ شہِ دیں کا بجا لایا ہوں
اور اب بانوؑ کے لینے کے لیے آیا ہوں

سُن کے یہ بانوؑ نے زینبؑ سے کہا بادلِ زار — آخری ملنا ہے، مل لو تو یہ لونڈی ہو سوار
لپٹی بانوؑ کے گلے زینبؑ عالی مقدار — اور کہا جاؤں کہاں اب میں خدائے غفار
تم بھی اس زینبؑ بیکس کی کمر توڑ چلیں
ننگے سر بلوے میں پھرنے کو ہمیں چھوڑ چلیں

اُس گھڑی بانوؑ سے رو کر یہ سکینہؑ نے کہا — اماں بابا تو موئے، ہوتی ہو اب تم بھی جُدا
یہ تو کہیے کہ مجھے آپ نے کس کو سونپا — آہ بھر کر کہا بانوؑ نے کہ اندیشہ ہے کیا
باپ ماں سے جسے اس سن میں جُدا کرتا ہے

پرورش اُن کی مری جان خدا کرتا ہے

حضرت بیمارؑ کی نصیحت

کہہ کے یہ ہاتھ میں زینبؑ کے دیا ہاتھ اُسکا
جانیو عابدؑ بے کس کو بجاے بابا

اور کہا آج سے تم والدہ ان کو کہنا
فضل اللہ سے اب بھی ترا کنبہ ہے بڑا

سب کے ماں باپ زمانے میں یونہیں مرتے ہیں
وقت پڑتا ہی تو غیروں میں بسر کرتے ہیں

قید میں اپنی پھوپی سے نہ کوئی مانگیو چیز
یہ نہ کہہ بیٹھیو زہراؑ و علیؑ کی ہوں عزیز

پوچھے گر نام تمہارا کوئی اے اہلِ تمیز
کہیو زینبؑ کو بتا کر کہ میں ہوں انکی کنیز

کیا ہوا آج جو دُکھ تجھ پہ پڑا ہے بیٹی
نام تو تیرے بزرگوں کا بڑا ہے بیٹی

رزم اُردو مرثیہ گوئی کا ایک اہم اور ضروری مضمون ہے، اور اُس کے بیان میں زور۔ جدّت اور ایجادِ مضامین کی بیحد کوشش کی جاتی ہے۔ بیشک شاہنامہ نے فارسی رزم کا درجہ عربی اور اُردو شاعری کی رزم سے بہت بڑھا دیا ہے، لیکن اُردو میں مرثیہ گویوں نے بھی اس مضمونِ خاص کے ادا کرنے میں جو جو کمالات دکھائے ہیں وہ اُن کی جولانی طبع اور قادرالکلامی کی روشن نظیریں ہیں۔ میر صاحب اور مرزا صاحب نے ہزاروں مرثیے نظم کیے اور ہر مرثیہ میں رزمیہ مضامین مثلاً لڑائی کی تیّاری۔ معرکہ کا زور شور۔ ہنگامہ خیزی۔ تلوار کی کاٹ چھانٹ۔ نیزوں کی لچک۔ کمانوں کا کڑکنا۔ گھوڑے کا خدو خال۔ ڈیل ڈول۔ سرعت۔ رجز۔ بہادروں کی میدانِ جنگ میں مبارز طلبی۔ معرکہ آرائی۔ ان سب مضامین کو اس خوبی اور صفائی سے بیان کیا ہے کہ آنکھوں کے سامنے معرکۂ جنگ کا سماں پھر جاتا ہے پھر ہر مرثیہ میں ایک ہی مضمون کو مختلف اور گوناگوں طریقوں سے ادا کیا ہے اور یہ ان بزرگوں کی انتہا درجہ کی جولانیِ فکر اور زورِ طبیعت کی دلیل ہے، کیونکہ جس طرح اشعار میں ہمیشہ نئے اور اچھوتے مضامین ایجاد و اختراع کر کے طبع آزمائی کرنا شاعر کا کمال سمجھا جاتا ہے۔ اسی طرح ایک ہی مضمون اور مطلب کو مختلف پیرایوں اور متعدد

اسلوبوں میں بیان کرنا بھی کمالِ شاعری میں داخل ہی۔ اسلیے کہہ سکتے ہیں کہ اگر فارسی کو رزمیہ مضامین کے بیان میں شاہنامہ۔ اور سکندر نامہ پر بجا فخر ہی تو اُردو شاعری کو بھی مرثیوں کی نادر اور بیش بہا رزم پر ناز کرنا زیبا ہی۔ مولانا آزاد صاحب میر انیس کے حالات میں لکھتے ہیں کہ "سکندر نامہ جس کی تعریف میں لوگوں کے لب خشک ہیں اُس میں چند میدان جنگ ہیں۔ رزمِ زنگبار۔ جنگِ دارا۔ جنگِ روس۔ جنگِ فور۔ جنگِ فغفور اسی طرح بزم کی چند تمہیدیں اور جشن ہیں۔ شاہنامہ کے ۶۰ ہزار شعر فردوسی کی عمر بھر کی کمائی ہیں۔ انھوں نے ایجادِ مضامین کے دریا بہا دیئے۔ ایک مقرری مضمون کو سیکڑوں نہیں ہزاروں رنگ سے ادا کیا۔ ہر مرثیہ کا چہرہ نیا۔ آمد نئی۔ رزم جدا۔ بزم جدا۔ اور ہر میدان میں مضمون اچھوتا۔ تلوار نئی۔ نیزہ نیا۔ گھوڑا نیا۔ انداز نیا مقابلہ نیا" اب ہم مرزا صاحب کی رزم کے چند نمونے دکھاتے ہیں۔ ؎

سپاہیوں کی آمادگیِ جنگ (فوجِ امام حسینؑ)

کہتا ہے تول کر کوئی شمشیرِ آبدار	ولہ	لے تو سہی کہ چھین لیں میدانِ کارزار
تن تن کے صاف سینوں کی ڈھالیں سنبھال لیں	ولہ	آدھی سروہیاں کمر و نسے نکال لیں
لاکھوں کا ایک حملہ میں منہ پھیر دیتے ہیں	ولہ	کس طرح اُنسے طبل و علم چھین لیتے ہیں
کوئی تھا سبز پوش کوئی سرخ پوش تھا	ولہ	مرنے کی آرزو تھی شجاعت کا جوش تھا
باگیں اُٹھاؤ گھوڑوں کی تیغیں سنبھال لو	ولہ	جب تک امام آئیں انھیں دیکھ بھال لو

چپ ہیں ابھی تو اذنِ وغا شہ نے گر دیا	ولہ	گھوڑے اُٹھائے اور تمہیں پامال کر دیا
ہم تو سلاحِ جنگ نہ تن پر سنواریںگے	ولہ	تیغیں تمہیں کی چھینیںگے اور انکو ماریںگے
اس امر میں ہرگز کوئی قاصر بھی نہو گا	ولہ	آگے جو بڑھا پاؤں تو پھر سر بھی نہو گا
دیکھیں تو بھلا آئیں تو نو لاکھ سمٹ کر	ولہ	ہاں کہدیں جو ماموں تو صفیں کھدیں اُلٹ کر
سرکوبیِ افواجِ بد اعمال کرونگا	ولہ	چیونٹی کی طرح مورچے پامال کرونگا
جینے سے ہاتھ دہوتے ہیں مرد اپنی بات پر	ولہ	اپنا تو آج مورچہ ہو گا فرات پر
دعوے ہیں آج حیدریوں کے بڑے بڑے	ولہ	چاہیں تو شرق و غرب کو لے لیں کھڑے کھڑے
مِلکر حسینیوں نے کہا اے شہِ امم قرنا بجایا چاہتے ہیں بانیِ ستم	ولہ	اب کب تلک سکوت کہ رکتا ہی اپنا دم یاں صف کشی نہ مورچے نے طبل نے علم

بس اب تو ضبط اے شہِ ذیجاہ قہر ہے
شیروں کے منہ پہ چڑھتے ہیں روباہ قہر ہے

حملہ کا زور شور اور فوجوں کی ہل چل

جب رن میں شیرِ حق کا بسر حملہ ور ہوا خورشید نے کہا کہ وہ شق القمر ہوا	باہر نیام سے سرِ تیغِ دو سر ہوا آیا جو جنبشِ تیغ وہ زیر و زبر ہوا

مولا بڑھے جو تیغِ دو پیکر کو تول کر
روح الامیں سپر ہوئے شہپر کو کھول کر

لگ بھاگنے کا مشورہ گمراہ کرتے تھے	دریا میں ڈوبنے کی کبھی چاہ کرتے تھے

پیشِ حسینؑ آ کے کبھی آہ کرتے تھے
گہ دیکھتے تھے تیغ کو اور آہ کرتے تھے
کھنتے تھے کچھ، تو کرتے تھے کچھ اضطراب میں
جس طرح کوئی بھولے سخن کہہ کے خواب میں
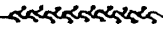
برہم ہیں صفیں شاہِ شہیداں کی ہے آمد
فرعونیوں پر موسیٰؑ عمراں کی ہے آمد
ہر مورچہ لرزاں ہے سلیماں کی ہے آمد
تیغوں کے جہازوں پہ بھی طوفاں کی ہے آمد
جن سیر کو نکلے تھے پہ ہیبت سے مُڑے ہیں
پریوں کی طرح ہوش سلیمانؑ کے اُڑے ہیں

خورشید ہے دن کو مہِ نو شرم سے گھٹ کر
پانی ہوئی جاتی ہے گھٹا ڈھال کی پھٹ کر
اغلب ہے کہ سیدھا فلکِ کج ہو اُلٹ کر
اک سوئی کا نگ بنگئی ہے دھوپ سمٹ کر
ثابت ہے کہ سیارہ ہر اک ماند ہوا ہے
سیارے ہیں کیا، شہر بدر چاند ہوا ہے

نے چرخ ہے نے دشت نہ کہسار نہ قلزم
ہر برج ہے گردش میں، گرے پڑتے ہیں انجم
وہ سکتہ ہے وہ گرد وہ رعشہ وہ تلاطم
جس طرح سے آندھی میں حُبابِ خوشوں سے گندم
خالی ہیں رگیں خون سے اور خون رگوں سے
ناموں کے حروف اُڑتے ہیں مُہر و نگینوں سے

دیتی ہے فقط بے خبری کی خبر آمد
بالائے سر آفت ہے تو پیشِ نظر آمد
یاں شور وہاں غل ادھر آمد اُدھر آمد
اب سینے میں دم کی نہ در آمد نہ بر آمد
ہر تن کو ہے دشوار بچانا دل و جاں کا

آنا شہِ والا کا ہے جانا دل و جاں کا

تن دیکھ کے شمشیرِ دوسر کانپتے ہیں
ہیں جن و پری قاف میں پر کانپتے ہیں
دریا میں نہنگوں کے جگر کانپتے ہیں
پوشیدہ ہیں پانی میں مگر کانپتے ہیں
تلواروں کا زہرہ ہے صفِ جنگ میں پانی
دریا میں شرر چھپتے ہیں اور سنگ میں پانی

خیبر شکن کے لعل کی آمد ہے صف شکن
گرتی ہے فوج فوج پہ پڑتا ہے رن پہ رن
تیغِ خدا کی تیغ کا سایہ ہے تیغ زن
غلطاں کہیں قدم ہیں کہیں سر کہیں بدن
بے حوصلہ نہ بغض امام مبیں رہا
اب دل میں بھاگنے کے سوا کچھ نہیں رہا

فوجوں کی ابتری اور ہل چل

یکسر صفتِ بختِ سیہ ڈھالیں تھیں بیکار
تھی تن میں زرہ نامۂ عصیاں سے گرانبار
برش نہ رہی تیغوں میں عاری ہوئے کفّار
اور خوف سے خاموش تھے گویا لبِ سوفار
دہشت سے جواں بھاگتے تھے تیر کی مانند
تھا نیزوں کو رعشہ قدمِ پیر کی مانند

بیکار ہر اک دستِ ہنر تھا دمِ پیکار
شانوں کی طرح خشک ہوئے پنجۂ کفار
تھا مثل رکابوں کے تہی قالبِ اسوار
اور سہم سے تھے ناوکِ خود رفتہ کماندار
دہشت سے سپر کرتے تھے شمشیر سے پہلے
ہاتوں سے کماں چھوٹتی تھی تیر سے پہلے

ترکش میں عدو ڈھونڈتے تھے نیزوں کو ہر آں
مانند سپر روکتے تھے چہرے پہ تلوار
زرہ کرتے تھے نیزوں کو کمانوں میں ستمگار
تیغوں کی جگہ ڈھالوں کا کرتے تھے کبھی وار

اک نہر زرہ پوشوں کے خوں کی جو بہی تھی
موجوں کی طرح آپ زرہ کانپ رہی تھی

رجز حضرت امام حسینؑ کی زبان سے پہلوانی اور بہادری کے عوض فضیلت اور شرف کا اظہار۔

دادا حسینؑ کا ہے ابوطالبؑ ولی
جعفرؑ مرا چچا ہے وہ مقبولِ ایزدی
دنیا میں جس نے دیں کی طلب کبریا سے کی
تیار جنگ پر جو رہا ہمرہِ نبیؐ

صدقے کیے جو ہاتھ رسولِ کبار پر
پائے خدا کے گھر سے جواہر نگار پر

میں ہوں نہالِ گلشنِ ناز و نعم کا پھول
درگاہِ حق میں عرض ہوا کی مری قبول
مجھ پر ریاض کرتے رہے حیدرؑ و بتولؑ
احمدؐ نے سجدہ کو مری خاطر دیا ہے طول

بچپن میں بات مجکو بڑی ہاتھ آئی ہے
میں نے نبیؐ کے دوش پہ معراج پائی ہے

جو چاہوں حق کے حکم سے میں ناتواں کروں
کوثر مچائے شور تو ریگ رواں کروں
حوریں کریں قصور تو جاں کا زیاں کروں
طوبیٰ اُٹھائے سر تو زمیں میں نہاں کروں

گرمی کرے شرر تو شرارت نکال دوں
جنت ہوا پہ آئے تو دوزخ میں ڈال دوں

شمشیرِ قہرِ حق ہوں میں اے شام کی سپاہ
جوہر عیاں ہیں تیغ کے ماہی سے تا بماہ

آفاق میں نہیں دمِ صمصام کی پناہ
قبضہ کے درمیان ظفر ہے خدا گواہ

تیغوں سے خنجروں سے خطر کیا فقیر کو
تلوار حق نے دی ہے جناب امیرؑ کو

ہم دل میں جب در آئینگے فوجِ شریر کے
ٹکڑے کرینگے خنجر و شمشیر و تیر کے
جوہر کھلیں گے طاقتِ برنا و پیر کے
وارث ہیں ذوالفقارِ جنابِ امیرؑ کے

اک اک کی موت آج حسامِ دو سر سے ہے
قبضہ قضا کی تیغ پہ حکمِ قدر سے ہے

ہم وہ ہیں کہ گھر عرشِ معلّا ہے ہمارا
خضرِ رہِ فردوس تولّا ہے ہمارا
کعبے کی طرح پاک مصلّا ہے ہمارا
اور چاند بہشتوں کا، تجلّا ہے ہمارا[1]

زندہ ہیں تو تصویر ہیں ہم نورِ خدا کی
مردہ ہیں تو تسبیح ہیں ہم خاکِ شفا کی

اُس ماں کی کمائی ہوں جو مریمؑ کا شرف ہے
اُس بھائی کا بھائی ہوں جو عالم کا شرف ہے
اُس باپ کا بیٹا ہوں جو آدمؑ کا شرف ہے
نانا ہے وہ جو عرشِ معظّم کا شرف ہے

اُس فوج کا سردار ہوں جو فوجِ خدا ہے
اُس گھر کا بقیّہ ہوں کہ جو آج لٹا ہے

ڈھونڈو جو اماں حشر کی دامن ہے ہمارا
خاک اس سے ہوئی پاک کہ مدفن ہے ہمارا
رضوانِ جناں خادمِ گلشن ہے ہمارا
جنّت کا شرف یہ ہے کہ مسکن ہے ہمارا

[1] یعنی ہمارے نور کی ضیا بہشتوں کا چاند یعنی اُن کی روشنی ہے ۱۲

تعویذ ہوں بازوئے زبردستِ علیؑ کا
قرآن ہوں میں رحلِ دوزانوئے نبیؐ کا

موسیٰؑ کے لیے نہر کو پُل کر دیا ہم نے
فرعون کو بے طبل و دُہل کر دیا ہم نے
اور بہرِ خلیلؑ آگ کو گُل کر دیا ہم نے
ہر شہر میں تکبیر کا غُل کر دیا ہم نے

ہاروت کو اندوہ دیا ہم نے دہوئیں سے
یوسفؑ کو شہِ مصر کیا لاکے کنوئیں سے

میں ہوں مکین دوشِ نبیؐ ہر مکاں کا فخر
کوثر کی آبرو ہوں، اور اہلِ جناں کا فخر
شیرِ خدا کا لال ہوں، نوشیرواں کا فخر
کعبہ کا نور، عرش کا اوج۔ آسماں کا فخر

نام و نسب سے قدر، عجم اور عرب کی ہے
رونق ہماری ذات سے نام و نسب کی ہے

روشن پدر کا زور ہے دنیا پہ دین پر
چاہوں تو بیٹھے بیٹھے اک اُنگلی سے زین پر
ششدر تھے جبرئیلؑ کٹے جبکہ تین پر
گردوں کی ڈھال چیر کے رکھ دوں زمین پر

ہم نوبہار گلشنِ صبر و ثبات ہیں
ہم شہسوار توسنِ والعادیات ہیں

بُرجوں کو اپنی مہر سے شمس و قمر ملے
بے پر نے مس کیا جو ہمیں، بال و پر ملے
دریا کو اپنی چاہ سے لعل و گہر ملے
فطرس کے ذہن میں نہ یہ رُتبے تھے پر ملے

اس رُتبہ کا اُسی پہ فقط خاتمہ + ہوا

+ چونکہ فطرس پسرِ فاطمہؑ کا آزاد کیا ہوا تھا اسلیے اس عظیم الشان رتبہ کا اُسی پر خاتمہ ہوا، دوسرے کو ایسا شرف نصیب نہیں ہوا

آزاد کردۂ پسرِ فاطمہؑ ہوا

پیاسا ہوں پر خضر بھی ہوں آبِ بقا بھی ہوں	ہمسایہ بھی ہوں سایۂ ربّ العلا بھی ہوں
ہمراہ بھی خدا کے ہوں راہِ خدا بھی ہوں	راہِ خدا بھی ہوں بخدا رہنما بھی ہوں

حرزِ گلوے عیسیٰؑ عالی وقار ہوں
کُل کی دوا ہوں حکمتِ پروردگار ہوں

نور اپنا ہوگا جبکہ جُزو کُل بھنوئینگے	ہم وہ چراغ ہیں جو کبھی گُل بھنوئینگے
مر کر بھی کم ہمارے تجمل بھنوئینگے	باغ اپنا ہوگا جب گُل و بلبل بھنوئینگے

دن ہو کہ رات، خلق پہ سرگرمِ مہر ہیں
جس کو کبھی زوال نہ ہو ہم وہ مہر ہیں

عالم مرا مطیع، مطیعِ خدا ہوں میں	نانا کی شکل ہادیِ ہر دوسرا ہوں میں
بابا کی طرح خلق کا مشکل کشا ہوں میں	سیّد ہوں میں امام ہوں میں پیشوا ہوں میں

مخدومِ خلق خادمِ ربِّ جلیل ہوں
میں وارثِ مسیح و ذبیح و خلیل ہوں

چاہیں تو ہم زمیں کو ابھی آسماں کریں	اعجازِ انبیاے سلف کے عیاں کریں
عیسیٰؑ صفت رواں تنِ بیجاں میں جاں کریں	مثلِ خلیلؑ نار کو باغِ جناں کریں

موسیٰؑ کی طرح ساحروں کو پست کرتے ہیں
ہم اژدہا عصا کو سرِ دست کرتے ہیں

میں خاصِ حق ہوں۔ قبلۂ ہر خاص عام ہوں
احمدؐ کا میں نشان ہوں حیدرؑ کا نام ہوں
حاجت روائے خلق ہوں شاہِ انام ہوں
مختارِ سلسبیل ہوں گو تشنہ کام ہوں

پشت و پناہِ شرعِ رسالت پناہ ہوں
میں ناخدائے کشتیِ دینِ الٰہ ہوں

امام حسینؑ کی زبان سے عام رجز کے قاعدہ کے لحاظ سے بعض بعض جگہ شجاعت اور زور و قوّت کا بھی اظہار ہے۔

وارث ہیں ہم جناب شہِ ذوالفقار کے
لی مرحبا فرشتوں سے مرحب کو مار کے
کامل ہوئے ہیں جن سے ہنر کارزار کے
عنتر کو تر لہو میں کیا سر اُتار کے

یکتا تھا عبدود کا پسر اپنے ڈھنگ میں
پر کیسی مُنہ کی کھائی ہے خندق کی جنگ میں

گھوڑے پر سوار ہونا

رہوار پر سوار ہوئے تب امامِ دیں
تھا یوں میانِ زیں وہ پیمبرؐ کا نازنیں
اور نورِ شاہِ دیں سے مزیّن ہوا وہ زیں
جیسے خدا کی یاد ہو مومن کے دلنشیں

اُس زین پر حسینؑ تھا رونق فزا ہوا
یا رحل پر تھا مصحفِ ناطق کھُلا ہوا

عفّت سرا سے جبکہ برآمد ہوئے جناب
حاصل جُدا جُدا کیا ایک ایک نے ثواب
عبّاسؑ لائے مرکبِ ابنِ ابوترابؑ
چومے عثماں نے ہاتھ۔ گری پاؤں پر رکاب

عباسؑ سے کیا زین مزین نظر آیا
پھر نورِ نگہ دیدۂ یعقوبؑ نے پایا
دیگر
یوسفؑ بھی نہ یوں چشم زلیخا میں سمایا
یا عرش کے قالب میں خدا کا تھا وہ سایا

یوں زین پہ زینت تھی علمدار جری کی
جیسے دلِ مومن میں جگہ حُبِ علیؑ کی

کیا نامِ خدا زین پہ ہیں انکے قرینے
قدرت کی انگوٹھی پہ جڑے حق نے نگینے

قرآنِ نور زیب وہ رحلِ زین ہوا
غل پڑ گیا کہ طور پہ موسےٰؑ مکیں ہوا

نرگس گُلِ حیدرؑ نے کیا پھر چمنِ زین
اک گُل سے بنا دامنِ زین - دامنِ گلچیں

دو حریفوں کی معرکہ آرائی اور فنونِ جنگ

فنونِ جنگ

مولف لکھتے ہیں کہ فنونِ جنگ کے مقام پر مرزا صاحب یہ واقعات اس طرح لکھتے ہیں کہ یہ نہیں اندازہ ہوتا کہ حریفوں نے فنِ جنگ میں کیا ہنر دکھائے۔ اس دعوے کے بُطلان کے واسطے ذیل کے پُرشان و شکوہ بند ملاخطہ ہوں ۔ ؎

وہ بولا ہی قریب اجل، رہ امیدوار
یہ بولے تیر انیزہ۔ مری تیغ آبدار
میں نیزہ کی لڑائی لڑونگا لے ہوشیار
شمشیر و نیزہ چلنے لگا پھر تو ایک بار

ہر چند تیغ سے کہیں نیزہ بلند تھا
پر نیشکر کی طرح جدا بند بند تھا

جب اُسکا نیزہ تیغ نے سب کر چکے قلم
پھر اپنا نیزہ ابنِ حسنؑ نے کیا علم

آگے بڑھا کے توسنِ چالاک خوش قدم
للکار کر کہا کہ خبردار آئے ہم

نیزے پہ یوں اُٹھا لیا اُس نابکار کو
جنبش رکاب کو، نہ خبر راہوار کو

پھینکا جو خاک پر تو ہوئے استخواں شکست
دکھلادیا زمانہ کا اُسکو بلند و پست

تھے نشۂ شرابِ شجاعت سے جو کہ مست
ہتیار کھو لنے کا کیا سب نے بندوبست

قاسمؑ کے رُخ سے نورِ شجاعت نمود تھا
بیٹوں کے غم سے چہرۂ ازرق کبود تھا

ازرق یہاں برابرِ قاسمؑ پہنچ گیا
وہ صرصرِ خزاں۔ یہ گلِ باغِ مجتبےٰؑ

قاسمؑ نے کی بلند جو شمشیرِ شعلہ زا
ازرق نے لی سپر صفتِ پشتِ اژدہا

اس تیغ نے عیاں برشِ ذوالفقار کی
دو، ایک ضرب میں سپرِ نابکار کی

سرگرمِ معرکہ ہوا۔ وہ ہو کے خشمگیں
مطلع سے دیں کے مقطعِ ایماں ہوا قریں

گرزِ ثقیل لاتا تھا سر پر جو اہلِ کیں
بچکر خفیف کرتا تھا اُس کو وہ مہ جبیں

اس عرصہ میں حملے کیے مرحب نے وہاں چار
پر ایک بھی اُس بہشتی پر نہ لگا وار

مانندِ دل و چشم ہر اک عضو تھا ہُشیار
عاری ہوئی تلوار، مخالف ہوا ناچار

جب تیغ کو جھنجلا کے رُخِ پاک پہ کھینچا
تلوار نے اُنگلی سے الف خاک پہ کھینچا

غازی نے کہا بس اسی فن پر تھا تجھے ناز
سیکھا نہ یداللّٰہیوں سے ضرب کا انداز

پھر کھینچی اس انداز سے شمشیرِ سرانداز | جو میان کے بھی منہ سے ذرا نکلی نہ آواز

یاں خوف سے قالب کو کیا میان نے خالی
واں قالبِ اعدا کو کیا جان نے خالی

مرحب سے مخاطب ہوئے عباسؑ دلاور | شمشیر کے مانند سراپا ہوں میں جوہر
ممکن ہے کہ اک ضرب میں۔ دو ہو تو برابر | پر اس میں عیاں ہونگے نہ جوہر مرے تجھ پر

لے روک مرے وار ترے پاس سپر ہے
زخمی نہ کرونگا، ابھی اظہارِ ہنر ہے

کمے کی سپر لے کے مقابل ہوا دشمن | بتلانے لگے تیغ سے یہ ضرب کا ہر فن
یہ سینہ۔ یہ بازو۔ یہ کمر اور یہ گردن | یہ خود۔ یہ چار آئینہ۔ یہ ڈھال۔ یہ جوشن

کس وار کو وہ روکتا۔ تلوار کہاں تھی
آنکھوں میں تو پھرتی تھی۔ نگاہوں سے نہاں تھی

مرحب نے نہ پھر ڈھال نہ تلوار سنبھالی | اک ہاتھ سے سر ایک سے دستار سنبھالی
ظالم نے سناں غصہ سے اک بار سنبھالی | اس شیر نے شمشیرِ شرربار سنبھالی

تانی جو سناں اُس نے علمدار کے اوپر
نیزہ یہ اُڑا لے گئے تلوار کے اوپر[1]

اُس تیغ نے سرکش کے جو ترکش میں کیا گھر | غل تھا کہ گرا برجِ کبوتر[2] میں وہ اژدر
پر تیروں کے کٹ کٹ کے اُڑے مثلِ کبوتر | مرحب ہوا مضطر۔ صفتِ طائرِ بے پر

[1] حضرت عباسؑ دشمن کے نیزہ کو اپنی تلوار کے اوپر اُڑا کر لے گئے یعنی اُسکو تلوار سے قطع کر ڈالا ۱۲

[2] برجِ کبوتر اُس عمارت کا نام ہے جو ایران میں بلند خانہ دار خاص کبوتروں کے واسطے جنگل میں (بقیہ صفحہ ۴۵۶)

بڑھ کر کہا غازی نے بتا کس کی ظفر ہے
اب مرگ ہے اور تو ہے۔ یہ تیغ اور وہ سر ہے

نامرد نے پوشیدہ کیا رُخ کو سپر سے
خنجر تو اُدھر سے چلا اور تیغ اِدھر سے
اور کھینچ لیا خنجرِ خونخوار کمر سے
اُسوقت ہوا اچل نہ سکی بیچ میں ڈر سے

اللہ رے شمشیرِ علمدار کے جوہر
جوہر کیے اُس خنجرِ خونخوار کے جوہر

اس کے بعد پہلوان کے مع مرکب پارہ پارہ ہوجانے کا ذکر بڑی صفائی وخوبی سے فرما کر سلسلۂ بیان شروع کیا ہے۔

جو زندہ تھے اللعظمۃ للہ پکارے
ڈر کر عمر سعد کو گمراہ پکارے
مُردوں کے جو سر نیزوں پہ تھے واہ پکارے
خوش ہو کے علمدار شہنشاہ پکارے

یاں تو ہوا یا حضرت شبیرؑ کا نعرہ
شبیرؑ نے ہنس کر کیا تکبیر کا نعرہ

پردے کو اُٹھا کر یہ بہن شہ کی پکاری
عباسؑ نے کی فتح مبارک ہو میں واری

(بقیہ صفحہ ۴۵۵) بناتے ہیں۔ بعضوں نے لکھا ہے کہ خانۂ کبوتر کو برج کبوتر کہتے ہیں۔ یہاں تلوار کو اژدر۔ ترکش کو برج۔ اور تیروں کو کبوتر قرار دیا ہے۔ برج کبوتر اکثر شعرا نے باندھا ہے۔ یغما جندقی کا کیا خوب شعر ہے ؎

چشمِ صیاد تو بر چنبر زلف از پے دل
شاہباز یست کہ بر برج کبوتر گذرد

یہاں بھی شاعر نے چشم کو شہباز۔ حلقۂ زلف کو برج۔ اور دل کو کبوتر قرار دیا ہے۔ عرفی شیرازی ؎

آشیانہ خراب کردۂ باز
پیش برج کبوتر اندازد

۲ جوہر کرنے کے معنی ہیں مار ڈالنا۔ نیست و نابود کرنا۔ فنا کرنا۔ میر انیس کا مصرع ہے
ع۔ جاتے ہو تو جوہر مجھے کرتے ہوئے جاؤ۔

اب کہتی ہوں میں دیکھتی تھی جنگ سیاری — عباسؑ کی اک ضرب میں ٹھنڈا ہوا ناری
مرحب کو تو خیبر میں یداللہؑ نے مارا
ہمنام کو ابنِ اسداللہؑ نے مارا

میداں میں علمدار کے جانے کے میں صدقے — اس فاقہ میں تلوار لگانے کے میں صدقے
باہم علم و مشک اُٹھانے کے میں صدقے — اس پیاس میں اک بوند نہ پانے کے میں صدقے
سقّا بنا پیاسوں کا مروت کے تصدّق
بے سر کیا شہزوروں کو قوّت کے تصدّق

اب فخرِ رازی یہ رقم کرتا ہے اخبار — ہمنامِ یزید ایک تھا اُس فوج میں سالار
ناگاہ ہوا آن کے وارد دمِ پیکار — ہمراہ لیے تین ہزار اَور ستمگار
کہتا تھا کہ احمدؐ کے نواسے سے لڑونگا
سیّد سے مسافر سے میں پیاسے سے لڑونگا

یہ تازہ تلاطم ہوا کفّار میں پیدا — اب جی نہیں بچنے کا حسینؑ ابنِ علیؑ کا
ہمراہ بجاتے دُہل و دف بڑھے اعدا — قرنا نے کیا شور تو محشر ہوا برپا
جنبش تھی زمیں کو تو تزلزل تھا فلک کو
تھے ساٹھ غلامان زرہ پوش کمک کو

زینبؑ جو یتیموں کو لیے بیٹھی تھی مضطر — نقارے کی آواز گئی کان کے اندر
گھبرا کے چلی آئی وہاں خیمے کے در پر — دیکھا صفِ لشکر ہے بسانِ صفِ محشر
رُخ سیّدِ والا کی طرف سب کے پھرے ہیں

اک جان سے شبیرؑ ہزاروں میں گھرے ہیں

زینبؑ نے کہا دیکھ کے یہ ماجرا کیا ہے
تنہا یہ ہجومِ سپہ جور و جفا ہے
یہ کون مقابل مرے بھائی سے ہوا ہے
اس سیّدِ بیکس کا مددگار خدا ہے

خواہر کو قریب اپنے بلاتے نہیں شبیرؑ
خیمے میں بلاتی ہوں تو آتے نہیں شبیرؑ

کرتی تھی یہاں زینبؑ دلخستہ یہ تقریر
آتا ہے ادھر مستعدِ جنگ وہ بے پیر
کیا دیکھتے ہیں آنکھ اٹھا کر وہاں شبیرؑ
گھوڑے سے یہ فرمانے لگے سرورِ دلگیر

مونس مرے اسوقت رفاقت کی گھڑی ہے
حرمت یہ ترے شاہ کی بات آن پڑی ہے

رہوار نے کی عرض بصد منت و زاری
تیغِ اسد اللہؑ کمر سے یہ پکاری
ہو جائیگی اب ختم رفاقت مری ساری
برش تو ذرا دیکھیے اسوقت ہماری

ہاتوں نے کہا شیر سے زہراؑ کے پلے ہیں
پاؤں نے کہا ہم نہ ٹلیں گے نہ ٹلے ہیں

گھوڑے کی عناں روک کے ظالم یہ پکارا
حضرت نے بھی لی میاں سے شمشیر قضا را
شبیرؑ کو ہے سامنا درپیش ہمارا!؟
خود ہوگئی قوت ہمہ تن محوِ نظارا

ہمت نے کہا اب ہمہ تن ناز ہوئی ہیں
جرأت نے کہا خلق میں ممتاز ہوئی ہیں

شہ بولے کہ میں حجتِ حق ہوں پے کفار
حیراں ہوا شبیرؑ کی جرأت پہ وہ غدار
سبقت میں نہیں کرنے کا، کر شوق سے تو وار
اس ابرِ سخاوت پہ برسنے لگی تلوار

گہ فرق پہ گہ دوش پہ اور گاہ کمر پر
شہ روکتے تھے حضرتِ حمزہؓ کی سپر پر

جب یکصد و ہفتاد چلی ضرب مکرّر
گھوڑے نے کہا شہ سے کہ جاتا ہوں عدو پر
صارم صفتِ برق ہوئی ہاتھ میں مضطر
آئی یہ ندا غیب سے اے سرورِ اطہر
توضیح تو کی معنیٔ تسلیم و رضا کی
جرأت بھی دکھا دو اسے ضرغامِ خدا کی

تب شہ نے کہا دیکھ، کہ آئی مری باری
گویا ہوا نازل غضبِ حضرتِ باری
وہ برق جو چمکی تو ہوا ہو گئے ناری
دنیا کی بلا آ کے مجسّم ہوئی ساری
پہلے تو چمک کر گئی افلاک کے اوپر
افلاک سے آئی سرِ ناپاک کے اوپر

جب خود پہ بیٹھی تو وہیں تا بہ سر آئی
پھر سینے کو لیتی ہوئی وہ تا کمر آئی
دو کر چکی راکب کو تو مرکب میں در آئی
اللہ رے بُرّش کہ زمیں پر اُتر آئی
تھا شور کہ کیا زورِ حسینؑ ابنِ علیؑ ہے
حقّا کہ یہ سردفترِ اولادِ نبیؐ ہے

گھوڑا

گھوڑے کا خدوخال

گھوڑے کا خدوخال ۔ ڈیل ڈول ۔ چہرہ مہرہ

اللہ رے نزاکت فرسِ غنچہ دہن کی
آتی ہیں نظر صاف رگیں گُل سے بدن کی
سیرت ہے اگر شیر کی صورت ہے ہرن کی
رانوں میں ٹھہرتا نہیں بو سونگھ کے رن کی

دُھن ہی کہ گذر جائے حدِ چرخِ بریں سے
ہر جست میں یہ قصد کہ اُڑ جاؤں زمیں سے

معشوقیت اُسکے رگ و ریشہ میں بھری ہی
گرمی وہ ہی جو سرد نسیمِ سحری ہی
اس چال سے پامال سرِ کبکِ دری ہی
ہوش اُڑتے ہیں پریوں کے عجب تیز پری ہی

ہی برق خجل، حال ہے یہ تیز روی کا
رفرف کا گماں، شک ہی براقِ نبوی کا

چلنے میں یہ شمشیر ہی پلّہ میں یہ ہے تیر
جانے میں رسولوں کی دعا آنے میں تاثیر
لڑنے میں یہ تقدیر بگڑنے میں یہ تدبیر
چھپنے میں یہ ہی خوابِ عیاں ہونے میں تعبیر

مضموں ہیں بہت، پر کوئی دلچسپ نہیں ہے
اسرار ہی اعجاز ہے یہ اسپ نہیں ہے

آہو شُم۔ و عقاب دُم۔ و ہمسرِ ہما
سیلِ جبال افگن و طوفانِ قہر زا
ضیغم جبیں۔ و فیل تن۔ و برقِ تیز پا
فرمانِ غیب حکمِ قدر نائبِ قضا

راکب دمِ وغا جسے زیر و زبر کرے
یہ اُس کے سر پہ موت سے پہلے گذر کرے

کھنچتی نہیں پر توسنِ چالاک کی تصویر
آتا ہی نہیں ذہن میں کیا کیجیے تدبیر
عامل میں نہیں ہوں جو ہوا کو کروں تسخیر
دل آپ کو حیرت زدہ عقل آپ کو دلگیر

ہر گز صفتِ اسپِ ہنرمند نہ ہوگی

اس شیشۂ دل میں یہ پری بند نہوگی

گم تیغ دو پیکر سے نہ تھی اُس کی لڑائی
مہندی لہو کی پانووں میں تھی اُسنے لگائی
گر خون سے تھا ناخنِ شمشیر حنائی
تھی وضع حسینانہ زمِ جنگ بنائی

سلمائے عجم تھا نہ وہ لیلائے عرب تھا
پر ناز و کرشمہ جسے کہتے ہیں وہ سب تھا

ہی رعد ہوا میں تو یہ ہے کبک ادا میں
یہ حور ہی فردوس میں بلقیس سبا میں
یہ موج ہی دریا میں یہ بجلی ہے ہوا میں
آہو ہی تگاپو میں تو ہے شیر وغا میں

دل اس پہ سلیمانؑ کا پروانہ ہوا ہے
کہیئے جو پری کہتا ہے دیوانہ ہوا ہے

گھوڑا ہی، مگر شیر کا بالکل ہے قرینہ
گرمی کے سبب بہتا ہی پٹھوں سے پسینہ
ٹاپوں سے جھلکتا ہے یہ اشرار کا سینہ
ہر قطرہ ہے یوں جیسے کہ خاتم پہ نگینہ

اللہ رے ضیا آنکھ جھپکتی ہے قمر کی
بوندیں نہ کہو صاف یہ پا کھر ہے گہر کی

شوخی میں پری حسن میں ہی حورِ بہشتی
کب ابلقِ دوراں میں یہ ہی نیک سرشتی
طوفان میں راکب کے لیے نوحؑ کی کشتی
یہ خیر ہی وہ شر ہے یہ خوبی ہی وہ زشتی

صحرا میں چمن، فصلِ بہاری ہی چمن میں

رہوار ہی اصطبل میں، تلوار ہے رن میں

تعریف اسپ

گھوڑے کی تیزی اور چل پھر

رانوں سے بہادر کے فرس رشکِ صبا ہی
بجلی ہی کسی جا تو کسی صف میں ہوا ہی
سرعت میں کہیں برقِ جہندہ سے سوا ہی
سرعت میں جو آہو تو اسد وقتِ وغا ہی

مہمیز کی حاجت اُسے زنہار نہیں ہے
اللہ کی قدرت ہی، یہ رہوار نہیں ہے

اُسکے رہوار کی سرعت کا کروں کیا میں بیاں
ہو پری تیز پری دیکھ کے اُس کی حیراں
برق وش رشکِ صبا، غیرتِ طاؤسِ جناں
منزلوں تختِ سلیماںؑ سے بھی آگے ہو رواں

نقشِ پا اُسکا کسی نے جو نہیں دیکھا ہے
توسنِ روح اگر اُسکو کہوں زیبا ہے

لاکھوں کمال اُس میں ہیں کہیئے کہاں تلک
پہونچے ابھی نہ دستِ تصوّر عناں تلک
راکب کا اُسکے عزم جو ہو آسماں تلک
ہو آئے اتنے عرصہ میں یہ لامکاں تلک

شیرِ ایزداوہ رخشِ پری رو ہی زیرِ راں
چلنے میں چھوڑ دیتا ہے یہ حدِّ آسماں
گوڑے کا دہیان لائے جو راکب تو یہ کہاں
یعنی کہ تازیانے کی صورت ہے کہکشاں

رہوارِ سبک خیز بھی ہر سمت تھا جولاں
صرصر کی طرح سے کبھی یاں تھا تو کبھی واں

بھرتا تھا طرارے جو فرس برق کی عنواں
بھرتی تھی دمِ سرد صبا ہو کے پریشاں

رہوار کے آگے کوئی جادو نہیں چلتا
سائے کے برابر کوئی آہو نہیں چلتا
ساتھ اُسکے فلک وقتِ تگاپو نہیں چلتا
اس چال سے صرصر کا بھی قابو نہیں چلتا
بجلی سے تک و تاز میں ممتاز ہے گھوڑا
جاں باز ہے راکب تو قدم باز ہے گھوڑا

بولا کوئی چالا کیِ رہوار تو دیکھو
بجلی کی تڑپ گرد ہے رفتار تو دیکھو
اک کہنے لگا شانِ علمدار تو دیکھو
شان ایک طرف - جلوۂ رخسار تو دیکھو
کس قہر سے ہر ایک کو للکار رہے ہیں
کس پیار سے رہوار کو چمکار رہے ہیں

تھی نرم روی پاسِ شہِ عرش نشیں سے
پر اُس میں بھی لیتا تھا سبق روح امیں سے
یعنی سبقت کرتا تھا ۱۲
اور گرم جو ہوتا تھا وہ حکم شہ دیں سے
پھر اُٹھتی تھی بجلی عوضِ گرد زمیں سے
جب گرم ہوا موت کا نقشہ نظر آیا
مثلِ ملک الموت - اِدھر آیا - اُدھر آیا

چالا کیِ رہوار سے مردم سے تھے ششدر
ابرو کی طرح رکھتا تھا نعل آنکھوں کے اوپر
گہ پھرتا تھا پتلی کی طرح آنکھوں کے اندر
گہ مثلِ نگہ صاف نکل جاتا تھا باہر
کچھ تیغ کے سائے میں تو دم لیتے تھے اعدا

پر گرمیِ توسن سے تو جاں دیتے تھے اعدا

حضرت عونؓ و محمدؓ کے گھوڑے

دیکھا نہ سُنا ہم نے سمندوں کا یہ دستور
وہ کہتا تھا میں طُورہوں یہ کہتا تھا میں نور
وہ کہتا تھا میں رعد ہوں یہ کہتا تھا میں صور
وہ کہتا تھا لیلےٰ ہوں تو یہ کہتا تھا میں حور

وہ کہتا تھا دیکھ آیا ہوں میں گاوِ زمیں کو
یہ کہتا تھا میں پھاندتا ہوں عرشِ بریں کو

وہ کہتا تھا بجلی ہوں یہ کہتا تھا ہوا ہوں
وہ کہتا تھا سودا ہوں یہ کہتا تھا بلا ہوں
وہ کہتا تھا نکہت ہوں یہ کہتا تھا صبا ہوں
وہ کہتا تھا عنقا ہوں یہ کہتا تھا ہُما ہوں

وہ کہتا تھا واقف ہے قمر کبکِ دری ہوں
یہ کہتا تھا شاہد ہے سلیمانؑ میں پری ہوں

شبدیزِ فلک سامنے انکے کمری ہے
نبض ان کی شرر سانس نسیمِ سحری ہے
آنکھوں میں وہ شوخی ہے کہ شیشہ میں پری ہے
سایہ ہے ہُما نقشِ قدم کبکِ دری ہے

چلنے میں اگر نرم روی مدِ نظر ہو
آنکھوں میں پھریں اور نہ مردم کو خبر ہو

مضمونِ ذوالجناح نیا باندھتے ہیں ہم
آج اپنی شاعری کی ہوا باندھتے ہیں ہم
پائے قلم سے پائے صبا باندھتے ہیں ہم
کھلتا نہیں یہ عقدہ کہ کیا باندھتے ہیں ہم

یال اک طرف کو دُم ہے وہ حسن و جمال میں
چوٹی کے آرہے ہیں مضامیں خیال میں

اُس توسنِ چالاک کا اب وصف ہو کیونکر   **ولہ**   چلنے میں وہ تھا تُند ہوا سے بھی فزوں تر

اس تیزی سے جاتا تھا وہ رہوار زمیں پر
سائے کو بھی گرنے نہیں دیتا تھا کہیں پر

اس رخش سے برق و شرر و شعلہ و سیماب   لرزندہ و شرمندہ و درماندہ و بیتاب
خورشید و سحاب و فلک و انجم وبنات   لرزان و ہراسان و سراسیمہ و بیخواب

ساتھ اُسکا دیا جائے ہوا سے نہ پری سے   شہبازِ نگہ باز رہے تیز پری سے

جنت کی ہوا میں جو یکایک ہوا جولاں   رہوار پری بن گیا زیں تختِ سلیماںؑ

سرعت کی جو قسمت ہوئی منظور قضا کو   نو جزو تو اُسکو دیئے اک جزو ہوا کو

ہی برق شرر خیز اگر جلوہ کناں ہے   ہی ابرِ گہر ریز اگر قطرہ زناں ہے

اور توسنِ **شبیرؑ** تو ہے توسنِ اعجاز   آہو روش و برق خرام و شرر انداز

کہتا تھا فرس ڈھونڈھ تو لے کوئی کہاں ہوں   آنکھوں میں تو پھرتا ہوں نگاہوں سے[له] نہاں ہوں

اُڑنے سے ہی ثابت کہ پر و بال بہم ہیں   شانوں میں تو پیدا نہیں پر زیرِ قدم ہیں

کیا تیز قدم اسپِ شہِ عرش نشیں ہے   اللہ کی قدرت ہے یہ رہوار نہیں ہے

پھر آیا عالمِ بالا سے یوں سوئے جنگاہ   کہ جیسے دیدۂ مردم سے جست کرے نگاہ

جولانیِ فرس کو کروں کیا میں آشکار   آہو کی طرح ہوتے ہیں مضمون بھی فرار

له میر انیس صاحب۔ مانندِ تصوّر کبھی یاں تھا کبھی واں تھا ؎ آنکھوں میں تو پھرتا تھا پہ نظروں سے نہاں تھا

ڈہونڈو تو بھلا نقشِ سُمِ نعل کہیں ہے	دنیا میں جگہ پاؤں کے رکھنے کی نہیں ہے
سرعت یہ ہی گر آئینہ خانے میں رواں ہو	ہرگز نہ کسی آئینہ میں عکس عیاں ہو
چالاک ہے اس درجہ عقابِ علی اکبرؑ	آرام نہیں مدح کے حرفوں کو ورق پر
قدغن ہی شاعروں پہ اُسکا جہان میں	ساکن حروف آئیں نہ میرے بیاںؔ میں

ع۔ جانے میں رسولوں کی دعا آنے میں تاثیر۔

ع۔ اللہ کی قدرت ہی نہ چھل بل نہ چھلاوہ۔

ع۔ فردوس کی ہوا میں اُڑا حرؑ کا بادپا

ع۔ شعلہ تو وہ نہ تھا پہ ہوا سے بھڑکتا تھا

تلوار واقعی مرثیہ گویوں کا سب سے بڑا موضوع شاعری ہی اور ہر مرثیہ گو تلوار کی صفت میں زورِ طبیعت سے کام لیا کرتا ہی۔ مگر مرزا صاحب نے خاص طور پر اس موقع پر اپنے کمالات کے وہ جوہر دکھائے ہیں کہ قابلِ داد و تحسین ہیں۔ مؤلف کی نارسا طبیعت پر افسوس آتا ہی کہ وہ ان نادر مضامین کی لطافت کا احساس

ؔ اسی کے ہم مضمون میر انیس کا یہ لاجواب شعر ہی ؎ اس کی ثنا اگر کوئی لائے زباں پہ ٭ ساکن جو حرف ہو وہ نہ آئے زبان پہ ٭ دونوں کے مقابلہ سے معلوم ہوتا ہی کہ میر صاحب کے شعر میں زیادہ بلاغت پائی جاتی ہی۔ مرزا صاحب کا مضمون ہی کہ گھوڑے کی شاعروں کو تاکید ہے کہ میری تعریف کرتے وقت حروفِ ساکن کا استعمال نہ کرو۔ لیکن میر صاحب فرماتے ہیں کہ اسکی ثنا کے وقت حروف ساکن زبان پر آہی نہیں سکتے گو شاعر ایسا قصد بھی کرے۔ یہ مضمون نہایت پُر لطف ہے ۱۲۔

نہیں کر سکے ۔ مرزا صاحب کے جو جو بند اُنھوں نے اعتراض کی غرض سے انتخاب
کیے ہیں ۔ درحقیقت اُن میں واقعیت کا پہلو کم ہی ۔ اصل یہ ہی کہ نازک خیال شعرا
جب ایسے باریک اور لطیف مضامین لکھ کر اپنی رسائیِ طبیعت اور بلندیِ فکر کا
اظہار کرتے ہیں ۔ تو بعض اوقات واقعیت سے دور جا پڑتے ہیں ۔ لیکن یہ کہنا
کہ "مرزا صاحب ہمیشہ اس عالم میں لامکان تک پہونچ جاتے ہیں" یا اُن کے کلام
میں ہمیشہ تلوار کی تعریف میں اسی قسم کے مضامین ہوتے ہیں ۔ بالکل غلط اور مہمل
خیال ہی ۔ اس ہمہ داں شاعر کے کلام میں ہر انداز اور ہر قسم کے اشعار مل سکتے
ہیں ۔ لیکن اگر چشمِ بدبیں عمدہ کلام کی طرف سے آنکھیں بند کرلے تو اسکا علاج
ہمارے پاس موجود نہیں ۔ بہر حال ہم اُس قسم کے اشعار لکھتے ہیں ۔ جس انداز کے
مصنّف نے میر انیس صاحب کے انتخاب کیے ہیں اور جن میں واقعیت اور صلیت کا
جوہر ہر جگہ نمایاں ہی ۔ مؤلف خود انصاف کرلیں کہ ہمارا دعویٰ کہانتک راستی
پر مبنی ہے ۔

سب سے پہلے دیکھو تلوار کا سراپا کس طرح کھینچتے ہیں ۔

چھل بل تھی ۔ چھلاوہ تھی ۔ طلسمات تھی اسرار	چالاک ۔ سبکبار ۔ طرحدار ۔ نمودار
نیزہ کہیں ۔ خنجر تھی کہیں اور کہیں تلوار	بجلی تھی کسی جا ، تو کہیں نور کہیں نار

سیماب تھی ۔ سیلاب تھی ۔ طوفاں تھی ۔ ہوا تھی
شعلہ تھی ۔ شرارہ تھی ۔ قیامت تھی بلا تھی

پھل وزن میں تھا پھولِ تجلّی میں نخلِ طور	گرمی میں محض نار ، تو نرمی میں صاف نور

تلواروں میں عامل کی طرح سیف زباں تھی نمرودیوں کے واسطے یہ تیغ دھواں تھی	ولہ	آسیب تھی آفت تھی بلائے دوجہاں تھی بجلی کی طرح گاہ یہاں - گاہ وہاں تھی

ہر وار میں جوہر کی عجب جلوہ گری تھی
چم خم میں مہِ نو۔ تو کرشمہ میں پری تھی

ہیبت سے تزلزل میں سما تا بہ سمک ہے شورِ آبِ دمِ تیغ کا زخموں کو نمک ہے		ہفت آئینۂ چرخ سے پار اس کی چمک ہے بجلی کی تڑپ ہے کبھی شعلے کی لپک ہے

گہ مرگِ مفاجات ہے اور گاہ قضا ہے
گہ ابر ہے گہ رعد ہے گہ سیلِ فنا ہے

شمشیر تھی کہ ناخنِ مشکل کشا تھی وہ الیاسِ بحرِ فتح کہ خضرِ فنا تھی وہ		دستِ قضا تھی یا کہ اجل کا عصا تھی وہ زخموں کے تنگ کو چوں سے خوب آشنا تھی وہ

بے بار کیوں خمیدہ سرِ ذوالفقار تھا
اعدا کے سر پہ تن تھے یہی اُسپہ بار تھا

وہ تیغ کی سج اُور وہ قبضے کی سجاوٹ		معشوقوں کی صوت، سرِ اعدا سے لگاوٹ

دم۔ کس۔ چم و خم۔ فتح کا جس حسن کا جوہر بھاری تھی ہزاروں پہ وہ اک تیغِ دوپیکر		کیا خوبیاں شمشیر دوسر میں تھیں سراسر ہلکی تھی مگر ہاتھ میں ناخن کی برابر

کی پھر تو علم شاہ نے تیغِ شہِ مَرداں تیغِ دوزباں صاعقہ افگن سرِ میداں	ولہ	وہ برقِ دو دم جس سے خجل برقِ درخشاں خود جوہرِ شمشیر بنے دیدۂ حیراں

گو تیغ میں شعلے تھے مگر آب بھی کیا تھی
کیا معجزہ تھا آتش و آب ایک ہی جا تھی

اُس تیغ سے مکّاروں کو مہلت ہی کہاں کب تھی	ولہ	تلوار نہ تھی - قہرِ خدا - برقِ غضب تھی
منظور جو اُس تیغ کو اکبرؑ کی رضا تھی	ولہ	گہ ابر تھی - گہ برق تھی - گہ سیلِ فنا تھی
اُس تیغ سے برباد عناصر کی بنا تھی	ولہ	خود آگ تھی خود خاک تھی خود آب و ہوا تھی
تھی رہ‌ رہ‌ کے گو وہ تیغ یہ روشن جہاں پہ تھا	ولہ	جتنا لہو پیا تھا وہ جاری زباں پہ تھا
جوہر نہ تھے وہ تیغِ شہِ خوشخصال میں	ولہ	دن کو چمک سے ہے تھے ستارے ہلال میں

ع - اک جلوہ ہے اُس تیغ کا برقِ فلک پیر،
ع - یہ تیغ ہے یا ناخنِ شہبازِ قضا ہے،

تلوار کا کاٹ

جس صف پہ گری صاف صفائی نظر آئی چھینٹے جو پڑے پر تو لہو میں یہ بھر آئی		جس غول پہ چمکی تو ہوا غل کدھر آئی اک اک کو خبر بھی نہ رہی اپنی - پرائی

لہرا کے جو بیٹھی - تو جگر کاٹ کے اُٹھی
ناگن کی طرح شبنمِ خوں چاٹ کے اُٹھی

بجلی سی گری تیغِ شرر بار سَروں پر		تھی خود پہ ہر بار - تو ہر بار سروں پر

تلوار کی کاٹ

کٹ کٹ گئے جسوقت چلا وار سروں پر
تھی خود پہ ہر بار۔ تو ہر بار سروں پر

ہل چل میں نہ تھا ہوش کسی کو سروپا کا
چلاتے تھے خود سر پہ طمانچہ ہے قضا کا

صورت میں مہ نو۔ تو چمک مہر سے افزوں
وہ باڑ کہ اک دم میں بہا خون کا جیحوں
لب تشنہ تھی ایسی کہ ہزاروں کا پیا خوں
ہر وار میں تھا رنگ لڑائی کا دگرگوں

کشتوں سے بیابانِ بلا پاٹ رہی تھی
ہل ہل کے لعینوں کے گلے کاٹ رہی تھی

اعدا کے پرے خون میں بھر جاتی تھی تلوار
جوں سیل سروں پر سے گذر جاتی تھی تلوار
دو کر کے سپر تا بہ کمر جاتی تھی تلوار
حاضر تھی قضا ساتھ، جدھر جاتی تھی تلوار

سر پر جو پڑی تیر گئی دامنِ زیں تک
اُتری سرِ زیں سے تو گئی گاوِ زمیں تک

کی پھر تو علم شاہ نے تیغ شہِ مرداں
وہ برق دو دم جس سے خجل برقِ درخشاں
تیغِ دو زباں صاعقہ افگن سرِ میداں
خود جوہرِ شمشیر بنے دیدۂ حیراں

گو تیغ میں شعلے تھے مگر آب بھی کیا تھی
کیا معجزہ تھا۔ آتش و آب ایک ہی جا تھی

جس سر پہ ٹھہری تو وہ سر تن پہ نہ ٹھہرا
تن زین پہ اور زین بھی توسن پہ نہ ٹھہرا
توسن کا قدم دشت کے دامن پہ نہ ٹھہرا
اور شرع میں خوں تیغ کی گردن پہ نہ ٹھہرا

قانونِ عدالت عملِ تیغ نکو تھا

جو منکرِ یکتائیِ حق تھا وہی دو تھا

خود رفتہ ہوئے بھاگنے کے قصد میں بے پیر ترکش میں رکھیں تیغیں، نیاموں میں رکھے تیر
جی کر کے جو ٹھہرے بھی دمِ دار و دمِ گیر قبضے کے بدل ہات میں پکڑا سرِ شمشیر
تیروں کے عوض ہاتھ فقط جوڑ رہے تھے
ہاتوں سے کماندار کماں چھوڑ رہے تھے

میداں سے صفیں بھاگ گئیں فوجِ لعیں کی بس رہ گئیں ماتھے پہ صفیں چینِ جبیں کی
ضربت تھی غضب دستِ جنابِ شہِ دیں کی ہر بار لچکتی تھی کمر گاوِ زمیں کی
چھپتی تھی زمیں شہپرِ جبریلؑ امیں میں
جبریلؑ فلک میں تو فلک عرشِ بریں میں

اللہ رے رعبِ تیغ زہے شوکت و جلال چمکی جدھر صفیں کی صفیں ہو گئیں نڈھال
دشمن کے فرق پر جو گئی برق کی مثال گھبرا کے تیرہ روزوں نے آگے بڑھائی ڈھال
غل پڑ گیا سپر کو بچا تیغِ شاہ سے
بجلی کو لاگ ہوتی ہے رنگِ سیاہ سے

جس مورچہ میں لیلیِ تیغِ دو سر گئی چنگے بھلوں کو سایہ سے دیوانہ کر گئی
ہر صف پہ خاک اڑائی ادھر سے ادھر گئی پھر یہ نہا نہا کے لہو میں نکھر گئی
عالم نہ پوچھو قطرہ فشانی کے حسن کا
جوبن ٹپک رہا تھا جوانی کے حسن کا

آگے کبھی بڑھی کبھی پیچھے کو پھر پڑی سر پر جو لڑکھڑائی تو شانوں پہ گر پڑی

تجویز جو لعینوں نے کی وہ مضر پڑی
اُفتاد اُن سے پوچھیے، یہ جنکے سر پڑی
اُٹھی۔ گری۔ بلند ہوئی۔ پست ہو گئی
پی پی کے میکشوں کا لہو مست ہو گئی

پھول اُڑ گئے جو ڈھالوں کے خرمن سے جا ملی
رگ رگ الگ الگ ہوئی جس تن سے جا ملی
پھر سر تھا سو قدم پہ جو گردن سے جا ملی
کڑیاں جُدا ملیں۔ جو یہ جوشن سے جا ملی
تاثیرِ چشمِ زخم، بدوں کو دکھا گئی،
مثلِ نظر، بدن کو لگی، اور کھا گئی

تیغِ دو سر کو سر پہ سنبھالتے تھے خاص و عام
چپ تھے۔ حضورِ تیغِ زباں آورانِ شام
یعنی بلند صاحبِ جوہر کا ہے مُقام
کیا مُنہ جو کوئی اہلِ زباں سے کرے کلام
برچھی نے بحث کی نہ خدنگ و حسام نے
سب کی زبان بول گئی اُسکے سامنے

پہلو کے پاس آ کے جوشن سے نکل گئی
چھوڑی نہ کوئی بات دہن سے نکل گئی
بے زخم کھائے جان بدن سے نکل گئی
ڈوبی زمیں میں چرخِ کہن سے نکل گئی
تارے کہیں۔ قمر کہیں۔ چرخِ بریں کہیں،
مچھلی کہیں تڑپتی تھی، گاوِ زمیں کہیں

جس صف کے سر پہ تیغِ دو پیکر نظر پڑی
جب سرکشوں کی، تیغِ دو سر پر نظر پڑی
وہ صف کی صف، زمین پہ بے سر نظر پڑی
اُٹھے جہاں سے، موت برابر نظر پڑی
پتھرا کے آنکھ رہ گئی، مردم کو غم ہوا
جو عین اُس کے دم پہ چڑھا وہ عدم ہوا

ہر اک سپر نڈھال تھی دہشت سے وار کی
ششدر تھا چار آئینہ۔ جب آنکھ چار کی

زرمی عیاں تھی کڑیوں سے سنبل کے تار کی
کڑیاں زرہ سے اُٹھ نہ سکیں ذوالفقار کی

مہتاب تھا کہ پرتوِ صمصامِ پاک تھا
رختِ حیات مثلِ کتاں چاک چاک تھا

لشکر کو مثلِ وعدۂ لیلیٰ نہ تھا قرار
دل سے شکستِ توبۂ مجنوں تھی آشکار
جاں اس طرف رواں تھی، قرار اُس طرف فرار
قالب سے روح بھاگ گئی، دل تو درکنار

روئیں تنوں کا طنطنہ و زورِ تن گیا
ہر عضو بھاگنے کے لیے پاؤں بن گیا

چال اُس پری کی عاملوں کو مات کر گئی
بھاگا وہاں سے سایہ، جہاں یہ ٹھہر گئی
کھیلی قضا کے ساتھ کہ ہستی گذر گئی
سر پر چڑھی تو شیشۂ دل میں اُتر گئی

آگے بڑھی جو دل پہ یہ قبضہ کیے ہوئے
غل تھا پری وہ اُڑ گئی شیشہ لیے ہوئے

کیسی زمیں، فلک سے یہ ہر دم گذرتی تھی
پر حدِّ شرع سے قدم آگے نہ دھرتی تھی
خونِ عدو نجس تھا۔ سو پرہیز کرتی تھی
ناخن بھی اپنا تیغِ دوپیکر نہ بھرتی تھی

بے جرم معرکے میں یہ خارانشگاف تھی
لشکر کا خوں کیا تھا مگر پاک صاف تھی

بو کی طرح دماغوں میں آئی۔ چلی گئی
مثلِ ہوا سروں میں سمائی۔ چلی گئی
مانندِ شعلہ باگ اُٹھائی چلی گئی
آندھی کی طرح۔ آگ لگائی چلی گئی

سینے میں صاف آتی تھی، اور صاف جاتی تھی
اندازِ دم کی آمد و شد کا دکھاتی تھی

آنکھوں میں کوندجاتی تھی پیشِ نظر نہ تھی ۔ صف کونسی تھی رن میں کہ زیر و زبر نہ تھی
کچھ انتہائے برّشِ تیغِ دوسر نہ تھی ۔ یہ کون مبتدا تھی کہ جس کی خبر نہ تھی
یاں تھی تو واں نہ تھی، جو ادہر تھی۔ اُدھر تھی
پر یہ نہ کچھ کھُلا کہ کدھر تھی۔ کدھر نہ تھی

اک دم میں برابر۔ ادھر آئی اُدھر آئی ۔ یاں دم لیا۔ واں سر۔ ادھر آئی۔ اُدھر آئی
ہر سو ہوا محشر۔ ادھر آئی۔ اُدھر آئی ۔ ڈر کر صفِ لشکر۔ ادھر آئی۔ اُدھر آئی
جانے میں شبِ وصل کی ساعت نظر آئی
آنے میں یہ عاشق کی طبیعت نظر آئی

سر کو نہ خبر یہ تھی کہ دستار کہاں ہے ۔ رہوار نہ واقف تھے کہ اسوار کہاں ہے
حیران تھی ہر اک چشم کہ تلوار کہاں ہے ۔ پیدا ہی شرر برقِ شرربار کہاں ہے

چھائی جو سرِ دست یہ صمصام کی بدلی ۔ رُت پھر گئی رنگت سیہ شام کی بدلی
بدلی نے ہوا گردشِ ایّام کی بدلی ۔ غُل تھا کہ نگہ کفر سے اسلام کی بدلی
گرنے میں جھڑی لگ گئی بیدادگروں کی
پڑنے لگی بوچھار جہنّم میں سروں کی

اللہ رے دماغ اُسکا کسی سر پہ نہ ٹھیری ۔ سر ایک طرف۔ گنبدِ مغفر پہ نہ ٹھیری
بنتِ ستمگار کے ممبر پہ نہ ٹھیری ۔ بالائے سپر۔ پھولوں کے بستر پہ نہ ٹھیری
یہ بیٹھنا کب تھا ادھر آئی۔ اُدھر آئی

جس سر پہ رکھا پاؤں - زمیں پر اُتر آئی

کہتے تھے ستمگار زہے تیغ علمدار
سمجھیں اگر آسیب کہاں اُسکے یہ کردار
چھل بل ہی چھلاوہ ہی طلسمات ہے اسرار
کہیے جو پری تیز پری اُس سے یہ شوار

بھاگیں کہ لڑیں بات کوئی بن نہیں آتی
یوں مرگِ مفاجات بھی فورن نہیں آتی

ناگاہ دیا تیغ کو اکبرؑ نے یہ فرماں
یہ سنکے اُٹھا آبِ دمِ تیغ سے طوفاں
گرمی میں دکھادے مجھے برسات کا ساماں
سرِ خاک پہ گرنے لگے جوں قطرہ باراں

منظور جو اُس تیغ کو اکبرؑ کی رضا تھی
گہ ابر تھی گہ برق تھی گہ سیل فنا تھی

گہ سر پہ کبھی شانے پہ اور گاہ جگر پر
گہہ شعلہ فگن ہوتی تھی بڑھ بڑھ کے سقر پر
گہ سینے پہ گہہ قلب پہ اور گاہ کمر پر
گہ تھی دُمِ ماہی پہ کبھی ماہ کے سر پر

ہمشکلِ نبیؐ اپنا اگر ہات نہ روکیں
وار اُسکا کبھی ارض و سماوات نہ روکیں

تھرّا رہے تھے کون و مکاں خوف سے اُسکے
ہر منہ میں ہوئی بند زباں خوف سے اُسکے
تھے زرد رخِ پیر و جواں خوف سے اُسکے
قالب سے رواں ہوگئی جاں خوف سے اُسکے

ہنگامۂ محشر تھا عیاں تیغِ دو دم سے
مرنے کے سوا کچھ نہ بنا فوج ستم سے

سینے میں گئی - لیتی ہوئی دم نکل آئی
گہہ دل کی خبر لینے کو - زیرِ بغل آئی

کی قطع کلائی - مگر اُسکو نہ کل آئی
جس جسم کو یہ چھُو گئی اُس کی اجل آئی

ٹھیرے ہوئے چال اسکی فلک دیکھ رہے تھے
گھبرائے ہوئے جن و ملک دیکھ رہے تھے

گہ مثلِ نگہ چشمِ لعیں سے نکل آئی
گہ چینِ جبیں بنکے جبیں سے نکل آئی
مانندِ ہوا دامنِ زیں سے نکل آئی
گردوں میں چھپی اور زمیں سے نکل آئی

باندھی وہ ہوا جس سے بگولے ہوئے ناری
شرمائے جلے آگ ببولے ہوئے ناری

غصّے سے زرہ پوشوں کے سر پر اگر آئی
شیشے میں پری جال میں مچھلی نظر آئی
چار آئینے میں عکس، وہ جوشن میں در آئی
منہ دیکھ کے چلائی اجل میں کدھر آئی

قالب نہ زرہ میں تھا نہ دم اہلِ ستم میں
دم بھاگنے کے واسطے ٹھہرا تھا قدم میں

جلاّدِ فلک کہتا تھا ہاں شیرِ علیؑ کے
یہ زور یہ قوّت نہیں حصّے میں کسی کے
کیا حوصلے میداں میں نکالے مرے جی کے
ہاں سر نہ رہے جسم پہ ایک ایک شقی کے

اب تاب نہیں ہے تنِ افواجِ ستم میں
شہزادے ہوئی فتح لڑائی کوئی دم میں

لو تیغ زنو اپنے سر و خود سے ہشیار
کھنچتی ہے حُسامِ کمرِ حیدرِ کرّار

* یعنی چار آئینہ میں تو تلوار کا عکس ظاہر ہوا اور وہ خود جوشن میں سما گئی - پس چار آئینہ میں اُسکا عکس اسطرح تھا گویا شیشے میں پری ہے اور خود تلوار کا جوشن میں سمانا ایسا تھا گویا جال میں مچھلی نظر آرہی ہے - ۱۲

اس فاقے میں دکھلاتا ہوں حملے تمہیں دو چار | سر پر اجل آپہونچی خبردار خبردار

کھولونگا شجاعت کے ہنر پیر و جواں پر
باندھونگا سرِ فوج سے پُل آبِ رواں پر

تھا شور وہ تڑپی وہ گری فوج پہ آکر | وہ جسم میں ڈوبی وہ تری خوں میں نہاکر
چمکی وہ زمیں میں، وہ پھری چرخ پہ جاکر | وہ خود پہ بیٹھی، وہ اُٹھی سر کو گراکر

وہ پے کیا پیدل کو۔ وہ اسوار کو کاٹا
وہ تنگ میں درآئی وہ رہوار کو کاٹا

آندھی کی طرح آئی اُڑائے سرِ اعدا | کوندی صفتِ برق جلائے سرِ اعدا
دریا کی طرح اُمڈی۔ بہائے سرِ اعدا | بیٹھی روشِ گرد چھپائے سرِ اعدا

اس تیغ سے برباد عناصر کی بنا تھی
خود آگ تھی۔ خود خاک تھی۔ خود آب و ہوا تھی

اُس تیغ سے تھا ہر صفِ لشکر میں تلاطم | تھا نوحؑ کے طوفاں کا سمندر میں تلاطم
ہر شہر میں۔ ہر کوچے میں۔ ہر گھر میں تلاطم | دوزخ تہ و بالا تھا تو کوثر میں تلاطم

بتلاتے تھے زندے یہ کرامت ہے کرامت
چلاتے تھے مُردے یہ قیامت ہے قیامت

حرص و ہوا کی طرح سروں سے نکل گئی | آرام کی طرح جگروں سے نکل گئی
دکھلاکے اپنا بل کمروں سے نکل گئی | چار آئینوں سے اور سپروں سے نکل گئی

بے جسم شے کا کاٹنا تیغوں کی خو نہ تھی

برش سے اُسکی ڈھال کے پھُولوںمیں لَو بہ تھی

جب یہ ٹلی کمر سے - کمر بند تھا جُدا
محشر تھا یہ کہ باپ سے فرزند تھا جُدا
روح و بدن کے ربط کا پیوند تھا جُدا
مانندِ درد علیش کا ہر بند تھا جُدا
یعنی لفظ درد ۱۲

کس تیغ کے وہ مُنہ سے ہو بات اس جو ہوئی
زخمی کے لب سے آہ جو نکلی تو دو ہوئی

چینِ جبیں کی طرح جبیں سے نکل گئی
زین اک طرف یہ حدِّ زمیں سے نکل گئی
پائی جو راہ تنگ تو زیں سے نکل گئی
جب سر اُٹھایا، چرخِ بریں سے نکل گئی

گردن سے سر لیا کبھی قالب سے دم لیا
بس دم لیا تو تیغِ دو دم نے یہ دم لیا

اک وار میں سواروں کی صف سے یہ پار تھی
کہ پیش و پس تھی، گاہ یمین و یسار تھی
مثلِ اجل پیادوں کے سر پر سوار تھی
جو اُسکے سامنے تھا یہ خدمت گزار تھی

حیراں برش نے اسکی ہر اک تیغ کو کیا
چار آئینہ میں اپنے ہی سایہ کو دو کیا

جب رن میں ذوالفقار علم کی حسینؑ نے
لی دادِ حرب فاطمہؑ کے نورِ عین نے
دکھلائے دو ہلال شہِ مشرقین نے
کی مدحِ حرب فاتحِ بدر و حُنین نے

یہ ہیبتِ جہادِ شہِ نیک خو ہوئی
خود ذوالفقار میاں سے کھنچتے ہی دو ہوئی

حیرت کا نقشہ چہرۂ کفّار بن گیا
رہوار ہر سوار کا دیوار بن گیا

تصویر کا سوار ہر اسوار بن گیا
دلّالِ مرگ سب کا خریدار بن گیا

اڑتے نہ بھاگتے نہ ٹھہرتے بنی اُنھیں
جاں سے بدن سے سے گذرتے بنی اُنھیں

شمشیر تھی کہ ناخنِ مشکل کشا تھی وہ
الیاس بحرِ فتح کہ خضرِ فنا تھی وہ
دستِ قضا تھی یا کہ اجل کا عصا تھی وہ
زخموں کے تنگ کوچوں سے خوب آشنا تھی وہ

بے بار کیوں خمیدہ سرِ ذوالفقار تھا
اعدا کے تن پہ سر تھے یہی اُس پہ بار تھا

چشم و دہن میں مثلِ نگاہ و زباں گئی
آئی یہاں وہاں سے یہاں سے وہاں گئی
شکلِ نیام قلب کے یہ درمیاں گئی
اور یہ نہ کچھ کھلا کدھر آئی کہاں گئی

کوئی نہ ذکرِ عیش میں نے فکرِ قوت میں
انگلی کی طرح سب کی زباں تھی سکوت میں

تیغ کی زبان

وہ تیغ میں ہوں کفر سے کی جسنے زمیں صاف
صاف اُسنے ہوں جن سے ہیں جنابِ شہِ دیں صاف
ولہ
رن صاف کیے ظالموں سے خانۂ زیں صاف
دشمن جو اماں مانگے تو کرتی ہوں نہیں صاف

پوشیدہ کوئی بدمزگی میں نہیں رکھتی
گردن کا جو نام آئے گلی میں نہیں رکھتی

اُس تیغ کے الف† کی چمک تا بقاف تھی
ولہ
جس صف کے بیچ میں یہ در آیا وہ صاف تھی

اللہ رے دغا آنکھ نے دیکھی نہ چمک بھی
ولہ
پتلی تو سناں لگئی جھپکی نہ پلک بھی

† تیغ چونکہ سیدھی ہوتی ہے اسلیے اُسکے قد کو الف سے تشبیہ دی ہے۔

ظاہر تھی کبھی اور کبھی آنکھوں سے نہاں تھی	ولہ	قدرت تھی خدا کی، کبھی یاں تھی کبھی واں تھی
ہلتی تھی زمیں گاوِ زمیں کانپ رہی تھی	ولہ	ساتھ اُسکے جو پھرتی تھی اجل ہانپ رہی تھی
بے وجہ نہ وہ قہر سے گرتی تھی زمیں پر	ولہ	جبریل[2] کے پر ڈھونڈتی پھرتی تھی زمیں پر
بل کھاتی تھی گہ اژدرِ خونخوار کی صورت	ولہ	اعدا کے گلے میں تھی کبھی ہار کی صورت
بھاگیں کہ لڑیں، بات کوئی بن نہیں آتی	ولہ	یوں مرگِ مفاجات بھی فورن نہیں آتی
صورت الف کی پھل میں جو سیفِ خدا کے تھی	ولہ	آگے اجل کے چلتی تھی، درپے بقا کے تھی
حق تو یہ ہے، کہ مسئلہ داں تیغِ شاہ تھی	ولہ	سرچڑھ کے سب کے لڑتی تھی اور بیگناہ تھی
اعدا ہی نہ کمزور تھے شبیر سے لڑکر	ولہ	چلتی تھی کوئی تیغ بھی تو ہاتھ پکڑ کر
قدرت کا طلسمات وہ تیغِ شہِ دیں تھی	ولہ	ہرجا تھی ہر اک سمت تھی اور پھر نہ کہیں تھی[1]

تلوار کا میان سے جدا ہونا

بادل سے مہر تیغِ دو پیکر نکل آیا شیشے سے پری، غار سے اژدر نکل آیا	بیضے سے ہما کھولے ہوئے پر نکل آیا شق ہو[2] کے قمر برج سے باہر نکل آیا

بپھرے ہوئے دو شیر نئے ڈھنگ سے نکلے
دو آئینۂ فتح نما زنگ سے نکلے

[1] میر انیس ؎ ہاں ہاں کا شور تھا کسی لب پر نہیں نہ تھی ؛ جلوہ تھا ہر مقام پہ اور پھر کہیں نہ تھی۔
[2] چونکہ ذوالفقار کے دو پھل تھے اسلیے اسکو اُس قمر سے جو شق ہوگیا ہؤا درمیان کو برج سے تشبیہ دی ہے یہی صورت ٹیپ کے دونوں مصرعوں میں ہے۔

نکلی غلافِ نور سے تفسیرِ جوہری یا حجلہ سے عروس نے کی جلوہ گستری	ولہ	یا آکے دست بوسِ سلیمانؑ ہوئی پری یا تھی یہ شاخِ میوۂ طوبیٰ ہری بھری
	اس ہاتھ سے مرادیں تھیں جو جو وہ مل گئیں باچھیں خوشی سے تیغ کے قبضے کی کھل گئیں	
باہر نیام سے سرِ تیغ رواں ہوا اژدر نکل کے غار سے شعلہ فشاں ہوا	ولہ	یا آستین سے یدِ بیضا عیاں ہوا بے پردہ مہرِ خسروِ کون و مکاں ہوا
اکبرؑ نے بھی غلاف سے لی تیغ دور سے	ولہ	اک شمع نکلی پردۂ فانوسِ طور سے
کیا ہاتھ میں شمشیرِ علیؑ برمحل آئی مشتاقِ یوسفؑ میں نہ عاشق کو کل آئی	ولہ	قبضے میں اجل، پنجہ میں تیغِ اجل آئی بیساختہ حجرے سے زلیخا نکل آئی
خالی نیام سبز ہوا ذوالفقار سے یا برق کوندتی ہوئی ابرِ بہار سے	ولہ	یا عندلیبِ سدرہ اُڑا شاخسار سے یا شہسوارِ فتح کا نکلا غبار سے
ٹھہری نہ پھر نیام میں یوں تیغِ آبدار	ولہ	جیسے سخی کے کیسے میں زر کو نہ ہو قرار
شمشیر بھی غلاف سے باہر نکل پڑی	ولہ	غرفے سے حورِ خلد کھلے سر نکل پڑی

ع - پھل میان سے نکلا کہ ضیا کاہکشاں سے

تلوار کے جوہر

مالک تھی دو زبان کی تیغِ شہِ انام		جوہر کلام اُسکا تھا، پر پیچ کا کلام
اللہ رے آبدارئِ شمشیرِ آبدار	ولہ	ڈوبی لہو میں اور ہوئی آلودہ غبار

پر دھونے کو نہ پانی کی حاجت تھی زینہار		خود آبِ تیغ تیغ کو دھوتی تھی بار بار

گر کر اُٹھی تو اور بھی جوہر چمک گئے
مینھ کھل گیا برس کے ستارے چٹک گئے

جوہر سے سب کے بال بدن پر کھڑے ہوئے مرتے ہیں رعبِ تیغ سے ہم بے لڑے ہوئے	ولہ	غل تھا ہلال میں ہیں ستارے جڑے ہوئے جوہر کے پیچ سے ہیں بلا میں پڑے ہوئے
جوہر کا سلسلہ تھا مگر مچھلیوں کا جال	ولہ	یہ سیف خود پھڑکتی تھی انہیں پہ جدال
جوہر نے جب چمک کے شرارے دکھا دیئے	ولہ	پھر دن کی دھوپ رات کے تارے دکھا دیئے
جلو میں فتح و ظفر پشت پر قضا و قدر	ولہ	قضا کا جال برابر لیے چلے جوہر
ناگاہ آئے پشت پہ کچھ پیشوا ے شر	ولہ	تیغِ علیؑ نے دیدۂ جوہر سے کی نظر+
دیکھے نہیں کسی نے یہ جوہر حسام میں	ولہ	کہتے تھے سب کہ تیغ ابھی ہے نیام میں
سب کے گلے سے ملتی تھی لیکن رُکی ہوئی	ولہ	جوہر یہ تھے کہ بوجھ سے تھی خود جھکی ہوئی
کیا تیغِ آبدار تھی جوہر سے خوش جمال	ولہ	منجدھار میں کھڑی تھی پری کھولے سر کے بال
ہوئے اُسے قیام نہ ہرگز نیام میں	ولہ	گر قید ہوئے آپ نہ جوہر کے دام میں[1]

ع۔ چشم جوہر سے لعینوں کی جو تھی جوئندہ+

---

[1] میر انیس ۔ بجلی نے کہیں میان میں آرام لیا ہے ٭ زنجیر نے جوہر کی اُسے تھام لیا ہے
+ میر انیس ۔ ع ۔ وہ دیدۂ جوہر سے جفاکاروں کا تکنا۔

رزم کے بیان میں عشقیہ الفاظ کا استعمال

رزم کے بیان میں چونکہ میر صاحب مرحوم کے کلام میں عشقیہ الفاظ کا استعمال ہوا ہے، اسلیے شکر ہے کہ مؤلف نے اُسکے جواز کا فتوےٰ دیکر اُردو مرثیہ گویوں کو گرانبار احسان بنا دیا ہے۔ لیکن اس موقع پر وہ اُن کو بالکل آزاد اور خودسر بنا دینا بھی نہیں چاہتے اسلیے ایک سخت شرط لگا دی ہے کہ "رزم میں عشقیہ الفاظ اور تشبیہات کا استعمال وہیں تک جائز ہے جہانتک کلام کا اثر نہ جانے پائے اور کلام میں ابتذال نہ آجائے"۔ مگر مشکل تو یہ آپڑی ہے کہ ابتذال کا معیار مولوی صاحب کے مذاقِ صحیح کے سوا اور کوئی چیز نہیں، اُنھیں کا مذاق اس بات کا فیصلہ کر سکتا ہے کہ یہ لفظ مبتذل۔ پست اور سوقیانہ ہے۔ اہلِ زبان کی اس موقع پر کچھ چل نہیں سکتی۔ جیسے اُنھوں نے ایک موقع پر لکھدیا کہ میر صاحب نے کمتی کا جو لفظ استعمال کیا ہے یہ اراذل اور انفار کی زبان ہے، حالانکہ پایۂ تحقیق کو پہونچ چکا ہے کہ یہ لفظ محلاتِ شاہی میں بولا جاتا تھا۔ بہرحال مولوی صاحب کا یہ فتویٰ ہم کو بھی تسلیم ہے، سوا...... اس فقرہ کے کہ اس طرز میں مرزا دبیر صاحب نے بھی میر انیس کی تقلید کرنی چاہی مگر کلام کا یہ رنگ ہوگیا، اس کے بعد ایک شعر بڑی جستجو کے بعد تلاش کر کے یا خود تصنیف کر کے تحریر کر دیا ہے جو یہ ہے۔ ؎

جب خوں میں بھری فوج کے انبوہ سے نکلی   غل یہ تھا کہ وہ لال پری کوہ سے نکلی

استغفر اللہ۔ نہیں معلوم یہ شعر کس مسخرے کا ہے جو نہایت بیجا اتہام و افترا سے مرزا صاحب کی طرف منسوب کر دیا۔ یہ ٹیپ نہ مطبوعہ ہے نہ قلمی قرنوں میں نظر سے گذری ہے، شاید مؤلف نے خود تصنیف کر کے مرزا صاحب کے نام سے درجِ کتاب کر دی ہے۔

اب ہم مرزا صاحب کے وہ اشعار نقل کرتے ہیں جن میں عشقیہ الفاظ اور تشبیہات کا نہایت خوبی کے ساتھ استعمال فرمایا ہے اور منصف مزاج مولف سے اُنکی نفاست و رنگینی کی داد چاہتے ہیں۔ ان اشعار میں نہ کلام کا اثر جانے پایا ہے نہ ابتذال آیا ہے۔ مثلاً

تلوار	جانے میں شبِ وصل کی ساعت نظر آئی	آنے میں یہ عاشق کی طبیعت نظر آئی
	سب کے گلے سے ملتی تھی، لیکن رُکی ہوئی	جوہر یہ تھے کہ بوجھ سے تھی خود جھکی ہوئی
	آگے بڑھی جو دل پہ یہ قبضہ کیے ہوئے	غل تھا پری وہ اُڑ گئی شیشہ لیے ہوئے
	کیا تیغِ آبدار تھی جوہر سے خوش جمال	منجدھار میں کھڑی تھی پری کھولے سر کے بال
	اُٹھی گری، بلند ہوئی، پست ہو گئی	پی پی کے میکشوں کا لہو مست ہو گئی
	شمشیر بھی غلاف سے باہر نکل پڑی	غُرفہ سے حورِ خلد کھُلے سر نکل پڑی
گھوڑا	سلمائے عجم تھا نہ وہ لیلائے عرب تھا	پر ناز و کرشمہ جسے کہتے ہیں وہ سب تھا

اُردو شاعری میں سلام غزل کا قائم مقام ہے۔ جس طرح غزل میں ہر شعر کا مضمون علیحدہ علیحدہ ہوتا ہے اور تسلسل بیان سے مطلب نہیں رکھا جاتا حتّیٰ کہ دو شعروں کے مضمون میں بھی تسلسل نہیں پایا جاتا، ایک شعر میں زلفِ محبوب کی تعریف ہے تو دوسرے میں ہجر کے مصائب کا ذکر ہے۔ یہی سلام کا بھی حال ہے۔ جس طرح غزلوں میں عشقیہ اور رندانہ مضامین کے علاوہ بعض عام اخلاقی اور تمدنی مضامین بھی نظم کیے جاتے ہیں، اسی طرح سلاموں میں مرثیت سے علیحدہ ہو کر مختلف جذباتِ انسانی مثلاً حسرت و غم۔ صبر و رضا۔ قناعت و توکّل۔ یاس و ناامیدی۔ حبِّ وطن۔ قومی ہمدردی۔ بے ثباتیِ دنیا۔ شکایتِ اربابِ زمانہ۔ یادِ ایّامِ شباب اور اس کے سوا دیگر مختلف مضامین کے اشعار بھی پائے جاتے ہیں جنکو اگر سلام سے علیحدہ کر دیں تو غزل کے اشعار میں مل سکتے ہیں۔ چنانچہ بعض شعرا کے کلام میں سلام کے اشعار ایسے رنگین اور دلچسپ ہوتے ہیں کہ غزل کا لطف حاصل ہو جاتا ہے۔ میر مونس صاحب کو اس طرزِ خاص میں شہرت حاصل ہے، میر انیس صاحب مرحوم کے سلاموں میں بھی ایسے دلچسپ اور رنگین اشعار پائے جاتے ہیں، لیکن مرزا صاحب کے کلام پر ازبسکہ مرثیت کا رنگ ہمیشہ غالب رہتا ہے اسلیے سلاموں میں اُن کی توجہ فقط الفاظ کی سادگی و صفائی اور مضمون کی درد انگیزی پر رہتی ہے۔ اور مرثیت کے مضامین

کے علاوہ عام رنگین مضامین کے اشعار اُن کے سلاموں میں کم ملتے ہیں ۔ اب ہم مرزا صاحب کے دو چار سلام نقل کرتے ہیں ۔

مجرا اُسے مدام جو راہِ رضا میں تھا	خنجر تھا جب گلے پہ وہ شکرِ خدا میں تھا
عابدؑ نے دفن کر کے شہیدوں کو یہ کہا	حصّہ نہ اس مریض کا خاکِ شفا میں تھا
پیاروں کی موت، گھر کی تباہی، عطش کا غم	کیا شاہ پر وفورِ بلا کربلا میں تھا
عبّاسؑ نے بھی خوب نباہی حسینؑ سے	جو عشق ابتدا میں، وہی انتہا میں تھا
اے چرخ کیوں حسینؑ کا خیمہ اُٹھا دیا	دریا تو مہرِ حضرتِ خیر النساؑ میں تھا
افسوس اے دبیرؔ نہ طالع رسا ہوئے	دل اس برس بھی آرزوئے کربلا میں تھا

ایضاً

سلامی خاک ہوا، خاک سے غبار رہوا	ابو تراب کی تربت پہ یوں نثار رہوا
ہجومِ غم میں سلامی جو اشکبار رہوا	ہر ایک تارِ مژہ موتیوں کا ہار رہوا
گلے میں باپ کے باہیں تھیں لاشِ اصغرؑ کی	خزاں ہوا جو وہ گل تو گلے کا ہار رہوا
بلند کیوں نہ ہوا آفتابِ محشر آہ	علیؑ کے لال کا نیزے پہ سر سوار رہوا
ہوئی نہ شمع میسّر جو شہ کی تربت کو	تو داغِ دل ہی چراغِ سرِ مزار رہوا
دبیرؔ سبطِ رسولؐ خدا کے صدقے سے	ترا سلام یہ نایابِ روزگار رہوا

ایضاً

نام پر شاہ کے پانی جو پلا دیتے ہیں	میرِ کوثر انھیں مجرائی دعا دیتے ہیں
فاطمہؑ کہتی ہے دنیا میں یہ آباد رہیں	شہ کا پرسا مجھے سب اہلِ عزا دیتے ہیں
کربلا میں کوئی مدفون اگر ہو تو حسینؑ	خاک کو مرتبۂ خاکِ شفا دیتے ہیں

چشمِ سجادؑ اگر ضعف سے بھی ہوتی ہے بند / اشقیا پاؤں کی زنجیر ہلا دیتے ہیں

بوسہ لیکر لبِ سوفار کا کہتے تھے حسینؑ / بھوک اور پیاس میں کیا تیر مزا دیتے ہیں

دیکھ کر لاشوں کو شہ کہتے تھے، اے پیرِ فلک / یوں کہیں خاک میں گلزار ملا دیتے ہیں

رو کے کہتی تھی سکینہؑ کہ ہمیں قید کیا / لوگ زنداں سے یتیموں کو چھڑا دیتے ہیں

کیا سخی ہیں شہِ دیں بخششِ امت کے لیے / جان بھی دیتے ہیں اور گھر بھی لُٹا دیتے ہیں

یہ سلامِ شہِ مظلوم کہا خوب دبیر / دیکھیں انعام میں مولا مجھے کیا دیتے ہیں

ایضاً

ہے عکسِ گیسو و رخِ اکبرؑ کہاں کہاں / سنبل کہاں کہاں ہے، گلِ تر کہاں کہاں

کوفے میں۔ کربلا میں۔ بقیعہ میں۔ طوس میں / مدفون ہوئے بتولؑ کے دلبر کہاں کہاں

گلزار میں جناں میں۔ ختن میں۔ تتار میں / پھیلی ہے نکہتِ گلِ حیدرؑ کہاں کہاں

گل میں شفق میں۔ لعل میں۔ خورشیدِ صبح میں / ہے رنگِ خونِ کشتۂ خنجر کہاں کہاں

صفین میں جمل میں۔ احد میں۔ تبوک میں / تنہا لڑے ہیں حیدرؑ صفدر کہاں کہاں

فرقِ عدو میں سینے میں۔ جوشن میں زین میں / در آئی ذوالفقارِ دو پیکر کہاں کہاں

بستی میں جنگلوں میں۔ ترائی میں کوہ میں / شہ کو لیے پھرا ہے مقدر کہاں کہاں

غربت میں۔ گھر میں۔ قبر میں۔ محشر میں اے دبیر / آئے مدد کو ساقیِ کوثر کہاں کہاں

ایضاً

بیت جنت میں ملے، نظمِ سلام ایسا ہو / روئیں سب مجرئی، پُردرد کلام ایسا ہو

سرِ شہ نیزہ پہ تھا سارے سروں کے آگے / بعدِ مُردن بھی امامت تھی امام ایسا ہو

لاشہ ہائے شہدا دیکھ کے شہ کہتے تھے / لشکر اک دن میں کسی کا نہ تمام ایسا ہو

ہو گیا نقشِ نگیں مُہرِ نبوت کا حسینؑ — مُہر ایسی ہو نگیں ایسا ہو - نام ایسا ہو

حرؑ جو شبیرؑ پہ صدقے ہوا زینبؑ نے کہا — یا الٰہی مرے بیٹوں کا بھی نام ایسا ہو

بے ردا آلِ نبیؐ! پردے میں ناموسِ یزید!! — خاص کی قدر وہ ہو، رتبۂ عام ایسا ہو!!

زینبِؑ خستہ جگر تھامنے کو آئی رکاب — کیوں فلک بیکس و مظلوم امام، ایسا ہو

ایضاً

مجرئی شہ کو نہ کیوں خلقِ خدا یاد کرے — جو خدا کو تہِ شمشیرِ جفا یاد کرے

مجرئی ہند کو پھر میری بلا یاد کرے — درِ دولت پہ اگر شیرِ خداؑ یاد کرے

کس طرح خاک اُڑا کر نہ دمِ سرد بھرے — باغِ زہراؑ کی خزاں کو جو صبا یاد کرے

اپنے ہر شیعہ سے مولا کی یہ فرمائش ہے — جو پئے پانی، مرا خشک گلا یاد کرے

ق

دیکھ کر چہرۂ اکبرؑ یہ پکارے اعدا — کون یوسفؑ کو حضورِ اسکے بھلا یاد کرے

رُخ ہے وہ گلشنِ قدرت کہ بوقتِ گلگشت — دل عنادل کا نہ اک گُل کی صفا یاد کرے

گر نگہ خضرؑ کی ہو آبِ ذقن سے سیراب — پھر نہ وہ ذائقۂ آبِ بقا یاد کرے

چشم وہ چشم کہ نظّارہ کرے اُسکا اگر — نرگسِ باغِ جناں کو نہ صبا یاد کرے

واہ کیا نور ہے۔ کیا حُسن ہے اللہ اللہ — ایسے بندوں کو نہ کیوں جلد خدا یاد کرے

ایضاً

مجرائی قحطِ آب بھی تھا اور غذا نہ تھی — پر بیچو اس فاقے میں فوجِ خدا نہ تھی

آزار سے گناہ کے ممکن شفا نہ تھی — جز خاکِ پاکِ مجرئی اُس کی دوا نہ تھی

مجرائی کیا غضب ہے کسی کو حیا نہ تھی — بلوے میں سر پہ آلِ نبیؐ کے ردا نہ تھی

تعمیر اس لیے کیا کعبہ خلیلؑ نے — قابل کوئی ولادتِ حیدرؑ کے جا نہ تھی

تشبیہِ اشکِ ماتمِ شہ نے دیا شرف
آ گئے یہ آبروئے دُرِ بے بہا نہ تھی

آئیگی حشر میں لبِ سوفار سے صدا
بانوؑ کے بے زباں کی یارب خطا نہ تھی

ہے ہے طمانچہ شمر نے مارا یتیم کو
رونا یتیم کا تو کچھ ایسی خطا نہ تھی

عابدؑ پکارے گورِ غریباں بنا کے، آہ
بیمار کے نصیب میں خاکِ شفا نہ تھی

رعشہ۔ ورم۔ بخار۔ غشی۔ ضعف۔ دردِ سر
عابدؑ کو اتنے عارضے تھے، اور دوا نہ تھی

ہیہات چوبِ بید سے کھولے لبِ حسینؑ
بے رحم کو یہ دست درازی روا نہ تھی

آئے حسینؑ لاشۂ اکبرؑ پہ کس گھڑی
ساقط تھی نبض، روح بدن سے روانہ تھی

سائل ہوا بخیلوں سے پانی کا وہ کریم
حرفِ طلب سے جس کی زباں آشنا نہ تھی

ہیہات اُسکو شمر نے پہنائیں بیڑیاں
جس ناتواں کو خبرِ دست و پا نہ تھی

پھر اس زمیں میں فکر کروں گا میں اے دبیر
اسوقت اختیار میں طبعِ رسا نہ تھی

ایضاً

حشر میں جوہریِ اشکِ عزادار ملے
مجرئی مول میں قصرِ دُرِ شہوار ملے

شمشیرِ خاتونِ قیامت کی جسے دھار ملے
مجرئی قہر ہے اُس حلق سے تلوار ملے

دی جگہ آبلوں میں تا نہ خلش غیر کو ہو
پائے سجادؑ کو رستے میں جہاں خار ملے

سرِ شہ دیکھا۔ چھڑی ہونٹوں کے اوپر دیکھی
رنج زینبؑ کو نہ کیا کیا سرِ دربار ملے

متفق حبِّ علیؑ پر ہوں جو سب اہلِ جہاں
ایک بھی پھر نہ قیامت میں گنہگار ملے

حشر میں نذرِ غمِ شاہ کا بدلہ ہوا خوب
جسنے یاں اشک دیئے واں دُرِ شہوار ملے

ہند آئی جو محل سے سرِ دربارِ یزید
اک رسن میں کئی سادات گرفتار ملے

کیوں نہ گل چاک گریباں ہو زمیں سے پیدا
خاک میں فاطمۂ زہرا کا جو گلزار ملے

شہدا کہتے تھے قربانِ حسینؑ و عباسؑ	ایسے کس فوج کو سردار و علمدار ملے
شام تک راہ میں عابدؑ کو تمنا یہ رہی	دم میں لیلوں جو کہیں سایۂ دیوار ملے
رن میں بازارِ شہادت جو قضا نے کھولا	سر بکف جنسِ شہادت کے خریدار ملے
دی دعا ماں نے یہ عباسؑ کو ہنگامِ سفر	جا تجھے مرتبۂ جعفرؑ طیار ملے
درِ شہرِ خوابِ اجل کے لیے پاؤں جو دبیرؔ	آنکھ کھل جائے کہ اب طالعِ بیدار ملے

ایضاً

کینہ دلِ مجرائی سرور میں نہیں ہے	یہ آئینہ اقلیمِ سکندر میں نہیں ہے
جو فکرِ سلامِ شہِ صفدر میں نہیں ہے	اے مجرئی خلد اُسکے مقدر میں نہیں ہے
بانوؑ نے کہا شادیِ اکبرؑ کی ہوں مشتاق	ہی دل میں وہ حسرت جو مقدر میں نہیں ہے
اکبرؑ کے سراپا کی ثنا کرتے تھے اعدا	حقا یہ ضیا نیرِ اکبر میں نہیں ہے
کیا نکہتِ رخسار ہی کیا شوکتِ رفتار	وہ گل میں نہیں ہی، یہ صنوبر میں نہیں ہے
سیبِ ذقن و موجِ لبِ خشک کا ثانی	طوبیٰ میں نہیں، چشمۂ کوثر میں نہیں ہے
ہی نامۂ صغراؑ میں جو مضمونِ نقاہت	پرواز کا مقدور کبوتر میں نہیں ہے
زینبؑ نے کہا حرؑ کی ضیافت میں کروں کیا	فاقے کے سوا کچھ بھی مرے گھر میں نہیں ہے
مانگا شہِ مظلوم نے پانی جو دمِ ذبح	قاتل نے کہا آب بھی خنجر میں نہیں ہے
ہی ہائے حسیناؑ کی صدا سنگ زنی میں	اس غم سے شررِ کونسے پتھر میں نہیں ہے

ایضاً

سلامی شاہ کے غم میں جو اشکبار ہوئے	گُہر سے بھی گہرِ اشک آبدار ہوئے
عزیزو! سنگدلی شمر کی، حسینؑ کا صبر	یہ دونوں واقعے دنیا میں یادگار ہوئے

لبِ فرات عجب بیکسی و غربت سے	ق	شہید مسلمؑ بیکس کے گلعذار ہوئے
نہو گا بھائی کا بھائی پہ بعد مرگ یہ پیار		بہے جو نہر میں لاشے تو ہمکنار ہوئے
کھلے جو زخم شہیدوں کے مثلِ باغ جناں		خزاں کے بعد وہ گل غیرتِ بہار ہوئے
ہر ایک دانۂ تسبیح کربلا ہے گواہ		کہ بوترابؑ کے سب لال خاکسار ہوئے
جبین سجدے میں گردنِ تہِ تیغ لب پہ شکر		خدا کی راہ میں شبیرؑ یوں نثار ہوئے
کہیں وہ دن ہو کہ مژدہ سُنے یہ سب سے دبیر		چلو کہ مہدیؑ دیں آج آشکار ہوئے

ایضاً

ہجر ہے سوگوارِ ماہِ حیدرؑ چاندنی	اشک ہیں شبنم بکا کرتی ہے شب بھر چاندنی
ہجر ہے فرشِ نجف سے کب ہو ہمسر چاندنی	چاندنی جھاڑو تو جھڑتی ہے زمیں پر چاندنی
تا کمالِ چاردہ معصوم روشن سب پہ ہو	چودھویں شب کو رہا کرتی ہے شب بھر چاندنی
شمر نے چاہا کہ حضرت سے جدا عباسؑ ہوں	یہ نہ سمجھا چاند سے چھوٹے گی کیونکر چاندنی
مال و زر کا کیا بھروسہ چاہیے فکرِ مآل	فی المثل ہے چار دن کی لے تونگر چاندنی
ابروے ماہِ بنی ہاشم سے روشن تھا جہاں	بدر سے اس ماہِ نو میں تھی فزوں تر چاندنی
خاکساروں کا ہر اک دھبّہ سے دامن پاک ہے	گرد آلودہ نہیں ہوتی زمیں پر چاندنی
بارہا لکھا ہے شب کو حُسنِ رخسارِ حسینؑ	روشنائی میں مرکبؑ کی ہے اکثر چاندنی
ہوتے ہی طالع کیا ماہِ جوانی نے غروب	چار دن بھی دیکھنے پائے نہ اکبرؑ چاندنی
بے سوادوں کو نہیں تمیزِ حسن و قبحِ نظم	جانتا ہے کور سائے کی برابر چاندنی
ہر مہینے دشمنانِ دیں سے ہے سر گرمِ جنگ	چرخ پر رکھتی ہے ماہِ نو کا خنجر چاندنی

؎ اس مقام پر یہ صنعت ہے کہ مرکبّ کے معنی بھی لکھنے کی روشنائی کے ہیں ۱۲ مولف

روضۂ حضرت کے گلشن میں اگر گلچیں بنے
بھر لے دامن میں گلِ خورشیدِ انور چاندنی

روضۂ پرنور مولا میں بچھانی ہے اگر
مہر کے چشمے میں دُھوائے ماہِ انور چاندنی

ایضاً

جو کہ مصروفِ سلامِ شہدا رہتا ہے
گو وہ رہتا نہیں پر نام سدا رہتا ہے

اے فلک بعدِ فنا کاٹے گئے دستِ حسینؑ
اک نہ اک ظلم ترے گھر میں نیا رہتا ہے

شمر کہتا تھا یہی ماں ہے علی اکبرؑ کی
جس کا اک ہاتھ کلیجے پہ دھرا رہتا ہے

ق

رو کے یہ ہند کی بیٹی نے سکینہؑ سے کہا
سر ترا کس لیے ہر وقت کھلا رہتا ہے

وہ لگی کہنے یتیموں کی نشانی ہے یہی
کرتا بے وارثی بچوں کا پھٹا رہتا ہے

باپ مارا گیا، بھائی موئے، زنداں میں پھنسی
اس مصیبت میں بھلا ہوش بجا رہتا ہے

طوفِ کعبہ کا تجھے شوق ہے ازبسکہ دبیر
مضطرب دل صفتِ قبلہ نما رہتا ہے

مؤلف نے میر انیس مرحوم کی چند رباعیاں لکھی ہیں جن میں کوئی اخلاقی مضمون ادا کیا گیا ہے یا کوئی مضمون بندی اور صنعت ہے، اسی طرح مرزا صاحب کی بھی بکثرت رباعیاں ہیں جن میں اُنھوں نے نہایت خوبی اور لطف کے ساتھ نفیس اور دلکش مضامین، اور عقیدت و معرفت و اخلاق کے مطالب نظم کیے ہیں۔ ہر ایک رباعی میں علاوہ خوبیِ مضمون کے صفائی۔ شگفتگی۔ گرمی اور تاثیر پائی جاتی ہے۔ اُن میں سے چند رباعیاں نمونہ کے طور پر یہاں نقل کی جاتی ہیں۔

گھر خلد میں مجلسوں کے جانے سے ملا
ہر چشم کے چشمے سے یہ جاری ہے صدا
قصرِ گہر اشکوں کے بہانے سے ملا
کوثر مردم کو اس بہانے سے ملا

بلبل! یہ زمانہ ایک گُل کا نہ ہوا
بندوں کو عبث خیالِ یکتائی ہے
محکوم ائمہ و رُسُل کا نہ ہوا
اللہ پہ اتّفاق کُل کا نہ ہوا

یارب، ہے ترا حسینؑ آقا میرا
تہلیل ہو جب روح، کروں ذکرِ حسینؑ
ہو دامنِ کربلا مصلّا میرا
ڈھلکے اسی تسبیح میں منکا میرا

مر کر بھی نہ چین زیرِ افلاک ملا
اے خانہ خراب قبر، تیری خاطر
اک تارِ کفن نہ گرد سے پاک ملا
کھویا گو نقدِ جاں بھی، کیا خاک ملا

دریائے ثواب میں تلاطم کیسا
باقی ہے غبار اشکباروں میں دبیر
مجلس میں تاخّر و تقدّم کیسا
ہوتے ہوئے پانی کے تیمّم کیسا

جامع سیپاروں کا جو رحمٰن ہوا
سوپارے مصحف کے ایک سو چودہ ہیں
چودہ معصوموں کا ثنا خواں ہوا
کامل چودہ سے مِل کے قرآن ہوا

پہونچا جو کمال کو وطن سے نکلا
تکمیلِ کمال کی غریبی ہے دلیل
قطرہ جو گہر بنا عدن سے نکلا
پختہ جو ثمر ہوا چمن سے نکلا

کھانے کا مزہ فقط زبانی نکلا
چاہا تھا کہ ہاتھ دھوئیں دنیا سے دبیر
باقی سامانِ عیش فانی نکلا
اتنا بھی نہ اس کنوئیں میں پانی نکلا

پیری سے جو دالِ قد میں خم اور ہوا
سمجھو نہ عصا، سوئے عدم جانے کو
دم تیز روِ ملکِ عدم اور ہوا
دو پاؤں تو تھے۔ ایک قدم اور ہوا

بن ٹھن کے ہزار بار آئی دنیا
جتنا درِ خیبر کو اُٹھایا تھا بلند
پر چشمِ علیؑ میں نہ سمائی دنیا
نظروں سے اسی طرح گرائی دنیا

افضل حیدرؑ کو ہر بشر سے پایا
پہلے تو علیؑ ملے خدا کے گھر سے
ہمنام خدائے بحر و بر سے پایا
پھر ہم نے خدا کو اُن کے گھر سے پایا

رہ جاتا ہوں انگشت بدنداں ہو کر
مانا کہ گہر بخش ہے نیساں بھی، مگر
حیدرؑ کو کہا ابر، سخنداں ہو کر!!
وہ دیتا ہے رُو رُو کے یہ خنداں ہو کر

اندھیر ہے، خیر میں ریا کرتے ہیں
غیروں کو مثالِ روشنی فائدہ ہے
برباد نکوئی کی جزا کرتے ہیں
مانندِ چراغ خود جلا کرتے ہیں

رحمت کا تری امیدوار آیا ہوں
چلنے نہ دیا بارِ گنہ نے پیدل
مُنہ ڈھانپے کفن سے شرمسار آیا ہوں
اسواسطے کاندھوں پہ سوار آیا ہوں

اے تربتِ پاک، دم ترا بھرتے ہیں
کھُل جاتا ہی عشق، آکے انشاءاللہ
کُشتے اکسیر کی ہوس کرتے ہیں
اے خاکِ شفا تجھی پہ ہم مرتے ہیں

پیشِ امرا طالبِ زر جھُکتے ہیں
سنجیدہ ہیں یہ لوگ ترازو کی مثال
سجدے سے سوا مجرے میں سر جھُکتے ہیں
ہے مال جدھر سوا اُدھر جھُکتے ہیں

گنجینۂ حبِ شاہِ دیں ہے دل میں
حاسد کو ہی پیچ و تاب کیوں موج کی شکل
گرد اسکے ولائے مومنیں ہے دل ہیں
یاں مثلِ حباب کچھ نہیں ہے دل ہیں

گھر اپنا اُجاڑ کر بسایا تجھ کو
اے قبر کہاں کہاں نہ کی تیری تلاش
ڈھانپا جو کفن سے مُنہ دکھایا تجھ کو
جب خاک میں مِل گئے تو پایا تجھ کو

احمدؐ نے کہا علیؑ سے ہرجا تم تھے
عرش ایک طرف، پردۂ اسرار سے بھی
معراج میں تا عرشِ معلا تم تھے
یوں آتی تھی آواز کہ گویا تم تھے

کہنے سے اذاں کے دین سب ملتا ہے
اعداد محمدؐ و علیؑ کے گن لو (۹۲ ۱۱۰)
پر نامِ علیؑ نہ لو تو کب ملتا ہے
جب دونوں یہ باہم ہوں تو رب ملتا ہے (۲۰۲)

جو قصر کرے حرص کو قیصر وہ ہے
آئینہ سکندر نے بنایا تو کیا
نکتہ ہے جسے حق پہ تونگر وہ ہے
دل جسکا ہے آئینہ سکندر وہ ہے

معزور ذلیل وخوار ہر چشم میں ہے
سب پر روشن ہی خاکساری کا شرف
اعزاز فروتنی کا ہر چشم میں ہے
سرمہ جو ہوا سنگ تو گھر چشم میں ہے

افسوس مری قدر نہ جاہل سمجھے
معنی ہیں یہی نزاعِ لفظی کے دبیر
سمجھایا، تو نقطۂ مقابل سمجھے
خاموش جو ہم ہوئے تو قائل سمجھے

کم مایہ سبک پیشِ جہاں ہوتا ہے
خوردوں سے تواضع ہی بزرگی کی دلیل
میزاں سے بدیہی یہ عیاں ہوتا ہے
جُھکتا ہے وہ پلہ جو گراں ہوتا ہے

مصرع ہیں مرے نہالِ گلشن کے لیے
ہی باعثِ آزار فروغ اپنا دبیر
اور خار ہیں چشم و دلِ دشمن کے لیے
آفت ہی ہوا کی شمعِ روشن کے لیے

حاصل یہیں نقدِ آرزو ہوتا ہے
جُھکتا ہے جو روسیہ بھی تو مثلِ نگیں
قطرہ دریائے آبرو ہوتا ہے
اُٹھتے اُٹھتے سفید رو ہوتا ہے

اعتراضات بر میر انیس

اعتراضات

یعنی اعتراضات مولّف بر میر انیس

یہ وہ مقام ہی جہاں بڑے بڑے دلچسپ منظر ناظرین کی نگاہ کے سامنے پھر جائینگے اور قابل مولف کی طبیعت کے ذاتی خاصّہ کا بآسانی پتہ چل جائیگا۔ یہاں مولّف نے اپنے ہیرو پر اُسی بیباکی اور قابلِ افسوس جرأت کے ساتھ اعتراضات کیے ہیں جس قابلِ اعتراض دلیری کے ساتھ مرزا صاحب اعلی اللہ مقامہ کی شان میں غیر مہذب الفاظ تحریر کیے ہیں۔ اگرچہ دنیا میں کوئی انسان سہو اور خطا سے خالی نہیں لیکن خطا اور غلطیوں کے بھی مدارج ہوا کرتے ہیں۔ جس مشہور اور جادو نگار انشا پرداز کی قابلیت کو بیشمار تجربوں کے بعد پبلک نے تسلیم کر لیا ہی، اگر اُس کی طرف منسوب کیے ہوئے کلام میں صرف و نحو اور لغت کی معمولی غلطیاں پائی جائیں تو اُن کے تسلیم کرنے میں ایک منصف مزاج اور تجربہ کار مبصّر کو نہایت تامّل ہوگا کہ آیا یہ الفاظ واقعی اُسی شخص کے قلم سے نکلے ہیں یا محرّفین کی عنایت ہے۔ لائق مولف نے میر انیس صاحب کے کلام میں جو غلطیاں بیان کی ہیں وہ اسی قبیل سے ہیں جنکو دیکھکر انیس تو درکنار دبیر بھی بیحد ملول و مکدّر ہو جاتے ہیں۔ افسوس ہی کہ اس موقع پر بھی ہم کو اپنے لائق بزرگ سے اختلاف کرنا پڑا، کیونکہ ہماری انصاف پسند طبیعت

کبھی گوارا نہیں کر سکتی کہ ہم میر انیسؔ جیسے یکتائے زمانہ شاعر کے کلام میں اُن معمولی غلطیوں کے قائل ہو جائیں جبکا ایک نومشق شاعر کے کلام میں بھی نظر آنا ناممکن ہو۔ آپ لکھتے ہیں کہ "میر انیسؔ کے کمال کا میری برابر کوئی معترف نہو گا تاہم میرا یہ دعویٰ نہیں کہ اُن کا کلام فروگذاشتوں اور غلطیوں سے پاک ہے" اگرچہ اس فقرے سے آپ نے اپنے ناظرین کو بھکایا ہے اور اپنی منصف مزاجی (کانشنس کے خلاف) دکھائی ہے لیکن اس میں آپ سے ہم بھی متفق ہیں کہ الانسان مرکب من الخطار والنسیان۔ باایں ہمہ ہمارا یہ دعویٰ ضرور ہے کہ اُن کا کلام ایسی معمولی اور ادنیٰ درجہ کی فروگذاشتوں اور غلطیوں سے ضرور پاک ہے جو آپ نے اُن کے سر تھوپی ہیں۔

اگر خدانخواستہ ان غلطیوں کو مان لیا جائے تو اُنکے کلام کا پایہ بہت گھٹ جاتا ہے حالانکہ ہرگز ایسا نہیں۔ ایسے مشہور اور باکمال شعرا کی غلطیاں اگر ہمارے کانوں میں پہونچیں تو منصفانہ اُصول یہ ہے کہ ہم پہلے غلطیوں کو غور سے دیکھیں اور سوچیں کہ آیا اس رتبہ اور شان کا شخص ان غلطیوں کا مرتکب ہو سکتا ہے یا نہیں، اگر نہیں ہو سکتا تو پھر ہم کو سوچنا چاہیے کہ ان غلطیوں کی کچھ تاویل ممکن ہے یا نہیں۔ یعنی الفاظ میں تحریف اور خلط تو نہیں ہو گیا۔ کاتب کی غلطی تو نہیں۔ اگر یہ تاویلیں ممکن ہوں تو سمجھ لینا چاہیے کہ تحریف یا کاتب نے ظلم کیا ہے اگر یہ تاویلیں بھی ممکن نہوں تو خیال کرنا چاہیے کہ یہ اُسکا کلام نہیں، کیونکہ ایسا باکمال شاعر معمولی اور مضحکہ انگیز غلطیاں ہرگز نہیں کر سکتا۔ ہم کو افسوس ہے کہ میر صاحب کے بارے میں مولف نے باایں ہمہ حسن اعتقاد اس اُصول سے کیوں عدول کیا اور ایسے ہمہ داں اور لاجواب شاعر کی نسبت کیونکر اُنکے پُر اعتقاد دل نے معمولی اعتراضوں کو قبول کر لیا، باوجودیکہ بآسانی اُن کی تاویل ہو سکتی تھی۔ الحق سلامت طبع اور استقامت ذہن جوبجی اور نارسی کی

اعتراضات نساخ بر موءلف

طرف نہ جاے ایک خداداد نعمت ہے ہر شخص کو نہیں مل سکتی ۔

قابل موءلف اس موقع پر پہلے وہ اعتراضات تحریر کرتے ہیں جو عبدالغفور خاں نسّاخ نے میر صاحب پر قائم کیے ہیں اور اُن کو موءلف نے بھی صحیح تسلیم کرلیا ہے، کیونکہ وہ خود آگے چل کر لکھتے ہیں کہ ”ان اعتراضات کے علاوہ نسّاخ نے اور بھی بہت سے اعتراض کیے ہیں، لیکن چونکہ وہ صحیح نہ تھے قلم انداز کیے گئے“ اس سے معلوم ہوا کہ نسّاخ کے جو اعتراضات اُنھوں نے تحریر کیے ہیں وہ اُنکے اعتقاد میں بھی صحیح ہیں ورنہ وہ بھی دوسرے غلط اعتراضوں کی طرح قلم انداز کردیئے جاتے ۔ اب ہم اس موقع پر اُنکے تمام اعتراضات اور پھر اُن کے مفصّل جوابات تحریر کرتے ہیں ۔ وہ لکھتے ہیں

پہلا اعتراض

گویا کہ تھا شبیہ علم سر بسر نشاں		ڈوبا تھا خوں سے پنجۂ پُر نور اور نشاں	

اعتراض ۔ اس شعر میں سربسر کا قافیہ ۔ اور ہے اور یہ بالکل غلط ہے ۔

جواب

جواب ۔ موءلف نے اس اعتراض کو صحیح سمجھ کر درج کتاب کیا ہے ۔ کیا اُن کا اعتقاد سے بھرا ہوا دل قبول کرسکتا ہے کہ جس عالی دماغ اور ہمہ داں شاعر کی مدح سرائی میں اُنھوں نے قلم توڑ دیئے ہیں وہ اتنا بھی نہ جانتا تھا کہ سربسر اور اور کا قافیہ ناجائز ہے ۔ میرے خیال میں ایک طفلِ مکتب بھی ایسی غلطی نہیں کرسکتا ۔ پس یقیناً اصل مصرع پر کمال بیدردی سے تصرّف کی چھُری چلائی گئی ہے ۔ ضرور اصل مصرع یوں ہے ۔ ع

ڈوبا تھا خوں سے پنجۂ پُر نور و زرنشاں ۔ افسوس ہے کہ موءلف کو بایں دعویِ لیاقت کتابت کی غلطی کا بھی علم نہوا اور یہ شعر جائز اعتراضات کے ضمن میں درج کر دیا ۔

دوسرا اعتراض

۲ ۔ اکثر جگہ شائیگاں قافیے ہیں ۔ مثلاً اس بند میں ؎

ایطا یا شائیگاں ۵۰۰

۲ ایطا کو فارسی میں شائیگاں کہتے ہیں ۔ یعنی قافیہ میں کسی کلمہ کی تکرار کہ اُن دونوں کلموں کے ایک معنی ہوں ۔

ناگاہ بڑھی فوج ہوا جنگ کا ساماں		اور گھٹنے لگی طاقتِ جسمِ شہِ مرداں
شہزادے پہ پڑنے لگا جب تیر کا باراں		تلوار علم کرکے کہا یا شہِ مرداں

اسکا جواب مجیب نے تو یہ دیا ہی کہ بجاے شہ مرداں، شہ ذیشاں تھا، لیکن قابل مولّف لکھتے ہیں کہ ”اس قسم کی تاویلات پر اعتبار کرنا مشکل ہی“ گویا اُنکے خیال میں اعتراض صحیح اور جواب غلط ہی۔ گویا میر انیس ایطا کے بھاری سقم سے بھی ناواقف تھے کسقدر زیادتی ہے۔

جواب

جواب - مجیب کا قول صحیح ہی۔ حقیقت میں اس موقع پر میر صاحب کے مرثیہ میں شہِ ذیشاں ہی ہی۔ چنانچہ مدت سے میں نے مختلف مرثیہ خوانوں کی زبان سے ہر مرتبہ شہِ ذیشاں ہی سُنا ہی۔ اور میر صاحب کی مطبوعہ جلد میں بھی شہِ ذیشاں چھپا ہوا[1]، پھر آپ لکھتے ہیں کہ ”اگر ایسا ہی سمجھا جائے تو جہاں جس لفظ پر اعتراض ہو یہ کہدیا جائیگا کہ یوں نہیں یوں تھا“، بیشک جو غلطی ایسی صریح اور فاش ہو کہ ایک نومشق بھی نہ کرسکتا ہو ایسے مواقع پر اگر تاویل کی گنجائش ہو تو ضرور سمجھ لینا چاہیے کہ یہ لفظ مصنّف نے اس طرح نہ کہا ہوگا بلکہ اصل میں یوں ہوگا۔ اکثر چھاپوں کی کتابوں میں بیشمار غلطیاں ہیں مگر کیا وہ مصنّفین کی جانب منسوب ہوسکتی ہیں۔ اگر ایسا ہو تو ایک طوفان بے تمیزی برپا ہو جائے گا۔

نوٹ بقیہ صفحہ ۴۹۹۔ لیکن اگر معنی مختلف ہوں ایطا نہیں ہی بلکہ صنعت تجنیس ہی۔ ایطا یا شائگاں دو قسم کا ہوتا ہی خفی و جلی۔ ایطا خفی یہ ہی کہ تکرار قافیہ کی ظاہر نہ ہو۔ مثلاً آب و گلاب کو اگر ہمقافیہ کریں تو اگرچہ گلاب میں بھی آب موجود ہی مگر وہ گل کے ساتھ ایسا متحد ہوگیا ہی کہ گویا ایک جداگانہ لفظ معلوم ہوتا ہے ایطا جلی وہ ہی کہ اُسمیں تکرار ظاہر ہو جیسے دردمند اور حاجتمند۔ کہ مند کا زائد و مکرر ہونا ظاہر معلوم ہوتا ہے۔

[1] جلد اوّل۔ صفحہ ۳۳۹۔

غلط جواب

پھر آپ نے لکھا ہی کہ ”اس مرثیہ میں تو سرے سے اعتراض ہی غلط ہی۔ کیونکہ شہِ مرداں سے ایک جگہ حضرت امام حسینؑ اور دوسری جگہ حضرت علیؑ مراد ہیں اسلیے قافیہ مکرّر نہیں“ آپکے جواب پر سخت افسوس بلکہ ہنسی آتی ہی۔ باوجود اسلامی تاریخ سے اسقدر ذوق وشوق رکھنے کے ہنوز آپ کو مداحانِ اہلبیتؑ کی اعتقادی اصطلاحات سے بھی اسقدر اجنبیت ہی۔ شاید آپ کا خیال ہوگا کہ جس مقام پر شہِ مرداں سے امام حسینؑ مراد ہیں وہ اپنے لغوی معنوں میں ہی۔ یعنی ”مردوں اور بہادروں کے سردار“ اور جہاں حضرت علیؑ مراد ہیں وہاں جناب امیرؑ کا وصفی لقب ہے جو آپکے واسطے بطور علم مخصوص ہوگیا ہی۔ لیکن یہ تاویل غلط ہی۔ بیشک شہِ مرداں اپنے لغوی معنی بھی رکھتا ہی لیکن یہ وصفی لقب حضرت علیؑ کے واسطے خاص ہوگیا ہے اور ہم لوگ اس لفظ کو سوا جناب امیرؑ کے اور کسی معصوم کے واسطے استعمال نہیں کرتے اسکے علاوہ اور بھی ایسے الفاظ ہیں جو خاص جناب امیرؑ کے واسطے مخصوص سمجھے جاتے ہیں جیسے لفظ امیر المومنینؑ یا مرتضیٰؑ کہ ان کو بھی لغوی معنوں کے لحاظ سے دوسرے شخص پر استعمال نہیں کرتے بلکہ یہ بھی جناب امیرؑ کے مخصوص القاب میں سے ہیں۔ پس ہماری رائے میں جواب بہت صحیح ہی میر صاحب نے یقیناً شہِ ذیشاں فرمایا ہے۔

اعتراض نمبر ۶ حروف تقطیع میں گر جانے کا

۶- پھر فرماتے ہیں کہ اکثر حروف تقطیع میں گر جاتے ہیں اسکے واسطے چند مثالیں بھی دی ہیں۔ لیکن خدا کا شکر ہے کہ اس خطا کو اسوجہ سے معاف کرتے ہیں کہ اساتذہ کے ہاں کثرت سے اس کی مثالیں پائی جاتی ہیں۔ آخر میں قابل مولف تقطیع میں حرفوں کے گرنے کی بحث کو اس فقرہ پر ختم کرتے ہیں کہ ”ان کے سوا اور بہت سی

مثالیں ہیں جنکو تطویل[1] کے لحاظ سے قلم انداز کیا گیا''۔

(جرم اعتراض)

۹ - انہیں اعتراضات کے ضمن میں جنکو قابل مولّف اپنے خیال میں صحیح سمجھتے ہیں ایک یہ ہو کہ میر صاحب نے فرمایا ہو۔ ع اُترا یہ سخن کہہ کے وہ کونین کا عالی ۔ یعنی مولف کے خیال میں یہ میر صاحب کے الفاظ ہیں -

(جواب)

جواب - کونین کا عالی بالکل مہمل اور بے معنی لفظ ہو۔ اور یہ غلطی ایسی بیّن اور کھُلی ہوئی ہو کہ ایک طفلِ مکتب بھی نہیں کرسکتا، چہ جائیکہ میر انیس جیسے یکتاے عصر فاضل کی نسبت ہم ایسا خیال کریں - میر صاحب کی جانب ایسا مہمل لفظ منسوب کرنے سے ہمارا دل تو کانپتا ہو، لیکن مولّف کے دل کو کیا کہیں جنھوں نے باایہمہ حُسنِ اعتقاد یہ مہمل لفظ میر صاحب کی طرف منسوب کردیا۔ حقیقت میں یہ موازنۂ انیس و دبیر کے مولف ہی کا کام تھا ہمارا تو اعتقاد ہو کہ میر صاحب کا مخالف بھی اُن کی شان میں ایسی جرات نہ کرسکتا تھا ہم نے اکثر لوگوں کی زبان سے یہ مرثیہ سُنا ہو اور ہمیشہ کونین کا والی سُنا گیا ہو اور اسی طرح جلد میں بھی طبع ہوا ہو[+]۔ ''کونین کا عالی'' سے ہمارے کان مطلق آشنا نہیں - علاوہ بریں جس بند کے پہلے مصرع میں کونین کا عالی بیان کیا جاتا ہو، اُسکے چوتھے مصرع میں لفظ

(انشا پردازی کی غلطی)

[1] اس مقام پر انشا پردازی کی ایک فاش غلطی قابلِ ملاحظہ ہو۔ لفظِ لحاظ ایسے مقام پر بولا جاتا ہے جہاں کسی کام کے کرنے کا ذکر ہوتا ہے - مثلاً جب قصداً طول دینا منظور ہوتا ہو تو کہتے ہیں ''ہم اس مضمون کو توضیح کے لحاظ سے بہ تفصیل بیان کرتے ہیں''، لیکن جس مقام پر کسی کام کے نہ کرنے کا بیان ہوتا ہو تو وہاں لفظ خوف استعمال کیا جاتا ہو۔ مثلاً جب طول سے بچنا منظور ہوتا ہو تو کہتے ہیں ''یہ مضمون تطویل کے خوف سے قلم انداز کیا گیا''، پس مولّف اس فقرہ کو اس طرح پر کہتے ''جنکو تطویل کے خوف سے قلم انداز کیا گیا'' یا اگر لفظ لحاظ کا استعمال ضروری تھا تو اس طرح لکھتے ''جنکو اختصار کے لحاظ سے قلم انداز کیا گیا''، غور سے دیکھیے تو اُن کا فقرہ یہاں بالکل بے معنی ہو۔ جسکا یہ مطلب ہوا کہ قلم انداز اس لحاظ سے کیا گیا کہ تطویل ضرور رہو -

[+] جلد ۱ - صفحہ ۲۰ -

شہ عالی بار دیگر موجود ہے۔ اس لحاظ سے کہہ سکتے ہیں کہ پہلے مصرع میں عالی نہیں ہوسکتا ورنہ تکرارِ قافیہ لازم آتی ہے۔ ہم اس پورے بند کو نقل کیے دیتے ہیں۔ ناظرین خود فیصلہ کرلیں ؎

اُترا یہ سخن کہہ کے وہ کونین کا والی	خاتم سے نگیں گر گیا زیں ہوگیا خالی
اس دُکھ میں نہ یاور تھے نہ مولا کے موالی	خود ٹیک کے تلوار کو سنبھلے شہِ عالی [1]

میر صاحب نے اس لفظ کو اور بھی چند موقعوں پر استعمال کیا ہے۔ مثلاً ایک موقع پر حضرت عباسؑ کی زبان سے اس طرح ادا کیا ہے ؎

تو بہ کرو یکساں ہوا میں اور شہِ عالی	میں بندۂ ناچیز وہ کونین کا والی [2]

پھر ایک مقام پر فرماتے ہیں ؎

عاشق ہیں سب اُسکے جو ہے کونین کا والی	اثنا عشری۔ پنجتنی۔ شیعۂ غالی [3]

ایک موقع پر رجز میں حضرت علی اکبرؑ کی زبان سے لکھا ہے ؎

فردوس کے مختار ہیں کونین کے والی	ہیں نورِ خدا ہم سے کوئی جا نہیں خالی [4]

بےجا تھا اعتراض

۱۰۔ رنگِ رخِ کفار رعب ہوگیا فق سے

اعتراض۔ رنگ فق سے ہوگیا محاورہ نہیں۔

جواب

جواب۔ رنگ فق سے ہوگیا' اہلِ زبان کا محاورہ ہے۔ بہت سے شاعروں نے یہ محاورہ باندھا ہے۔ میر ضمیر صاحب مرحوم لکھنوی فرماتے ہیں۔ ع رنگِ رخِ ناموسِ نبیؐ ہوگیا فق سے [5]۔

---

[1] ۱/۲۰ [2] ۵/۱۶۲ [3] ۱/۱۰ [4] ۱/۲۲۶ [5] جلد اول میر ضمیر صفحہ ۳۶۵

اعتراضات مولف بر میر انیس

یہانتک وہ اعتراض تھے جو نسّاخ نے کیے ہیں اور مولّف کی رائے میں بھی وہ صحیح تھے ۔ اب نسّاخ کے اعتراضات کے علاوہ مولف خود اپنی طرف سے بھی چند اعتراض قائم کرتے ہیں ۔ چونکہ ہم اپنے اعتقاد میں میر انیس اور مرزا دبیر دونوں صاحبوں کے برابر معتقد اور اُنکے کمالات کے یکساں طور پر قائل و معترف ہیں اسلیے جس طرح ہم نے اُن اعتراضات کو تفصیل کے ساتھ رفع کیا ہی جو مولف نے مرزا صاحب پر لگائے ہیں، اسی طرح اُن اعتراضات کو بھی تفصیل و تشریح کے ساتھ رد کرتے ہیں جو اُنھوں نے میر صاحب پر قائم کیے ہیں تاکہ میر صاحب اعلی اللہ مقامہ جیسے بزرگ اور مقبول مداحِ اہلبیتؑ کی بھی کچھ تھوڑی بہت خدمت کرکے داخلِ ثواب ہوں ۔ سُنا ہی کہ ان اعتراضات کے جوابات مختصر طور پر میر فضل حسین صاحب ثابت لکھنوی بھی حیاتِ دبیر میں لکھ رہے ہیں ۔

پہلا اعتراض

۱ ۔ بُت توڑکے کعبہ کو صفا کردیا کِسنے ۔

اعتراض ۔ صاف کردیا چاہیے ۔

جواب

جواب ۔ لغت میں صفا کے معنی علاوہ صفائی کے' پاک ۔ بے عیب بے کدورت کے بھی ہیں ۔ یہاں یہ مطلب ہے کہ وہ کون ہی جس نے کعبہ کو پاک اور تمام کدورتوں سے صاف کردیا ۔ اس صورت میں مطلب بالکل صاف اور اعتراض غلط ہے صفا کو صاف کے معنوں میں اکثر مستند شعرا نے بلا تکلّف استعمال کیا ہی ۔ جس کی چند نظیریں دی جاتی ہیں ۔

ذوق دہلوی تعریفِ فیل میں ؎

اُس کی خُرطوم ہے گر طرّۂ لیلیٰ کی مثال	توہیں دندانِ صفا ساعدِ سلمیٰ کی صفت

ایضاً

کہ فیل کوہ - گجک تیشہ - فیلباں فرہاد آتش ۱۲	وہ دونوں دانت صفا ایک ایک جوئے شیر[1]

ایضاً - تعریف محبوب میں ؎

سینہ تا ناف صفا - آبِ گہر کا دریا	ناف اک عکسِ ذقن اُس میں بجائے زورق[2]

خواجہ آتش لکھنوی ؎

اک الف قد کے سودے میں ہوا آتش فقیر	چار ابرو کو صفا کرکے قلندر ہو گیا[3]

مرزا داغ دہلوی ؎

آئینہ منہ پہ بھلا اور بُرا کہتا ہے	سچ یہ ہے صاف جو ہوتا ہے صفا کہتا ہے (یعنی صاف کہتا ہے)

رند لکھنوی ؎

صاف کر قلب اتقا کر کے	دیکھ اس آئینے کو صفا کر کے[4]

دیگر ؎

جمالِ دوست کا گر ہے مشاہدہ منظور	صفا رکھ آئینۂ دل کو آرسی کی طرح[4]

شاہ حاتم اُستاد سودا ؎

صفا کر دل کے آئینے کو حاتم	دیکھا چاہے سجن گر آشکارا[5]

مولوی حالی ؎

دھوکا ہنر کا دے کے چھپاتا ہے عیب یہ	اور منہ سے درد کہہ کے دکھاتا ہے وہ صفا[6]

[1] دیوان ذوق ص ۳۶۷ [2] دیوانِ ذوق ص ۳۷۵ ، دیوان آتش ص ۶۳ ، دیوان رند ص ۱۳۵-۱۷۷ ، شاہ حاتم دراجیات ص ۱۱۰ ، دیوان حالی ص ۳۸

اسی طرح میر صاحب مرحوم نے اپنے شعر میں **صفا** کے معنی **صاف** کے لیے ہیں۔ کعبہ اور صفا میں جو مناسبت ہی اُس نے ایک لطف پیدا کر دیا ہے۔

دوسرا اعتراض

۲۔ برخاست کی چراغوں کو پروانگی ہوئی

اعتراض۔ پروانگی غلط ہی۔

جواب

جواب۔ یہاں کوئی تشریح نہیں کہ پروانگی کیوں غلط ہی۔ آیا یہ لفظ ہی غلط ہی یا اسکا محلِ استعمال غلط ہی۔ غور کرنے سے معلوم ہوتا ہی کہ شاید لفظِ پروانگی ہی پر اعتراض ہی۔ اگر ایسا خیال ہو تو بالکل غلط ہی۔ کیونکہ پروانگی بمعنی اجازت اُردو فارسی میں برابر مستعمل ہے۔ شیخ حزیں کا ایک مصرع مشہور ہی۔ ع۔ دریں بزم رہ نیست بیگانہ را۔ اسکے جواب میں مرزا سودا کا مصرع ہی۔ ع کہ پروانگی داد پروانہ را۔

منشی **دلگیر لکھنوی**۔ ع ملی **زینب** سے جو پروانگیِ نالہ و آہ*

تیسرا اعتراض

۳۔ گرتے تھے طیورانِ ہوا کھولے ہوئے پر۔

اعتراض۔ طیور خود جمع ہی اس کی جمع الجمع نہ صحیح ہی نہ مستعمل۔

جواب

جواب۔ جمع الجمع کا استعمال فارسی۔ اُردو میں بہت مروج ہی۔ چنانچہ اس قسم کے الفاظ کی بیحد نظیریں موجود ہیں۔ مثلاً امیر کی جمع امرا۔ اور اُس کی جمع الجمع امرایان بنا کر اہلِ زبان نے استعمال کیا ہی۔ خواجہ ہروی کہتے ہیں ؎

دیں باختہ و ہیچ بکف نامدہ دنیا		ایں حملِ چندے بعبارت امرایاں	

(۲) یا مثلاً امل کی جمع آمال۔ پھر آمال کی جمع آمالہا بنائی گئی ہے۔ مرزا صائب فرماتے ہیں ؎

* دلگیر جلد سوم صفحہ ۳۶۹۔

ہر چند صائب میروم سامانِ نومیدی کنم ۔۔۔ زلفش بدستم میدہد سر رشتۂ اُمّا لہا

(۳) یا مثلاً صورت کی جمع صُوَر - پھر صور کی جمع صورہا استعمال کی گئی ہی حکیم خاقانی تحفۃ العراقین میں لکھتے ہیں ؎

اے رنگ آمیزِ ایں گہرہا ۔۔۔ وے از تو نگارشِ صورہا

قاآنی کا ایک شعر ہے ؎

امامے کز وجودِ او جہاں برپا بود ورنہ ۔۔۔ صورہا بازگشتے جانبِ نفسِ ہیولانی

(۴) یا مثلاً حقیقت کی جمع حقائق اور پھر جمع الجمع حقائقہا لکھتے ہیں- مولوی معنوی فرماتے ہیں ؎

ہنوز از کافِ کفرت آگہی نیست ۔۔۔ حقائقہائے ایماں راچہ دانی

(۵) یا مثلاً واقعہ کی جمع وقائع اور جمع الجمع وقائعہا لکھتے ہیں - مولوی معنوی کا شعر ہی ؎

چو از شانِ نزولت آگہی نیست ۔۔۔ وقائعہائے قرآں راچہ دانی

(۶) یا مثلاً صغیر و کبیر کی جمع صغار و کبار - اور جمع الجمع صغارہا و کبارہا شعرا نے نظم کی ہی- قاآنی لکھتے ہیں ؎

خطیبہا ادیبہا - اریبہا لبیبہا ۔۔۔ قریبہا غریبہا - صغارہا کبارہا

اگر اردو شعرا کی سند بھی مطلوب ہو تو پرانا شاعر صفی دہلوی لکھتا ہی ؎

جاتے ہو تم فقط اغیار کے اقوالوں پر ۔۔۔ غور کرتے نہیں عشاق کے احوالوں پر

اسیر لکھنوی ؎

اک غزل شکوۂ خوباں میں بھی لکھ اور اسیر ۔۔۔ کس لیے درد بہت ہے ترے اشعاروں میں

مولوی شبلی صاحب نعمانی لکھتے ہیں[۱]

ع۔ کہ تم نے وہ مظالم ہائے روز افزوں بھی دیکھے ہیں۔ مظلمہ کی جمع مظالم۔ اور جمع الجمع مظالم ہا۔

ایضاً۔ ع۔ نتائجہائے امیدِ کلید اسٹوں بھی دیکھے ہیں۔ نتیجہ۔ نتائج۔ نتائجہا

ایضاً۔ ع۔ کہ ہم نے وہ مصائبہائے گوناگوں بھی دیکھے ہیں۔ مصیبت۔ مصائب۔ مصائبہا

غیاث میں ہے "بعض اساتذہ لفظ عربی را کہ جمع باشد باز بالف و ہا وہمچنیں بالف و نون جمع کنند"

۴۔ جو خوبیاں کہ چاہییں وہ سب حصول ہیں۔

چوتھا اعتراض

اعتراض۔ حصول کی بجائے حاصل چاہیے۔

جواب

جواب۔ یہ اعتراض بھی غالباً کم نظری کے سبب سے ہے۔ جس طرح اسم فاعل اکثر مصدر کے مقام پر آتا ہے جیسے قم قائماً ای قیاماً۔ اسی طرح مصدر کو اسم فاعل کے معنوں میں استعمال کرتے ہیں جیسے رجلٌ عدلٌ وصومٌ۔ اسی وجہ سے شعرائے مستند نے اکثر **حاصل** کی جگہ **حصول** کا استعمال کیا ہے۔ چنانچہ اساتذہ کے کلام میں اس کی مثالیں پائی جاتی ہیں۔

میر تقی[۲]	ہم ان دنوں نہیں لگ نہیں پڑتے ہیں صبح و شام	ورنہ دعا کریں تو جو چاہیں حصول ہو
سودا[۳]	نوکری میں نہیں کچھ اُس کو حصول	کاٹے ہے میرے حق میں نت گل پھول
درد[۴]	گو بحث کرکے بات بٹھائی پہ کیا حصول	دل سے اٹھا خلاف اگر تو اٹھا سکے
مصحفی[۵]	حصول یہ ہے کہ جب کو تو ال تک قضیہ	گیا ہو ازپئے تہدیدِ شاعرانِ شریر

۱؎ نظم مندرجہ اخبار وکیل ۲ اجولائی ۱۹۱۳ء ۲؎ کلیات میر صفحہ ۹۶ ۳؎ کلیات سودا صفحہ ۱۴۳ ۴؎ دیوان درد صفحہ ۳۰ ۵؎ مصحفی درانجیات صفحہ ۳۰۵

اسیر	ہمسے نافہموں کو گلگشتِ چمن سے کیا حصول	لے زباں سوسن کی سمجھیں نے زبانِ عندلیب
مومن	مومن لے ہرزہ درا نالہ و افغاں سے حصول	ذکر کیا راہ پر آئے فلکِ ناہنجار
ذوق	کٹا کر اپنا سر نوکِ سناں پہ تاج کرتے ہیں	حصول اسطرح عاشق رتبہ معراج کرتے ہیں
آتش	حسن کے نظّارہ سے ہوتی ہی کیفیّت حصول	عشق رکھتا ہی ہمیں بے بادہ گلگوں مست
ناسخ	تقلید سے ہوا شرفِ ذات کب حصول	آئینہ ساز مثلِ سکندر نہو سکے
رند	حصول کچھ نہیں بلبل دُہائی دینے سے	سُنے گا نالوں کو گلچیں نہ باغباں فریاد
داغ	کوئی مراد جو چاہی حصول ہی نہوئی	دعاے مرگ جو مانگی قبول ہی نہوئی
امیر	ہوا ہو کوئی شعر شاید قبول	کہ اُس سے ہو عقبیٰ کی دولت حصول
شیفتہ	فانوسِ شیشہ ولگنِ زر سے کیا حصول	وہ ہی وہاں جہاں نہیں روغن چراغ میں

اب ہم اس کی چند نظیریں مستند مرثیہ گویوں کے کلام سے درج کرتے ہیں۔ میر نفیس صاحب نے جو بڑے ذی علم اور وسیع النظر اور اصولِ فصاحت و بلاغت کے ماہر تھے اور جنکا کلام عیوبِ شاعری سے پاک و صاف نظر آتا ہی، حصول بمعنی حاصل اکثر موقعوں پر لکھا ہی۔ ایک مقام پر فرماتے ہیں ؎

	جتنی لطافتیں ہیں وہ اُن کو حصول ہیں	کیونکر نہوں کہ باغِ محمدؐ کے پھول ہیں
ضمیر	کی عرض دو جہاں کی سعادت حصول ہو	لونڈی کی عرض بھی مرے آقا قبول ہو

حوالہ جات معہ صفحہ۔ دیوان امیر (ص ۴۰)۔ مومن (ص ۳۲)۔ دیوان ذوق (ص ۱۶۶)۔ دیوان آتش (ص ۷۳)۔ دیوان ناسخ (ص ۲۹۱)۔ دیوان رند (ص ۳۹)۔
داغ در نظم شہر آشوب۔ امیر درمحامد خاتم النبیین (ص ۴)۔ شیفتہ درمقدمہ شاعری حالی (ص ۱۵۸)۔ جلد میر نفیس (ص ۲۷۷)۔ میر ضمیر جلد ا (ص ۱۳۵)

فصیح	تیرے کرم سے دولتِ عقبیٰ حصول ہو	دگیر	تم بھی دعا کرو مرا مطلب حصول ہو
تعشق	طوف میں ہوتی ہیں وہ کیفیتیں ساتھ حصول		سنگِ اسود کے نثار اور فدائے کعبہ

اسی طرح اور بھی بہت سے مصدر ہیں جن کو فاعل کے معنوں میں استعمال کیا گیا ہی مثلاً

فوق بمعنی فائق

(۱) فوق بمعنی فائق۔

میر ضمیر	ہی سب پہ فوق حکم ترے باباجان کا	یعنی سب پہ فائق

اظہار بمعنی ظاہر

(۲) یا اظہار بمعنی ظاہر

میر ضمیر	بھائی سے کہا کیجیے احوالِ دل اظہار	ایضاً	تارا سا ہوا پہلوے خورشید میں اظہار
عرفی	ندانم اے فلک انصاف میدہی یا نہ		گر از ہزار جفایت یکے کنم اظہار
قاآنی	چو عاشقے کہ کند رازِ دل بیار اظہار	منیر	کراہت اُسنے کی چہرے سے اظہار

احضار بمعنی حاضر

(۳) یا احضار بمعنی حاضر

قاآنی	شعر من ہمچو عزائم شدہ افسونِ پری		کہ پری وار کند سادہ رخاں را احضار

تواتر بمعنی متواتر

(۴)۔ یا تواتر بمعنی متواتر

میر ضمیر	اتنے میں تواتر یہ خبر لائے خبردار	یعنی متواتر

نمود بمعنی نمودار

(۵) یا نمود بمعنی نمودار

فصیح	کہ یہ زخم اسلیے ہے چہرۂ حیدر پہ نمود	یعنی نمودار

اشکال بمعنی مشکل

(۶) یا اشکال بمعنی مشکل

ذوق	کھینچنی تصویر مجنوں کی تمہے اشکال ہی	یعنی مشکل ہی

+ میرزا فصیح جلد دوم ص ۸ - منشی دلگیر جلد پنجم ص ۲۵ - میر تعشق ۱/۲ میر ضمیر ۱/۳۲ - ایضاً ۱/۲۷۶ - قصائد عرفی ص ۱۷ - کلیات قاآنی ص ۱۲۴ - ایضاً ۱/۳۶۵

کبھی مصدر کو مفعول کے معنوں میں بھی استعمال کرتے ہیں۔

میر نیس	حالت ہی مگر سیدِ مظلوم کی تغییر			یعنی متغیر	
امیر مینائی	کافی ہی فقط خُلق نہیں حاجتِ شمشیر		اقلیمِ دل خَلق اشارے میں ہی تسخیر	یعنی مسخر	
قاآنی	وے زخواندنِ شعرش بخویش کردم رام		بلے بخواندنِ افسون پری شود تسخیر	یعنی مسخر	
۵	واللہ اُس سے زور عیاں لاتعد ہوا		قتل اُسکے ہاتھ سے عمرِ عبدود ہوا		

اعتراض۔ عبدود۔ لاتعد کا قافیہ نہیں ہو سکتا۔

جواب۔ جو شخص معمولی مسائل صرف ونحو اور علمِ لغت سے واقف ہو وہ بھی ایسا مہمل اعتراض نہیں کر سکتا۔ اب ہم مولوی شبلی صاحب جیسے فاضلِ عصر کو چند معمولی باتیں سمجھائے دیتے ہیں۔ سُنیئے۔ عَدّ بالفتح شمردن از باب نصر ینصر۔ لاتُعَدُّ اس باب کا مضارع منفی مجہول ہی۔ اصل میں لاتُعْدَدُ تھا جو بقاعدۂ ادغام لاتُعَدُّ ہو گیا۔ دال کی تشدید اور حرکت اُردو زبان کے استعمال میں حذف کردی گئی ہی۔ جیسا کہ اکثر فارسی دانوں نے عربی الفاظ میں تغیّر کر دیا ہی جسکو تفرّس کہتے ہیں۔ اسکے بہت سے اقسام ہیں منجملہ اُن کے ایک یہ ہی کہ لفظِ مفرد۔ عربی۔ مشدّد الآخر کو اگر فارسی میں بعنوانِ فارسی ذکر کریں تو اُسے بہ تخفیف پڑھتے ہیں مثلاً لاتعدّ۔ غمّ۔ ہمّ۔ حدّ۔ خطّ۔ عوامّ۔ خواصّ۔ قدّ۔ جادّہ۔ ہدیّہ۔ خاصیّہ وغیرہم۔ مگر در صورت ترکیب عربی الاسلوب اصل کلمہ کی رعایت کرنا اور تشدید کو ظاہر کرنا انسب و اولی ہی جیسا عوامّ الناس۔ خواصّ الملوک۔ اب عبدود کو دیکھنا چاہیے۔ وُدّ واؤ کے فتحہ اور ضمّہ دونوں حرکتوں کے ساتھ

صحیح ہی۔ منتہی الارب میں ہی وُد بالفتح وبضم نام بت قوم نوح علیہ السّلام۔ منتخب اللغات میں ہی وُد بالضم والفتح نام بتے۔ صاحبِ غیاث اللغات لکھتے ہیں۔ وَدّ بالفتح و تشدید نام بت قوم نوح علیہ السلام کہ بصورتِ مرد بود۔ اگرچہ اہلِ لغت نے واو کی دونوں حرکتیں صحیح سمجھی ہیں لیکن قرآن مجید میں یہ لفظ صاف طور پر بہ فتح واو ہی آیا ہی جس سے معلوم ہوا کہ واو کے فتح کو ترجیح حاصل ہی۔ سورۂ نوح میں ہی وقالُوا لاتذرُنَّ اٰلِهتکم ولاتذرُنَّ وَدًّا وّلاسُواعًا وّیعوقَ ونسرًا۔ اب فرمائیے کہ لاتُعَدُ اور عبدوَدُ کا قافیہ صحیح ہی یا نہیں۔ شاید مولف کو لاتُعَدُ کے عین کی حرکت۔ یا عبدوُد کے واو کی حرکت میں کچھ مغالطہ ہوگیا۔ سمجھ لیجیے کہ لاتعَدُ کا عین اور عبدوَد کا واوُ دونوں مفتوح ہیں۔

چھٹا اعتراض

۶۔ کرّار ہے وہ شخص نہ غیر فرار ہے

اعتراض۔ فرار بہ تشدید را چاہیے۔

جواب

جواب۔ بیشک فرّار بہ تشدید را صحیح لفظ ہی لیکن شعرا اکثر الفاظ میں تصرّفات کر لیتے ہیں جنکو جائز سمجھا جاتا ہے چنانچہ اکثر مشدّد الفاظ کو مخفف کرلیا ہی مثلاً مشّاطہ کو مشاطہ۔ نظّارہ کو نظارہ۔ نقّارہ کو نقارہ۔ کتّاں کو کتاں۔ دُکّان کو دُکان بھی بولتے ہیں۔ اسی طرح اسکا عکس مثلاً شکر کو شکّر کہنا۔ خیر یہ تو ایک معمولی بات تھی، لیکن تعجب خیز اور مضحکہ انگیز یہ امر ہی کہ قابل مولف کی طبیعت کو اسقدر رسائی نہوئی کہ اس مہمل اور بے معنی مصرع کی غلطی کو سمجھ سکتے۔ افسوس ہی کہ اُنھوں نے بے سوچے سمجھے یہ مہمل مصرع میر صاحب کے نام سے درج کتاب کر دیا۔ گو میر صاحب کی جلد میں اسی طرح چھپا ہی، لیکن مولف اپنے دماغ پر زور دیتے تو معلوم ہو جاتا کہ اس میں تحریف

ہوگئی ہی۔ چونکہ وہ ہمیشہ تحریف شدہ اشعار پر بھی اعتراض کرنے کے عادی ہیں، اور اس موقع پر اُسکے بے معنی ہونے کا کوئی اعتراض قائم نہیں کیا، اسلیے معلوم ہوا کہ اُنھوں نے اسکو بامعنی سمجھ کر درج کیا ہی۔ گویا اُن کی رائے میں سوا لفظ فرّار کے اور کوئی غلطی اس مصرع میں نہیں ہی۔ حالانکہ اگر ہم یہاں لفظ فرار بہ تشدید را بھی مان لیں تو بھی یہ مصرع بالکل مہمل ہی۔ دیکھیے ایک جگہ تو لکھا ہی کہ "وہ شخص کرّار ہی" پھر کہا ہی "نہ غیر فرّار ہی" یعنی "وہ غیر فرّار نہیں ہی" قاعدہ ہی کہ نفی کی نفی اثبات ہوتی ہی۔ جیسے یہ کہیں کہ "فلاں شخص غیر کاتب نہیں ہی" تو اسکے یہ معنی ہونگے کہ وہ کاتب ہے۔ اسی طرح "غیر فرّار نہیں ہی" کے یہ معنی ہوئے کہ وہ فرّار ہے۔ تو یہ مطلب ہوا کہ ایک شخص کرّار بھی ہی اور فرّار بھی، یعنی اُس میں دو صفات متضادہ جمع ہیں۔

یہ مرثیہ جس میں یہ مصرع ہی میر ضمیر صاحب کی جلد میں بھی طبع ہوا ہی۔ اور میر انیس صاحب کی جلد میں بھی، صرف مطلعوں میں فرق ہی۔ میر صاحب کی جلد میں یہ مطلع ہے۔ ع شیرِ خدا کے وصف کہاں تک رقم کروں۔ اور میر ضمیر کی جلد میں مرثیہ اس مطلع سے شروع ہوا ہے۔ ع۔ شفقت علیؑ پہ ختم سخاوت علیؑ پہ ختم۔ باقی تمام بندکیاں ہیں۔ تسلسل بیان اور روانی کلام سے معلوم ہوتا ہی کہ میر انیس کی ابتدائی تصنیف ہی اور میر ضمیر کی جلد میں غلطی سے درج ہوگیا ہی۔ میر ضمیر کی جلد میں یہ مصرع اس طرح چھپا ہی۔ ع کرّار ہی وہ شخص نہ مردِ فرار ہے۔ اور یہی صحیح اور درست معلوم ہوتا ہی اس صورت میں اگر فرار کو بہ تشدید را نہ سمجھیں تو بھی معنی درست ہو جاتے ہیں۔ یعنی وہ شخص کرّار ہی اور مردِ گریز نہیں جیسے مردِ غیب۔ مردِ ہیجا وغیرہ مستعمل ہیں پس یہاں فرار بالکسر مصدر ہی نہ کہ فرّار اسم فاعل مبالغہ کا مخفف۔

۷- عالم کی تغیری پہ بحالی کی ہے آمد-

نواں اعتراض

اعتراض- تغیری صحیح نہیں-

جواب

جواب- یہاں پہ تشریح نہیں کہ تغیری کیوں صحیح نہیں ہے- اگر مولف کا یہ مطلب ہو کہ تغییر بروزن تفعیل بدو یا صحیح لفظ ہے از بسکہ اس میں ایک ی کم ہے اسلیے غلط ہے تو یہ اُن کی علم لغت سے نابلدی ہے- اگرچہ تغییر اصل میں بدو یا بروزن تحریر ہے لیکن اس میں ایک یا کا تخفیف کر دینا جائز ہے- صاحب غیاث لکھتے ہیں "تغییر بکسر یار تحتانی اول- وسکون تحتانی ثانی، بروزن تشریف نہ بروزن فقیر- مگر فارسیاں یک یار ابرائے تخفیف حذف کنند و ایں نوعے از تفرس ہست از چراغ ہدایت و بہار عجم" اور اگر یہ مطلب ہے کہ اُسکے آخر میں ی کا لانا غلط ہے تو یہ بھی صحیح نہیں- کیونکہ مستند شعرائے لفظ تغیری کا استعمال کیا ہے- شیخ مصحفی فرماتے ہیں ؎

تغیری کی مثالیں

تاب و طاقت رہے کیا خاک کہ اعضا کے تئیں		حاکم ضعف سے فرمان تغیری آیا[۱]

میر ضمیر صاحب لکھنوی نے لکھا ہے- ع- واں سب پہ تغیری تھی یہاں سب پہ بحالی[۲]

میر نفیس صاحب لکھنوی خلف میر انیس صاحب مرحوم جنکا شمار مستند شعرا، متاخرین میں ہوتا ہے اور جو علاوہ زبردست کمالات شاعری کے اعلیٰ اوصاف علمی سے بھی متصف تھے، ایک رباعی میں فرماتے ہیں ؎

سامان امیری کا فقیری میں نہیں	انداز بحالی کا تغیری میں نہیں
نے جب تھا کمال کچھ نہ کچھ اب ہے کمال	ہم کیا تھے جوانی میں جو پیری میں نہیں

[۱] آبحیات صفحہ ۲۰۰ [۲] میر ضمیر جلد اول صفحہ ۲۷۵

اس کے علاوہ اور بھی بہت سے الفاظ ہیں جو بغیر یا اور مع یا دونوں طرح مستعمل ہیں۔ مثلاً

(۱) بہبود ۔ وبہبودی ۔ ظہوری ع دل از غمہا بروں آمد نماند امید بہبودی [1]

(۲) یا بیداد اور بیدادی ۔ سودا ۔ ع کس سے اے چرخ کہوں جا کے تری بیدادی

(۳) یا نہاں اور نہانی ۔ قاآنی ۔ ع نے نے کہ درین معجزہ رمزیست نہانی

(۴) یا پنہاں اور پنہانی ۔ قاآنی ؎

بہردو کون قناعت مکن کزین و بروں		ہزار عالم بے منتہاست پنہانی

مومن ۔ ع کھولدے دل میں یہ رازِ نہانی ۔

۸ ۔ اس مژدہ کے سنتے ہی خوشی ہوگئی شیریں ۔

اعتراض ۔ خوش چاہیے ۔

جواب ۔ لفظ خوشی کو خوش کے معنی میں میر صاحب مرحوم نے اسکے علاوہ اور بھی اکثر مقامات پر لکھا ہے ۔ اور دیگر شعرا نے بھی اس معنی میں نظم کیا ہے چند نظیریں دیجاتی ہیں ؎

آتش	بہارِ گلستاں کی ہے آمد آمد		خوشی پھرتے ہیں باغباں کیسے کیسے
نسیم دہلوی	جسطرف دیکھیے دو تین پھڑکتے ہیں اسیر		کیوں نہ صیاد خوشی ہو چمن آباد ہیں سب
میر ضمیر	اے شیر ہے یہ کونسا آئینِ بندگی		تو یاں رہا ترائی کے اندر خوشی خوشی [2]
نصیح	اور تم کو خوشی کرنا واللہ عبادت ہے		

[1] دیوان ظہوری صفحہ ۲۳۰ [2] میر ضمیر جلد اول صفحہ ۲۶۹

رجوع الی الغرض

جواب

دلگیر	خوشی ہو ہو کے وہ کرنے لگی سب گھر کی تیاری

اور بھی اس قسم کے چند الفاظ روزمرّہ کے استعمال میں مستعمل و متداول ہیں۔ مثلاً جلدی بمعنی جلد ہر شخص استعمال کرتا ہے۔

جلدی بمعنی جلد

میرانیس	جلدی نکل چلو یہ ٹھہرنے کی جا نہیں	یعنی جلد نکل چلو
میرضمیر	لو سکینہؑ ہی کو آغوش میں لاؤ جلدی	یعنی جلد

اس کے علاوہ فاضل مؤلف نے میر صاحب مرحوم کی چند معنوی غلطیاں بھی درج کی ہیں جنکو تطویل کے خوف سے قلم انداز کیا گیا۔

میر انیس اور مرزا دبیر کا موازنہ

اس مقام پر بھی قابل مولّف نہایت حسرت کے ساتھ لکھتے ہیں کہ افسوس ملک نے کیوں مرزا دبیر کو میر انیس کا مدِ مقابل بنا دیا۔ میرے خیال میں غالباً مرزا دبیر کا فضل و کمال دیکھ کر ملک نے ایسا فیصلہ کیا ہوگا۔ اگر ملک اور زمانہ بھی آپ کی طرح متعصب اور بے انصاف ہوتا تو شاید ایسا فیصلہ نہ کرتا۔ لیکن زمانہ کسی کے ساتھ بے انصافی نہیں کر سکتا، اور مقبولیتِ عام ایک خداداد بات ہے اس میں رنج و غم کرنے اور تاسّف وقلق کے ساتھ پیچ وتاب کھانے کی کیا ضرورت ہے۔ ہم تو اس امر میں آپ کے شکر گزار ہیں کہ آپ نے بقولِ ملک مرزا صاحب کو میر صاحب کا مدِ مقابل ظاہر کر دیا، ہاں یہ اور بات ہے کہ آپ اپنے سوا تمام دنیا کو نافہم سمجھتے ہیں، تو اسکے فیصلے کی ہم کو ضرورت نہیں، ناظرین خود فیصلہ کر سکتے ہیں کہ ایک شخص کو ملک بھر تو میر انیس کا مدِ مقابل تسلیم کر چکا ہے لیکن مولّف کسی طرح نہیں مانتے، ایسی حالت میں اُنکے فیصلہ کو تسلیم کیا جائے یا تمام دنیا کے فیصلہ کو۔ ایک مورّخ کے واسطے یہ امر نہایت نازیبا ہے کہ وہ طرفداری کے جوش میں آکر تمام دنیا کے خلاف اپنا راگ الگ ہی گائے۔ لیکن یہ عیب مولّف کی تمام تصانیف میں عام ہے کہ وہ جوش اور جذبہ میں ایسے متوالے ہو جاتے ہیں کہ سراسر غلط بیانی اور خلافِ واقعہ ہٹ کرنے پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔

بجز آپ کے آج تک تمام لوگ ان صاحبوں کی نسبت یہ سمجھتے آئے ہیں کہ ع

ہر گلے را رنگ و بوے دیگر ست - اسی وجہ سے آجتک کسی نے ترجیح کے مسئلے کو حل کرنے کی تکلیف نہیں اٹھائی - مگر آپنے فریقین میں چلوانا اور اسی پردہ میں اپنی تالیف بلکہ خود اپنے کو فروغ دینا چاہا ہے - لیکن یاد رہے کہ انیس و دبیر میں ہمیشہ باہم خلوص رہا کبھی شکر رنجی تک نہیں ہوئی تو پھر انکے معتقدوں میں کیوں ہو - میر انیس نے مرزا دبیر کی حیات میں انتقال فرمایا اور مرزا صاحب کو نہایت صدمہ ہوا چنانچہ ایک درد انگیز نظم لکھی جس میں تاریخ وفات کا یہ مادہ لکھا ع طور سینا بے کلیم اللہ منبر بے انیس - اس سے ثابت ہوتا ہی کہ مرزا دبیر کے دل میں میر انیس کی کیسی وقعت تھی - جب بقول آپکے ملک نے دونوں کو مد مقابل تسلیم کرلیا ہی اور پبلک میں دونوں کے کمال کا درجہ ہم پلہ ہی تو آپ موازنہ کے لیے باٹ ترازو کیوں لے بیٹھے - اب وہ لکھتے ہیں کہ مرزا دبیر کے متعلق ہم ہر ایک چیز بہ تفصیل لکھتے ہیں -

فصاحت

مرزا صاحب پر فصاحت کے متعلق اعتراضات

مولف لکھتے ہیں کہ مرزا دبیر کے کلام میں وہ فصاحت و شستگی نہیں جو میر انیس کے کلام میں ہی اسکے یہ اسباب ہیں -

پہلی وجہ ثقیل الفاظ

(۱) مرزا صاحب ثقیل و غریب الفاظ استعمال کرتے ہیں - اس کی چند مثالیں لکھی ہیں - مثلاً

ع - مستدعی شق القمر آکر ہوئے گمراہ -

ع ہر کوہ کی آواز انا الطّور انا الطّور

ع مستجمع جمیع فضائل - ملک سیر

ع بابا نے تو قلم کیے جبرئیل کے سہ پر

اس کے علاوہ اور بھی چند مثالیں دی ہیں -

جواب - یہ الفاظ آپ کو ثقیل معلوم ہوتے ہونگے - لیکن غور کرنا چاہیے کہ ہر قسم کا کلام ایک سانچے میں ڈھلا ہوا نہ کسی شخص کا ہوسکتا ہی نہ ہونا ممکن ہے جن شاعروں کا دائرۂ سخن متعدد مرثیوں یا قصائد تک محدود ہی وہ شاید ان معمولی فروگذاشتوں سے بچ سکتے ہوں لیکن جس شخص کو سیکڑوں واقعات بیان کرنے کی غرض سے بیشمار الفاظ اور جملے استعمال کرنے پڑے ہوں وہ ان مسامحات اور ادنیٰ فروگذاشتوں سے ہرگز بچ نہیں سکتا - جس زمانہ میں صنائع و بدائع کو معراجِ کمال سمجھا جاتا ہو اور لوگ زبان کی صفائی و شستگی پر زیادہ توجہ نہ کرتے ہوں ایسے وقت میں ایک باکمال کے وسیع ذخیرۂ کلام میں سے چند الفاظ تلاش کر لینا تعجب کی بات نہیں ہی - پُرگو شعرا کو جنکے کلام کا ذخیرہ لاکھوں اشعار تک پہونچ گیا ہو ایسی فروگذاشتوں سے بری رکھنا چاہیے -

علاوہ بریں پہلے زمانہ اور زمانۂ حال کے محاورات میں بہت فرق ہوگیا ہی - میر صاحب اور مرزا صاحب دونوں کے کلام میں جسقدر ابتدائی زمانہ کا کلام ہے اُسیقدر اوسط زمانے - اور اُسی قدر کہنہ مشقی کا ہی - دونوں صاحبوں نے اُردو زبان کی پستی اور بلندی کے زمانے دیکھے ہیں، پس ابتدائی کلام میں آجکل کے محاورہ کے خلاف کوئی لفظ آگیا ہو تو ہرگز قابلِ اعتراض نہیں - خیال کرنا چاہیے کہ

مرثیہ گوئی ابتدا میں کیا چیز تھی اور انتہا میں کیا ہوگئی۔ خود مولّف میر انیس کی بابت لکھتے ہیں کہ "میر انیس نے بہتر برس کی عمر پائی اُن کی ابتدائے مشق میں قدیم محاورے اور غلط الفاظ نہایت کثرت سے متداول تھے اور شعرا بے تکلّف اُنکو استعمال کرتے تھے دونوں صاحبوں کی آغاز شاعری کا کنارہ مصحفی۔ انشا۔ جرات وغیرہ سے ملا ہوا تھا اور چونکہ مرزا صاحب میر صاحب سے بہت پہلے کے شاعر ہیں اسلیے پُرانے محاورات کا میر صاحب کے کلام سے زیادہ اُنکے کلام میں پایا جانا قرین قیاس ہی۔ مرزا صاحب جس زمانے میں مرثیہ کہتے تھے اُس زمانہ میں اکثر الفاظ جو آجکل متروک ہیں مروّج تھے اور بہت سے ثقیل الفاظ جائز سمجھے جاتے تھے۔ مثلاً اُدہر ادہر کی جگہ اُدہر ایدہر۔ اونکو کے عوض اون کوں۔ اُن سے کے بدلے اُن سے تی۔ زور کا لفظ بہت کے معنوں میں آئے ہے۔ جائے ہے۔ ٹک۔ بل بے۔ موصوف جمع ہو اور صفت لفظِ ہندی تو موصوف کی مطابقت کے لیے صفت کو جمع بولنا جیسے ع بڑیاں منّت کی بھی پی تو ہمنے بھاریاں۔ فارسی جمع کو بے اضافت یا صفت کے لانا جیسے ع۔ رفتگان کا بھی خیال اے اہلِ عالم چاہیے۔ چنانچہ مرزا صاحب کے ابتدائی کلام میں بھی اس قسم کے الفاظ موجود ہیں۔ پہلے زمانہ میں چومصرع مرثیے کہے جاتے تھے مرزا صاحب کا بھی شروع زمانہ کا ایک چومصرع مرثیہ موجود ہی۔[۱]

پس اوائلِ زمانہ کی تصانیف اور اوسط اور آخر زمانہ کی مشق میں تفریقِ مدارج ہونا لازمی ہی، اور یہی فرق مرزا صاحب کے کلام میں بھی دیکھا جاتا ہی، لیکن مطبع والوں کی بے پروائی نے ہر زمانہ کے کلام کو باہم مخلوط کر دیا۔ کاش تینوں زمانوں کی

---

[۱] موازنہ صفحہ ۲۰۔

الحاق

بہار الگ الگ دکھائی جاتی تو نہایت دلچسپی ہوتی ۔ اور غضب تو یہ ہی کہ صرف اسی ظلم پر اکتفا نہیں کیا بلکہ دوسروں کے کلام کا بھی اُس میں الحاق کر دیا یہی وجہ ہی کہ دوسروں کے ناقص کلام کو مرزا صاحب کا کلام سمجھکر لوگوں کو اعتراض کرنے کا موقع مل گیا ۔

ازبسکہ دونوں صاحبوں کی شاعری کا ابتدائی زمانہ پُرانے شاعروں سے ملا ہوا ہے اسوجہ سے مرزا صاحب کی طرح میر صاحب مرحوم کا ابتدائی کلام بھی چند ثقیل الفاظ سے پاک نہیں ہی، چنانچہ بعض ثقیل الفاظ جو مولّف نے مرزا صاحب کے پُرانے زمانے کے مرثیوں میں سے پیش کیے ہیں وہ بعینہٖ میر انیس صاحب مرحوم کے کلام میں بھی پائے جاتے ہیں ۔ مثلاً

مرزا صاحب ۔ ع ۔ ہر کوہ کی آواز انا الطور انا الطور
میر صاحب ۔ ع ۔ کہتی تھی یہ گیتی کہ انا الطور انا الطور

مرزا صاحب ۔ ع ۔ مستجمع جمیع فضائل ملک سیر
میر صاحب ۔ ع ۔ مستجمع جمیع صفات کمال ہے

مرزا صاحب ۔ ع ۔ بابا نے تو قلم کیے جبریل کے سر پر
میر صاحب ۔ ع ۔ پیہم سہ روز جنگ سے سب نے کیا فرار

چند ثقیل الفاظ میر صاحب کے پُرانے مرثیوں میں اَور بھی پائے جاتے ہیں ۔ مثلاً

ع ۔ جز حق کے نہیں کوئی پرستش کا سزاوار

ع ۔ ہشتاد و سہ بار اُنسے لڑے اہلِ شقاوت

ع ۔ پہونچا خدا کا شیر بمیدانِ کارزار

ع ۔ حیدر نے بہرِ دفع ضرر سر پہ لی سپر

۶ $\frac{1}{214}$ $\frac{6}{8}$ $\frac{2}{31}$

ع۔ تھے جمع واں بہت سے صنا دید بد صفات

ع۔ نیّت سہ روز روزے پہ روزے کی لُسنے کی

ع۔ آنکھیں رمد سے گو کہ نہ کھلتی تھیں مومناں

ع۔ تھاموعلیؑ کے ہاتھ کو جلدی فرشتگاں

ع۔ خوں جوشِ غضب سے ہوئیں چشمانِ منوّر

ع۔ چشمہ ہی یا محیط ہے۔ شط ہی کہ نہر ہے

دوسری وجہ بندش کی سستی

(۲) بندش کی سُستی اور ناہمواری۔ قابلِ مولّف کا قول ہی کہ "بندش کی چستی، ترکیب کی دلاویزی۔ الفاظ کا تناسب اور برجستگی و سلاست مرزا صاحب کے ہاں بہت کم ہیں"

جواب

مرزا صاحب کا نادر اور عالیشان کلام ہم مختلف عنوانات میں گزشتہ اوراق میں بہ تفصیل لکھ چکے ہیں؛ جس سے معلوم ہو سکتا ہی کہ ہر مضمون اور ہر کیفیت کے متعلق اس باکمال شاعر نے فصاحت و بلاغت کے جوہر دکھائے ہیں، اور ایک ایک لفظ گوہر شہوار سے زیادہ درخشاں اور مہر منوّر سے زیادہ پُر نور ہی۔ لیکن لائق مولّف کو یہ انوار ہرگز نظر نہیں آ سکتے۔ مگر اس میں مرزا صاحب کا کیا قصور ہی، کیونکہ یہاں۔ ع چشمۂ آفتاب را چہ گناہ۔ والا مضمون صادق آتا ہی۔ اُنھوں نے اس عنوان کے تحت میں مرزا صاحب کے مرثیوں میں سے چند بند منتخب کیے ہیں جنکو وہ اپنے دعوے کی تائید میں پیش کرتے ہیں۔ لیکن ہر موقع پر اعتراض کی وجہ اور اُسکا سبب اسقدر بے ٹھکانے اور غلط بیان کیا ہی کہ اُن کی سخن فہمی کی قلعی بہت اچھی طرح کھُل جاتی ہی۔ اصل یہ ہی کہ اشعار کی لطافت و خوبی ایک وجدانی شے ہی اور اُسکا سمجھنا ذوقِ صحیح پر منحصر ہی اور اس کی مولّف میں

بہت کمی ہے۔ ان بندوں پر اعتراض کرتے ہوئے بعض مقامات پر نقص کی تشریح کرنے سے اُن کا قلم مجبوراً رُک گیا ہے اور اکثر کہدیا ہے کہ معانی میں بہت کم ربط ہے۔ فلاں مضمون کو فلاں سے کیا نسبت۔ اس لفظ کو اس سے کیا تعلق۔ یہاں اس بات کا کیا موقع ہے احتیاجِ اظہار نہیں۔ خود ہی روشن ہے۔ تشریح کی ضرورت نہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ مولوی شبلی صاحب اُن میں کوئی نقص معلوم نہ کرسکے اور عاجز آکر ایسے الفاظ کہنے لگے کہ خود ہی روشن ہے۔ تشریح کی ضرورت نہیں۔ مولوی اسلم جیراجپوری نے سچ لکھا ہے کہ "مولانا شبلی جب سے اس کوچہ میں آئے ہیں، یعنی موازنہ انیس و دبیر وہ اس امر میں برابر ناکامیاب ہوتے ہیں، جہاں اس قسم کی باریکیاں بیان کرنی ہوتی ہیں وہاں اُن کا قلم رُک جاتا ہے اکثر کہدیتے ہیں کہ احتیاجِ اظہار نہیں۔ خود ہی روشن ہے۔ تشریح کی حاجت نہیں۔ اور جہاں بیان کرتے ہیں مذاقِ صحیح سے بہت دُور جا پڑتے ہیں"۔

چونکہ ایسے موقعوں پر اُنھوں نے صرف اپنی خاص طبیعت اور اپنے خاص مذاق کا اظہار کیا ہے، اسلیے ان مقامات پر ہم خاموشی اختیار کرتے ہیں کیونکہ آپ کا مذاقِ سلیم جو کچھ ہے اُسکو ہم خوب اچھی طرح جانتے ہیں۔ اور جب آپ نے کسی نقص کی کوئی وجہ ہی نہیں لکھی تو اُسکا کیا جواب دیا جاسکتا ہے۔ لیکن جہاں آپ نے اپنی قابلیت کے موافق نقائص کی وجہ بیان کی ہے اُن مقامات پر ہم کچھ لکھنا چاہتے ہیں جس سے ناظرین کو آپ کے ذوقِ سخن فہمی کا اندازہ ہو جائیگا۔ لیکن قبل اسکے کہ ہم اُن اعتراضات کا جواب دیں ایک امر بطورِ تمہید سُن لینا چاہیے۔

مرزا صاحب کے کلام میں ذاکرین اور اہلِ مطابع کی عنایت سے دوسرے لوگوں کا

مولوی اسلم جیراجپوری

تنویر بن اسحاق

۴ رسالہ زمانہ، جون ۱۹۱۰ء

کلام اکثر الحاق ہوگیا ہے۔ ذاکرین نے کبھی مرزا صاحب کے شاگردوں کا کلام اور کبھی خود اپنی تصنیفات سے حسب ضرورت جو چاہا ملا دیا اور مرثیہ بنا لیا۔ بلکہ مصرعے اور بند تو الگ رہے ۔بعض اوقات پورے مرثیے الحاقی پائے جاتے ہیں مثلاً مرزا صاحب کی ایک جلد میں یہ مرثیہ چھپا ہوا ہے۔ ع ۔ ہر آہ علم ہے یہ عزاخانہ ہے کسکا۔ حالانکہ یہ مرثیہ مرزا نظیر مرحوم کا بیان کیا جاتا ہے۔ اس مرثیہ کو ع۔ شاہوں سے کم نہیں ہیں غلامانِ مرتضےٰؑ ۔ اکثر لوگ شیخ گوہر علی مشیر مرحوم کا کہتے ہیں۔ اکثر مقامات پر کاتبوں کی عنایت سے الفاظ بدل گئے ہیں ۔جن کم علم کاتبوں نے اوّل اوّل نقلیں کیں بعض لفظوں کو کچھ کا کچھ سمجھ کر تصرّف کر لیا۔ یہیں سے تحریف کی ابتدا ہوئی پھر نقل در نقل مرثیوں میں اکثر الفاظ تبدیل ہوتے گئے۔ یہی وجہ ہے کہ قلمی مرثیوں میں اور چھاپے کے مرثیوں میں بیحد اختلاف پایا جاتا ہے۔ اور قلمی مرثیے بھی باہمدگر مختلف ہیں۔ ملحقات کی شکایت مرزا صاحب اور میر صاحب دونوں کے خاندان کو یکساں طور پر ہے جیسا کہ بقول مصنّف تطہیر الاوساخ میر نفیس نے اس کی تصدیق کی ہے۔ مولوی شبلی صاحب کے اعتراضات کا اکثر حصّہ انھیں خرابیوں کی وجہ سے ہے۔ اُنھوں نے بندش کی سُستی اور ناہمواری، اور نیز آگے چل کر بلاغت کے موقع پر جو اعتراضات کیے ہیں اُن کا جواب سُننے کے وقت ناظرین ان امور کو بھی پیش نظر رکھیں۔

پہلے غزل گو اور قصائد گو شعرا کو اپنے کلام کی صفائی ۔ترمیم و تنسیخ، اور نظرثانی کا بہت بڑا موقع تھا اور وہ اس طرح کہ طبع کرانے سے پہلے اُسکو دیکھ لیتے تھے، جانچ لیتے تھے۔ اگر زمانہ کی رفتار کسی طرزِ بیان کو جو پہلے مطبوعِ خاص و عام تھا

مرثیہ گویوں کو نظرثانی کا موقع نہ ملا

ناپسندیدہ ثابت کر دیتی تھی تو وہ اُس کی تصحیح کر دیتے تھے یا شعر کو خارج کر دیتے تھے؛
جن باتوں پر نکتہ چینیاں شروع ہو جاتی تھیں وقتِ الطباع اُن پر غور کر لیتے تھے۔ پس
اُن کے کلام کا شائع اور منتشر ہونا اُسوقت سمجھا جاتا تھا جب وہ چھپ کر شائقین کے
ہاتھوں میں آجائے۔ اس سے پہلے اُنکے قابو کی بات تھی۔ برخلاف اسکے مرثیہ گویوں کی
شاعری کی مقبولیتِ عام، قدر دانوں کے جوش، اور کلام کی اشاعت کی ضرورت نے
ان لوگوں کو سخت مشکلات میں ڈال دیا، اور جو بات دوسرے شعرا کے قابو میں تھی
وہ انکے ہاتھ سے نکل گئی۔ یہ لوگ بھی آخر انسان تھے اور سہو و نسیان لازمۂ بشریت ہے
لیکن انکے کلام کا دیگر شعرا کے کلام کی طرح صاف اور پاک ہونا قریب ناممکن کے ہو گیا
کیونکہ ادھر مجلس سے پڑھکر اُٹھے اور اُدھر خفیہ طور پر مرثیہ کی نقلیں تمام ہندوستان
میں پہونچ گئیں۔ ایک نقل کی ہزار نقلیں اور ایک نسخہ کے سیکڑوں نسخے ہو گئے۔
کسی نے طول کلام کو ناپسند کر کے بہت سے بند نکال ڈالے، کسی طباع نے موقع اور
محل کے لحاظ سے اپنی خوانندگی کی ضرورت کے مطابق بیچ میں مطلع لگا دیا، یا ربطِ کلام
کے قائم رکھنے کے لیے مصرعوں میں ادل بدل کر دیا، یا ضرورتاً دوسرے مرثیوں کے
بند لگا لیے۔ نقل در نقل ہونے میں غلطی کتابت سے اکثر جگہ وہ الفاظ آگئے جو شاعر
کے ذہن میں بھی نہ تھے، چنانچہ بعض الفاظ کو جن سے مفہوم شاعر یا مضمون شعر خبط ہو گیا
ہے، قابل مولف نے اعتراض کی نگاہ سے دیکھا ہے، حالانکہ ان الفاظ کا قلمی مرثیوں
میں پتہ بھی نہیں ہے۔

اُسپر غضب یہ ہوا کہ جسقدر ملک نے دونوں باکمال بزرگوں کی قدر کی اُسی قدر اُن کے
خاندان کے ممبروں نے کلام کی تصحیح میں کاہلی سے کام لیا۔ اگر کوئی معتقدان صاحبوں کے

کمالات ظاہر کرنے کی کوشش کرتا ہی اور اُنکے خاندان سے صرف تصحیح کلام کی مدد لینا چاہتا ہی تو نہایت بے توجہی کا برتاؤ کرتے ہیں۔ گویا مرحومین کا کوئی حق اُنکے وارثوں کے ذمے نہیں ہی۔ زمانۂ سلف سے کسی شاعر کا کلام ایسی کس مپرسی اور بے توجہی سے طبع نہیں ہوا جیسا ان دونو بزرگوں کا۔ کاغذ ناقص۔ خط ناکارہ۔ تحریر غلطیوں سے بھری ہوئی کوئی کسی طرح چھاپ رہا ہی۔ کوئی کسی طرح۔ مرزا صاحب کی جلدوں میں کسی مرثیہ میں بیس بند کم کسی میں تیس بند زیادہ، کبھی وہی مرثیہ میر انیس کے نام سے چھپا ہے۔ کہیں میر مونس کے نام سے۔ کہیں میر ضمیر کی جلد میں۔ غرض یہ افسوسناک خرابیاں دونوں صاحبوں کے مرثیوں میں اکثر مقامات پر نظر آتی ہیں۔

مرزا صاحب کے کلام پر اعتراضات کرنے سے قبل مولف لکھتے ہیں کہ "ہم چند بند اُن مرثیوں کے لکھتے ہیں جن میں سے بعض میر انیس کے جواب میں لکھے گئے ہیں" اس سے پہلے آپ لکھ چکے ہیں کہ "باوجود بہت سی جد وجہد کے مجکو یہ معلوم نہوا کہ خاص خاص مرثیے بلکہ خاص خاص بند جو دونوں کے ہاں قریب المعنیٰ پائے جاتے ہیں، اول کسنے کہے اور کسنے جواب لکھا"، لیکن اب کہاں سے وحی آگئی جو فرماتے ہیں کہ "بعض مرثیے میر صاحب کے جواب میں لکھے گئے ہیں" اس متناقض کلام پر افسوس آتا ہی اور مجبوراً زبان سے نکل جاتا ہی کہ ...... را حافظہ نباشد۔

اب ہم تمام اعتراضات کے مفصل جوابات لکھتے ہیں۔

اے دبدبۂ نظم دو عالم کو ہلا دے	اے طنطنۂ طبع جزو کُل کو ملا دے
اے معجزۂ فکر فصاحت کو جلا دے	اے زمزمۂ نطق، بلاغت کا صِلا دے
اے بادۂ بیاں معنیٔ تسخیر کو حل کر	

اے سین سخن قاف سے تا قاف عمل کر

اعتراض (۱) طنطنہ کو جزو کل کے ملا دینے سے کیا نسبت ہے (۲) زمزمۂ نطق سے بلاغت کا صلہ مانگنے کے کیا معنی؟ بیان کی بے کو تسخیر سے کیا خاص تعلق ہے؟ اسی طرح سخن کے سین کو قاف سے تا قاف عمل کرنے کے لیے کیا خصوصیت ہے۔

جواب

جواب ۔ طنطنہ کے معنی ہیں کرّوفر۔ شان و شوکت۔ پس مراد یہ ہے کہ اے پُر زور طبیعت کے کرّوفر۔ ایسے شاندار اور پُر شوکت الفاظ بیان کر کہ زمین و آسمان میں تہلکہ پڑ جائے اور جزو کل میں لرزہ پیدا ہو جائے (۲) زمزمہ سُریلی آواز کو کہتے ہیں۔ نطق کو استعارۃً ایک ذی روح چیز فرض کر لیا ہے اور چونکہ ذی روح میں آواز پیدا ہو سکتی ہے، اسلیے شاعر کہتا ہے کہ اے نطق تو اپنی گویائی سے میرے فصیح و بلیغ اشعار کا صلہ عطا کر، یعنی دادِ سخن دے۔ باقی اعتراضات کی چونکہ کوئی وجہ نہیں لکھی اسلیے ہم بھی اُن سے قطع نظر کرتے ہیں۔

دوسرا اعتراض

بولا علم خامہ فلک پر میں گڑوں گا	سکّے نے ندا دی زرِ انجم پہ پڑوں گا
معنی نے کہا بیت میں آئینہ جڑوں گا	مضمون پکارا میں کسی سے نہ لڑوں گا

بندش یہ کھلی دم میں فصاحت کا بھرونگی
چلّائی طبیعت کہ میں اصلاح کرونگی

اعتراض ۔ چوتھا مصرع گر گیا کیونکہ اوپر کے مصرعوں کی مناسبت سے موقع یہ تھا کہ اس میں بھی ایجابی دعویٰ کیا جاتا۔ مضمون کا نہ لڑنا اگرچہ معنیً تعریف کی بات ہے لیکن یہاں لڑائی سے گریز کرنے کا موقع نہیں۔ اخیر کا شعر خصوصاً اُسکا دوسرا مصرع کسقدر پھس پھسا اور مبتذل ہے۔ طبیعت کے چلّانے کا یہ کیا موقع ہے اور طبیعت کیلیے

چلّانا کتنا ناموزوں لفظ ہے۔

جواب۔ افسوس ہے کہ قابل مولف کی متعصب طبیعت نے اُن کو اس بند کی صنعت و خوبی پر متوجہ نہ ہونے دیا۔ اس میں ایک صنعت ہے جسکا نام تاکید المدح بمایشبہ الذم ہے۔ یعنی تعریف کی ایسے الفاظ سے تاکید کرنا کہ ظاہر میں ہجو پر دال ہوں لیکن فی الحقیقت مدح پر تاکید کرتے ہوں۔ جیسے کہتے ہیں کہ فلاں شخص میں کچھ عیب نہیں ہے مگر یہ کہ ہمیشہ مفلس رہتا ہے بوجہ کثرتِ جود وسخا۔ اول تمام عیبوں کی اُس سے نفی کی۔ پھر "مگر" کا لفظ کہہ کر اُسکو مفلس بتایا جس سے معلوم ہوا کہ اُسکے عیوب بیان کرنے کی طرف متوجہ ہوا کیونکہ مفلسی بھی ظاہراً و عرفاً ایک عیب ہے۔ مگر جب معلوم ہوا کہ مفلسی کثرتِ سخا کی وجہ سے ہے تو یہی مفلسی کمال ہُنر ہوگئی کیونکہ اس سے سخاوت میں اُور مبالغہ پیدا ہوگیا۔

یا جیسے یہ شعر ؎

نہیں ہے مجھ میں بُرائی کچھ اور اسکے سوا		کہ میں بُرا ہوں رقیبوں کی چشمِ بد میں میں

کسی کی آنکھ میں بُرا ہونا عرفاً ایک عیب ہے، لیکن جب معلوم ہوا کہ یہ شخص رقیبوں کی آنکھ میں بُرا ہے تو ثابت ہوگیا کہ واقع میں اچھا ہے، کیونکہ رقیب حسد کی وجہ سے بُرا جانا کرتے ہیں باعتبار نفس الامر کے۔ یا یہ شعر ؎

ترا عدل سارے جہاں پر ہے، لیکن		رہے ہے ترا ظلم دائم ستم پر

دائم ظلم کا رہنا اسلوب ہجو کا ہے لیکن ستم پر ظلم رہنا کمال عدل ہے۔

اسی صنعت میں مرزا صاحب کا یہ بند ہے۔ پہلے عَلمِ خامہ نے کہا کہ میں آسمان پر گڑونگا۔ پھر سکّہ نے کہا کہ میں زرِ انجم پہ پڑونگا۔ لیکن مضمون نے کہا کہ میں کسی سے نہ لڑونگا لڑائی سے گریز کرنا بظاہر ایک امرِ قبیح ہے لیکن جب معلوم ہوا کہ جو

لڑائی سے گریز کرتا ہے وہ مضمون ہی تو ثابت ہو گیا کہ واقع میں اُسکا نہ لڑنا اچھا ہے۔
علاوہ بریں اس بند کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر صفت اپنا اظہار ایک پہلو سے کر رہی ہے۔ مضمون بھی اپنا اظہارِ کمال نہ لڑنے سے کرتا ہے کیونکہ اُسکا لڑنا معیوب ہے۔

تیسرا اعتراض

میں کون ہوں صاحب علم کلکِ جہانگیر	نوبت زنِ بامِ عروجِ فلکِ پیر
تاجِ سرِ لفظ و سخن و معنی و تحریر	خاکِ قدم محتشم و مقبلِ شبیرؑ

اعتراض۔ پہلے تین مصرعوں کا جو انداز ہے چوتھا مصرع اُس سے کس قدر بیگانہ ہے۔

جواب

جواب۔ اس بند میں بھی وہی صنعت تاکید المدح بمایشبہ الذم ہے۔ ایک فصیح و بلیغ شاعر کا، جو ابھی اپنے پرشوکت کلام پر تعلّیاں کر رہا ہے، کسی کا خاکِ قدم ہونا عرفاً عجز و ذلّت پر دلالت کرتا ہے لیکن جب معلوم ہوا کہ وہ محتشم و مقبل جیسے مقبول مداحانِ اہلبیتؑ کا خاکِ قدم ہے تو اُس کی شان و شکوہ میں اَور زیادہ ترقی ہو گئی۔
پہلے تین مصرعوں میں جو شاعرانہ افتخار کیا گیا ہے وہ بوجہ عام شاعری کے ہے۔ چوتھے مصرع میں اُس کی توضیح کر کے بتایا ہے کہ وہ شاعری مدّاحی اہلبیتؑ کی شاعری ہے اور پھر اُس کے رُتبہ کو اَور بڑھاتا ہے کہ میں باوجود ان صفاتِ کاملہ کے محتشم و مقبل مداحانِ اہلبیتؑ کا خاکِ قدم ہوں۔ اور یہی وجہ میری منزلت و قدر کی ہے۔ جسکے ضمناً یہ معنی ہوئے کہ عام شعرا کی شاعری خواہ کتنا ہی اعلیٰ سے اعلیٰ مرتبہ حاصل کرلے باایںہمہ اُسکا درجہ بلحاظِ فضل و شرف مدّاحانِ اہلبیتؑ کی شاعری سے پست اور ادنیٰ ہی رہتا ہے۔

چوتھا اعتراض

مضمون نئے کرتا ہوں ایجاد ہمیشہ	کہتا ہے سخن حضرتِ اُستاد ہمیشہ
کہنے میں ہے تاثیرِ خداداد ہمیشہ	بھولے سے بتادوں تو ہے یاد ہمیشہ

بے لطفِ خدا یہ ہمہ دانی نہیں آتی
پر شمع صفت چرب زبانی نہیں آتی

اعتراض۔ جو چیز خداداد ہے اُسکے لیے ہمیشہ کی قید حشو محض ہے۔ چوتھا مصرع تیسرے مصرع سے بالکل بے تعلق ہے۔ اُستادی کا ذکر دوسرے مصرع میں ہے۔ اور اُس کے ساتھ اس مصرع کو ربط ہو سکتا ہے۔ ٹیپ کے دو مصرع بھی باہم بالکل بے تعلق ہیں۔

جواب۔ بعض نعمتیں خداوندکریم کی طرف سے خاص خاص موقعوں پر عطا کی جاتی ہیں اور پھر لے لیجاتی ہیں، پس یہ کہنا کہ جو چیز خداداد ہے اُسکے لیے ہمیشہ کی قید کی کیا ضرورت ہے کسقدر مہمل خیال ہے۔ قابل مولف کی رائے میں جو چیز ہمیشہ قائم رہتی ہے وہی خداداد ہوتی ہے لیکن جو چیز ہمیشہ قائم نہیں رہتی وہ خداداد نہیں ہوتی بلکہ کسی اور شخص کی عطیہ سمجھی جاتی ہے۔ اگر کوئی شخص ایک خاص وقت تک ذہن و حافظہ میں کامل ہو اور پھر یہ خداداد صفت اُس سے زائل ہو جائے تو کیا یہ کہا جائیگا کہ یہ صفت خداداد نہ تھی کیونکہ خداداد ہوتی تو ہمیشہ قائم رہتی۔ مال و دولت، حشمت و اقبال، صحت و تندرستی ہمیشہ قائم نہیں رہتیں حالانکہ خداداد ہوتی ہیں۔ آپ کی باتیں بھی عجب مضحکہ خیز ہیں۔ اب تیسرے اور چوتھے مصرع کا تعلق سُنیے۔ شاعر کا یہ مطلب ہے کہ تاثیر (جو خداداد عطیہ ہے) ہر وقت میرے کہنے میں رہتی ہے اور کبھی مجھ سے جُدا نہیں ہوتی، اور چونکہ میرا کلام ہمیشہ با اثر ہوتا ہے اسلیے اسی اثر کا سبب ہے کہ جب کبھی کسی کو کچھ بتادیا پھر وہ تمام عمر نہیں بھولا اور جو کچھ بتادیا وہ نقشِ کالحجر ہو گیا۔ اب غور فرمائیے کہ تیسرے اور چوتھے مصرع میں کسقدر تعلق اور ربط ہے۔

ٹیپ کے دونوں مصرعوں کا یہ تعلق ہے کہ خدا کی عنایت و کرم کے بغیر یہ کاملیت اور

ہمہ دانی (جو مجھ میں ہے) حاصل نہیں ہو سکتی، لیکن اس ہمہ دانی اور فضیلت پر بھی میری یہ حالت ہی کہ دوسرے لوگوں کی طرح چرب زبانی و لسانی سے تعلیاں نہیں کیا کرتا۔ نہیں معلوم مولف کی سمجھ ٹیپ کے دونوں مصرعوں کے تعلق کے سمجھنے میں کیوں قاصر رہی۔

مضمونِ تر و تازہ ہی جستی میں یگانا اس دھیان کے آنے سے کرم شاہ کا جا	مبوسِ قلم کار نہ دوں ہے نہ پُرانا خدّامِ ولا بولے کہاں ہاتھ بڑھانا

لے ہدیۂ تائیدِ قدیر ازلی لے
لے خلعتِ تحسینِ حسینؑ ابن علیؑ لے

خیچوان اغرض

اعتراض ۔ پہلے اور دوسرے شعر کی ترکیب اور انداز میں باہم کس قدر تفاوت ہی۔ دوسرا شعر پہلے شعر سے بالکل الگ ہو گیا ہی۔ دوسرے شعر کی بندش ایسی ہی کہ مطلب بھی آسانی سے سمجھ میں نہیں آتا۔ اسکا مشارٌ الیہ کون ہے۔

جواب

جواب ۔ ہمارے خیال میں نہیں آتا کہ پہلے اور دوسرے شعر کی ترکیب اور انداز میں کیا تفاوت ہی۔ یہ بھی نہیں معلوم ہوتا کہ مولف نے ایک کو دوسرے سے کیوں الگ سمجھا ہی۔ مولف کا یہ کہنا کہ "دوسرے شعر کی بندش ایسی ہے کہ مطلب آسانی سے سمجھ میں نہیں آتا" ظاہر کرتا ہی کہ مطلب سمجھ میں تو آتا ہی مگر مشکل سے، خیر یہ بھی غنیمت ہے۔ اسکا مشارٌ الیہ پہلے شعر کا کُل مضمون ہی۔ مطلب شاعر کا یہ ہے کہ میرا مضمون تازگی و چستی میں بے مثل و یگانہ ہی اور ملبوسِ قلم کار[1]، یعنی میری شاعری

[1] یہاں ملبوسِ قلم کار سے اپنی شاعری سے استعارہ فرمایا ہی۔ ازبسکہ شاعری قلم کے ذریعے سے ظاہر ہوتی ہے اسلیے اُسکو ملبوسِ قلم کار کہا۔ ۱۲

نہ تو ادنیٰ درجہ کی ہے نہ پُرانی شاعری۔ میرا رنگِ سخن معمولی رنگ نہیں ہے بلکہ اپنی تازگی۔ چستیِ بندش۔ اور جدّتِ مضامین میں ممتاز ہے۔ جب میں نے اپنے کلام کو اس پایہ کا سمجھا اور مجھے اپنی نازک خیالی۔ قوتِ فکر۔ اور حُسنِ بیان کا دعوےٰ ہوا تو اس دھیان کے آتے ہی یعنی اس خیال کے ساتھ ہی، میرا خیال اس طرف منتقل ہوا کہ میرا جو کچھ بھی سرمایۂ ناز اور پایۂ کمال ہے یہ سب حضرت کے کرم کی بدولت ہے کیونکہ میں اُنکا مدّاح ہوں اور وہ جناب میری تائید فرماتے ہیں۔ اس خیال کے آنے پر جوشِ ولا نے بڑھکر کہا کہ ہاتھ بڑھا اور تائید غیبی اور تحسینِ حسینؑ ابن علیؑ کا خلعت لے۔ اس میں کونسا پیچ تھا جو مولف کی سمجھ میں نہ آیا اور کونسی بے ربطی اور پیچیدگی تھی جس سے اس بند کے معنی سمجھنے میں دقّت واقع ہوئی۔ سوا اسکے اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ ع۔

ہنر بچشمِ عداوت بزرگتر عیبے ست۔

حامی جو سلیمانؑ وہ عالم نظر آئے	مضمون جو عنقا تھے وہ پر جوڑ کر آئے
طاؤسِ تصوّر کی طرح دل میں در آئے	شیشے میں پری زادِ معانی اُتر آئے

یاقوت بدخشاں سے دُر آتے ہیں عدن سے
لعل اُگلوں گا میں طائرِ سدرہ کے دہن سے

بچھلا اعتراض

اعتراض۔ حضرت سلیمانؑ کو عنقا سے کیا تعلق ہے۔ تصوّر کی تشبیہ طاؤس سے کس بنا پر ہے، اور پھر اسکے کیا معنی کہ عنقا ئے مضمون دل میں اس طرح اُتر آئے جس طرح طاؤس تصوّر دل میں اُترآتا ہے، طاؤس دل میں نہیں اُترتا اور اگر تصوّر کے طاؤس ہونے کی بنا پر ہے تو مضمون کا عنقا خود دل میں اُتر سکتا ہے طاؤس کی مشابہت کی کیا ضرورت ہے۔ ٹیپ میں عجب بے ربطی ہے، شاعر لعل اُگلے گا لیکن طائرِ سدرہ کے دہن سے اُگلے گا

اسکے کیا معنی؟ شاید اُگلنے کو اُگلوانے کے معنی میں لیا ہے، یا اپنے آپ کو طائر سدرہ قرار دیا ہے۔

جواب

جواب - سلیمانِ دو عالم سے مراد شاعر کے ممدوح ہیں۔ حضرت **سلیمانؑ** کو جو نسبت دیو و پری۔ وحش۔ و طیور سے ہے وہی تعلق عنقا سے ہے کیونکہ وہ جن۔ و انسان و وحش و طیور سب کے بادشاہ تھے۔ بادشاہ کو جو تعلق اپنی رعایا سے ہوتا ہے وہی حضرت سلیمانؑ کو عنقا سے ہے۔ تصوّر کی تشبیہ طاؤس سے اسی بنا پر ہے جس بنا پر کہ شعرا وہم کی تشبیہ طائر خیال کی مرغ سے۔ نظر کی عنقا سے دیا کرتے ہیں۔ جیسے نلدمن میں فیضی کے اس شعر میں ہے

اے در تگ و پوے تو ز آغاز		عنقاے نظر بلند پرواز	

بہت افسوس ہے کہ مولف کی سمجھ ایسی آسان بات کے سمجھنے سے قاصر رہی کہ عنقائے مضمون دل میں اس طرح اُتر آئے جیسے کہ طاؤسِ تصوّر دل میں اُترآتا ہے۔ اگر جوشِ تعصّب ذرا بھی غور کرنے کی مہلت دیتا تو اس کوتاہی خیال کے اظہار کی نوبت نہ آتی۔ مدعا یہ ہے کہ جو بات مشکل سے مشکل تھی وہ آسان سے آسان طریقہ سے مجکو حاصل ہو گئی۔ اسلیے کہ اوّل تو مضمون جسکا ملنا بہت دشوار اور پھر مضمون کا بھی عنقا، مضمون بڑی مشکل اور محنت سے شاعر کو ملتا ہے اور مضمون بھی وہ مضمون جو عنقا ہو اور کسی کو نہ ملا ہو، کیا ایسے مضمون کا ہاتھ آجانا کوئی آسان بات ہے۔ اب دوسری صورت دیکھیے کہ طاؤس کثیر الحصول پرند، ہر جگہ موجود ہوتا ہے۔ بلند پرواز بھی نہیں کہ اُسکا قابو میں لانا مشکل ہو۔ نایاب بھی نہیں کہ اُس کی تلاش میں سرگردانی کرنی پڑے، پھر اُسپر یہ آسانی کہ تصوّر کا طاؤس کسی شے کا تصوّر دل میں آجانا ایسی آسان بات ہے کہ اُس سے آسان تر کوئی بات ہو نہیں سکتی، حتّیٰ کہ انسان کا دل کبھی تصوّر سے خالی ہی نہیں رہتا۔ تلوار کی تعریف کے ایسے مضامین

جو کسی نے نہیں لکھے انسان کے ذہن میں ایسی آسانی کے ساتھ نہیں آسکتے جیسے کہ تلوار کا تصوّر۔ پس شعر کا یہ مطلب ہوا کہ مضامین کے عنقا جنکا ہاتھ آنا بہت مشکل ہی میرے دل میں اس آسانی کے ساتھ اُتر آئے جیسے طاؤس کا تصوّر۔

ٹیپ میں مطلق بے ربطی نہیں۔ مطلب شاعر کا یہ ہی کہ میں اپنے ذہن سے وہ لعل اُگلوں گا جو طائرِ سدرہ کے ہیں یعنی جو طائر سدرہ کے منہ سے نکلے ہیں۔ یعنی وہ مضامینِ منقبت و فضائل لکھونگا جو حضرت جبریلؑ کی معرفت بذریعۂ وحی نازل ہوئے ہیں۔ اس مصرع کے مخففات کو بریکٹ میں ظاہر کیا جائے تو مطلب معلوم ہو جائیگا۔ یعنی (اپنے) ذہن سے (مدح اہلِ بیتؑ کے وہ) لعل اُگلونگا میں (جو) طائرِ سدرہ کے (منہ سے نکلے تھے) یہ مطلب بھی ہو سکتا ہی کہ فضائلِ اہلبیتؑ کے مضامین مدّاحانِ اہلبیتؑ کے دل میں بذریعۂ روح الامین القا ہوتے ہیں جیسا کہ حضرت ابوعبداللہؑ سے منقول ہی قال ما قال فینا قائلٌ بیت شعر حتّیٰ یوید بروح القدس۔ یعنی حضرت نے فرمایا کہ ہماری منقبت میں شاعر کوئی شعر نہیں کہتا مگر یہ کہ روح القدس (جبریل علیہ السّلام) اُس کی تائید کرتے ہیں۔ پس ان فضائل کے لعل جو میرے دل میں بحیثیتِ مدّاح اہلِ بیتؑ حضرت جبریلؑ نے القا کیے ہیں میں اُن کو اپنی زبان سے ادا کرونگا۔

سانواں اعتراض

کب شعلۂ خس نور کی قندیل کو پہونچے	اُڑ کر نہ مگس طنطنۂ فیل کو پہونچے
پشّہ کا نہ غل صورِ سرافیل کو پہونچے	بلبل نہ لب و لہجۂ جبریلؑ کو پہونچے

ارباب سخن پر جو سخن ور ہے ہمارا
القابِ سخن سنج سخن ور ہے ہمارا

اعتراض بے ربطی کو دیکھو، شعلہ کا مقابلہ قندیل سے نہیں بلکہ قندیل کی روشنی سے ہو سکتا ہی۔ پرواز کو طنطنہ سے کیا نسبت ہی؟ بلبل کو جبریلؑ سے کیا مناسبت ہے لقب کی بجائے القاب باندھا ہے۔

جواب

جواب - نور کی قندیل سے مراد تمام قندیل کا مجموعہ ہی جس میں روشنی وغیرہ سب شامل ہی - جیسے محاورہ میں کہتے ہیں کہ "اس قندیل کی کیا اچھی روشنی ہی" از قبیل اطلاق المظروف علی الظرف - حالانکہ روشنی اور ضو قندیل میں نہیں بلکہ اُس کی شمع میں ہوتی ہی - اور نور کی قندیل تو سراپا نور ہوگی - پس مطلب یہ کہ شعلۂ خس اُس قندیل کو نہیں پہونچ سکتا جو ہمہ تن نور ہی نور ہی اسلیے یہ مصرع بہت درست اور فصیح ہی - مگس لاکھ بلند پروازی اور عروج حاصل کرے لیکن اُس کی بلند پروازی اور شان، کر و فر اور شان و شکوہِ فیل سے کوئی نسبت نہیں رکھتی - بلبل کو جبرئیل سے یہ مناسبت ہے کہ بلبل ایک مشہور و معروف طائر ہی جسکے دلاویز نغمے دلچسپ اور تفریح بخش سمجھے جاتے ہیں اور جبرئیل کو بھی طائرِ سدرہ اور طوطیِ سدرہ وغیرہ کہا جاتا ہی - اسی مناسبت سے شیخ ناسخ کا یہ شعر ہی -

بلبل ہوں بوستانِ جنابِ امیرؑ کا روح القدس ہی نام مرے ہم صفیر کا

لقب کی عوض القاب اسوجہ سے لکھا گیا ہی کہ الفاظ القاب - اسباب - اصول احوال وغیرہم گو جمع ہیں مگر ان کو محاورہ میں مثلِ واحد استعمال کرتے ہیں اور اُنکے واسطے فعلِ واحد لایا جاتا ہی - اس کی چند نظیریں دی جاتی ہیں -

القاب

القاب کی مثالیں

میر تعشق	ملکے دیوار سے بیٹھی نہ رہی ضعف سے تاب	پہلے مد کھینچ کے آغاز کیا پھر القاب
منشی دلگیر	لکھا یہ عرضی میں القاب پھر بشیوۂ شین	جناب قبلۂ کونین و کعبۂ دارین

۱ ۳/۵۴ ۲ ۳/۲۵۵

میر مونس	خط میں القاب کیا سبطِ نبیؐ کو یہ رقم		قبلۂ کون و مکاں پشت و پناہِ عالم[5]
میر نفیس	القاب تھا کہ قبلۂ دیں کعبۂ جہاں		خورشیدِ آسمانِ شرف عیسیِٔ زماں[2]

اسباب کی نظیر

میر انیس۔ آرام کی صورت نہ کوئی زیست کا اسباب۔ سبب کی عوض اسباب باندھا ہے۔

اُصول کی مثال

مولوی شبلی صاحب۔ "واقعات کے بیان میں بلاغت کا ایک بڑا اصول یہ ہے" اصل کی جگہ اُصول باندھا ہے

احوال کی مثالیں

قاآنی	دو سر زلفِ پریشاں را باہم پیوست		یعنی امسالت آشفتہ نگردد احوال
ایضاً	من چناں ساز شعر ساز کنم		کہ دگرگوں شود ورا احوال[3]

میر انیس۔ ع۔ دنیا میں سدا ایک سا رہتا نہیں احوال

ایضاً۔ ع۔ تم لوگوں کے غم کھانے کا کھلتا نہیں احوال

ایضاً۔ ع۔ کھل جائیگا احوال دمِ جنگ تمھارا

ایضاً۔ ع۔ میں کیا کہوں جو ہوتا ہی جو اسدم مرا احوال۔ دیکھو سب جگہ حال کی

---

۱ ۲۷۸/۲ ۲ جلد میر نفیس ۳ کلیاتِ قاآنی صفحہ ۲۲۷ - ۲۲۸ -

احکام

عوض احوال باندھا ہے۔

[میر صاحب ایک موقع پر فرماتے ہیں۔ ناگاہ ہوا نیّرِ اعظم کو یہ احکام۔ حکم کی جگہ احکام

باندھا ہے۔

آداب

[میر انیس۔ ع۔ ناداں تھے جنھوں نے نہ کیا آپ کا آداب۔

[ذوق ~ میں نہ تڑپا جو دمِ ذبح تو باعث یہ تھا — کہ رہا مدِّ نظر عشق کا آداب مجھے[1]

دیکھو دونوں اُستادوں نے ادب کی عوض آداب باندھا ہے۔

عنایات

[میر انیس۔ ع۔ کی ہم سے غریبوں پہ عجب لطف و عنایات۔

[رند۔ ع۔ کب مرے حال پہ ساقی کی عنایات نہ تھی۔ دونوں جگہ عنایت

کی جگہ عنایات لکھا ہے۔

خلاصہ یہ کہ روزمرہ میں جو الفاظ جمع بجائے واحد مستعمل ہیں وہ سب صحیح و فصیح ہیں

اور اسی قبیل سے لفظ القاب ہے۔

اٹھواں اعتراض

سرکار ہے ہر مجلسِ شبیرؑ ہماری آئینہ سکندر پہ ہے تسخیر ہماری		مضموں کی طرح بیت ہے جاگیر ہماری ہے مہرِ سلیمانؑ کی تحریر ہماری

	تنہا مہ و ماہی پہ نہیں سکہ پڑا ہے سورج کا نگینہ بھی انگوٹھی پہ جڑا ہے	

اعتراض۔ بیت کا درجہ مضمون سے کم ہے، کیونکہ بیت کی جو خوبی ہے مضمون

ہی کی وجہ سے ہے۔ اس بنا پر یہ تشبیہ کہ مضمون کی طرح بیت ہماری جاگیر ہے بے معنیٰ ہے

جب مضمون جاگیر ہو چکا تو بیت خود ہی جاگیر ہو گئی۔ ٹیپ کا اخیر مصرع بالکل بے معنیٰ ہے،

پہلے انگوٹھی سے کسی چیز کا استعارہ کرنا تھا، پھر سورج کا نگینہ جڑنا تھا ورنہ ظاہر ہے کہ

[1] دیوان ذوق صفحہ ۲۴۷

ہات میں پہننے کی انگوٹھی پر سورج کا نگینہ جڑنا کسقدر لغو بات ہے۔

جواب۔ اس بند کا مضمون نہایت صاف اور درست ہے صرف سمجھ کا پھیر ہے پہلے شاعر کہتا ہی کہ ہم مضمون آفریں ہیں' اور چونکہ مضمون آفرینی ایک جداگانہ چیز ہے اور بیت یعنی شاعری ایک علیحدہ چیز ہی (کیونکہ مضمون آفریں کے واسطے شاعر ہونا لازمی نہیں ہے) اسلیے وہ کہتا ہی کہ ہم مضمون آفریں ہونے کے علاوہ شاعر بھی ہیں اس لحاظ سے مضمون کی طرح بیت بھی ہماری جاگیر ہی۔ یہ خیال غلط ہی کہ جب مضمون جاگیر ہو چکا تو بیت خود ہی جاگیر ہو جائیگی، کیونکہ ممکن ہے کہ ایک شخص اعلیٰ درجہ کا مضمون آفریں تو ہو لیکن شاعر نہ ہو بلکہ اپنی مضمون آفرینی کو دوسرے پیرایہ مثل نثر نگاری و انشا پردازی وغیرہ میں صرف کرے۔

ٹیپ کا اخیر مصرع بھی درست اور بامعنی ہی اور اعتراض لغو ہی۔ انگوٹھی سے کسی چیز کا استعارہ کرنے کی کوئی ضرورت نہیں شاعر اپنی انگوٹھی کی شان و شوکت ظاہر کرتا ہے کہ وہ ایسی ہی جسکا نگینہ سورج ہی۔ اس قسم کی تشبیہیں اکثر مستعمل ہیں جنکو بخوفِ طوالت قلم انداز کرتے ہیں۔

نواں اعتراض

قابل میں سخن کے ہوں سخن ہی مرے قابل		لیکن سخنِ شہرہ فگن ہی مرے قابل
رضوان کو جنت یہ چمن ہی مرے قابل		موتی کو صدف اور یہ عدن ہے مرے قابل

شہرہ ہی یہ تائیدِ شہِ جن و ملک سے،
مضموں مرا گھر بوجھتے آتے ہیں فلک سے

اعتراض (۱) سخنِ شہرہ فگن نئی ترکیب ہی (۲) رضوان کو جنت' یہ چمن ہے مرے قابل' ناموزوں ترکیب ہے۔ یا تو یوں ہونا چاہیے کہ رضوان کو جنت چاہیئے اور مجکو یہ چمن

یا یوں کہنا تھا کہ رضوان کے قابل جنّت ہے، اور میرے قابل یہ چمن، چوتھے مصرع کی ترکیب کا بھی یہی حال ہے (۳) ٹیپ کے دونوں مصرعے باہم متناقض ہیں، شہرہ بھی انتہا کا ہے اور مضمون کو گھر پوچھنے کی بھی ضرورت ہے، شاید یہ مراد ہو کہ صرف نام مشہور ہو چکا ہے لیکن چونکہ مضامین کو کبھی مرزا صاحب سے روشناسی نہیں ہوئی اور آستانہ مبارک تک پہونچنے کی نوبت نہیں آئی۔ اسلیے گھر کا پتہ پوچھنا پڑا۔

جواب

جواب۔ اگر یہ مان لیا جائے کہ سخن شہرہ فگن نئی ترکیب ہے تو اس میں قباحت کیا ہے۔ کوئی ترکیب خاص اسالیبِ کلام میں منحصر و محدود نہیں ہے، نہ اسکا اختراع اور ایجاد کرنا ممنوع قرار پایا ہے۔ جتنے مرکب الفاظ آج بولے یا لکھے جاتے ہیں جب تلاش کیجے گا تو اوّل اوّل کسی شاعر یا ناثر نے ترکیب دی ہوگی۔ وہی شاعر یا ناثر اُسکا موجد سمجھا جائیگا۔ اگر سخن شہرہ فگن مرزا صاحب نے پہلے پہل نظم فرمایا تو اس کے موجد مرزا صاحب ہوئے۔ سخن۔ شہرہ۔ فگن۔ ان میں سے کوئی لفظ غلط اور بے معنی تو نہیں ہے۔ رہا یہ امر کہ مرزا صاحب نے کیوں اسکو ایجاد کیا تو یہ کوئی ممنوع امر نہیں ہے۔ دیکھو مرزا غالب نے اپنی ایک کتاب کا نام ماہِ نیم ماہ تجویز کیا تھا اور اُن کو اپنی اس ترکیب پر ناز تھا۔ مرزا کہتے تھے کہ چودھویں رات کے چاند کو ماہِ چہاردہ اور ماہِ دوہفتہ تو پہلے لوگوں نے اکثر باندھا ہے مگر جہاںتک مجھے معلوم ہے ماہِ نیم ماہ کسی نے نہیں باندھا۔ یہ ترکیب خاص میری تراشی ہوئی ہے[1]

مرزا غالب کی ایجادیں

ایک موقع پر مولوی حالی صاحب یادگار غالب میں لکھتے ہیں "بعض اسلوب بیان خاص مرزا کے مخترعات میں سے ہیں جو نہ ان سے پہلے اُردو میں دیکھے گئے

[1] یادگار غالب صفحہ ۳۱۔

نہ فارسی میں،، پس اگر سخنِ شہرہ فگن مرزا صاحب کی ایجاد ہو تو اُنکے لیے یہ امر باعثِ فخر و مباہات ہے۔

(۲) رضوان کو جنّت یہ چمن ہے مرے قابل۔ یہ مصرع اس طرح بھی ہو سکتے ہیں۔ اور شاید اسی طرح ہونگے سہوِ کاتب معلوم ہوتا ہی ؎

رضوان کے جنّت یہ چمن ہی مرے قابل		موتی کے صدف اور یہ عدن ہے مرے قابل

یعنی رضوان کے قابل جنت ہی اور یہ چمن میرے قابل ہے۔ اسی طرح موتی کے قابل صدف، اور یہ عدن میرے قابل ہی۔ معتبر ذرائع سے یہ بھی معلوم ہوا ہی کہ یہ چاروں مصرعے مرزا صاحب نے اوّل اوّل لکھے تھے مگر پھر ان کو بدل دیا اور یہ مصرعے فرمائے ؎

مدّاحیِ سلطانِ زمن ہم کو مبارک		رضوان کو جنّت یہ چمن ہم کو مبارک
موتی کو صدف اور یہ عدن ہم کو مبارک		جبرئیلؑ کو وحی اور یہ سخن ہم کو مبارک

شہرہ ہی یہ تائیدِ شہِ جن و ملک سے
مضموں مرا گھر پوچھتے آتے ہیں فلک سے

چنانچہ یہ بند اُس مرثیہ میں جو ۱۸۵۸ء کے قریب مطبع حسینی اثنا عشری میں طبع ہوا تھا اسی طرح چھپا تھا۔ اور قلمی مرثیہ میں بھی یوں ہی موجود ہی۔ واللہ اعلم۔

(۳) تیسرا اعتراض آپ کا یہ ہی کہ جب شہرت ہی تو مضمون کو گھر پوچھنے کی کیا ضرورت ہی یہ کسقدر خلافِ عقل اعتراض ہی۔ آدمی کو جوشِ تعصّب میں اسقدر بھی متوالا اور مدہوش نہ ہو جانا چاہیے کہ معمولی باتیں بھی ذہن میں نہ آئیں۔ کیا شہرت کوئی راہبر ہوتی ہی کہ صاحبِ شہرت کے مکان کا نشان دیتی پھرتی ہے۔

مثلاً آپ ایسے مشہور و معروف شخص ہیں کہ ہندوستان میں کوئی پڑھا لکھا انسان نہو گا جو آپ کو نہ جانتا ہو پس اگر آپ کی شہرت کو سنکر کوئی مدراس کا باشندہ لکھنؤ میں آپ سے ملنے آئے تو اسکو آپ کا درِ دولت پوچھنے کی ضرورت ہوگی یا نہیں - یا محض شہرت کوئی مجسم انسان بنکر آپ کے مکان تک پہونچا دیگی - شاعر کا مطلب یہ ہے کہ عالمِ بالا پر فقط میری ہی شہرت ہی - اس لیے جب مضامین زمین پر آتے ہیں تو شہرت کی وجہ سے اُن کو میرے آستانہ پر پہونچنے کی خواہش ہوتی ہی اور وہ پتہ پوچھ کر مشرّف بزیارت ہوتے ہیں اور چونکہ مضامین نئے نئے ہوتے ہیں اسلیے ہر نئے مضمون کو اسی قسم کی تلاش کرنی پڑتی ہی - اس معمولی بات میں ایسی کیا باریکی تھی جو آپ کی سمجھ میں نہ آئی - یہ ہم مانتے ہیں کہ مرزا صاحب کے اشعار کی لطافت سمجھنے کے واسطے قدرت سے آپ کا دماغ نہیں بنایا لیکن کیا ایسی معمولی باتیں بھی آپ کی سمجھ سے باہر ہوگئیں -

دیوان غزلیات

ہیں وقفِ ہمیشہ مرے الفاظ و معانی
ہر بحر میں ہے بحرِ طبیعت کی روانی

ہاں قلزمِ شیریں کا سبھی پیتے ہیں پانی
ہے زورِ سخن شور پہ موجوں کی زبانی

قطرہ سے مگر بحث میں میں صرف نہیں ہوں
دریا ہوں سخن کا میں تنک ظرف نہیں ہوں

اعتراض - تیسرے مصرع کا مطلب مشکل سے سمجھ میں آسکتا ہی، مقصد یہ ہی کہ زورِ سخن شور پر ہی لیکن اس بات کو میں نہیں کہتا بلکہ موج کی زبان کہتی ہی - بحث میں صرف ہونا کونسا محاورہ ہی - ٹیپ کے دوسرے مصرع میں "میں" کا لفظ محض فضول ہی - پہلے مصرع میں میں کا لفظ آچکا ہی -

جواب

جواب - تیسرے اور چوتھے مصرع کا مطلب یہ ہی کہ میری بحرِ طبیعت کی روانی ہر بحر میں ہی اور اُس بحر کی ہر موج ہمہ تن زبان ہوکر بیان کر رہی ہی کہ بحرِ سخن زور شور سے ہمہ صرف بمعنی مصروف اُردو کے روزمرہ میں مستعمل ہی - میر ضمیر[1] صاحب لکھنوی فرماتے ہیں ع - خدمت میں صرف رہتے ہیں ہر شام و ہر سحر (یعنی مصروف رہتے ہیں -) میں کا لفظ اگر یہاں نہ ہوتا تو بھی معنی میں خلل نہ آسکتا تھا اور اگر حذف نہیں کیا تو بھی کوئی خرابی نہیں ہے - اصل میں وزنِ شعر کی ضرورت سے شاعر کو زائد اور غیر ضروری الفاظ بھی لانے پڑتے ہیں - جیسے میر انیس مرحوم فرماتے ہیں ؎

ماموں پہ فدا ہوتے ہو میں تم پہ فدا ہوں		لو آؤ کہ میں اب تو نہ غصے نہ خفا ہوں

دیکھیے ٹیپ کے دوسرے مصرع میں بھی میں کا لفظ ہی حالانکہ پہلے مصرع میں بھی میں کا لفظ آچکا ہی - دیگر ؎

عشقِ رخسار میں رُتبہ ترا گھٹ جائیگا		منہ پہ کہتا ہوں کہ چہرہ ترا کٹ جائیگا

دوسرے مصرع میں ترا کا لفظ زائد ہی اسی طرح اور بھی بہت سی اس قسم کی مثالیں میر صاحب اور مرزا صاحب اور تمام شعرا کے یہاں مل سکتی ہیں -

بجا بولی اعتراض

خامہ ہے فروتن مرا افراطِ ادب سے نخوت کے معانی ہیں الگ لفظوں کے لب سے		جھک کر شمہ فا اور بجا ملتے ہیں سب سے جس طرح سے بد اصل جُدا نیک نسب سے

دشمن سے بھی ہم قطع نہیں کرتے حیا کو
مانندِ غبار اُٹھتے ہیں تعظیم ہوا کو

اعتراض - پہلے مصرع میں انکساری اور خاکساری کے بجائے ادب کہا ہی

[1] میر ضمیر $\frac{1}{35}$

حالانکہ دونوں میں بہت فرق ہی۔ تیسرے مصرع کی ترکیب اور لفظ کے لب کا استعارہ سابق ولاحق کی سادگی وصفائی سے نہایت بیگانہ ہی۔

جواب

جواب۔ ادب ایک جامع لفظ ہی جس میں تمام محاسنِ اخلاق مع خاکساری اور فروتنی کے شامل ہیں۔ منتہی الارب میں ہی۔ ادب نگاہداشت حدِ ہر چیز۔ منتخب اللغات میں ہی۔ ادب طورِ پسندیدہ و نگاہداشت حدِ ہر چیزے۔

پس ادب کا لفظ بھی اُسی معنی میں سمجھنا چاہیے۔ مصنفؒ نے افراطِ ادب فرمایا ہی جو عین انکسار ہی بلکہ انکساری وخاکساری دونوں سے یہ لفظ بہتر ہی۔ بند کے چھئوں مصرعے ایک ہی حالت اور ایک ہی انداز کے کسی شاعر کے کلام میں نہیں دیکھے گئے۔ یہ عجب مشکل ہی کہ مولف کی راے میں اگر آسان اور سلیس ہوں تو چھئوں مصرع آسان ہوں اور مشکل و دقیق ہوں تو چھئوں مصرعے مشکل ہی ہوں

بارہواں اعتراض

شیریں سخنی کا ہنر اکبرؑ سے لیا ہے		اس ذرہ میں سب مہرِ حسینیؑ کی ضیا ہے

بے مہریِ افلاک سے گو خاک بسر ہوں
ہاں عیب بڑا یہ ہے کہ میں اہلِ ہنر ہوں

اعتراض۔ گو خاک بسر ہوں کا جواب' ہاں عیب بڑا یہ ہی' کسقدر بے جوڑ ہی میں کا لفظ بالکل حشو ہی۔

جواب

جواب۔ ٹیپ کے پہلے مصرع میں گو کا لفظ غلط ہی۔ کاتبوں کی غلطی سے کیوں کا گو ہو گیا ہی۔ چنانچہ میرے پاس جو قلمی مرثیہ ہی اُس میں "کیوں خاک بسر ہوں" لکھا ہوا ہی۔ پس اصل میں یہ شعر اس طرح پر ہی ؎

بے مہری افلاک سے کیوں خاک بسر ہوں		ہاں عیب بڑا یہ ہی کہ میں اہلِ ہنر ہوں

اب مطلب بالکل صاف ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ حضرت علی اکبرؑ علیہ السلام نہایت شیریں سخن تھے پس میں نے شیریں سخنی کا ہنر اُنھیں سے لیا ہے، اور اس ذرہ میں تمام مہر حسینیؑ (حضرت علی اکبرؑ) کی روشنی ہے۔ لیکن (باوجود اس ہنر کے بھی) افلاک کی بے مہری سے کیوں خاک بسر ہوں؟ اس استفہام کا جواب شاعر خود دوسرے مصرع میں دیتا ہے کہ یہ خاک بسری اسوجہ سے ہے کہ مجھ میں اہل ہنر ہونے کا عیب ہے۔ اور اہل ہنر ہمیشہ مبتلائے مصائب و آلام رہا کرتے ہیں۔ رہا میں کا حشو یہ آپ کی سمجھ کی غلطی ہے ورنہ میں کا لفظ بالکل حشو نہیں بلکہ وہ فاعل ہے۔ پہلے مصرع میں لفظ میں موجود نہیں کہ دوسرے مصرع کے میں کو حشو سمجھا جائے۔ دونوں مصرعوں میں سے ایک مصرع میں میں کا ہونا بہت ضروری ہے بالکل اسی قسم کی ٹیپ میر صاحب مرحوم کی لکھتا ہوں ؎

رُلواؤں گا لحد میں جنابِ بتولؑ کو | پیاسا کرونگا ذبح میں سبطِ رسولؐ کو

کیا اس بیت میں بھی آپ میں کے لفظ کو حشو فرمائینگے۔ ہرگز نہیں یہاں بھی وہ فاعل ہے۔ میر صاحب مغفور کا ایک دوسرا شعر ہے ؎

میں اپنے ساتھ تجھے لے کے جاؤنگا | تیری خطا حسینؑ سے میں بخشواؤنگا

بیسواں اعتراض

بیہوش ہے بجلی یہ سمند اُن کا ہے ہشیار | خوابیدہ ہیں سب طالعِ عباسؑ ہے بیدار
پوشیدہ ہے خورشید علم اُن کا نمودار | بے نور ہے منہ چاند کا رُخ انکا ضیابار

سب جزو ہیں کل رتبہ میں کہلاتے ہیں عباسؑ
کونین پیادہ ہے سوار آتے ہیں عباسؑ

اعتراض۔ یہ بند اوپر کے بند سے دفعتہً اسقدر بے تعلق ہوگیا ہے کہ مطلب سمجھنا

متسکل ہی۔ اُن کا مشار الیہ حضرت عبّاسؑ ہیں لیکن چونکہ حضرت عباسؑ کا ذکر پہلے بندوں میں آیا تھا۔ جس سے تین بندوں کا فاصلہ ہے اسلیے ذہن اسطرف جلدی منتقل نہیں ہوتا۔ مضمون کی بے ربطی کی یہ کیفیت ہے کہ ایک طرف تو ہل چل کی وجہ سے بجلی کو بیہوش قرار دیا ہی۔ دوسری طرف فرماتے ہیں کہ سب خوابیدہ ہیں۔ ٹیپ کی بندش کی سُستی خود ظاہر ہے۔

جواب۔ واقعی یہ مرزا صاحب کی کرامت ہے کہ اُن پر بیجا اعتراض کرنے سے آپ کا ذہن اسقدر مختل ہوگیا ہی کہ جو اعتراض کرتے ہیں وہ مہمل اور بے سروپا ہوتا ہے جب تمام مرثیہ حضرت عباسؑ کے حال میں ہے تو باوجود تین بندوں کے فاصلے کے آپ کو سمجھ لینا چاہیے کہ "اُن" کا مشار الیہ حضرت عباسؑ ہیں۔ کم سے کم آپ کے ذہنِ ثاقب میں اسقدر جودت تو ضرور ہونی چاہیے کہ ایسی معمولی باتوں کی جانب جلد منتقل ہو جائے۔ ورنہ مرزا صاحب نے کچھ اس بات کا ٹھیکہ نہیں لیا ہی کہ آپ ایسے عالی فہم لوگ بھی اُن کا کلام سمجھیں۔ اسکے علاوہ ممکن ہے کہ پہلے دو مصرعوں میں اُلٹ پھیر ہو گیا ہو اور اصل میں اس طرح پر ہوں۔

خوابیدہ ہیں سب طالعِ عباسؑ ہی بیدار		بیہوش ہے بجلی یہ سمند اُن کا ہی ہشیار

اب اُن کا مشار الیہ حضرت عباسؑ ہو گئے۔ لیکن اگر بحیثیتِ موجودہ بھی دیکھا جاوے تو بھی کچھ عیب نہیں۔ کیونکہ علاوہ اس کے کہ یہ مرثیہ حضرت عباسؑ کے حال میں ہی۔ دوسرے مصرع میں حضرت عباسؑ کا نام موجود ہے اور اضمار قبل الذکر ممنوع نہیں۔ فارسی اُردو میں برابر اس کی مثالیں موجود ہیں۔

جس امر کو آپ نے بے ربطی قرار دیا ہے وہ غلط ہے۔ بجلی کے بیہوش ہونے اور سب کے خوابیدہ ہونے کو آپ باہم ملائے کیوں دیتے ہیں۔ ہر مضمون علحدہ علحدہ مصرعوں سے تعلق رکھتا ہے۔ پہلے مصرع کا یہ مطلب ہے کہ رعب داب کی وجہ سے بجلی بیہوش ہے۔ حضرت عباسؑ کا طالع بیدار ہے۔ اسکے سوا سب خوابیدہ ہیں۔ خورشید پوشیدہ ہے مگر انکا علم نمودار ہے۔ چاند بے نور ہے۔ مگر ان کا رخ، روشن و منور ہے۔ غرض ہر مصرع اپنے اپنے الگ الگ معانی رکھتا ہے اور ان میں جو محاسن ہیں وہ قدر شناسانِ سخن پر مخفی نہیں۔

تعقید قابل مولف کی رائے میں مرزا صاحب کے کلام میں فصاحت نہونے کی تیسری وجہ تعقید ہے۔ اس بحث میں اُنھوں نے اپنے دعوے کی تائید میں جو مثالیں لکھی گئے ہیں وہ نہایت مضحکہ خیز ہیں۔ ان اشعار میں اکثر الفاظ یا تو کتابت کی غلطی کی وجہ سے بدل ہیں۔ یا مولف نے قصداً اُن کو مسخ کر دیا ہے۔ مثلاً مرزا صاحب کا مصرع ہے۔

(۱) ع۔ لوحِ جبیں ہے مشرقِ خورشید ہر امید۔ مولوی شبلی صاحب نے اُسکی جگہ لکھا ہے ع نامِ جبیں ہے مشرقِ خورشید ہر امید۔ گویا مصرع کو بالکل بے معنی بنا دیا گیا۔

(۲) پھر مرزا صاحب کا شعر ہے ؎

سر پر ہے عرش زیرِ قدم سلسبیل ہے	بینی جبین ولب سے حسین و جلیل ہے

مولف نے اس شعر کو اس طرح بے معنی بنانے کی کوشش کی ہے ؎ بینی جبین ولب سے حسینؑ و خلیلؑ ہے۔ سر پر ہے عرش زیرِ قدم سلسبیل ہے۔

(۳) مرزا صاحب کا مصرع ہے۔ ع۔ مانندِ میم مرگ میانِ کمر گئی۔* مولوی شبلی اسکو مسخ فرماتے ہیں ع مانندِ سیم مرگ میانِ کمر گئی۔ سیم مرگ بالکل مہمل لفظ ہے۔ آپ کو

* جلد ۲ صفحہ ۹۲۔

بہ تیم کی وجہ تعقید

مرزا صاحب کی طرف سے اسقدر بے اعتقاد تو نہونا چاہیے۔ اگر آپ کے اعتقاد میں وہ ایک فصیح البیان شاعر نہ تھے تو کم سے کم پڑھے لکھے تو ضرور ہونگے، پس سیمِ مرگ کس طرح اُنکے قلم سے نکل سکتا ہے۔ لیکن جب آپ کے خیال میں میر صاحب کونین کا عالی جیسا مہمل لفظ لکھ سکتے تھے، تو مرزا صاحب پر تو بایں بے اعتقادی جو کچھ بھی تہمت لگائی جائے کم ہے۔ اس سے مرزا صاحب کی مسلّمہ قابلیت تو مطلق کم نہ ہوئی البتہ ناظرین کی نگاہوں میں آپ کی سخن فہمی کی قلعی کھل گئی کہ الفاظ کو صحیح پڑھنے کی بھی قابلیت نہیں۔ اور اگر آپ نے قصداً ایسا کیا ہے تو اس سے بھی زیادہ ندامت کی بات ہی

ہم اس عنوان کے مہملات کا جواب بخوفِ طوالت قلم انداز کرتے ہیں۔ صرف یہ چند نظیریں اسوجہ سے لکھدی گئیں کہ جس طرح ان اشعار کے الفاظ کچھ سے کچھ ہو گئے ہیں اسی طرح ممکن ہی کہ باقی اشعار پر بھی محرّفین کی عنایت ہوئی ہو اور الفاظ میں تغیّر و تبدّل کر دیا گیا ہو۔

استعارات و تشبیہات

استعارات و تشبیہات

قابل مولّف لکھتے ہیں کہ حقیقت میں مرزا صاحب ایسی عجیب اور نادر تشبیہات و استعارات پیدا کرتے ہیں جنکی طرف کسی کا خیال منتقل نہیں ہوا ہوگا لیکن اس زور میں وہ اکثر اسقدر بلند اُڑتے ہیں کہ بالکل غائب ہو جاتے ہیں۔ اسکے بعد چند اشعار کا انتخاب کیا ہے جو اُن کو ناپسند ہیں کیونکہ اُن کا سمجھنا اُن کی استعداد سے باہر ہے۔ ہم پہلے کہہ چکے ہیں کہ مرزا صاحب کے کلام میں ہر قسم کے نمونے موجود ہیں، جو ذکی الطبع اور صاحبِ طبعِ رسا ہیں وہ ان دقیق مضامین کا لطف اُٹھاتے ہیں اور جن کی لیاقت محدود ہے وہ صاف اور سادہ اشعار سے محظوظ ہوتے ہیں۔ چنانچہ ہم مناسب موقع پر اس قسم کے اشعار لکھ چکے ہیں۔ جن میں فصاحت و سلاست۔ روانی و برجستگی پورے طور پر موجود ہے اور جو مولف کی سمجھ میں بھی بآسانی آسکتے ہیں۔ ناظرین بھی اُن مواقع پر اس قسم کے اشعار سے محظوظ ہوں۔

مضمون بندی و خیال آفرینی

مضمون بندی و خیال آفرینی

اس موقع پر مولّف چند منٹ تک منصف مزاج بنکر کہتے ہیں کہ مرزا صاحب کی قوتِ متخیلہ زبردست ہے اور خیال آفرینی۔ جدّتِ استعارات۔ اختراعِ تشبیہات میں اُن کا جواب نہیں۔ پھر وہ لکھتے ہیں کہ اس موقع پر ہم اُن کی ہر قسم کی عمدہ مضمون

آفرینی کی متعدد مثالیں نقل کرتے ہیں۔ اس کے بعد انھوں نے بہت سے اشعار نقل کیے ہیں۔ اور اُن کی بہت داد دی ہے۔ جسکا ہم بھی شکریہ ادا کرتے ہیں۔ ان کے علاوہ اور ہر قسم کے اشعار مختلف عنوانات کے تحت میں ہم پیچھے لکھ آئے ہیں جو ناظرین خصوصاً مولف کے واسطے باعثِ تفنّنِ طبع ہوں گے۔

بلاغت

بلاغت کے متعلق اعتراضات

اس موقع پر مولف لکھتے ہیں کہ یہ وہ چیز ہی جہاں انیس اور دبیر کی شاعری کی سرحدیں بالکل الگ ہوجاتی ہیں۔ پھر لکھتے ہیں کہ "مرزا صاحب کی شاعری میں بالفرض گو اور تمام اوصاف پائے جاتے ہوں۔ لیکن بلاغت کا تو شائبہ نہیں پایا جاتا وہ کسی مضمون کو مقتضائے حال کے موافق نہیں لکھ سکتے" افسوس ہی کہ مولوی صاحب نے ابتک جسقدر بے دلیل دعوے فرمائے ہیں۔ اُن میں سے کوئی معیارِ صداقت پر ٹھیک نہیں اُترا۔ وہ طرح طرح سے کہیں کسی دھوکہ سے اور کہیں کسی فریب سے چاہتے ہیں کہ مرزا صاحب کے شمعِ کمال کی روشنی کو چھپا دیں۔ مگر ؎

چراغے را کہ ایزد برفروزد کسے گرپُف زند ریشش لبسوزد

کا مضمون ہوجاتا ہے۔ اب ہم نمبروار اُن کے لاطائل اعتراضات کا جواب دیتے ہیں

پہلا اعتراض

مثال ۱۔ ایک مرثیہ میں حضرت امام حسین علیہ السلام کی شہادت پر حضرت شہربانو کا جو نوحہ لکھا ہی اُس میں لکھتے ہیں۔

تم جانوجہاں سے شہِ عالی کو لے آؤ		اکبرؑ سے میں گذری مرے والی کو لے آؤ

اعتراض (۱) "تم جانوجہاں سے" بلتذل محاورہ ہی (۲) یہ خلاف مقتضائے حال ہی کہ کوئی شریف عورت یہ کہے کہ میں اپنے بیٹے سے درگذری، میرے شوہر کو جہاں سے ممکن ہو پیدا کرو۔

۱۹۰ ب

جواب۔ "تم جانوجہاں سے" اہلِ زبان کا محاورہ ہی۔ محاورہ شناسی مرزا دبیر

سے زیادہ اور کس شخص کو آسکتی ہے۔ رہا حضرت بانوؑ کا یہ کہنا کہ میں اپنے بیٹے سے
درگذری میرے شوہر کو لے آؤ۔ ہرگز خلاف مقتضائے حال نہیں۔ اہلبیت
علیہم السلام کو حضرت امام حسینؑ کی زندگی اسقدر عزیز تھی کہ سب نے اپنے اپنے فرزندوں
کو امامِ ہمام کے قدموں پر نثار کر دیا۔ پس حضرتِ بانوؑ کا یہ کہنا کہ مجکو اپنے بیٹے سے
زیادہ اپنے عالی قدر شوہر کی زندگی عزیز ہے۔ بالکل مقتضائے حال کے مطابق اور
اُن کی دینداری و وفاشعاری کا سچا نمونہ ہے۔ حضرت بانوؑ کا اس موقع پر
ایسا کہنا صرف اسی لحاظ سے نہ تھا کہ امام حسینؑ اُنکے شوہر تھے بلکہ وہ اُن کے امام اور
دینی پیشوا بھی تھے۔

دوسری غرض

مثال ۲۔

ناگہاں بالی سکینہؑ نے مچل کر یہ کہا
خوب ملبوس ہے یہ پہنیں گے ہم بھی ایسا
میرے کُرتہ کا گریباں بھی کرو چاک چچا
روٹھ جاؤنگی نہ مانو گے جو میرا کہنا
آپ جب خیمہ میں آئینگے تو چھپ جاؤنگی
پھر مجھے گو دیں لوگے تو نہیں آؤنگی

روئے نادان کی تقریر پہ عباسؑ کمال
بے پدر ہوگی کوئی آن میں نیک خصال
اور کہا دل سے کہ اسکا بھی کرو ردّ سوال
چاک اُسکا بھی گریباں کیا باحزن و ملال
پیار جو آگیا بنتِ شہِ دیں کے اوپر
بوسے دیدیے کئی خاک جبیں کے اوپر

اعتراض۔ حضرت عباسؑ کو امام علیہ السلام سے جو عشقیہ محبت تھی اُسکے
لحاظ سے یہ امر نہایت خلافِ عقل اور خلافِ عادت ہے کہ وہ امام حسینؑ کو قبل از وقت

شہید فرض کریں اور اس بنا پر اُن کے بچے کو یتیم فرض کرکے اُس کا گریبان چاک کردیں

جواب

جواب - حضرت عباسؑ نے جناب سکینہؑ کی ہٹ اور بچپنے کی ضد کے خیال سے اگر ایسا کیا ہو تو اس میں کچھ قباحت نہیں پائی جاتی۔ اور اگر حضرت عباسؑ نے ایسا سمجھا ہو کہ بعد عصر یہ بھی یتیم ہو جائیگی۔ جیسا کہ اس قیامت خیز معرکہ کا بہت مدّت سے علم تھا۔ تو اس میں بھی کوئی ہرج نہیں معلوم ہوتا۔ ایک موقع پر جناب میر صاحب اعلی اللہ مقامہ نے بھی اس قسم کا ایک واقعہ نظم فرمایا ہے۔ اور ہماری رائے میں وہ بھی صحیح اور درست ہے۔ یعنی جب اعدائے دیں نے دریا کے کنارے سے خیام اہل بیتؑ کو ہٹانا چاہا اور حضرت عباسؑ سے رد و کد ہو گئی تو جناب زینبؑ نے فرمایا کہ عباسؑ سے کہدو کہ نہر کو چھوڑ کر چلے آئیں۔ میں ہرگز ساحل پر نہ اُترونگی۔ اسکے بعد میر صاحب نے حضرت زینبؑ کی زبان سے فرمایا ہے ؎

میر صاحب کے کلام سے نظم

یاں آئے گی احمدؐ کے سفینے پہ تباہی ہر سمت سے اُمڈے چلے آتے ہیں سپاہی	تقدیر نے بربادیِ سادات ہے چاہی ہے ہے نہ بچے گا پسرِ شیرِ الٰہی

روشن ہے کہ شبیرؑ چراغِ سحری ہیں
امّاں مجھے اس دن کی خبر دے کے مری ہیں

دیکھو حضرت عباسؑ نے تو جو کچھ بھی خیال کیا وہ اپنے دل ہی میں خیال کیا لیکن حضرت زینبؑ تو اپنے خیال کو صاف صاف علانیہ ظاہر کرتی ہیں باوجودیکہ مردوں کی بہ نسبت عورتیں فطرتاً وہم پرست ہوتی ہیں۔ پس کیا غلطی سے آپ میر صاحب پر بھی اعتراض کرینگے کہ حضرت زینبؑ کی محبت سے بعید ہے کہ وہ امام حسینؑ کو

۴ جلد سوم صفحہ ۵۔

قبل از وقت شہید فرض کرلیں۔ حالانکہ میر صاحب مرحوم نظرت کے بہت بڑے نکتہ داں تھے۔ پس دونوں صاحبوں نے جو واقعہ نظم فرمایا ہی اُسکا مضمون قریب قریب یکساں ہے۔ ہماری رائے میں دونوں بزرگوں نے بہت درست اور صحیح فرمایا ہی۔

دوسری نظیر

ایک دوسرے موقع پر شب عاشور حضرت زینبؑ امام حسینؑ سے فرماتی ہیں ؎

ہر وقت بھرا گھر نظر آجاتا ہے ویراںؔ	آتا ہے سکینہؑ کی یتیمی کا مجھے دھیان

تیسری نظیر

ایک دوسرے مقام پر حضرت زینبؑ اپنے صاحبزادوں سے فرماتی ہیں ؎

تم ہوگئے تابہ عصر نہ عباسؑ خوشخصال	اک دوپہر کے واسطے ناحق یہ قیل وقال
مجکو یقیں نہیں کہ بچے فاطمہؑ کا لالؑ	اِس دن کی دے گئے ہیں خبر شیرِ ذوالجلال

نمبر اعتراض

مثال ۳۔

تسلیم کرکے بانو نے سر کو جھکا لیا	یہ کہتی تھی کہ آئی قریں بنتِ مرتضےٰؑ
جس کی نہ بات پوچھیے تعظیم اُس کی کیا	زینبؑ پکاری بیٹھو ادب میرا ہو چکا

سب جانتے ہیں بنتِ جنابِ امیرؑ ہوں
گھر میں تمہارے رہتی ہوں اس سے حقیر ہوں

اعتراض۔ یہ خیال کہ چونکہ میں اپنا گھر چھوڑ کر تمہارے گھر میں رہتی ہوں اسلیے تم لوگ مجکو حقیر سمجھتے ہو نہایت پست اور مبتذل خیال ہی جو ہرگز حضرت زینبؑ کی متانت اور وقار کے شایاں نہیں۔

جواب

جواب۔ اہلِ حرم جناب زینبؑ کا بہت بڑا ادب کرتے تھے پس یہ فقرہ

طنز ہی نہ حقیقۃً - حضرت زینبؑ کو اس بات کا صدمہ تھا کہ مجھ سے پوچھے بغیر جناب بانوؑ نے علی اکبرؑ کو کیوں رخصتِ میدانِ جنگ دیدی، اسی غصہ میں اُنھوں نے کہدیا کہ شاید تم لوگ مجکو حقیر سمجھتے ہو - اس قسم کے فقرات روزمرّہ مستوراتِ ہند کی معمولی بول چال میں داخل ہیں - ہمارے خیال میں یہ الفاظ ہرگز پست اور مبتذل نہیں اور نہ حضرت زینبؑ کی متانت و وقار کے خلاف ہیں -

مثال ۴ -

بچوتھا اعتراض

محبوب ہوں خدا کے ذوی الاحترام کا	نانا ہوں میں حسین علیہ السّلام کا

اعتراض - یہ شعر جنابِ رسولِ خداؐ کی زبان سے ادا کیا ہے - لیکن مرزا صاحب کو یہ خیال نہ رہا کہ کیا آنحضرت بھی امام حسین علیہ السّلام کا نام علیہ السّلام کہہ کر لیتے تھے -

جواب

جواب - یہ امر تحقیق ہوگیا ہے کہ یہ شعر مرزا صاحب کا نہیں ہے، الحاقی ہے - مرزا صاحب کی جلدوں میں اسکا پتہ نہیں ہے - اسلیے ہم کو اسکے جواب دینے کی کچھ ضرورت نہیں -

مثال ۵ -

پانچواں اعتراض

یہ بات سُن کے نظری نے گھونگٹ اُلٹ دیا صدقے میں تم پہ یاں سے سرک جاؤ اک ذرا	عباسؑ کو حسینؑ کو اکبرؑ کو دی صدا تم سب کے آگے روتے ہوئے آئے گی حیا

ماتم کا ہے ہجوم دلِ پاش پاش پر جی بھر کے رولے یہ بنے قاسمؑ کی لاش پر

سر کے وہاں سے اکبرؑ و عباسؑ و شاہِ دیں	لاشے کے گرد پھرنے لگی وہ دُلہن حزیں

زینبؑ سے پوچھنے یہ لگی پھر وہ مہ جبیں		اب اختیار دل پہ مرے مطلقاً نہیں

	نوشاہ ایک رات کے جو قتل ہوتے ہیں بتلاؤ اے پھوپی انھیں کیا کہہ کے روتے ہیں	

اعتراض۔ مرزا صاحب اور تمام مرثیہ گویوں نے اہلِ حرم کی عادات شرفائے ہند کی مستورات کے مطابق فرض کی ہیں۔ اس بنا پر کبریٰ کا اپنے باپ وغیرہ سے یہ کہنا کہ تم لوگ یہاں سے سرک جاؤ میں اپنے شوہر پر نوحہ کرنا چاہتی ہوں کسقدر بے حجابی اور بے شرمی ہے۔

جواب۔ پہلے بند کا مہمل مضمون خود بتا رہا ہی کہ اُس میں تحریف ہوگئی ہے۔ چنانچہ "یہ" کا اسم اشارہ صاف ظاہر کرتا ہی کہ یہ حضرت کبریٰ کا مقولہ نہیں ہوسکتا بلکہ کسی دوسرے کا قول ہے، کیونکہ اگر اسکو حضرت کبریٰ کا مقولہ فرض کیا جائے تو یہ مصرع اس طرح ہونا چاہیے تھا ع جی بھر کے رولوں میں بنے قاسمؑ کی لاش پر۔ اگر کہا جائے کہ یہ مصرع حضرت کبریٰ کا قول ہی اور "یہ" کا مشار الیہ دل ہے۔ یعنی "یہ دل جی بھر کے روئے" تو بھی مضمون خبط ہوا جاتا ہے، کیونکہ دل کی طرف رونے کی نسبت نہیں کی جاتی ہے۔ بہرحال یہ بند اس طرح پڑھیے

یہ بات سُنکے بنڑی نے گھونگٹ اُلٹ دیا　　عباسؑ کو حسینؑ کو بالو نے دی صدا الخ

ہمارے قول کی تصدیق اس سے پہلے بند کے مضمون پر غور کرنے سے اچھی طرح ہوجاتی ہی، جو مولف نے کسی خاص غرض سے قصداً چھپا ڈالا ہی۔ اب ہم دونوں بندوں کو مسلسل لکھتے ہیں ؎

ناگاہ کی یہ فاطمہ کبریٰ نے گفتگو گھونگٹ میں اُلٹوں بال میں کھولوں، جو تم کہو		لوگو! کوئی ذرا مرے والی سے پُوچھ لو ماں بولی اب نہ شرم کرو سر کو کھول دو

سر ننگے تم کو جانا ہے بلوائے عام میں
چھینے گا شمر اوڑھنی آکر خیام میں

یہ بات سُنکے بڑی نے گھونگٹ اُلٹ دیا
صدقے میں تم یہاں سے سرک جاؤ اک ذرا
عباسؑ کو حسینؑ کو بانوؑ نے دی صدا
تم سب کے آگے روتے ہوئے آئے گی حیا

ماتم کا ہے ہجوم دلِ پاش پاش پر
جی بھر کے رولے یہ بہنے قاسمؑ کی لاش پر

ایک اور اعتراض

دونوں بندوں کے مفہوم پر غور کرنے سے صاف معلوم ہوتا ہی کہ یہ حضرت بانوؑ کا مقولہ ہی نہ حضرت کبرؑا کا۔ پھر مولف لکھتے ہیں کہ "مرزا صاحب نے اس واقعہ کو ایک اور مرثیہ میں لکھا ہے اور وہاں تو حد کر دی ہے۔ فرماتے ہیں ؎

ناگاہ شہ نے لاش اُٹھائی بصد بکا
ہم کچھ کہیں جو مانیے اے شاہِ کربلا
کبرؑا نے ہاتھ باندھ کے تب شاہ سے کہا
احسان ہوگا لاش کو رکھ دیجیے ذرا

بالیں پہ بیٹھیں سر پہ ذرا خاک ڈال لیں
ہم بھی کچھ اپنے دل کی تمنا نکال لیں

جواب

جواب - یہ بند مرزا صاحب کے اُس مرثیہ میں دیکھے جاتے ہیں جسکا مطلع ہی - ع - خورشید کا طلوع ہے برجِ خیام سے - لیکن اصل مرثیہ ۶۲ بند پر ختم ہوگیا ہی - اور سات بند جن میں کا پہلا بند اس مصرع سے شروع ہوتا ہی - ع ناگاہ شہ نے لاش اُٹھائی بصد بکا - ملحقات سے ہی - نہیں معلوم یہ بند کس شخص کے اس میں ملحق ہوکر اہلِ مطبع کی غفلت سے جلد میں طبع ہو گئے ہیں - حقیقت میں یہ بند نہایت مہمل اور قابلِ اعتراض ہی - اور اسکا مصنف ایسا شخص معلوم ہوتا ہی جو مبتذل خیالات

اور محدود اور پست قابلیت رکھنے کے علاوہ شرفا کے عاداتؔ و اطوار سے بالکل نابلد ہی۔ شاعری کی اصلی بنیاد یہ ہی کہ قوتِ متخیّلہ کی بلند پروازی قوتِ ممیّزہ کی محکوم اور مطیع رہے اور خیالات، حقیقتِ واقعیہ و اصلیہ پر مبنی ہوں نہ یہ کہ ذہن نے جو کچھ اختراع کیا اور طبیعت میں جو بے سروپا۔ ناممکن۔ اور فوق العادت خیالات پیدا ہو گئے اُن کو نظم کا لباس پہنا کرے آئے۔ پس ان مہمل اشعار کو مرزا صاحب کی طرف منسوب کرنا نہایت جرات۔ بیباکی اور سوء ادبی ہے۔

مثال ۶۔

کہا سجّادؑ سے کبرا نے یہ اُس دم رو رو	بھائی صاحب مرے دولہ کو بھی اب دفن کرو
تا مجاور میں بنوں کھول کے اپنے سر کو	کہا کبرا سے یہ سجّادِ حزیں نے کہ چلو

ٹکڑے لاشوں کے ہم با دلِ غمناک کریں
قاسمِ ابنِ حسنؑ کو بھی تہِ خاک کریں

اعتراض ۔ ایک رات کی بیاہی عورت کا اپنے بھائی سے یہ کہنا کہ میرے دولہ کو بھی دفن کرو کسقدر خلافِ عادت ہی۔

جواب ۔ شاید یہ امر ہندوستان کی عورتوں کے مراسم کے خلاف ہو۔ اور ہندوستان کی عورتوں کے رسوم کے خلاف تو یہ بھی ہی کہ ایک رات کی بیاہی اپنے شوہر کی لاش پر اپنے بزرگوں کے سامنے بین کرے، جسکو میر صاحب اور مرزا صاحب اور تمام مرثیہ گویوں نے نظم کیا ہی، لیکن رسومِ نسوانِ عرب کے لحاظ سے خلاف نہیں ہے اسی طرح حضرت کبرا کا اپنے بھائی سے یہ کہنا کہ میرے شوہر کو بھی دفن کر دو۔ رسومِ عرب کے مطابق ہرگز خلافِ عادت نہیں۔ اور یہ بات ظاہر ہے کہ مرثیوں میں کہیں مراسمِ ہند

اور کہیں مراسم عرب کے مطابق تخیل ہوئی ہے۔ ہر جگہ کسی مرثیہ گو نے ایک ہی التزام نہیں رکھا۔

مثال ۷۔

ساتواں اعتراض

زینبؑ نے رو کے بانوئے مغموم سے کہا
بے آس ہو نہ بھابی ہی غش میں یہ مہ لقا
اور مر گئی تو خیر جو اللہ کی رضا
اب اسکے رفع غش کی یہ اسوقت ہے دوا

ہی عاشقِ حسینؑ یہ پیاری حسینؑ کی
اب غل کرو کہ آئی سواری حسینؑ کی

اعتراض۔ تسکین اور تسلّی دینے میں یہ کہنا کہ خیر مر گئی تو کیا کرو گی جو اللہ کی رضا۔ کسقدر ناموزوں اور خلافِ آدمیّت ہے۔

جواب

جواب۔ حضرت زینبؑ کو ابتدا ہی میں معلوم ہو گیا تھا کہ سکینہؑ نے وفات پائی۔ لیکن اس جانکاہ حادثہ کی فوراً حضرت بانوؑ کو اطلاع دینا نامناسب اور خلافِ مصلحت تھا۔ اسلیے پہلے تو ماں کے دل کو اس طرح سمجھایا کہ میرے خیال میں غالباً سکینہؑ کو غش آگیا ہی۔ لیکن اگر یہ غشی نہو اور اس لاڈلی نے انتقال کیا ہی تو صبر و شکر کر کے رضائے خدا پر سرِ تسلیم خم کرنا چاہیے۔ نہیں معلوم اس میں کیا امر ناموزوں اور خلافِ آدمیت ہے۔ حاسد کی نگاہ میں اچھی سے اچھی چیز بھی ناموزوں معلوم ہوتی ہی۔

مرزا صاحب پر جو مولّف نے اعتراضات کیے ہیں کہ وہ کسی مضمون کو مقتضائے حال کے موافق نہیں لکھ سکتے اور اس کی یہ چند مثالیں دی ہیں اُن کا جواب تو ہم مفصّل طور پر لکھ چکے۔ اسکے بعد شاید یہ کہنا بے محل نہو گا کہ اگر ان کو تسلیم بھی کر لیا جائے تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ ایسی معمولی فرو گذاشتوں سے کسی کا کلام خالی نہیں ہو سکتا۔

معترض نگاہیں اچھے سے اچھے شاعر کے کلام میں بھی ایسی دو چار مثالیں تلاش کر سکتی ہیں۔
مولف نے مرزا صاحب کے وسیع ذخیرۂ کلام سے یہ سات مثالیں بڑی توجہ سے
تلاش کی ہیں۔ لیکن اگر ایسی ہی جانفشانی اور چھان بین کیجائے تو شاید میر صاحب
مرحوم کا کلام بھی ان سے خالی نہوگا۔ چنانچہ اس قسم کی چند مثالیں میر صاحب کے کلام
سے نقل کیجاتی ہیں۔ ان مثالوں کے تحریر کرنے سے اسکے سوا ہرگز کچھ مطلب
نہیں ہے کہ جب میر صاحب جیسے فصیح البیان اور فطرت کے نکتہ شناس شاعر نے
ان باتوں کو جائز قرار دیا ہے تو مرزا صاحب کو بھی معذور سمجھ لینا چاہیے اور مان لینا
چاہیے کہ یہ مسامحات ہرگز قابلِ گرفت اور لائقِ اعتراض نہیں۔

میر صاحب کے کلام سے بھی اسی قسم کی مثالیں بطور نظیر

مثال ۱۔

پہلی مثال

ناگہ سُنا جو زوجۂ عباسؑ نے یہ حال ہمراہ لے کے بیٹے کو اپنے وہ خوشخصال	مارے خوشی کے ہو گیا چہرہ کا رنگ لال آئی حضورِ سرورِ ذی قدر و ذی کمال

پہلے تو بڑھ کے شاہِ امم کی بلائیں لیں
پھر دونوں ہاتھ اُٹھا کے عَلَم کی بلائیں لیں

جُھک کر قدم پہ شہ کے یہ بولی وہ خوش سیر	کونین میں کیا مرے والی کو نامور[1]

یہ ملحوظ رکھنا چاہیے کہ میر صاحب اور تمام مرثیہ گویوں نے اہلِ حرم کے عادات
اور مراسم اکثر ہندوستان کے شرفا کی مستورات کے مطابق فرض کیے ہیں۔ چنانچہ
عروسی۔ شادی اور موت کے متعلق جس قسم کے مراسم اور عادات یہاں مروج ہیں
وہی تمام مرثیوں میں مذکور ہیں۔ ظاہر ہے کہ ہندوستان کی شریف عورتیں اپنے

[1] جلد اوّل صفحہ ۱۵۱۔

شوہر کے بڑے بھائی سے ہمیشہ پردہ کرتی ہیں۔ گفتگو تو درکنار اُن کے سامنے چلنا پھرنا بھی معیوب سمجھتی ہیں۔ اس بنا پر زوجۂ حضرت عباسؑ کا امام حسینؑ کی بلائیں لینا اور یہ کہنا کہ آپ نے میرے شوہر کو علم دیکر سرفراز کیا۔ رسومِ عرب کے مطابق تو بہت صحیح ہی لیکن رسم و رواجِ ہند کے خلاف معلوم ہوتا ہی۔

دوسری مثال

مثال ۲۔

کھولو اسے کنگنے سے بس اب ہاتھ اُٹھایا	کیوں ہائے یہ کنگنا مجھے اماں نے پنھایا
بیٹی کو رنڈاپے کی مصیبت میں پھنسایا	کیا ان کا بگاڑا جو دُلہن مجھ کو بنایا[۱]

ان اشعار میں ظاہر کیا ہی کہ جب جناب قاسمؑ نے رزمگاہ کو جانا چاہا تو حضرت کبراؑ کو نہایت قلق ہوا۔ اور آنکھوں کو رنڈاپے کا سامان نظر آگیا۔ اسی تشویش میں وہ حضرت سکینہؑ سے کہتی ہیں کہ افسوس یہ کنگنا مجھے اماں نے کیوں پنھایا اور میں کیوں دُلہن بنی تھی۔ اس مقصد کے اظہار کے واسطے جو طریقہ اختیار کیا گیا ہی وہ کسیقدر رسومِ ہند کے خلاف ہی۔ یہ خیال کہ ماں نے اپنی بیٹی کو رنڈاپے کی آفت میں مبتلا کر دیا اور میں نے اماں کا کیا بگاڑا تھا جو اُنھوں نے مجکو دُلہن بنا کر دیدہ و دانستہ ایک جانفرسا مصیبت میں پھنسا دیا، حضرت کبراؑ کی زبان سے اچھّا نہیں معلوم ہوتا کیونکہ شرفا کی لڑکیوں سے بعید ہی کہ وہ اپنی شادی بیاہ کے معاملات میں اپنے والدین کو ملزم ٹھہرا کر ایسے طعنے دیں۔

تیسری مثال

مثال ۳۔

یہ سُنتے ہی اُس پیاسی میں اک جان سی آئی	فضہؑ گئی اور دوڑ کے مشکیزے کو لائی
یوں کہنے لگی رو کے وہ شبیرؑ کی جائی	میں رن میں چلی آؤں گی گر دیر لگائی

جلد آؤنگا دریا سے ' یہ فرما کے سدھارو
جاتے ہو تو آنے کی قسم کھا کے سدھارو

عبّاسؑ نے کی عرض کہ دریا نہیں کچھ دُور — مشکیزہ بھرا - اور پھرے خرّم و مسرور
اور آگے مری جان جو اللہ کو منظور — مانع ہوئی آنے میں اگر موت تو مجبور

تقدیر سے کیا زور ہے سقّائے حرم کا
وعدہ کریں کیونکر کہ بھروسا نہیں دم کا

یہ کہا جا سکتا ہے کہ ایک کم سن - ستم زدہ - پیاس کی ماری بچّی سے جسکا کثرتِ عطش سے ہونٹوں پر دم آ رہا ہے اور جسکو تسکین اور تشفّی کی سخت ضرورت ہے، یکبارگی یہ کہدینا کہ مشکیزہ تو لیے جاتے ہیں لیکن اگر موت آگئی تو مجبوری ہے - یا تقدیر سے ہمارا کیا زور ہے - یا پانی لانے کا ہم وعدہ نہیں کر سکتے - کیونکہ زندگی کا کیا بھروسہ ہے - مناسب نہیں - حضرت عبّاسؑ کو جناب سکینہؑ سے جو دلی محبت تھی اور جسکا اظہار ہر جگہ میر صاحب نے بھی کیا ہے - اُس کے لحاظ سے یہ کسقدر مستبعد معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنی پیاری بھتیجی کا دل توڑ دیں - اور اُن کی امیدِ موہوم کا جو قدرے باعثِ تسکین تھی، اس طرح کے مایوسانہ کلمات سے خاتمہ کر دیں - باوجودیکہ بعض مرثیوں میں میر صاحب نے لکھا ہے کہ حضرت عبّاسؑ جناب سکینہؑ کی دلشکنی کی خاطر خود قسم کھانے پر آمادہ ہیں کہ ہم ضرور تمھارے واسطے پانی لائیں گے - چنانچہ ایک موقع پر لکھا ہے ؎

بے مشک بھرے نہر سے آئیں تو قسم لو — دریا سے ہم آگے کہیں جائیں تو قسم لو

مثال ۴ -

بھائی کو وہ پیارے ہیں انھیں بھائی ہے پیارا — عاشق کہیں معشوق سے کرتے ہیں کنارا

یہ ننگ علمدار کو ہوگا نہ گوارا		قسمت ہی اُلٹ جائے تو اسکا نہیں چارا

لیکن فلک اس طرح سے گرتے نہیں دیکھا
بھائی کو کبھی بھائی سے پھرتے نہیں دیکھا

اس سوچ میں پھرتی تھی سراسیمہ و مضطر		اسکا بھی نہ تھا ہوش کہ کب گر گئی چادر
رخ زرد تھا دل کانپتا تھا سینہ کے اندر		دھڑکا تھا کہ اب کیا کہینگے آن کے سرور

یارب نہ سُنوں میں کہ جُدا ہوگئے عباسؑ
یہ غُل ہو کہ بھائی پہ فدا ہوگئے عباسؑ

دشمنوں نے یہ جھوٹی خبر اُڑا دی تھی کہ عباسؑ امام حسینؑ کو چھوڑ کر ہم سے مل گئے۔ اس خبر کو سُنکر زوجۂ حضرت عباسؑ کو نہایت صدمہ ہوا۔ چنانچہ اُسی حالت میں اُن کی زبانی یہ اشعار میر صاحب نے تحریر فرمائے ہیں۔ حضرت عباسؑ کو امام علیہ السّلام سے جو عشقیہ محبت تھی جسکا اظہار تمام مرثیہ گویوں نے کیا ہے اُس کے لحاظ سے یہ امر قدرے خلاف واقعہ ہے کہ خود حضرت عباسؑ کی بیوی اپنے شوہر کی وفاداری کی جانب سے مشتبہ ہو کر یہ کہنے لگیں۔

ع۔ قسمت ہی اُلٹ جائے تو اسکا نہیں چارا

ع۔ دھڑکا تھا کہ اب کیا کہیں گے آن کے سرور

ع۔ یارب نہ سُنوں میں کہ جُدا ہوگئے عباسؑ

ان اشعار کے مفہوم سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عباسؑ کی زوجہ متردد ہیں کہ کہیں میں یہ نہ سُنوں کہ عباسؑ جُدا ہوگئے۔ حالانکہ اُن کا اعتقاد اور یقین

ایسا مضبوط اور مستحکم ہونا چاہیے کہ کسی فقرے سے اس خبر کی صداقت کا شائبہ بھی نہ پایا جائے۔ حتّیٰ کہ بہ فرضِ محال بھی اسکو ماننے پر طیّار نہ ہوں۔

اسی طرح مرزا صاحب اور میر صاحب اور تمام مرثیہ گویوں کے کلام میں اس قسم کے مضامین مِل سکتے ہیں۔ پس مرثیوں کے مختلف مضامین اور گوناگوں واقعات پر لحاظ کرکے مرثیہ گویوں کو اس امر میں معذور اور مجبور سمجھنا چاہیے۔

میر انیس اور مرزا دبیر کے متحد المضمون مرثیے

اور اشعار

میر انیس اور مرزا دبیر کے متحد المضمون مرثیے اور اشعار

متحد المضمون مرثیے

اس موقع پر مولف لکھتے ہیں کہ "میر انیس اور مرزا دبیر کے موازنہ کا صحیح تر اور آسان طریقہ یہ ہی کہ دونوں صاحبوں کے ہم مضمون مرثیوں کا مقابلہ کیا جائے۔ چونکہ مرثیے کا موضوع صرف چند معیّن واقعات ہیں اسلیے اگرچہ دونوں صاحبوں کا انداز شاعری بالکل الگ الگ ہی، تاہم واقعات اور مضامین میں ہر جگہ اشتراک پیدا ہو جاتا ہے اسکے ساتھ یہ بھی نظر آجاتا ہی کہ دونوں حریفوں نے اکثر مرثیے۔ اور بند۔ اور متفرق اشعار ایک دوسرے کے مقابلے میں لکھے ہیں۔ یہانتک کہ بعض بعض بندوں میں مضمون، ردیف، اور قافیے تک مشترک ہیں" آخر میں پھر افسوس کرتے ہیں کہ "ان موقعوں پر یہ پتہ نہ چل سکا کہ ابتدا کس نے کی اور جواب کس نے لکھا۔" لیکن اسکے بعد پھر رگِ تعصّب متحرک ہوتی ہی اور لکھتے ہیں کہ مرزا صاحب ہی زیادہ تر مقابلہ کا قصد کرتے تھے اور اس کی دلیل میر صاحب کے اُنھیں چند فخریہ اشعار کو قرار دیتے ہیں جو بار بار لکھے جا چکے ہیں۔ یعنی

ع۔ لگا رہا ہوں مضامینِ نو کے پھر انبار

یا۔ ممکن نہیں وزدانِ مضامیں سے نجات

اگر اسی قسم کے اشعار پر اس قضیہ کا فیصلہ منحصر ہی تو ایسے اشعار مرزا صاحب کے

کلام میں بھی پائے جاتے ہیں۔ مثلاً ؎

جو بند کے بند قطع کر لیتے ہیں	یا	اُن مرثیہ گویوں کو سلام اپنا ہے
ہیں وقف ہمیشہ مرے الفاظ و معانی		ہاں قلزمِ شیریں کا سبھی پیتے ہیں پانی

بہر حال اس بحث کو ہم گذشتہ اوراق میں صفحہ ۴۲ پر مفصّل طور پر لکھ چکے ہیں وہاں اس دلچسپ قضیہ کو دیکھنا چاہیے۔

اب مولف متحد المضمون مرثیے اور اشعار درج کرتے ہیں۔ اس موقع پر ہم کو جواب دینے کی زیادہ ضرورت نہ تھی۔ کیونکہ ہم پہلے لکھ چکے ہیں کہ ہر شاعر کا کلام مختلف مدارج کا ہوا کرتا ہے، اسلیے ایک شاعر کا عمدہ کلام انتخاب کرنا اور اُسکے مقابلہ میں دوسرے شاعر کا سُست اور معمولی کلام پیش کر دینا کوئی ناممکن بات نہیں ہے مولف نے جو اس ترکیب سے میر صاحب کو فضیلت دی ہے۔ اسی طرح دوسرا شخص شاید مرزا صاحب کو بھی ترجیح دے سکے۔ ہمارے اعتقاد میں میر صاحب اور مرزا صاحب مرثیہ گوئی میں وحیدِ عصر اور ایک کا ایک جواب تھے۔ اور دونوں صاحب اس فن میں یکتا اور بے مثل سمجھے جاتے ہیں۔ مگر یہ ظاہر ہے کہ کسی شاعر کا کلام بلحاظِ بندش و برجستگی و صفائی ایک پایہ کا نہیں ہوتا، میر صاحب اور مرزا صاحب بھی اس کلّیہ سے مستثنےٰ نہیں ہیں۔ چنانچہ ان صاحبوں کے کلام میں بھی دو درجے نظر آتے ہیں (۱) یہ کہ کسی مضمون اور مطلب کو میر صاحب نے اعلیٰ درجہ پر ادا کیا ہے اسلیے وہ مرزا صاحب سے بڑھ گئے ہیں (۲) یہ کہ کسی خاص مضمون کو مرزا صاحب صفائی اور برجستگی سے لکھ گئے ہیں، اس لیے ایسے موقعوں پر اُن کو ترجیح دیجا سکتی ہے۔

کسی مضمون کے ادا کرنے میں میر صاحب کی فوقیت

امر اوّل یعنی جہاں کسی مضمون کے ادا کرنے میں میر صاحب مرحوم کا کلام بڑھ گیا ہے، اُسکو مولف نے اپنی کتاب میں ظاہر کیا ہے اور اپنی راے کے مطابق وجوہ ترجیح بھی ظاہر کر دیئے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ بعض مقامات پر میر صاحب کے کلام کو نہایت ترجیح حاصل ہے، لیکن مولف مذاقِ سلیم کی کمی کی وجہ سے اُن مقامات کا انتخاب کرنے سے عاجز رہے ہے۔ کاش ہم کو فرصت ہوتی تو اس قسم کا میر صاحب کا نفیس اور لاجواب کلام دکھا کر ظاہر کر دیتے کہ انتخاب اسکا نام ہے۔ دونوں صاحبوں کا مشترک مضامین کا کلام انتخاب کرنے کے موقع پر مولف نے نہ صرف مرزا صاحب پر ظلم کیا ہے، بلکہ وہ میر صاحب کی بھی کما حقّہ خدمت نہ کر سکے۔ مرثیوں کے دیکھنے پر بہت سے مقامات ایسے مِل سکتے ہیں جہاں کسی مضمون کے ادا کرنے میں میر صاحب کو مرزا صاحب پر فوق حاصل ہے۔ اگر مولف ذوقِ سلیم سے کام لیکر اُن مقامات کو صحیح طور پر لکھدیتے تو ہم بسر وچشم تسلیم کر لیتے اور جواب دینے کی مطلق ضرورت نہ تھی۔ لیکن اُنھوں نے جو اس غرض کے واسطے یہاں میر صاحب اور مرزا صاحب کا کلام مقابلے میں انتخاب کیا ہے اُس میں ہم کو گونہ اختلاف ہے، خاصکر اسوجہ سے کہ اُنھوں نے تعصب کی وجہ سے مرزا صاحب کے کلام پر غلط اور بیجا اعتراضات کیے ہیں اور بعض مقامات پر شرمناک تحریف کر گئے ہیں۔ اُن کی اسی ہٹ دھرمی نے ہم کو آمادہ کیا کہ اس مقام پر بھی اُن کی قابلیت اور انصاف کی قلعی کھول کر ناظرین کو اس بات کے جانچنے کا موقع دیں کہ قابل مولف نے اس کتاب کے لکھنے میں کہانتک دیانت و انصاف سے کام لیا ہے۔ اور وہ ایک شخص کا جامہ پہن کر یک طرفہ کار روائی کرتے وقت کیسے بیخود اور متوالے ہو جاتے ہیں۔ اب ہم اُن مقامات پر بحث کرتے ہیں جہاں کسی

مضمون کے ادا کرنے میں مولف نے اپنے مذاق کے مطابق میر صاحب کو فوقیت دی ہے لیکن وجوہِ ترجیح بیان کرنے میں ناکام رہ کر ہر مقام پر متعدد غلطیاں کی ہیں۔

پردے کا اہتمام

میر انیس

بیت الشرفِ خاص سے نکلے شہِ ابرار
فراشوں کو عباسؑ پکارے یہ بہ تکرار

روتے ہوئے ڈیوڑھی پہ گئے عترتِ اطہار
پردے کی قناتوں سے خبردار خبردار

باہر حرم آتے ہیں رسولِؐ دوسرا کے
شقہ کوئی جھک جائے نہ جھونکوں سے ہوا کے

لڑکا بھی جو کوٹھے پہ چڑھا ہو وہ اتر جائے
ناقے پہ بھی کوئی نہ برابر سے گذر جائے

آتا ہو ادھر جو وہ اسی جا پہ ٹھہر جائے
دیتے رہو آواز جہاں تک کہ نظر جائے

مریمؑ سے سوا حق نے شرف انکو دیئے ہیں
افلاک پہ آنکھوں کو ملک بند کیے ہیں

مرزا دبیر

درباں عصا اٹھا کے بڑھے جانبِ بیمار
آ آ کے در پہ لونڈیاں چلائیں بار بار

دہنی طرف نقیب گئے باندھ کر قطار
آئے ادھر نہ اب، نہ کوئی جائے زینہار

آوازِ غیر سُن کے وہ اندیشہ کرتی ہیں
آہستہ بولو دخترِ زہراؑ اترتی ہیں

عفت کے جتنے مرتبے خیر النسا نے پائے
ہاں ہاں مسافرو نہ کوئی غل مچانے پائے

وہ ماں کے بعد دخترِ مشکل کشاؑ نے پائے
ناقے پہ بیٹھ کر نہ ادھر کوئی آنے پائے

حُسنِ ادب یہی ہے کہ حق کو پسند ہو
وہ بیٹھ جائے جسکا کہ قامت بلند ہو

اعتراض

اعتراض (۱) میر صاحب نے پردے کے اہتمام اور لوگوں کے ہٹانے اور روکنے کو حضرت عباسؑ کی طرف منسوب کیا ہی جس سے حضرت زینبؑ کی عظمت و شان کے علاوہ، اصلی واقعہ کی مطابقت ہوتی ہے، کیونکہ تمام معزز خاندانوں میں پردے کا اہتمام خود خاندان کے ممبر کیا کرتے ہیں۔ بخلاف اسکے مرزا صاحب نے یہ کام بالکل دربانوں، نقیبوں، اور لونڈیوں کے سپرد کر دیا ہی، جس سے بظاہر مفہوم ہوتا ہی کہ یا تو گھر میں کوئی مرد تھا ہی نہیں، یا تھا تو اُسکو عورتوں کی چنداں پروا نہ تھی۔ (۲) پردے کے اہتمام میں نقیبوں کا کیا کام ہی۔ (۳) لونڈیوں کے غل مچانے سے ثابت ہوتا ہی کہ ادب و شائستگی نہیں پائی جاتی۔

جواب

جواب (۱) جس طرح میر صاحب نے پردے کے اہتمام کو خاندان کے ممبروں کے سپرد کیا ہی، اسی طرح کا التزام مرزا صاحب نے بھی رکھا ہی۔ میر صاحب نے پردے کا اہتمام حضرت عباسؑ کی طرف منسوب کیا ہی تو مرزا صاحب نے یہ اہتمام خود حضرت امام حسینؑ۔ جناب عباسؑ۔ جناب اکبرؑ۔ جناب قاسمؑ۔ چاروں کی جانب منسوب کیا ہی، جس سے حضرت زینبؑ کی عظمت و شان کا اَور بھی زیادہ اظہار ہوتا ہی۔ مگر افسوس ہی کہ مولف نے اپنی قدیمی حق پوشی و ضمیر فروشی کا نمونہ دکھا کر وہ بند بد دیانتی سے بالکل اُڑا دیا ہے۔ اب ہم اُس بند کو لکھتے ہیں ؎

آوازِ دورباش کا ناگاہ غل اُٹھا | اور خیموں میں اُترنے لگی آلِ مصطفےٰ
ڈیوڑھی سے پرکجاوۂ زینبؑ جہاں ملا | خود اہتمام کرنے لگے شاہِ کربلا

روکی قنات اکبرؑ و قاسمؑ نے آن کر عباسؑ گرد پھرنے لگے نیزہ تان کر

اسکے بعد وہی دونوں بند ہیں جو مولف نے درج کیے ہیں۔ ناظرین اس موقع پر اندازہ کر سکتے ہیں کہ مولوی شبلی صاحب کے دل میں مرزا صاحب کی جانب سے کسقدر کاوش ہو کہ اعتراض کرنے کی غرض سے وہ قابل شرم کارروائی کی جو اُن کی شان سے نہایت بعید ہو۔ چونکہ مرزا صاحب کا کلام جملہ عیوب سے پاک ہو اسلیے مولف کوئی سچا نقص تلاش نہ کر سکے اور مجبوراً اس قسم کی دھوکہ دہی سے کام لینا پڑا۔ حقیقت میں مرزا دبیر پر غلط اور بے سروپا اعتراض اس سے بہتر پیرایہ میں نہیں ہوسکتا تھا جو آپ نے اختیار کیا ع

این کار از تو آید و مرداں چنیں کنند۔

ایک دوسرے موقع پر مرزا صاحب نے پردے کا اہتمام اس طرح نظم کیا ہو ؎

سوار کرنے کو خواہر کے آئے شاہِ ہدا بغل میں ہاتھ دیئے بانوؑ نے بلطف و عطا	قناتیں روک کے عباسؑ نے کیا پردا علیؑ کی بیٹی کو اس شان سے سوار کیا[1]

دیکھیے اس موقع پر بھی خاندان کے ممبروں نے پردہ کا اہتمام کیا ہو۔

ایک دوسرے موقع پر لکھا ہو ؎

یہ سُن کے اُٹھا حیدرِ کرّار کا پیارا عباسؑ نے پردا کیا اکبرؑ نے اُتارا	سامان اُترنے کا مہیا کیا سارا شہ بولے بہن حال تو ظاہر ہے ہمارا[2]

(۲) مرزا صاحب نے جو لکھا ہو۔ ع۔ دہنی طرف نقیب گئے باندھ کر قطار۔ ع آ آ کے در پہ لونڈیاں چلّائیں بار بار۔ اسپر آپ لکھتے ہیں کہ پردے کے اہتمام میں نقیبوں کا

[1] جلد ۷ صفحہ ۱۵۔ [2] جلد ۱۲ صفحہ ۲۰۶۔

مولف کی جعلکارروائی کی دوسری مثال

کیا کام ہی۔ لونڈیوں کے غل مچانے سے ثابت ہوتا ہی کہ ادب اور شائستگی نہیں پائی جاتی۔ اسکا جواب یہی ہی کہ بطور نظیر میر صاحب مرحوم کے اشعار پیش کر دیئے جائیں، میر انیس فرماتے ہیں ؎

ہر محفل ہو وجہ پہ گھٹا ٹوپ پڑے ہیں		پردے کی قناتیں لیے فراش کھڑے ہیں

فراشوں کو عباسؑ پکارے یہ بتکرار		پردے کی قناتوں سے خبردار خبردار

دیکھو میر صاحب مرحوم نے تو پردہ کرنے کا اہتمام اسلیے فراشوں کے سپرد کیا ہی کہ پردے کی قناتوں کی درستی اور فرش وفروش کے انتظام کا اُن سے خاص تعلق ہی اور مرزا صاحب نے پردے کے متعلق لوگوں کی آمد و رفت روکنے اور اُن کو ہٹانے بچانے کا کام نقیبوں سے لیا ہی کیونکہ اُمرا کے ہاں یہی کام نقیبوں کے سپرد کیے جاتے ہیں۔

لونڈیوں کے چلاّنے کا جواب یہ ہی کہ میر انیس صاحب بھی فرماتے ہیں۔ ع
چلاّتے ہیں درباں کوئی آئے نہ خبردار۔ مولوی شبلی صاحب غور فرمائیں کہ اب ان دونوں مصرعوں میں کیا فرق باقی رہا۔

دبیر	آآکے در پہ لونڈیاں چلاّئیں بار بار	انیس	چلاّتے ہیں درباں کوئی آئے نہ خبردار	

تعجب ہی کہ دربانوں کا کرخت اور سخت صداؤں سے چلاّنا تو آپ کو مرغوب ہوا لیکن بیچاری لونڈیوں کی نرم اور رسیلی آواز آپکے کانوں کو ایسی ناگوار معلوم ہوئی۔ عورتوں کے پردے کے اہتمام میں بہ نسبت دربانوں کے غل مچانے کے، لونڈیوں کا چلاّنا حق بجانب ہے۔

مرزا صاحب کی خاص بلاغتیں
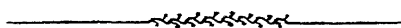
مرزا صاحب کے اشعار کی خاص بلاغتیں

صفائی اور روانیِ کلام کے علاوہ میر صاحب نے بھی درحقیقت پردے کا اہتمام خوب نظم فرمایا ہے، لیکن اگر غور سے دیکھا جائے تو اس موقع پر مرزا صاحب کے اشعار میں بلاغت کے چند جدید نکات نظر آتے ہیں۔

اول

(۱) یہ کہ میر صاحب اعلی اللہ مقامہ نے پردے کا اہتمام صرف حضرت عباسؑ کے سپرد کیا ہے، بخلاف اسکے مرزا صاحب نے یہ اہتمام خود حضرت امامِ ہمام۔ اور خاندان کے تمام ممبروں کی طرف منسوب کیا ہے جس سے اہلِ حرم کی عظمت و شان کا اور بھی زیادہ اظہار ہوتا ہے۔ گویا خاندان کا ہر ممبر اس ضروری اہتمام میں سرگرم تھا۔

دوم

(۲) میر صاحب نے اظہار فرمایا ہے کہ حضرت عباسؑ کے علاوہ جو کام کرنے والے ملازم تھے وہ سب مرد تھے لیکن مرزا صاحب نے لکھا ہے کہ مردوں کے علاوہ لونڈیاں بھی پردے کے اہتمام میں مصروف تھیں جو اس موقع کے واسطے مردوں سے زیادہ موزوں اور مناسب ہوتی ہیں

سوم

(۳) میر صاحب مرحوم نے فقط اسی امر کا انتظام کیا ہے کہ کوئی غیر مرد اُدھر سے گذرنے نہ پائے تاکہ اہلِ حرم پر نامحرم کی نظر نہ پڑے۔ لیکن مرزا صاحب نے علاوہ اس معمولی اہتمام کے اس امر کا بھی انتظام کیا ہے کہ نامحرم بہ آوازِ بلند کلام بھی نہ کرنے پائیں تاکہ عصمت مآب اہلِ بیتؑ نبوی کے کانوں میں غیر مرد کی آواز بھی نہ آنے پائے جو پردے کے اہتمام میں انتہا درجہ کا احتیاط، اور ایسے عالی منزلت خاندان کی عظمت و شان کے لائق و شایاں ہے۔ دیکھو اس مصرع میں اہلِ بیتؑ نبوی کی عصمت۔ و تقدس۔ و جلال

کی کیسی موثر تصویر کھینچ دی ہے۔ ع۔ آہستہ بولو دختر زہراؑ اُترتی ہیں۔ (۴) میر صاحب نے فقط ناقہ پر گذرنے والوں کی بندش کی ہے، لیکن مرزا صاحب نے میر صاحب کی طرح ناقہ والوں کی ممانعت کے علاوہ اس مصرع میں پردہ کے اہتمام کا خاتمہ کر دیا ہے۔ ع

وہ بیٹھ جائے جسکا کہ قامت بلند ہو۔

صغریٰؑ کی آزردگی

صغراؑ نے کہا صاحبو کیا کرتے ہو گفتار شاید کہ سفر ہی میں شفا دے مجھے غفّار	اک بات پکڑلی کہ یہ بیمار ہے بیمار یاں کون خبر لے گا مری یہ در و دیوار

اتنی بھی تو طاقت نہیں جو اُٹھ کے کھڑی ہوں
اے لوگو میں کیا آپ سے بیمار پڑی ہوں

واقعہ یہ ہے کہ حضرت امام حسینؑ تمام اہل حرم کو ساتھ لیے جاتے ہیں اور حضرت صغراؑ کو بوجہ علالت چھوڑے جاتے ہیں اسپر وہ گریہ وزاری کرتی ہیں حضرتؑ اور گھر کی عورتیں سمجھاتی ہیں کہ تم بیمار ہو مصائب سفر برداشت نہیں کر سکتی ہو۔ صغراؑ جواب دیتی ہیں اسی مضمون کو میر انیس صاحب ادا کرتے ہیں ؎

کیا خلق میں لوگو کوئی ہوتا نہیں بیمار زندہ ہوں پہ مُردہ کی طرح ہو گئی دشوار	ہے کونسی تقصیر کہ سب ہو گئے بیزار کیوں بھاگتے ہیں سب مجھے ہے کونسا آزار

حیرت میں ہوں باعث مجھے کھُلتا نہیں اسکا
وہ آنکھ چُرا لیتا ہے مُنہ تکتی ہوں جسکا

اعتراض۔ مرزا صاحب نے بھی عمدگی سے اس واقعہ کو ادا کیا ہے لیکن میر صاحب کے طرز بیان میں جو حسرت رنج اور بیکسی ہے وہ مرزا صاحب کے ہاں نہیں۔

(۱) "اک بات پکڑلی" عامیانہ اور سوقیانہ طرزِ گفتگو ہی (۲) ٹیپ کے دونوں مصرعوں میں کوئی ربط نہیں (۳) یہ کہنا کہ مجکو اُٹھنے کی بھی طاقت نہیں صغرا کی خواہش پر ناکامی کا اثر پیدا کرتا ہی کیونکہ جب اُٹھنے کی طاقت نہیں تو وہ سفر کیونکر کرسکتی ہیں - اسی بنا پر میرانیس نے جہاں یہ واقعہ باندھا ہی صغریٰ کی زبان سے کہا ہی ؎

قربان گئی اب تو بہت کم ہے نقاہت		تپ کی بھی ہی شدت میں کئی روز سے خفت
بستر سے میں خود اُٹھ کے ٹہلتی بھی ہوں حضرت		پانی کی بھی خواہش ہی غذا کی بھی ہی رغبت

حضرت کی دعا سے مجھے صحت کا یقیں ہی
اب تو مرے مُنہ کا بھی مزہ تلخ نہیں ہی

دیکھو حضرت صغریٰ کس کس طرح سے بیماری کی تخفیف اور قریب الصحۃ ہونے کو ثابت کرتی ہیں -

جواب - (۱) اک بات پکڑلی - اہلِ زبان کا محاورہ ہی - اور لکھنؤ وغیرہ میں مستعمل ہی پس اہلِ زبان کے محاورات پر اعتراض کرنا آپ کا کام نہیں (۲) ٹیپ کا پہلا مصرع تو چوتھے مصرع کے متعلق ہی - یعنی یہاں کیا در و دیوار میری خبر لینگے مجکو اتنی بھی تو طاقت نہیں کہ اُٹھ کر کھڑی ہو جاؤں ایسی حالت میں مجکو کسی خبر لینے اور تیمار داری کرنے والے کی کسقدر ضرورت ہی - اور ٹیپ کا دوسرا مصرع' بند کے دوسرے مصرع کا جواب ہے' یعنی تم نے جو اک بات پکڑلی کہ یہ تو بیمار ہی تو کیا میں آپ سے بیمار پڑی ہوں جو تم لوگوں کو اسقدر نفرت اور بیزاری ہی (۳) اعتراض سوم کا جواب یہ ہی کہ دونوں صاحبوں نے حضرت صغریٰ کے مطلب و مقصد' اور اظہارِ خیالات کا الگ الگ انداز رکھا ہی - میر صاحب کا پیرایہ یہ ہے کہ حضرت صغرا مرض کی تخفیف اور اپنے قریب الصحۃ ہونے کا یقین دلاتی

ہیں تاکہ اُن کو ہمراہ لے جانے میں جو عذر مانع ہے وہ جاتا رہے اور حضرت امام علیہ السّلام اُن کو ساتھ لے جانے پر رضامند ہو جائیں۔ اس مطلب کو انھوں نے حقیقت میں نہایت خوبی کے ساتھ ادا فرمایا ہے۔ لیکن مرزا صاحب نے یہ انداز رکھا ہی کہ حضرت صغریٰ اپنے آپ کو مریض اور علیل، بلکہ قریبِ مرگ ثابت کریں تاکہ والدین کو یہ خیال ہو کہ اس حالت میں ایسی مریضہ کو تنہا چھوڑ دینا بالکل نامناسب ہے۔ کیونکہ جس مریضہ کو اُٹھنے بیٹھنے کی بھی طاقت نہو اُسکو ایک ہمدرد تیماردار کی سخت حاجت ہے، اور وہ سوا ماں باپ کے اور کون ہو سکتا ہی، اسلیے یا تو بزرگوں میں سے کوئی ٹھہر جائیں یا بیمار کو اپنے ساتھ لے جائیں مرزا صاحب نے اس بیان کے متعلق اپنے ہر مرثیہ میں یہی پہلو مدِّنظر رکھا ہی۔ چنانچہ اسی بنا پر ایک دوسرے مرثیے میں جہاں یہ واقعہ باندھا ہے۔ حضرت صغریٰ کی زبان سے کہا ہے۔ ؎

یک بیک میرے مقدّر کا بگڑنا دیکھو	پاؤں پڑتی ہوں، مرا پاؤں رگڑنا دیکھو
سانس کا بات کے کہنے میں اُکھڑنا دیکھو	حال یہ، اُس پہ عزیزوں کا بچھڑنا دیکھو

غیر بھی ایسے مریضوں کو نہ تنہا چھوڑیں
حیف ہی بیٹی کو اسوقت میں بابا چھوڑیں

ہمارا خیال اس بند میں اَور زیادہ صاف ہو جاتا ہی ؎

ہوش میں آئی جو صغرا تو کیا شہ نے مقال	اس نقاہت پہ مری جان سفر کا ہی خیال
بولی وہ میں بھی تو بابا یہی کرتی ہوں سوال	چھوڑ دو تنہا اُسے تم گھر میں، ہو جسکا یہ حال

بعد اگر آپکے جانے کے غش آتا مجکو
کون اس پیار سے گودی میں اُٹھاتا مجکو

دیکھو حضرت صغرا کس کس طرح اپنی نازک حالت یاد دلاکر التجا کرتی ہیں کہ ایسے مریضوں کو تنہا چھوڑ دینا کسی طرح مناسب نہیں ہے۔

حقیقت میں دونوں صاحبوں نے اپنے اپنے انداز کو خوب نباہا ہے۔ تعجب ہے کہ مولف کی نارسا طبیعت اس نکتہ کو نہ پہونچی کہ دونوں صاحبوں کی غرض و غایت جدا جدا ہے وہ دو متضاد اور باہمدگر مختلف خیالات کو ملاکر دونوں میں باہم مطابقت پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ افسوس! ع برین عقل و دانش بباید گریست۔

اصغر سے خطاب

دبیر

پھر ہاتھوں پہ اصغر کو رکھا کر کے یہ زاری
ماں نے کہا لو گو وہیں آتے ہیں یہ واری

لٹکا دیئے ہاتھ اُس نے ہمک کر کئی باری
اصغر کی طرف ہاتھ اُٹھا کر وہ پکاری

پھر جیتی ملوں یا نہ ملوں تجھ سے بلا لوں
اے چھوٹے مسافر تجھے چھاتی سے لگا لوں

انیس

میں صدقے گئی بس نہ کرو گریہ و زاری
وہ کانپتے ہاتھوں کو اُٹھا کر یہ پکاری

اصغر مرا روتا ہے صدا سُن کے تمہاری
آ آ مرے ننھے سے مسافر ترے واری

چھٹتی ہے یہ بیمار بہن جان سے گئے تم
اصغر مری آواز کو پہچان گئے تم

تم جاتے ہو اور ساتھ بہن جا نہیں سکتی
جو دل میں ہے لب پہ وہ سخن لا نہیں سکتی

تپ ہے تمہیں چھاتی سے بھی لپٹا نہیں سکتی
رکھ لوں تمہیں اماں کو بھی سمجھا نہیں سکتی

بیکس ہوں مرا کوئی مددگار نہیں ہے
تم ہو سو تمہیں طاقتِ گفتار نہیں ہے

اعتراض (۱) صغرؑا کا وقتِ رخصت علی اصغرؑ کو حسرت اور پیار سے دیکھنا نہایت درد انگیز سماں ہے مگر مرزا صاحب ایسے درد انگیز واقعہ کو بھی تاثیر کا رنگ نہ دے سکے۔ دیکھو میر صاحب اسی بات کو کس لہجہ سے ادا کرتے ہیں (۲) اسکا نہایت درد انگیز پہلو صغرؑا کا خود اصغرؑ سے مخاطب ہونا اور جوشِ محبت میں چھ مہینے کے بچّے سے اپنا دردِ دل کہنا تھا۔ مرزا صاحب صرف یہ کہہ کر رہ گئے۔ ع۔ آ چھوٹے مسافر تجھے چھاتی سے لگا لوں میر صاحب نے پورا دردِ دل کہا (۳) مرزا صاحب کے اس مصرع۔ ع۔ اصغرؑ کی طرف ہاتھ اُٹھا کر وہ پکاری۔ اور میر صاحب کے اس مصرع۔ ع۔ وہ کانپتے ہاتوں کو اُٹھا کر یہ پکاری میں کوئی نسبت نہیں۔ میر صاحب کے ہاں ہات کے ساتھ کانپنے کی قید نے کسقدر بلاغت پیدا کر دی ہے (۴) ذیل کے دونوں مصرعوں میں بھی زمین آسمان کا فرق ہے۔ ع آ مرے ننھے سے مسافر ترے واری۔ ع۔ آ چھوٹے مسافر تجھے چھاتی سے لگا لوں۔ (۵) چھوٹا مسافر مرزا صاحب کا ایجاد ہے۔

اعتراض

جواب۔ (۱) مرزا صاحب اس درد انگیز واقعہ کو تاثیر کا رنگ دے سکے یا نہیں یہ آپ کا دعوے بے دلیل ہے ورنہ ہر شخص جانتا ہے کہ اُن کا ہر قسم کا کلام سوز و گداز اور تاثیر سے بھرا ہوا ہوتا ہے۔ لیکن اوّل تو آپ اُن کا بہتر کلام انتخاب ہی نہیں کرتے اور اگر کبھی بھول کر انتخاب کر لیتے ہیں تو بوجہ تعصّب وہ موثّر کلام آپ کے دل میں اثر نہیں کرتا اس میں مرزا صاحب کے کلام کا کیا قصور ہے (۲) اس مرثیہ میں واقعی مرزا صاحب نے جناب صغرؑیٰ کی جانب سے حضرت اصغرؑ کی طرف مخاطب ہو کر دو ایک ہی بند لکھے ہیں۔ یہ آپ کے انتخاب کا قصور ہے کہ دوسرے مرثیوں کی طرف سے آپ کی حاسد نگاہ خیرگی کر گئی ورنہ اگر آپ چاہتے تو ایسے بند بھی مل جاتے جن میں پورے

جواب

دردِ دل کا اظہار کیا گیا ہے۔ دیکھیے مرزا صاحب ایک دوسرے مرثیہ میں پورا دردِ دل لکھتے ہیں اور کس موثر طریقہ سے ؎

صغراؑ نے اِدھر اور اُدھر یاس سے دیکھا
کہنے لگی تم میری سفارش کرو بھیّا

پھر جھولے سے اصغرؑ کو اُٹھا لائی وہ دکھیا
سب کنبہ ہے بابا کی طرف اور میں تنہا

صغراؑ کو تو سمجھاتے ہیں بابا کی طرف سے
کچھ باپ سے کہتے نہیں صغراؑ کی طرف سے

تم اپنی زباں کھولو سفارش میں ہماری
صغراؑ کو نہ چھوڑو، یہ بہن ہے مجھے پیاری

ہونٹوں کو ہلا کر یہ اشارہ کرو واری
اصغرؑ! میں بڑی چاہنے والی ہوں تمہاری

اس تپ میں بھی جب ہوش میں آجاتی ہوں واری
ڈوری ترے جھولے کی ہلا جاتی ہوں واری

دوسرے مرثیہ میں فرماتے ہیں ؎

ماں کی آغوش میں واں پی رہا تھا دودھ صغیر
کی ہر اک سمت کو الفت بھری آنکھوں سے نظر

سُن کے بیمار کی آواز وہ ہمکا رو کر
کہا صغراؑ نے ادھر دیکھو کھڑی ہوں میں ادھر

سہمے سہمے ہوئے کچھ تم نگراں ہوتے ہو
سرمہ آنکھوں سے بہا جاتا ہے کیوں روتے ہو

الوداع اے مرے ننھے سے[1] مسافر ناداں
آج ہی منہ پہ ہیں پردیسوں کے سارے نشاں

الوداع اے مرے معصوم میں تجھ پر قرباں
مسکرانا نہ اشارہ نہ ہمکنا اس آں

میرے بھولے مرے پیارے مرے کمسن بھائی

[1] دیکھیے اس مرثیہ میں مرزا صاحب نے بھی "ننھے مسافر" باندھا ہے۔ اب تو آپ کو صبر آیا۔

گھٹنوؤں بھی نہ چلے گھر میں تم اک دن بھائی

چشمِ بد دُور جب ان آنکھوں کا آئیگا خیال — آنکھیں رو رو کے شب و روز کروگی ہیں لال
دل پہ لہرائینگے جبدم یہ جھنڈولے ترے بال — انہیں بالوں کی طرح ہوگا پریشاں احال

چوسنے پر ان انگوٹھوں کے ہو قرباں صغرا
اب رہیگی یہاں انگشت بدنداں صغرا

ایک اک دم میں ترے لاکھ دم اے نورِ نگاہ — مصطفےٰ ایترے نگہبان، علیؑ پشت و پناہ
صد وسی سال ترے سر پہ سلامت رہیں شاہ — باپ کے سائے میں پروان چڑھائے اللہ

تپ میں ہوں اسلیے گودی میں نہیں لیتی ہوں
ضامنی میں تمھیں اللہ کی میں دیتی ہوں

اگر آپ منصف مزاج ہیں تو خیال کر سکتے ہیں کہ مرزا صاحب نے جس طریقہ سے پورا دردِ دل کہا ہی وہ بھی میر صاحب کے اشعار کے دردِ دل کی طرح موثر اور دلنشین ہے۔ تعجب ہے کہ ایسے نادر اور درد انگیز اشعار سے آپ کیونکر بے خبر رہے۔ یا کسی غرضِ خاص سے قصداً بے خبر بنے رہے۔ ہم صرف یہی کہہ سکتے ہیں کہ ایسی کارروائیاں ایک منصف مزاج مورخ کی شان سے بعید ہیں۔

(۳) حقیقت میں میر صاحب کے مصرع میں ہاتھ کے ساتھ کانپنے کی قید بہت خوب ہی۔ ہم بھی اس کی داد دیتے ہیں۔ اس لفظ نے مصرع کو نہایت دردناک۔ پُر تاثیر اور بلیغ بنا دیا ہے (۴) جن دو مصرعوں میں آپ نے زمین و آسمان کا فرق بتایا ہی اُس میں انصاف سے کام نہیں لیا۔ غور سے دیکھیے مرزا صاحب کے ہاں "چھاتی سے لگالوں" کے درد انگیز فقرہ نے مصرع کو کیسا موثر اور دلنشین بنا دیا ہی (۵) یہ سچ ہی کہ مرزا صاحب کا "چھوٹا مسافر"

میر صاحب کے "ننھے مسافر" سے کسیقدر کم رتبہ کا لفظ ہی لیکن یہ لفظ مرزا صاحب کا ایجاد نہیں بلکہ اہل زبان کا مستند لفظ ہے۔

منشی دلگیر لکھنوی فرماتے ہیں ؎

بھیجا ہی مجھے بانو نے اصغر کی طرف کو	یہ چھوٹا مسافر گیا کوثر کی طرف کو[1]

ایک مصرع یہ بھی میر صاحب کے خاندان میں سے کسی صاحب کا یاد پڑتا ہی۔

ع اس چھوٹے مسافر کی مدد کیجیو بابا۔

چھوٹا مہمان - اور چھوٹا سید - میر صاحب مرحوم نے بھی نظم فرمایا ہے۔

ع - چھوٹے سے مہمان کی خاطر ضرور ہی[2] - ع یہ چھوٹا سا سید بھی مہمان تمہارا ہے[3]

اگر چھوٹا مسافر مرزا صاحب ہی کا ایجاد ہو تو اس میں قباحت کیا ہی۔

مرزا صاحب کے اشعار کی خاص بلاغتیں

مولف نے تو مرزا صاحب کے بند پر بیجا نکتہ چینیاں کی ہیں لیکن غور کیا جائے تو اس واقعہ کے متعلق مرزا صاحب کے اُس بند میں جو اُنھوں نے منتخب کیا ہی اور اُن بندوں میں جو ہم نے لکھے ہیں بہت سے دلچسپ اور پرُلطف نکات پائے جاتے ہیں۔

(۱) یہ کہ اس واقعہ کا ایک درد انگیز پہلو یہ بھی ہی کہ علی اصغر کی جانب سے کسی طفلانہ محبت آمیز حرکت کا اظہار ہو جیسا کہ اکثر ناسمجھ بچے اُن عزیزوں کے ساتھ کیا کرتے ہیں جنسے کچھ مانوس ہو جاتے ہیں۔ مرزا صاحب نے اس کی پوری تصویر کھینچدی ہی اور کس موثر اور حسرت خیز طریقہ سے ع لٹکا دیئے ہاتھ اُس نے ہمک کر کئی باری "ہمک کر"

[1] [2] [3] منشی دلگیر ۵/۳۹ ۲/۱۰۹ ۳/۵ ۴/۵۲

کا لفظ اور بھی زیادہ تیر و نشتر ہی۔ یا مثلاً یہ شعر ؎

سُنکے بیمار کی آواز وہ ہمکا رو کر	کی ہر اک سمت کو الفت بھری آنکھوں سے نظر

(۲) اس سے بھی زیادہ دردانگیز پہلو چھوٹے بچے سے محبت کے ساتھ ملنا اور آخری وداع ہونا تھا۔ میر صاحب کے ہاں اس مضمون کے متعلق صرف یہ بیان ہی کہ ع

آ مرے ننھے سے مسافر ترے واری۔ مرزا صاحب نے رخصت کا دردانگیز مضمون پورے طور پر ادا کیا کہ اے مرے چھوٹے مسافر آ تجھے چھاتی سے لگا لوں۔ نہیں معلوم اسکے بعد پھر تجھ سے ملنا بھی ہو یا نہو۔ ٹیپ کے دونوں مصرعوں کے طرز بیان میں جو دردانگیز سماں ہی اُسکو ناظرین خود محسوس کر سکتے ہیں ؎

پھر جیتی ملوں یا نہ ملوں تجھ سے بلا لوں	آ چھوٹے مسافر تجھے چھاتی سے لگا لوں

یا مثلاً یہ اشعار ؎

الوداع اے مرے ننھے سے مسافر نادان	الوداع اے مرے معصوم میں تجھ پر قربان
آج ہی منہ پہ ہیں پردیسیونکے سارے نشان	مسکرانا نہ اشارہ نہ ہمکنا اس آن

(۳) میر صاحب نے ظاہر فرمایا ہی کہ حضرت صغرا، جناب علی اصغر سے خطاب کر کے کہتی ہیں کہ اسوقت میرا کوئی مددگار نہیں ہی ایک تم ہو لیکن افسوس ہی کہ تم کو بولنے کی طاقت نہیں۔ تمام لوگوں سے مایوس ہو کر ایک بچہ کا سہارا ڈھونڈنا اور پھر یہ خیال کہ وہ بولنے کے قابل نہیں، انتہا درجہ کی حسرت اور ناکامی کی تصویر ہی اور یہ طرز کلام بجائے خود نہایت پرتاثیر اور لاجواب ہے؛ لیکن مرزا صاحب نے ہجوم یاس و اضطراب میں محویت و استغراق کی نہایت بے مثال تصویر کھینچ دی ہی۔ میر صاحب کے مصرع میں حضرت صغرا، علی اصغر کو بے زبان محسوس کر کے مایوس ہو جاتی ہیں لیکن

مرزا صاحب نے بیان کیا ہی کہ حضرت صغرؑا باوجودیکہ ایک بے زبان بچہ سے کلام کر رہی ہیں لیکن ہجوم یاس کی محویت میں اُن کو یہ بھی خیال نہیں کہ میرا مخاطب کون ہے اور اُسکو کلام کرنے کی طاقت بھی ہی یا نہیں۔ کبھی کہتی ہیں کہ تم میری سفارش میں زبان کھولو۔ کبھی اپنی خدمات یاد دلاکر کہتی ہیں کہ ہونٹوں ہی کو ہلاکر کچھ اشارہ کردو جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ پریشانی اور مصیبت نے حواس کو اسقدر مختل کر دیا ہی کہ اُن کو مطلق خیال نہیں رہا کہ علی اصغرؑ کلام کرنے یا کسی قسم کا اشارہ کرنے سے بالکل معذور ہیں۔ درحقیقت یہ ناکامی کی بدحواسی کا نہایت سچا اور اصلی مرقع ہی کیونکہ ایسے انتشار اور اپنی موہوم کامیابی کی دُھن میں ہمیشہ انسان سے ایسی ہی خلافِ عقل باتیں ظہور میں آیا کرتی ہیں۔

ادنیٰ اور اعلیٰ کا مقابلہ

اودنیٰ اور اعلیٰ کا مقابلہ

میرانیس	کچھ خارِ مغیلاں گلِ تر ہو نہیں سکتا ہر قطرۂ ناچیز گہر ہو نہیں سکتا		قلعی سے کچھ آئینہ قمر ہو نہیں سکتا مس پر جو ملمع ہو تو زر ہو نہیں سکتا
		جس پاس عصا ہو اُسے موسیٰ نہیں کہتے ہر ہاتھ کو عاقل یدِ بیضا نہیں کہتے	
مرزا دبیر	ساماں سے کوئی صاحبِ ایماں نہیں ہوتا پہنے جو انگوٹھی وہ سلیماں نہیں ہوتا		ہر اہلِ عصا موسیٰ عمراں نہیں ہوتا آئینہ گرِ اسکندرِ دوراں نہیں ہوتا
		لاکھ اوج ہو پشہ کا ہما ہو نہیں سکتا بت سجدۂ کافر سے خدا ہو نہیں سکتا	

اسکے علاوہ مرزا صاحب کے تین بند اور بھی درج ہیں۔

اعتراض

اعتراض ۔ میرانیس کا مشہور بند ہی۔ مرزا صاحب نے اسکے جواب میں بڑی کوشش

کی مختلف بحروں میں استعمال کیں بہت سی نئی نئی تشبیہیں ڈھونڈیں لیکن وہ بات پیدا نہو سکی
ایک بند میں جو تشبیہات لکھی ہیں وہ کافی نہوئیں تو ایک مرثیہ میں بہت سی تشبیہیں
جمع کیں۔

جواب

جواب۔ ایک شاعر نے ایک مضمون کو ایک بند میں لکھا ہی مگر دوسرا شاعر جس کی
روانی طبع کا سمندر کنارہ نہیں رکھتا اُس مضمون کو مختلف پیرایوں سے پانچ چھ بندوں
میں لکھتا ہی، لیکن باوجود اس محنت و کاوش کے، داد و تحسین کے عوض ایک متعصب
مولف کے اعتراضات کا نشانہ بنتا ہی۔ بظاہر معلوم ہوتا تھا کہ مولف اس موقع پر کیا
اعتراض سوچینگے کیونکہ یہ تو ایک تعریف کی بات ہی کہ ایک ہی مضمون کو کئی بندوں میں
لکھا۔ مگر حاسد اور متعصب طبیعت بھی بُری ہوتی ہی۔ اچھی بات کو بھی بُری سمجھ لیا۔
یعنی میر صاحب نے ایک بند لکھا اور مرزا صاحب نے تین، تو مولف کی رائے میں اسکی
یہ وجہ نہیں ہی کہ مرزا صاحب نے اپنی بلندیِ فکر اور جولانیِ طبع سے اس مضمون میں نئی نئی
باتیں اختراع کیں بلکہ یہ سبب ہے کہ یہ تشبیہات کافی نہوئیں تو بہت سی تشبیہیں جمع کردیں۔
بیشک ایک متعصب شخص ایسا ہی کہہ سکتا ہی اور اسکو ایسا ہی کہنا چاہیے، لیکن ایک
منصف مزاج اور غیر متعصب انسان یہ کہے گا کہ دیکھو مرزا صاحب سے بلند خیال شاعر نے
جن کی قوت متخیلہ نہایت زبردست ہے کسقدر زیادہ تشبیہات پیدا کیں اور ایک ہی مضمون کو
کس طرح نئے نئے پیرایوں میں ادا کیا۔

قیدخانے کے واقعات

قیدخانے کے واقعات قیدخانے کا حال اور ہند کے آنے کا واقعہ دونوں صاحبوں نے
نظم کیا ہی، چنانچہ مولف نے دونوں صاحبوں کے کلام سے ان حالات کے اشعار کا
بھی موازنہ کیا ہی۔ لیکن یہاں بھی اُسی قدیمی عادت سے کام لینا پڑا ہی کہ میر صاحب کے

ایک مشہور مرثیے کے بند لکھے ہیں اور مرزا صاحب کے ایک معمولی مرثیے سے جو صرف ۳۶
بندوں کا ہی چند اشعار درج کر کے موازنہ کیا ہے۔ یہ واضح رہے کہ مرزا صاحب کے جتنے
چھوٹے چھوٹے مرثیے ہند۔ شیریں۔ اور حضرت صغراؑ کے حال میں ہیں وہ سب ابتدائے
مشق کے ہیں۔ انکے سوا اور جو مختصر مختصر مرثیے ہیں وہ بھی اگلے زمانے کے ہیں جو
بہ عجلت سوز خوانوں کے واسطے کہہ دیئے گئے ہیں۔ ہم مرزا صاحب کے ایک دوسرے
مرثیے سے جسکا مطلع ہے۔ ع۔ جب طے سفرِ شام ہوا ماہِ صفر میں۔ چند اشعار لکھ کر
موازنہ کرتے ہیں۔

انیس

کیجیے شکستگیِ خرابہ کا کیا بیاں — ثابت نہ تھیں سقف نہ در اور نہ سائباں
وحشت کا گھر ہراس کی جا خوف کا مکاں — وہ شب کہ الحذر وہ سیاہی کہ الاماں

ظلمت سرائے گور تھی زنداں کا گھر نہ تھا
حجرے یہ تنگ تھے کہ ہوا کا گذر نہ تھا

دبیر

کیا شام کے زنداں کی سیاہی کروں تحریر — گویا تھا وہ قلبِ سیہ لشکرِ بے پیر
غش ہو گئے ڈر کر حرمِ صاحبِ تطہیر — تغیر تو تھا حال ہوا اور بھی تغیر

ہر صبح اسیروں کے لیے قہر و غضب تھی
ہر شب حرمِ شہ کے لیے حشر کی شب تھی

انیس

نکلی حرم سرا سے یہ کہہ کر وہ خوش سیر — تھیں ساتھ ساتھ چند خواصیں بھی نوحہ گر
پہونچی جناب حضرتِ زینبؑ کو یہ خبر — رنگ اڑ گیا یہ کہنے لگی سر کو پیٹ کر

اپنا نہیں خیال بزرگوں کا پاس ہے
ہے ہے کہاں چھپوں وہ مری روشناس ہے

ہی شرم کی جگہ کہ میں ہوں خواہرِ امام
ہم ہیں فقیر ہم میں امیروں کا کیا ہی کام
غمگین و سوگوار و پریشان و تشنہ کام
لوگو بتا نہ دیجو کہیں اُسکو میرا نام
پوچھے جو وہ کسی سے کہ زینبؑ کدھر گئی
کہدیجیو کہ بھائی کے ہمراہ مر گئی

دبیر

یہ ذکر تھا ناموسِ پیمبرؐ میں ابھی آہ
اور شور ہوا اے حرمِ سیّدِ ذیجاہ
جو مشعلوں کی روشنی در پر ہوئی ناگاہ
ہند آتی ہے آگاہ ہو۔ آگاہ ہو آگاہ
آداب سے مجرے کو چلو باندھ کے صف کو
آمد زنِ حاکم کی ہی زنداں کی طرف کو

ہوش اُڑ گئے زینبؑ کے پکاری میں کروں کیا
پہلے مرے بھائی سے بھی عقد اسکا ہوا تھا
لو آتی ہی یاں ہند چھپوں جا کے میں کس جا
یہ ہند وہی ہی جو مجھے کرتی تھی مجرا
میں خاک نشیں آج ہوں وہ تخت نشیں ہے
مُنہ کس سے چھپاؤں کہ ردا بھی تو نہیں ہے

انیس

یہ سُنکے ہند رونے لگی تب باتنگ و آہ
مُنہ سے ہٹائے بال تو حالت ہوئی تباہ
پھر مُڑ کے روئے حضرتِ زینبؑ پہ کی نگاہ
بیساختہ کہا کہ زہے قدرتِ الہ
ہر گز غلط نہیں جو مجھے اشتباہ ہے
زینبؑ تمھیں ہو خالقِ اکبر گواہ ہے

دبیر

پھر ہند نے زینبؑ سے کہا ہو کے پریشان
پیدا ہی تری شان سے سیدانیوں کی شان
کچھ آپ کی آواز سے واقف ہیں مرے کان
زینبؑ کی شبیہ آنکھ تلے پھر گئی اس آن
چہرے پہ عجب نور ہی گو خاک نشیں ہو

کیونکر کہوں تم فاطمہؑ کی کوئی نہیں ہو

علی اصغرؑ کے لیے پانی مانگنا

خدا کا شکر ہی کہ اس موقع پر مولف مرزا صاحب کے معاملہ میں انصاف سے کام لیکر لکھتے ہیں کہ "میر انیس اور مرزا دبیر کے موازنہ میں عموماً میر انیس کی ترجیح ثابت ہو گی لیکن ہر کلیہ میں مستثنیٰ ہوتا ہی چنانچہ مرزا دبیر صاحب نے اس واقعہ کے بیان میں جو بلاغت صرف کی ہی اور جو درد انگیز سماں دکھایا ہے کسی سے آجتک نہو سکا" نہیں معلوم اسوقت مولف کے جسم میں کس منصف مزاج کی روح حلول کر گئی تھی کہ یہ سچے فقرے زبان اور قلم سے نکل گئے، حالانکہ اُن سے امید تو یہ تھی کہ اس معاملہ میں بھی اُسی قدیمی تعصب سے جو اُن کی فطرت میں داخل ہی، کام لیکر جلے ہوئے فقرے لکھ جاتے۔ لیکن بقول اُنکے یہ بالکل سچ ہی کہ ہر کلیہ میں مستثنیٰ ہوتا ہے پس یہ کیا ضرور ہی کہ ایک متعصب اور غیر منصف مزاج شخص ہر وقت غیر منصف ہی بنا رہے بہرحال ہم اُن کا شکریہ ادا کرنے کے بعد اس مضمون کو اس مصرع پر ختم کرتے ہیں۔ ع

عمرت دراز باد کہ اینہم غنیمت است۔

امر دوم۔ یعنی جہاں کسی مضمون کے ادا کرنے میں مرزا صاحب کو فوقیت دی جاسکتی ہی۔ چونکہ ہر شاعر کے کلام میں ادنیٰ و اعلیٰ مختلف قسم کے اشعار پائے جاتے ہیں اسلیے جہاں بعض مطالب کے ادا کرنے میں میر صاحب کو فوق حاصل ہی اسی طرح بعض مقامات ایسے بھی مل سکتے ہیں جہاں مرزا صاحب کو ترجیح دی جاسکتی ہے۔ چنانچہ اس جگہ اُن مقامات کو درج کرتے ہیں جہاں مرزا صاحب کا کلام بلند اور شاندار ہو گیا ہے۔

علی اصغرؑ کے لیے پانی مانگنا

کسی مضمون کے ادا کرنے میں مرزا صاحب کی فوقیت

حضرت زینبؑ کے بین بیٹوں کی لاش پر

شاعر	مصرع	مصرع
میرانیس	ٹوکے کوئی رستے میں تو ڈر یو نہ مری جان	ہاں کلمۂ توحید پڑھے جائیو ہر آن
	اقرار نبوت میں فصاحت کا ہے دہیان	دلبند ہو تم تین اماموں کے ہیں قربان
	کہنا کہ ملازم ہیں ولی ابنِ ولی کے	
	ہم آتے ہیں لشکر سے حسینؑ ابنِ علیؑ کے	
مرزا دبیر	پوچھے درِ بہشت پہ گر خازنِ جناں	تم کون ہو، کہاں سے ہوا ہی گذر یہاں
	ہاں افصح العربؐ کے نواسو نثار ماں	اُس دم کہیں نہ پیاس سے لکنت کرے زباں
	کہنا، کہ ہم شبیہ پیمبرؐ کے بھائی ہیں	
	شبیرؑ کے غلام ہیں، اور کربلائی ہیں	

اصل مضمون یہ ہی کہ حضرت زینبؑ اپنے صاحبزادوں کی لاش پر بین کرتی ہیں او
فرماتی ہیں کہ سفرِ آخرت میں اگر روک ٹوک ہو تو گفتگو میں بند نہونا۔

میرانیس صاحب کے اشعار میں بھی صفائی اور شستگی اعلیٰ درجہ کی پائی جاتی ہے
لیکن غور کرنے سے مرزا دبیر صاحب کے اشعار میں چند لطافتیں زیادہ معلوم ہوتی ہیں

(۱) مرزا صاحب کے کلام میں کچھ ایجاز و اختصار پایا جاتا ہی۔ یعنی میر صاحب مرحوم جس
بات کو پورے دو مصرعوں میں ادا فرماتے ہیں۔ مرزا صاحب نے اُسکو صرف دو دو
لفظوں میں بیان کردیا ہی۔ مثلاً

(میر صاحب) کہنا کہ ملازم ہیں ولی ابنِ ولی کے (مرزا صاحب) شبیرؑ کے غلام ہیں،
(میر صاحب) ہم آتے ہیں لشکر سے حسینؑ ابنِ علیؑ کے۔
(مرزا صاحب) کربلائی ہیں۔

اس فصاحت آمیز اختصار کے علاوہ لطافتِ معنوی بھی پائی جاتی ہے مثلاً (۲) میر صاحب مرحوم کے مصرع میں "ملازم" کا لفظ ہے اور مرزا صاحب نے اُس کے عوض "غلام" کا لفظ استعمال کیا ہے۔ یہ شاید زیادہ موزوں نرم اور کثیر الاستعمال ہے کیونکہ یہی لفظ مراثی میں مستعمل و متداول ہے۔ حضرت عباسؑ اور جناب امام حسین علیہ السلام کے تمام اعزا و اقربا نیازمندی ظاہر کرتے وقت اپنے کو حضرت کا غلام کہا کرتے تھے۔ ملازم کا لفظ مرثیوں میں نظر نہیں آتا اسلیے بادی النظر میں کسیقدر اجنبی اور غیر مانوس معلوم ہوتا ہے (۳) اسکے سوا "کربلائی ہیں" کے الفاظ میں جو لطف حُسن اور موزونی پائی جاتی ہے وہ اس پورے مصرع میں نہیں نکلتی ع۔ ہم آتے ہیں لشکر سے حسینؑ ابن علیؑ کے۔ (۴) میر صاحب نے فرمایا ہے ع دلبند ہو تم تین اماموں کے مری جان۔ اسکے ہم مضمون مرزا صاحب کا جو مصرع ہے اُس میں حُسن بندش۔ صفائی۔ بے ساختگی۔ اور الفاظ کی نشست بہت خوب ہے ع ہاں فصح العرب کے نواسو نثار ماں۔ (۵) میر صاحب نے لکھا ہے کہ کہیں ڈر کے سبب جواب دینے سے رُک نہ جانا۔ لیکن مرزا صاحب نے زبان رُکنے کی وجہ کو پیاس کی جانب منسوب کیا ہے جس میں علاوہ بلاغتِ معنوی کے ایک درد انگیز۔ اور رقت خیز اشارہ پایا جاتا ہے علاوہ بریں گفتگو میں نہ رُک جانے کی وجہ افصح العرب کا نواسا ہونا، بہ نسبت تین اماموں کے دلبند ہونے کے زیادہ موزوں ہے۔

ایک غلط خبر کی تردید

دبیر	بالائے زمیں بیٹھ گئے سیدِ ابرار شکوہ کوئی عباسؑ کا کیجو نہ خبردار		تھیں جمع جو سب بیبیاں کی اُنسے یہ گفتار عباسؑ مرا اور مری جان کا ہے مختار

مجھ سے نہ بُرائی مرا محبوب کرے گا
جو حق میں کریگا وہ مرے خوب کرے گا

یہ سُنتے ہی دل زوجۂ عباسؑ کا تڑپا
شرمائی ہوئی شہ کے قریں آئی وہ دُکھیا
اور بولی کہ اے وارثِ ذریّتِ زہرا
یہ بات نہ تم اپنی زباں سے کہو آقا
والی مرا قربانِ امامِ دو جہاں ہو
فرزند مرا آپ کے سائے میں جواں ہو

خاطر سے علمدار کی کہتی نہیں یہ بات
فرماؤ تو فرزند کے سر پہ میں رکھوں ہات
وارث مرا بچپن سے شہِ پاک کے ہے ساتھ
حضرت کی غلامی ہی اُسے فخر و مباہات
والی مرا پھرنے کا نہیں تم سے بلا لوں
اس بات پہ جیسی کہو سوگند میں کھا لوں

انیس

چپکے سے سکینہؑ نے کہا جب یہ بصد یاس
غرقِ عرقِ شرم ہوئی زوجۂ عباسؑ
گھبرائی ہوئی خیمہ کی ڈیوڑھی کے گئی پاس
پھر سوچ کے کہتی تھی کہ بیجا ہے یہ وسواس
قوتِ شہِ والا کی اُنھیں سے تو فقط ہے
عباسؑ پھرے شہ سے!! نہ مانونگی غلط ہے

بھائی کو وہ پیارے ہیں اُنھیں بھائی ہے پیارا
عاشق کہیں معشوق سے کرتے ہیں کنارا
یہ ننگ علمدار کو ہوگا نہ گوارا
قسمت ہی اُلٹ جائے تو اسکا نہیں چارا
لیکن فلک اس طرح سے کرتے نہیں دیکھا
بھائی کو کبھی بھائی سے پھرتے نہیں دیکھا

اس سوچ میں پھرتی تھی سراسیمہ و مضطر
اسکا بھی نہ تھا ہوش کہ کب گر گئی چادر

دھڑکا تھا کہ اب کیا کہیں گے آنکے سرورؑ	رخ زرد تھا دل کانپتا تھا سینہ کے اندر

یارب نہ سنوں میں کہ جدا ہو گئے عباسؑ
یہ غل ہو کہ بھائی پہ فدا ہو گئے عباسؑ

دشمنوں نے یہ خبر اڑادی تھی کہ حضرت عباسؑ ہماری طرف آگئے اُسوقت حضرت عباسؑ کی زوجہ پر اس خبر کا جو اثر ہوا اور جو گفتگو اُنھوں نے کی اُسکا سماں دونوں بزرگوں نے باندھا ہی۔ لیکن مرزا صاحب کے اشعار میں مقتضائے حال کی مطابقت زیادہ پائی جاتی ہے۔ اُنکے اشعار پر غور کرو۔ حضرت عباسؑ کی زوجہ کو اپنے شوہر کی وفاداری کا کیسا مستحکم یقین ہی کہ کسی لفظ کسی فقرہ سے بطور فرضِ محال بھی شک و شبہ کا شائبہ نہیں پایا جاتا۔ حتّٰی کہ وہ اس خبر کے غلط ثابت کرنیکے واسطے قسم کھانے پر آمادہ ہیں۔ اور حقیقت میں یہ امر اصلی واقعہ کے مطابق بھی ہے، کیونکہ حضرت عباسؑ کو امام حسینؑ علیہ السّلام سے جو عشقیہ محبت تھی اُسکے لحاظ سے خود معلوم ہوتا ہی کہ کسی کو بھی اس خبر کے غلط ہونے میں شک نہ کرنا چاہیے۔ بخلاف اس کے میر صاحب مرحوم نے حضرت عباسؑ کی زوجہ کی جو کچھ حالت لکھی ہی اُس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ خود اپنے شوہر کی وفاداری کی جانب سے مشتبہ ہو کر خیمہ کی ڈیوڑھی پہ چلی گئیں اور پھر یہ کہتی ہیں کہ اگرچہ یہ ننگ علمدار کو گوارا نہیں ہوسکتا لیکن ع۔ قسمت ہی اُلٹ جائے تو اسکا نہیں چارہ۔ ع۔ دھڑکا تھا کہ اب کیا کہینگے آنکے سرور۔ ع۔ یارب نہ سُنوں میں کہ جدا ہو گئے عباسؑ۔ حالانکہ اُن کا یقین ایسا مضبوط ہونا چاہیے کہ کسی طرح بھی اس جھوٹی خبر کے مان لینے پر آمادہ نہوں اور اُن کے الفاظ ایسے ہوں جن سے اُن کے شوہر کی وفاداری کی نسبت شک کا

احتمال بھی پیدا نہ ہو سکے۔

مرزا صاحب نے ایک دوسرے مرثیہ میں بھی اس واقعہ کو نظم کیا ہی، وہاں بھی یہی پہلو مدّ نظر رکھا ہی چنانچہ اُس موقع پر حضرت عبّاسؑ کی زوجہ فرماتی ہیں ؎

تم مصحفِ ناطق ہو مرا کِ اس سے ہی آگاہ	سرآپ کا قرآں کی جگہ ہی مجھے یا شاہ
اس سر کی قسم جھونٹ نہیں بولونگی واللہ	شوہر مرا دل سے ہے غلامِ شہِ ذیجاہ

شق ہوگی زمیں یا کہ فلک اُسپہ گرے گا
عبّاسؑ نہ حضرت کی غلامی سے پھرے گا

پیارے نہیں اکبرؑ سے بھی اپنے یہ دلدار	مجکو اُسی غازی کی قسم اے شہِ ابرار
اُس شب کو یہی مجھ سے تھی عباسؑ کی گفتار	کل شہ کی غلامی سے ادا ہوگا علمدار

یہ کہہ کے ہمیں روئے گا سر دار ہمارا
عباسؑ سا تھا کوئی نہ غمخوار ہمارا

جناب امیرؑ بیٹوں سے اپنے قاتل کی سفارش فرماتے ہیں

انیس	یہ چاہتا ہی بند سے رسّی کے رہا ہوں	تم کھولدو ہاتھ اسکے کہ میں عقدہ کشا ہوں
دبیر	ہاتھ اسکے دونوں کھولدو حاجت روا ہو تم	مشکل کشا کے بیٹے ہو مشکل کشا ہو تم

اصل مضمون یہ ہی کہ جناب امیر علیہ السّلام بیٹوں سے اپنے قاتل کے ہاتھ کھولدینے کی سفارش کرتے ہیں۔ اسکا پیرایہ دونوں صاحبوں نے دو طرح پر رکھا ہی میر صاحب مرحوم جناب امیرؑ کی زبانی لکھتے ہیں کہ چونکہ میں مشکل کشا ہوں اسیلیے تم قاتل کے ہاتھ کھولدو۔ لیکن مرزا صاحب کے اشعار میں ایک نہایت لطیف پیرایہ میں سفارش کا اظہار کیا گیا ہی۔ یعنی جناب امیرؑ کسی عالی ظرفی اور دینداری کی صفت کو،

جو دشمن پر عفو و ترحم کا باعث ہو اپنی جانب نہیں بلکہ بیٹوں کی طرف منسوب کر کے طالب رحم ہوتے ہیں یعنی چونکہ تم خلق کے حاجت روا ہو خود بھی مشکلکشا ہو اور مشکل کشا کے فرزند بھی ہو' اسلیے تمہاری عالی ظرفی کا مقتضےٰ یہ ہے کہ قاتل کے ہاتھ کھولکر اُس کی خطا معاف کر دو۔ میر صاحب کے اس فقرہ میں کہ "میں عقدہ کشا ہوں" اور مرزا صاحب کے اس جملہ میں کہ "تم مشکل کشا کے بیٹے ہو" بات قریب قریب ایک ہی ہے' لیکن طرز ادا اور لفظوں کے اُلٹ پھیر نے مضمون کو کہاں سے کہاں پہونچا دیا ہے۔ علاوہ بریں میر صاحب اعلی اللہ مقامہ نے تمام مضمون کو دوسرے مصرع میں ادا کیا ہے اسلیے پہلا مصرع کچھ بیکار سا ہو گیا ہے' لیکن مرزا صاحب نے اُسی مضمون کو دونوں مصرعوں میں اس طرح تقسیم کر دیا ہے کہ دونوں مصرعے موزوں۔ باکار اور پُر لطف معلوم ہوتے ہیں۔

حضرت امام حسینؑ کربلا میں پہونچکر حضرت مسلمؑ کی خبر معلوم کرنے کے واسطے متفکر بیٹھے ہیں

میر انیس

اُس روز سے مغموم بہت حضرت شبیرؑ	خاموش تھے خویش و رفقا صورت تصویر
ہر سو نگراں تھے' مگر افسردہ و دلگیر	تھا دھیان خبر پوچھوں جو آئے کوئی رہگیر

رخساروں پہ آنکھوں سے کبھی اشک رواں تھے
لب پر کبھی دنیا کی مذمت کے بیاں تھے

مرزا دبیر

کرسی پہ مگر بیٹھے تھے یوں سبط پیمبرؐ	حیران و پریشان و سراسیمہ و مضطر
تھی نوک تو تیغ شہ مرداں کی زمیں پر	اور قبضۂ شمشیر پہ تھا دست مطہر

تشویش سے قبضہ پہ جھکائے ہوئے سر کو
اور دیکھنا گھبرا کے ادھر اور اُدھر کو

اسی مرثیہ میں اس مضمون کا ایک اور بند ؎

اُس دن تھا عجب حال دلِ سیدِ ابرار
مسلم کی نہیں یاد تھی اور چشم تھی خونبار

درد اُٹھتا تھا رہ رہ کے کلیجے میں اک بار
نے خیمے میں آئے، نہ سکینہ کو کیا پیار

تھی یاد نہ صغرا کی بھی زہراؑ کے خلف کو
پر اشک بھری آنکھیں تھیں کوفے کی طرف کو

حضرت امام حسینؑ میدان کربلا میں تشریف لائے ہیں۔ حضرت مسلمؑ کی کچھ خبر معلوم نہیں ہوئی۔ آپ کسی آنے جانے والے سے اُنکے حالات معلوم کرنے کے واسطے کرسی پر متفکر بیٹھے ہوئے ہیں، اُسوقت امام علیہ السّلام کے تردّد۔ واضطراب وپریشانی کی تصویر دونوں صاحبوں نے کھینچی ہے۔ مرزا صاحب کی اس ٹیپ میں ؎

تشویش سے قبضہ پہ جھکائے ہوئے سر کو   اور دیکھنا گھبرا کے ادھر اور اُدھر کو

واقعہ کی کیسی سچّی تصویر کھنچی ہوئی ہے اور حسن بلاغت کی کیسی اچھی مثال ہے۔

حضرت علی اصغرؑ کے لیے پانی مانگنا

اس واقعہ میں بلاغت کا اقتضا یہ ہے کہ امام حسینؑ جیسے غیور اور باحمیّت بزرگ کا طرزِ عمل یہ ہو کہ وہ اعدا سے اپنی طرف سے کسی قسم کا سوال نہ کریں بلکہ جو کچھ کہیں بچّے کی جانب سے کہیں۔ دوسرا دردانگیز پہلو یہ ہے کہ حضرت علی اصغرؑ کی طرف سے بھی پانی مانگنے کی عوض پہلے خود اُن کا حالِ زار ہی دکھایا جائے کیونکہ یہ انداز بجائے خود نہایت پُرحسرت اور ایک سنگدل انسان کے دل میں بھی اثر کر جانے والا ہے

یہ عمل بھی کافی نہو اور بچے کی طرف سے سوال ہی کرنا پڑے تو سوال صاف صاف الفاظ میں نہو بلکہ اُس کے الفاظ ایسے موزوں اور بچے ہوئے ہوں جنسے مطلب تو ظاہر ہو جائے لیکن کسی طرح مذمتِ سوال کا پہلو پیدا نہ ہونے پائے۔ دونوں صاحبوں نے ان تمام پہلوؤں کو جس طرح نباہا ہی اور اس واقعہ میں دردانگیزی پیدا کرنے مین جو غضب کی بلاغت ظاہر کی ہی اُنکے نمونے پیش کیے جاتے ہیں۔ مقابلہ کرنے سے دونوں حریفوں کے مدارج کلام کا پورا پورا اندازہ ہو جائیگا۔

میر انیس

بولے دکھاکے بچے کو شاہِ فلک سریر ۔۔۔ مرتا ہی پیاس سے یہ مرا کودکِ صغیر
پانی ملا ہی کل سے نہ ممکن ہوا ہے شیر ۔۔۔ للہ اس غریب پہ کر رحم اے امیر

مہماں ہی کوئی آن کا ہونٹوں پہ جان ہے
اسکا قصور کیا ہے کہ یہ بے زبان ہے

برپا ہی اہلِ بیت محمدؐ میں شور و شین ۔۔۔ در پر پھوپھی بلکتی ہی ماں کر رہی ہی بین
آنکھیں پھرائے دیتا ہی اب تو یہ نورِ عین ۔۔۔ لایا ہی اس عطش میں ترے پاس اب حسینؑ

تجکو قسم ہے روح رسالت مآبؐ کی
ٹپکا دے اسکے حلق میں اک بوند آب کی

دیگر

فرماکے یہ آئے صفِ اعدا کے برابر ۔۔۔ اک اک سے کہا ہاتھوں پہ بچے کو اُٹھاکر
مظلوم ہی معصوم ہی پیاسا ہے یہ دلبر ۔۔۔ نے دودھ میسّر ہے نہ پانی ہے مُیسّر

راضی ہوں میں تیغوں سے لہو میرا بہادو
پر تھوڑا سا پانی اسے دریا سے پلادو

بے آبی سے یہ پھول سا کملاتا ہے یارو — گھوارے میں ہر دم اسے غش آتا ہے یارو
معصوم پہ کافر بھی ترس کھاتا ہے یارو — بچّہ مرا ہاتھوں سے مرے جاتا ہے یارو

پانی کے نہ دینے کا سزاوار تو میں ہوں
تقصیر ہے کیا اس کی گنہگار تو میں ہوں

راضی ہوں میں قیمت ہے جو منظور تو زر لو — تم پانی کے قطرے کے عوض مجھ سے گہر لو
اک چلّو سے خالی ہو اگر نہر تو بھر لو — پانی دو اسے اور چمنِ خلد میں گھر لو

احساں کو نہ بھولے گا یہ حیدر کا ہی پوتا
فرزند مرا ساقیِ کوثر کا ہے پوتا

اعدا کے قریں سر کو جھکائے ہوئے آئے — آنسو رخِ انور پہ بہائے ہوئے آئے
معصوم کو چھاتی سے لگائے ہوئے آئے — اصغر کو ردا اپنی اڑھائے ہوئے آئے

روتے تھے یہ صدمہ تھا شہِ جن و ملک کو
اصغر کو کبھی دیکھتے تھے گاہ فلک کو

کچھ سوچ کے دامن رخِ انور سے اٹھایا — گویا کہ قمر ابر سے باہر نکل آیا
ہر صاحبِ اولاد کو رو کر یہ سنایا — دو روز سے پانی نہیں اس لال نے پایا

حاضر ہوں میں خنجر مری گردن سے ملادو
پر تھوڑا سا پانی مرے بچّے کو پلادو

مرزا دبیر

بھائی کے غم سے ٹوٹ گئی شاہ کی کمر
اکبرؑ کے بعد شہ کو ملا وقفہ اسقدر
ناگاہ رن میں قتل ہوا نوجواں پسر
پُرسا کھڑے کھڑے دیا بانوؑ کو آن کر
روتے ہی آئے روتے ہی رن کو چلے گئے
اکبرؑ کی لاش رکھ گئے اصغرؑ کو لے گئے

آئے جو شاہ متصل لشکر جفا
آنکھوں کے حلقے خشک دہاں چھوٹا سا گلا
چادر اُٹھا کے حال دکھایا صغیر کا
چاہا کہ پانی مانگیں مگر آگئی حیا
مشکل سے اتنی بات کہی درد و یاس سے
یارو قریب مرگ یہ بچہ ہے پیاس سے

حاجت جو لیکے جاتا ہی کوئی کسی کے پاس
اس دودھ پیتے بچّے کا لازم ہے تم کو پاس
اہلِ مروّت اُسکو نہیں پھیرتے اُداس
حاجت فقط یہی ہے بجھاؤ تم اس کی پیاس
منصف سے اہلِ درد سے میرا سوال ہے
کیا اتنے سن کے بچّے کا بھی خوں حلال ہے

دیگر

اصغرؑ کو لیے ہاتھ پہ زہرا کا وہ جایا
منّت سے سماجت سے یہ اعدا کو سُنایا
خیمے سے قریب صفِ کفّار جو آیا
ہوتا یہ سخی کا غرض اک اپنی ہے لایا
کہتا ہی اشارے سے کہ سیّد کا پسر ہوں
مہمان ہوں نادان ہوں اور تشنہ جگر ہوں

دیگر

پہونچے قریبِ فوج تو گھبرا کے رہ گئے
غیرت سے رنگ فق ہوا تھرا کے رہ گئے
چاہا کریں سوال یہ شرما کے رہ گئے
چادر پسر کے چہرہ سے سرکا کے رہ گئے
آنکھیں جھکا کے بولے کہ یہ ہمکو لائے ہیں
اصغرؑ تمہارے پاس غرض لیکے آئے ہیں

یہ کون بے زباں ہے، تمہیں کچھ خیال ہے
لو مان لو تمہیں قسمِ ذوالجلال ہے
دُرِّ نجف ہے بانوئے بیکس کا لال ہے
یثرب کے شاہزادے کا پہلا سوال ہے
پوتا علیؑ کا تم سے طلبگارِ آب ہے
دیدو کہ اس میں ناموری ہے ثواب ہے

پھر ہونٹ بے زبان کے چومے جھکا کے سر
باقی رہے نہ بات کوئی اے مرے پسر
رو کر کہا جو کہنا تھا وہ کہہ چکا پدر
سوکھی زبان تم بھی دکھا دو نکال کر
پھیری زباں لبوں پہ جو اُس نورِ عین نے
تھرا کے آسمان کو دیکھا حسینؑ نے

حضرت زینبؑ اپنے بیٹوں کے دل سے علم نہ ملنے کی آزردگی رفع کرتی ہیں۔

میر انیس

اک دوپہر کے واسطے ناحق یہ قیل و قال
اس دن کی دے گئے ہیں خبر شیرِ ذوالجلال
تم ہو گے تا بہ عصر نہ عباسؑ خوشخصال
مجکو یقیں نہیں کہ بچے فاطمہؑ کا لال
پیدا ہوئی ہوں اشک بہانے کے واسطے

	رہجاؤنگی میں قید میں جانے کے واسطے	

مرزا دبیر

کِس دن کے واسطے طلبِ رایتِ ظفر		واری بہت جیوگے جواب تم تو دوپہر
یہ دوپہر رُلائے گی زینبؑ کو عمر بھر		دنیا سے آج فوجِ حسینی کا ہے سفر

	گھر سے تمھیں حسینؑ کے صدقے کو لائی ہوں میں بے نشان ہونے کو یثرب سے آئی ہوں	

صفائی اور حُسنِ بندش میں دونوں کلام ایک پایہ رکھتے ہیں لیکن بحیثیتِ معنی مرزا صاحب نے بلاغت کا بہت لطیف پہلو رکھا ہی، میر صاحب کے اشعار میں حضرت زینبؑ نے صاف صاف کھُلے ہوئے الفاظ میں اپنے صاجزادوں، اور حضرت عبّاسؑ اور سب سے زیادہ یہ کہ خود امام حسینؑ کی شہادت کا حال بیان کر دیا، جو بظاہر غور تو نکتہ توہم پرست طبیعت سے عموماً، اور حضرت زینبؑ کی بے مثال محبت سے خصوصاً بعید معلوم ہوتا ہی۔ بخلاف اسکے مرزا صاحب کے اشعار میں حضرت زینبؑ اسی مطلب کو صاف صاف الفاظ میں نہیں بلکہ اشارۃً وکنایۃً ادا فرماتی ہیں۔ چنانچہ انھوں نے اپنے صاجزادوں کی شہادت کا تو کھُلے الفاظ میں اظہار کر دیا، ع واری بہت جیوگے جواب تم تو دوپہر، کیونکہ اُن کو حصولِ شہادت پر آمادہ کرنا تھا۔ لیکن باقی مطلب اور مضمون کو پوشیدہ اور چھپے ہوئے الفاظ میں بیان کرتی ہیں مثلاً ع یہ دوپہر رُلائیگی زینبؑ کو عمر بھر۔ اس میں امام حسینؑ کی شہادت اور اپنی تمام عمر تک سوگواری کا اشارہ ہی۔ اور ع دنیا سے آج فوجِ حسینیؑ کا ہی سفر۔ اس میں کنایۃً ظاہر کیا ہی کہ آج سب کنبہ کا خاتمہ ہی۔ کیونکہ تمام لشکر کے قتل ہو جانے کے بعد

سردار کی شہادت لازمی ہی۔ سب باتوں کا در پردہ اظہار بھی کر دیا۔ لیکن کسی بات کو صاف صاف زبان سے نہ کہا۔ علاوہ بریں یہ دونوں مصرعے ع اک دو پہر کیواسطے ناحق یہ قیل وقال۔ اور ع کسدن کے واسطے طلب ایت ظفر" بالکل ہم مضمون ہیں لیکن ان میں جو فرق ہی وہ اہل مذاق محسوس کر سکتے ہیں "کسدن کیواسطے" بہت اچھا محاورہ اور روزمرّہ ہی۔ اسکے سوا ٹیپ میں اُن کی شہادت کا بھی اشارہ کر دیا یعنی اب بجائے اسکے کہ علم اور منصب کی تمنا کرو۔ تم کو اپنی شہادت کی فکر کرنی چاہیے کیونکہ میں تمہیں گھر سے امام حسینؑ کے صدقے کے واسطے لائی ہوں۔

متحد المضمون اشعار

اس میں شک نہیں کہ دو شعروں کا جب مقابلہ کیا جائے تو ایک کو ضرور فوقیت ہوتی ہی، کیونکہ یہ بالکل ناممکن ہی کہ ایک اُستاد اُسی بات کو جو دوسرا اُستاد لکھ چکا ہی بلا کسی قسم کی ترقّی کے اپنے کلام میں لائے۔ لیکن مقابلہ کرتے وقت اس بات کا معلوم ہونا دشوار ہی کہ دونوں میں سے ایجاد کا فخر کس کو اور ترقّی دینے کا شرف کس کو حاصل ہی۔ بہرحال دونوں میں سے کوئی بھی موجد اور کوئی بھی ترقی دینے والا ہو دونوں مستحق داد و تحسین ہیں۔

متحد المضمون اشعار کے موقع پر بھی وہی دونوں مدارج قائم ہو سکتے ہیں۔ اوّل جہاں میر صاحب کو فوقیت ہے۔ دوسرے وہ مقامات جہاں مرزا صاحب کو ترجیح ہے۔

اس موقع پر ہم مولوی شبلی صاحب سے اسقدر عرض کرنا چاہتے ہیں کہ آپ نے جو موازنہ لکھتے وقت مرزا دبیر۔ اور میر انیس کے لاکھوں اشعار دیکھ ڈالے تو کہیں دو چار مقامات پر ایسے ہم مضمون اشعار بھی نظر سے گذرے جہاں بیچارے

مرزا صاحب کو ترجیح دیجا سکے۔ موازنہ کرنے کے یہ تو معنی نہیں ہیں کہ ہر موقع پر یک طرفہ کارروائی کیجائے۔ آپ کی طرح اَور لوگوں نے بھی مختلف شعرا کے محاسنِ سخن پر کتابیں لکھی ہیں اور اسی طرح آپ کی مانند اُنھوں نے بھی اپنے ممدوح کے کلام کا دوسرے شعرا کے کلام سے مقابلہ کیا ہے۔ پس جہاں دوسرے شعرا کا کلام فوق لے گیا ہے اُنھوں نے منصفانہ طور پر صاف ظاہر کر دیا ہے کہ اس موقع پر فلاں شاعر کا بیان ہمارے ممدوح کے کلام سے زیادہ بلیغ اور زیادہ دلکش واقع ہوا ہے۔ بغیر اسقدر انصاف پسندی اور حق گوئی کے موازنہ کا لطف نہیں اور وہ موازنہ نہیں بلکہ اُسکو مناظرہ ومجادلہ کہنا چاہیے۔

متحد المضمون اشعار میں میر انیس کی ترجیح

(۱) متحد المضمون اشعار میں میر انیس کی ترجیح

حقیقت میں بعض مقامات پر میر صاحب کے اشعار بہت بڑھ گئے ہیں اور اس قسم کے اشعار ہزاروں مِل سکتے ہیں۔ افسوس ہے کہ ہم بوجہ عدیم الفرصتی اس خدمت کے انجام دینے سے معذور ہیں۔ لیکن مؤلف نے میر صاحب کی ترجیح کے اشعار جو اس مقام پر لکھے ہیں اس میں ہم کو کلام ہے۔ اور اسکا سبب قابل مؤلف کے ذوقِ سلیم کی کمی کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے۔ بہر حال ہم اُن کے موازنہ کی حقیقت ظاہر کیے دیتے ہیں ؎

پہلا موازنہ

دبیر	مثلِ تنور گرم تھا پانی میں ہر حباب		ہوتی تھیں سیخِ موج پہ مرغابیاں کباب
انیس	پانی تھا آگ گرمیِ روزِ حساب تھی		ماہی جو سیخِ موج تک آئی کباب تھی

اعتراض

اعتراض - مضمون مشترک یہ ہے کہ گرمی کی شدّت یہ تھی کہ موج سیخ بن گئی تھی اور جب کوئی جانور اس کے پاس جاتا تھا تو جل کر کباب ہو جاتا تھا۔ بندش اور الفاظ کی نشست میں جو فرق ہے وہ خود ظاہر ہے لیکن معنوی حیثیت سے بھی میر انیس کا شعر بڑھا ہوا ہے۔ میر انیس کے ہاں گرمی کا مبالغہ جو شعر کی جان ہے زیادہ پایا جاتا ہے۔ یعنی مچھلی سیخِ موج تک آنے کے ساتھ ہی فوراً کباب ہو جاتی تھی۔ مرزا صاحب کے ہاں یہ بات نہیں وہ کہتے ہیں کہ موج کی سیخ پر مرغابیوں کا کباب لگایا جاتا تھا۔ اس سے فوراً کباب ہو جانے کا خیال نہیں پیدا ہوتا۔

جواب

جواب - مرزا صاحب کا بھی وہی مطلب ہے جو میر صاحب کے مصرع سے پیدا ہوتا ہے یعنی سیخ موج پر مرغابیاں کباب ہوتی تھیں۔ یعنی ہو جاتی تھیں۔ اگر غور سے دیکھیے تو مرزا صاحب کے مصرع میں بھی فوراً کباب ہو جانے کا خیال پیدا ہوتا ہے۔ مرزا صاحب کے ہاں علاوہ سیخ موج کی تشبیہ کے دوسری تشبیہ اور بھی ہے۔ کہ پانی میں گرمی کی شدت سے ہر حباب بھی تنور بنا ہوا تھا۔ اسکے علاوہ مرزا صاحب نے کل دریا کا شدت حرارت سے گرم ہونا ظاہر کیا ہے۔ اور میر صاحب نے فقط سیخ موج کی حرارت کا اظہار فرمایا ہے کیونکہ اگر کل پانی آگ ہوتا تو مچھلی پانی کے اندر بھی جل سکتی ہے۔ سیخ موج تک آنے پر کباب ہو جانے کی کیا خصوصیت ہے۔

دبیر و انیس موازنہ

دبیر	چاہوں تو بیٹھے بیٹھے اک انگلی سے زمیں پر		گردوں کی ڈھال چیر کے رکھدوں زمین پر
انیس	طاقت اگر دکھاؤں رسالتمآب کی		رکھدوں زمیں پہ چیر کے ڈھال آفتاب کی

اعتراض

اعتراض - مرزا صاحب کا پہلا مصرع نہایت بدترکیب ہے۔ اسکے علاوہ ایک انگلی سے چیرنا نہیں ہوتا۔ بلکہ کھونچا دیا ہوتا ہے۔ ڈھال کی تشبیہ آفتاب سے بہ نسبت آسمان کے زیادہ موزوں ہے۔

جواب

جواب - ایک انگلی سے چیرنا ناممکن نہیں ہے۔ خصوصاً اُن لوگوں کے لیے جو دوسرے لوگوں کی بہ نسبت ہر صفت و شان میں امتیازی درجہ رکھتے ہیں۔ ڈھال کی تشبیہ آسمان سے زیادہ موزوں ہے۔ کیونکہ آسمان علاوہ مدوّر ہونے کے بیچ میں خلو رکھتا ہے اور ڈھال کی بھی یہی شکل و صورت ہوتی ہے۔

تیسرا موازنہ

دبیر	وحشت سے جواں بھاگتے تھے تیر کی مانند		تھا نیزوں کو رعشہ قدمِ پیر کی مانند
انیس	چلنے میں نیزے کانپتے تھے مثلِ پائے پیر		

اعتراض

اعتراض ۔ میر صاحب کا مصرع زیادہ فصیح اور صاف ہے ان الفاظ سے "کانپتے تھے" جو تصویر خیال میں کھنچ جاتی ہے وہ "رعشہ" کے لفظ سے پیدا نہیں ہوتی۔ سب سے بڑھکر یہ کہ جب تک چلنے کی قید مذکور نہ ہو۔ پوری تشبیہ نہیں ہوتی۔ کیونکہ بوڑھے آدمی کے پاؤں چلنے ہی کی حالت میں کانپتے ہیں۔ اسکے ساتھ چونکہ چلنے کا اطلاق پاؤں اور نیزہ دونوں پر ہوتا ہے۔ اس لیے یہ لفظ اس موقع پر نہایت موزوں ہے۔ سب سے بڑھکر یہ کہ نیزہ چلانے کی حالت میں نیزہ کو لچک ہوتی ہے۔ اس لیے اسکو کانپنے سے تعبیر کر سکتے ہیں، اور اس لحاظ سے یہ کہنا کہ نیزہ چلنے کی حالت میں خوف سے کانپتا تھا۔ نہایت لطیف حسن التعلیل ہے۔ بخلاف اسکے مرزا صاحب نے چونکہ نیزہ کی جنبش اور حرکت کا ذکر نہیں کیا۔ اسلیے رعشہ کا کوئی ثبوت نہیں ہوتا۔

جواب

جواب ۔ ہماری رائے میں ان الفاظ میں کہ "کانپتے تھے" اور "رعشہ تھا" کچھ زیادہ تفاوت اور بُعد نہیں ہے۔ رہا یہ اعتراض کہ جب تک چلنے کی قید مذکور نہ ہو۔ پوری تشبیہ نہیں ہوتی۔ کیونکہ بوڑھے آدمی کے پاؤں چلنے ہی میں کانپتے ہیں، غلط ہے۔ گو میر صاحب کے مصرع میں چلنے کے لفظ نے ایک لطف پیدا کر دیا ہے لیکن اگر یہ نہ ہو تو بھی کچھ ہرج نہیں اور مطلب پورا ہو جاتا ہے۔ چنانچہ میر صاحب مرحوم نے جو مولوی شبلی صاحب سے بہت زیادہ فصاحت و بلاغت کے نکتہ داں تھے، اپنے کلام میں اس موقع پر تو نیزہ کے ساتھ چلنے کا لفظ لکھا ہے۔

مگر ایک دوسرے موقع پر اُنھوں نے بھی مرزا صاحب کی طرح اس قید کا کچھ لحاظ نہیں کیا
چنانچہ فرماتے ہیں۔ ؎

اللہ رے رعبِ نعرۂ مولائے خوشخصال	لرزاں تھیں برچھیاں قدمِ پیر کی مثال[۱]

دیکھیے۔ مولوی صاحب! یہاں میر صاحب نے بھی چلنے کا لفظ نہیں لکھا
علاوہ بریں مرزا صاحب نے تو ایک خاص لفظ رعشہ لکھا ہے اور رعشہ ہر وقت رہا
کرتا ہے خواہ آدمی چلے خواہ بیٹھا رہے۔ لہذا اسکے واسطے چلنے نہ چلنے کی قید کی
ضرورت نہیں جیسا کہ ہم میر صاحب کے کلام سے سند دیتے ہیں۔

ع۔ تھا ہاتھ میں نیزوں کے بھی رعشہ صفتِ پیر[۲]

دیکھیے اس موقع پر مرزا صاحب کی طرح میر صاحب کے مصرع میں بھی رعشہ کیواسطے
چلنے کا لفظ مذکور نہیں۔ اور یہ مصرع بعینہ مرزا صاحب کے مصرع سے ملتا ہوا ہے۔

دبیر۔ چلّائے ہاتھ مل کے جلاجل کہ الاماں	
انیس۔ ہوگیا جوڑ کے ہاتھوں کو جلاجل خاموش	

اعتراض۔ جلاجل کے دونوں حصّے جو بجانے میں مل جاتے ہیں اس کی
تعبیر دونوں بزرگوں نے دو طرح پر کی ہے۔ مرزا صاحب کہتے ہیں کہ جلاجل چلّا کر
الاماں کہتا تھا اور ہاتھ ملتا تھا۔ لیکن چلّانے کو ہاتھ ملنے سے کوئی تعلّق نہیں۔
اس لیے گو تشبیہ صحیح ہے۔ لیکن ہاتھ ملنے کی کوئی توجیہ نہیں ہوسکتی۔ میر صاحب
کہتے ہیں کہ حضرت امام حسینؑ کا رعب اسقدر غالب ہوا کہ جلاجل ہاتھ جوڑ کے
چُپ ہوگیا۔ رعب اور خوف کی حالت میں ہاتھ جوڑنا اکثر ہوتا ہے۔ اور چونکہ جلاجل

[۱] ج ۵ ص ۹۰ [۲] ج ۲ ص ۳۱۲

جلاجل سے متعلق

اعتراض

کے دونوں حصّے جب مل جاتے ہیں تو پھر جب تک جُدا نہ ہوں آواز نہیں دے سکتے اس لیے یہ کہنا بالکل صحیح ہی کہ وہ ہاتھ جوڑ کر چُپ ہو گیا۔

جواب۔ جلاجل کے دونوں حصّے جو بجانے میں مل جاتے ہیں اس کی تعبیر دونوں بزرگوں نے دو طرح پر کی ہی۔ میر صاحب مرحوم فرماتے ہیں کہ جلاجل رعب اور خوف کے سبب سے ہاتھ جوڑ کر چُپ ہو گیا۔ یہ تشبیہ بہت صحیح اور درست ہے۔ مرزا صاحب کا یہ مطلب ہی کہ امام حسینؑ پر جور وجفا دیکھ کر جلاجل کو ایسا صدمہ اور افسوس ہوا کہ ہاتھ مل کر الاماں الاماں پکارنے لگا۔ کسی شخص کی بیکسی اور مصیبت پر تاسّف کرنے کے لیے ہاتھ ملنا اکثر ہوتا ہی؛ اور چونکہ جلاجل کے دونوں حصّے جب مل جاتے ہیں تو فوراً آواز دیتے ہیں اسلیے یہ کہنا بالکل صحیح ہے کہ وہ ہاتھ مل کر الاماں الاماں کی آواز سے چلّاتا تھا۔ یہاں الاماں۔ اماں مانگنے اور جاں بخشی چاہنے کے معنی میں نہیں جیسا کہ آپ سمجھے ہوئے ہیں اور اسی بنا پر کہتے ہیں کہ "چلّانے کو ہاتھ ملنے سے کوئی تعلّق نہیں" اور یہ کہ "ہاتھ ملنے کی کوئی توجیہ نہیں ہو سکتی" یہ الاماں اس معنی میں ہی جیسا کہتے ہیں کہ افسوس صد افسوس حیف صد حیف الاماں الاماں اس شخص پر کیسا ظلم ہو رہا ہی۔ یعنی جلاجل ہاتھ ملکر ایسا کہتا تھا۔ اس بند کے چاروں مصرعے یہ ہیں جنسے مطلب صاف معلوم ہو جائیگا۔

ناگہ عمر کے قصد پہ قرنائے کی فغاں		بیداد کی گواہی کو ہر سو اُٹھے نشاں
چلّائے ہاتھ مل کے جلاجل کہ الاماں		نقّارے سینے پیٹتے آگے ہوئے رواں

مرزا صاحب کا یہ مصرع۔ چلّائے ہاتھ مل کے جلاجل کہ الاماں۔ میر صاحب کے اُس مصرع کے بالکل ہم مضمون ہے جو اُنھوں نے ایک دوسرے موقع پر فرمایا ہے،

ع - تھرّا کے جھانجھ بھی کفِ افسوس ملتے تھے[۱] - صرف فرق یہ ہے کہ میر صاحب نے افسوس کا لفظ لکھا ہے اور مرزا صاحب نے اسی معنی میں الاماں کا لفظ استعمال کیا ہے -

اب ہم اس بات کی نظیریں دیتے ہیں کہ الاماں کا لفظ افسوس اور تاسف کے معنوں میں بھی استعمال کیا جاتا ہے - میر انیس فرماتے ہیں ؎

عرش تھرّاتا تھا جب فاطمہؑ چلّاتی تھی	الاماں کی مرے خنجر سے صدا آتی تھی[۲]

پھر فرماتے ہیں ؎

نکلیں سروں کو پیٹتی خیمے سے بیبیاں	تھا خانۂ علیؑ میں تلاطم کہ الاماں[۳]

میر نفیس صاحب - ع - برپا ہوا حرم میں تلاطم کہ الاماں[۴]

میر تعشق لکھنوی - ع - ہونا وہ شام کا وہ اُداسی کہ الاماں[۵]

ملا عبد الکریم خراسانی در مثنوی نان و سرکہ ؎

ایں ہمہ ظلم و ستم بر بندگاں	الاماں از ظلمِ ایشاں الاماں[۶]

دبیر	یوں جسمِ رعشہ دار سے جانیں ہوئیں رواں	جیسے مکاں سے زلزلہ میں صاحبِ مکاں
انیس	یوں روح کے طائر تنِ سر چھوڑ کے بھاگے	جیسے کوئی بھونچال میں گھر چھوڑ کے بھاگے

اعتراض - اصل مضمون یہ ہے کہ روحیں جسم سے اس طرح بھاگ گئیں جس طرح بھونچال میں کوئی گھر چھوڑ کے بھاگ جاتا ہے - مرزا صاحب کے شعر میں صاحبِ مکان

---

[۱] ۳/۱۹۴ [۲] ۴/۲۲ [۳] ۱/۳۶۲ [۴] جلد میر نفیس ص۳ [۵] ۳/۱۵۵ [۶] نان و سرکہ صفحہ ۲۰

بھونچال

اعتراض

کی تخصیص بیکار ہے۔ زلزلہ جب آتا ہے تو صاحب مکان کی کوئی تخصیص نہیں ہر شخص مکان چھوڑ کے بھاگ جاتا ہے۔ جسمِ رعشہ دار کی ترکیب نامانوس ہے اور اس قید سے یہ مفہوم ہوتا ہے کہ صرف اُن لوگوں کی روحیں نکلیں جنکے جسم رعشہ دار تھے

جواب

جواب ۔ مرزا صاحب کا یہ مصرع ایک مقام پر اس طرح چھپا ہے۔ ع
جس طرح بھاگیں زلزلے میں چھوڑ کر مکاں[1] ۔ اس صورت میں صاحبِ مکان کا اعتراض باقی نہیں رہتا۔ لیکن اگر ہم اس مصرع کو اُسی طرح مان لیں جس طرح آپ نے لکھا ہے اور جیسا کہ ایک دوسرے موقع پر مرزا صاحب کی پہلی جلد میں چھپا ہوا ہے، تو بھی شعر بہت موزوں اور بامعنی ہے۔ صرف سمجھ اور عدم توجہی کا قصور ہے صاحبِ مکان کے یہ معنی ہیں کہ جو شخص زلزلے کے وقت مکان کے اندر موجود ہو۔ صاحبِ مکان سے مراد مالکِ مکان نہیں ہے جیسا کہ جناب نے سمجھ رکھا ہے مطلب یہ ہے کہ رعشہ دار جسموں سے روحیں اس طرح بھاگ گئیں جسطرح زلزلہ کیوقت مکان والے اپنے مکان کو چھوڑ کر چلے جاتے ہیں۔ جسمِ رعشہ دار سے یہ مطلب ہے کہ اس خوف و ہراس کے وقت کوئی شخص نہ تھا جسکا جسم رعشہ دار نہو، اسلیئے گویا ہر شخص کے جسم سے روح پرواز کر گئی۔ دونوں صاحبوں نے جسم کو زلزلہ والے مکان سے تشبیہ دی ہے لیکن جبتک جسم میں حرکت اور جنبش کا ثبوت نہو کامل تشبیہ نہیں ہوتی مرزا صاحب کے مصرع میں رعشہ دار کی قید نے جسم کی تشبیہ اُس مکان سے ثابت کر دی جو زلزلے سے متحرک اور متزلزل ہو رہا ہو۔

ان کے علاوہ مؤلف آئنے دونوں صاحبوں کے اور بھی چار پانچ ہم مضمون

---

[1] جلد ۸ ۔ صفحہ ۲۱۱ ۔

اشعار لکھ کر اپنی سمجھ اور لیاقت کے موافق راے زنی کی ہے اُن پر کچھ لکھنا غیر ضروری سمجھ کر ترک کرتے ہیں۔ آخر میں میر صاحب اور مرزا صاحب کے چند مختلف اشعار لکھ دیئے ہیں اور کچھ راے زنی نہیں کی۔

متحد المضمون اشعار میں مرزا دبیر کی ترجیح

(۲) متحد المضمون اشعار میں مرزا دبیر کی ترجیح

ہم کئی بار لکھ چکے ہیں کہ دو شاعروں کے مختلف اشعار جابجا سے منتخب کر کے کسی شاعر کی ترجیح کا مسئلہ طے کرنا نہایت مشکل ہے، کیونکہ ایک شاعر کے اعلیٰ درجے کے اشعار اور دوسرے کے معمولی اشعار مل جانا ناممکن نہیں ہے۔ جس طرح بعض اشعار میں میر صاحب مرحوم کو فوق حاصل ہے اسی طرح اگر تلاش اور جستجو کی جائے تو بعض اشعار میں مرزا صاحب کو فضیلت ہوسکتی ہے۔ مثلاً

پہلا موازنہ

میر انیس	لو آفتاب خانۂ زیں میں ہے جلوہ گر
مرزا دبیر	لو بُرجِ زیں کو غیرتِ برجِ قمر کیا

دونوں صاحبوں نے حضرت امام حسینؑ کے جسم مبارک کو آفتاب و قمر سے تشبیہ دی ہے۔ اس لحاظ سے آفتاب و قمر کا قیامگاہ برجِ زین بہ نسبت خانۂ زین کے زیادہ موزوں ہے۔

دوسرا موازنہ

میر انیس	کہتی تھی یہ گیتی کہ انا الطّور انا الطّور
مرزا دبیر	ہر کوہ کی آواز انا الطّور انا الطّور

مرزا صاحب کا مصرع زیادہ بامعنی اور مضمون خیز واقع ہوا ہے کیونکہ پہاڑوں نے

صداؤں کا نکلنا مشہور و معروف ہے لیکن گیتی آواز نہیں دیا کرتی۔ علاوہ بریں کوہ اور طور میں جو مناسبت ہے وہ گیتی اور طور میں نہیں پائی جاتی، پس کوہ یہ کہہ سکتا ہے کہ میں طور ہوں نہ گیتی۔

تیسرا موازنہ

میر انیس

قبضہ تو رہا دستِ جنابِ شہِ دیں میں	اور تا سرِ دُنبالہ درآئی وہ زمیں میں

مرزا دبیر

قبضہ تو رہا تیغ کا دستِ شہِ دیں میں	پھل جا کے لگا شاخِ سرِ گاوِ زمیں میں

میر صاحب کے پہلے مصرع میں جناب کا لفظ زائد اور "جنابِ شہِ دیں" کی ترکیب قدرے غیر مانوس ہے۔ مرزا صاحب کا پہلا مصرع صاف اور شستہ ہے۔ اس کے سوا مرزا صاحب کے دوسرے مصرع میں پھل شاخ میں جا کر لگنے کی رعایت نے کیسی لطیف صنعتِ ایہام پیدا کر دی ہے۔

چوتھا موازنہ

میر انیس

اُلٹوں فلک کو یوں جو ہو قصد انقلاب کا	جس طرح ٹوٹ جاتا ہے ساغر حباب کا

مرزا دبیر

گردوں گرے، چڑھائیں اگر آستین کو	ہم آستیں کی طرح اُلٹ دیں زمین کو

میر صاحب مرحوم کے شعر میں "اس طرح اُلٹوں" کا جواب "جس طرح ٹوٹ جاتا ہے" کچھ اچھا نہیں معلوم ہوتا۔ یا تو یوں ہونا چاہیے کہ اس طرح اُلٹوں جس طرح اُلٹ جاتا ہے یا اس طرح توڑوں جس طرح ٹوٹ جاتا ہے۔ آسمان کے اُلٹ جانے اور حباب کے ٹوٹ جانے میں کوئی مناسبت اور مشابہت نہیں ہے۔

مرزا صاحب کا شعر زیادہ موزوں اور مطلب خیز ہے۔ یعنی اگر آستین چڑھاؤں تو ہیبت سے آسمان گر پڑیں۔ اور زمین کو اس آسانی سے اُلٹ دوں جس طرح آستین کو اُلٹ دیتے ہیں۔ علاوہ بریں مرزا صاحب کے شعر میں مضمون بھی زیادہ ہے۔ میر صاحب نے آسمان کے اُلٹنے کو ایک پورے شعر میں ادا کیا ہے، مگر مرزا صاحب نے آسمان کے گرنے اور زمین کے اُلٹنے، دونوں باتوں کو ایک ایک مصرع میں بیان کر دیا ہے اور پھر ایک ہی لفظ (آستین) سے دونوں مطلب نکال لیے ہیں۔

انیس	مجلس میں ریا سے جو کہ روتے ہیں نہیں	اشک اُنکے بھی موتی ہیں مگر جھوٹے ہیں
دبیر	یاں اشکِ ریائی کا بھی ہے مول بہشت	موتی سچے ہیں جوہری جھوٹے ہیں
انیس	پرتو ہے یہ رخِ خلفِ بوترابؑ کا	دیکھو اُلٹ گیا ہے ورق آفتاب کا
دبیر	دیکھا گیا نہ جلوۂ روئے جناب کو	عینک کی احتیاج ہوئی آفتاب کو
انیس	خندق کے بھی رہنے نہ دیا غار میں لاشہ	رسّی سے پھرے کھینچتے بازار میں لاشہ
دبیر	پہلے اُسے دربارِ ستمگار میں لائے	پھر کھینچتے ہر کوچہ و بازار میں لائے
انیس	سینے پہ مرے زانوئے قاتل نہ گراں ہو	خنجر کے تلے نام ترا وردِ زباں ہو
دبیر	حلق پر تیغ رہے، سینے پہ جلّاد رہے	لب پہ ہو نام ترا، دل میں تری یاد رہے
انیس	گو خاک پہ بیٹھی ہو مگر نورِ خدا ہو	کس طرح کہوں فاطمہ زہراؑ سے جدا ہو
دبیر	چہرے پہ عجب نور ہے گو خاک نشیں ہو	کیونکر کہوں تم فاطمہؑ کی کوئی نہیں ہو

انیس	پہونچے نہ صبا اُسکے کبھی گرد کے دُنبال
دبیر	جولاں جو ہوا ایک صبا رہ گیا پیچھے
انیس	دو اُنگلی سے حلقہ درِ خیبر کا جو کھینچا
دبیر	دو اُنگلیوں سے قلع کیا قلعۂ خیبر
انیس	بیٹھے سرِ رہ کُرسی پہ خیمے سے نکل کر
دبیر	جلوہ کیا کُرسی پہ شہِ عرش نشیں نے
انیس	سائل کو کِسنے دی ہے انگوٹھی نماز میں

دبیر	کی جس سخی نے جود رکوع و سجود میں	دیگر	انگشتری گدا کو عطا کی رکوع میں

الحمدُ للہ علی الاتمام والصّلوۃ والسّلام علیٰ رسولہ محمّدٍ وآلہ الکرام

وتقبّل اللہ ھذا الکتاب من عبدہ المستہام وجعلہ مقبولاً للانام،

این نگارین نگار رشکِ نگار | کہ سوادش خوش از بیاضِ چمن

از قبولِ نگارخانۂ فیض | باد مقبولِ مقبلانِ سخن

تمام شد